چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

ڈر ڈائجسٹ

کراچی

خاص کہانیاں:

ابلتا لہو، مجبوری، عقرب

دختر آتش

دسمبر 2014

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

قرآن کی باتیں

☆ اور اے محمد ان کو آدم کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل کے حالات، جو بالکل سچے ہیں، پڑھ کر سنا دو کہ جب ان دونوں نے اللہ کی جناب میں کچھ نیازیں چڑھائیں تو ایک کی نیاز تو قبول ہوگئی اور دوسرے کی قبول نہ ہوئی۔ تب قابیل ہابیل سے کہنے لگا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا اس نے کہا کہ اللہ پرہیزگاروں ہی کی نیاز قبول فرماتا ہے اور اگر تو مجھے قتل کرنے کے لئے مجھ پر ہاتھ چلائے گا تو میں تجھ کو قتل کرنے کے لئے تجھ پر ہاتھ نہیں چلاؤں گا۔ مجھے تو خدائے رب العالمین سے ڈر لگتا ہے میں چاہتا ہوں کہ تو میرے گناہ میں بھی ماخوذ ہو اور اپنے گناہ میں بھی۔ پھر اہل دوزخ میں ہو۔ اور ظالموں کی یہی سزا ہے مگر اسکے نفس نے اس کو بھائی کے قتل ہی کی ترغیب دی تو اس نے اسے قتل کر دیا اور خسارہ اٹھانے والوں میں ہو گیا اب اللہ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کریدنے لگا تاکہ اسے دکھائے کہ اپنے بھائی کی لاش کو کیونکر چھپائے۔ کہنے لگا اے ہے مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اس کوے کے برابر ہوتا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا۔ پھر وہ پشیمان ہوا۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 27 سے 31)

☆ نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق و مغرب کو قبلہ سمجھ کر ان کی طرف منہ کر لو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر اور فرشتوں پر اور اللہ کی کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں کو چھڑانے میں یعنی قرض داروں کے قرض ادا کرنے میں خرچ کریں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور جب عہد کر لیں تو اس کو پورا کریں اور سختی اور ایمان نہ لائیں نکاح نہ کرنا کیونکہ مشرک عورت خواہ تم کو کیسی ہی بھلی لگے اس سے مومن کنیز بہتر ہے اور اسی طرح مشرک مرد جب تک ایمان نہ لائیں، مومن عورتوں کو ان کی زوجیت میں نہ دینا۔ کیونکہ مشرک مرد سے خواہ وہ تم کو کیسا ہی بھلا لگے مومن غلام بہتر ہے یہ مشرک لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنی مہربانی سے بہشت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے اور اپنے حکم لوگوں سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ نصیحت حاصل کریں۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 221)

☆ اور مومنوں مشرک عورتوں سے جب تک ایمان نہ لائیں نکاح نہ کرنا کیونکہ مشرک عورت خواہ تم کو کیسی ہی بھلی لگے اس سے مومن کنیز بہتر ہے۔ اور اسی طرح مشرک مرد جب تک ایمان نہ لائیں، مومن عورتوں کو ان کی زوجیت میں نہ دینا۔ کیونکہ مشرک مرد سے خواہ وہ تم کو کیسا ہی بھلا لگے مومن غلام بہتر ہے یہ مشرک لوگوں کو دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنی مہربانی سے بہشت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے۔ اور اپنے حکم لوگوں سے کھول کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ نصیحت حاصل کریں۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 221)

(کتاب کا نام "قرآن مجید مترجم" ناشر شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

شبانہ حنیف کراچی سے، السلام علیکم! ایڈیٹر صاحب، گزشتہ دو ماہ سے ڈر ڈائجسٹ زیر مطالعہ ہے، جبکہ میں دیگر رسائل و جرائد کی باقاعدہ قاری ہوں۔ ڈر ڈائجسٹ گھر لانے کی وجہ سراسر میری بیٹی کی فرمائش تھی، میری بیٹی سحرش کو خوفناک کہانیاں پڑھنے کا شوق یہ ڈائجسٹ گھر لانے کا سبب بنا۔ میری بچی نے ڈائجسٹ پڑھا اسے بہت پسند آیا اور اس نے ادارے کو خط لکھا اور شکایت یہ ہے کہ آج کل خطوط لکھنے کا چلن کتنا کم ہو کر رہ گیا ہے اس کے باوجود کوئی خط لکھے تو اس کی قدر کرنی چاہئے جو کہ آپ نے نہیں کی۔ آج کل کے دور میں جو کہ انٹرنیٹ کا دور ہے اس میں خط لکھنا بجائے خود کارنامہ ہے۔ آپ کو حوصلہ افزائی کرنی چاہئے تھی۔ کیونکہ سائنس کے طالب علم (بی ایس سی) کے وقت کی اہمیت امتحانات کے زمانے میں آپ بخوبی جانتے ہوں گے۔ نومبر کا شمارہ ہاتھ میں لیتے ہی خط نہ پاکر بہت مایوسی ہوئی۔ بہرحال آپ کا شمارہ انفرادیت لئے ہوئے ہے کہ اس میں ان لوگوں کی دلچسپی کا تمام سامان موجود ہے جن کو چونکا دینے والی خوفناک کہانیاں اور واقعات پسند ہیں۔ مجھے ذاتی طور پر ایم اے راحت کی کاوش زندہ صدیاں پسند آئی ہے۔ ایک عرصہ سے خواہش تھی کہ مہابھارت کا اردو ترجمہ پڑھ سکوں۔ راحت صاحب کی کہانی میں اس کا خلاصہ موجود ہے۔ بے حد شکریہ، باقی جریدہ ابھی زیر مطالعہ ہے بس اپنی بچی کی مایوسی دیکھی نہ گئی تو آپ کو شکایت لکھ بھیجی ہے۔ امید ہے توجہ فرمائیں گے۔ مزید انفرادیت یہ نظر آئی آپ کے جریدے میں کہ آپ نے ہر خط کے جواب کا اہتمام کیا ہوا ہے۔ اچھا سلسلہ ہے جاری رہنا چاہئے کیونکہ دیگر جرائد میں جواب بہت کم اور کسی کسی کو دیئے جاتے ہیں۔ میری بیٹی مستقل ماورائی کہانیوں کی قاری رہے گی اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ خط بروقت پہنچانے کی وجہ سے کہانیوں پر تبصرہ اگلی مرتبہ انشاء اللہ۔

☆☆ شبانہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں ویلکم، منہ میں ہم بھی زباں رکھتے ہیں، کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے، آپ کا تاریخ سے لگاؤ قابل قدر ہے ورنہ آج کل تو...... خیر اصل بات یہ ہے کہ سحرش صاحبہ کا خط لیٹ موصول ہوا...... لہٰذا تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں۔ ڈر ڈائجسٹ کی کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت دل کی گہرائی سے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی آپ اور سحرش شکریہ کا موقع دیتی رہیں گی۔ Thanks۔

پیا سحر مدینہ سیداں گجرات سے، السلام علیکم! حوصلہ افزائی اور تحریروں کو جگہ دینے کے لئے بہت بہت شکریہ، اکتوبر کا شمارہ بہت لیٹ ملا، سالگرہ نمبر ہونے کی وجہ سے بے چینی سے انتظار تھا۔ قرآن کی باتوں کے بعد خالد صاحب کا میسج پڑھا، سچ جانیں دل بھر آیا، خطوط کی محفل میں شگفتہ ارم درانی کا خط پڑھتے پڑھتے جب نظر پیا سحر پر پڑی تو میں خوشی سے اچھل پڑی، کیونکہ مجھے لگا تھا کہ خط محکمہ ڈاک کی نظر ہو چکا اور ایم اے راحت صاحب کی زندہ صدیاں سب سے پہلے پڑھی، پراسرار آئینہ بہت اچھی کہانی تھی۔ لفٹ ساحل دعا بہت خوب، اپنے فیورٹ رائٹر مدثر بخاری کی جادوئی چکر نمبر ون لگی، ہمیشہ کی طرح پھر سے ایک نئے سسپنس میں ڈال دیا کہ وہ لوگ تھے کون؟ عشق ناگن بہتر جا رہی ہے اگر رومانس کم کر دیا جائے تو، باقی ابھی بہت سی کہانیاں پڑھنی ہیں، ایک نظم اور ایک کہانی ارسال کر رہی ہوں۔ قوی امید ہے کہ ضرور ڈر کے معیار پر پورا اترے گی۔ آخر میں ڈر کے لئے دعائے خیر کہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین۔

☆☆ پیا صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، کہانی موصول ہو چکی ہے امید ہے اچھی ہوگی، اگلے شمارہ تک انتظار کریں۔ مگر آئندہ اپنی رائے برائے مہربانی کہانیوں کے لئے بھیجنا بھولئے گا نہیں۔ Thanks۔

ساجدہ راجہ ہنڈواں سرگودھا سے، تمام ڈر اسٹاف اور قارئین کو السلام علیکم، سالگرہ نمبر موصول ہوا، سوائے خطوط کے ابھی مطالعہ نہیں کیا، وجہ پھر چچا کی موت...... سات ستمبر کی رات میرے سب سے بڑے چچا کی وفات ہوگئی۔ اس دنیا سے میرے لئے سب سے زیادہ پیارا رشتہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ رمضان میں سب سے چھوٹے چچا اور پھر اتنی جلدی اک اور چچا کی وفات، میرے چاروں چچا کی یکے بعد دیگرے اس دنیا سے چلے جانا۔ اور چچا بھی وہ جو ہمیں اپنے بچوں سے بھی بڑھ کر پیار کرتے تھے۔ اور دوستوں کی طرح ٹریٹ کرتے تھے کتنا میٹھا رشتہ ہوتا ہے چچا کا۔ باقی پھپھو ماموؤں کا رشتہ میں نے نہیں دیکھا۔ مجھے تو بس اسی رشتے کی مٹھاس کا پتہ تھا۔ پانچوں بھائیوں میں بس میرے ابو ہی بچے ہیں ان کی صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی، میرے ابو کی صحت کے لئے ضرور دعا کیجئے گا اور میرے چاروں چچاؤں کے لئے مغفرت...... جب دکھ شدید ہوتا ہے تو اسے بیان کرنے کے لئے الفاظ کم پڑ جاتے ہیں میرے پاس بھی اس دکھ کو بیان کرنے کے لئے کوئی الفاظ نہیں۔ صرف سات سال کے عرصے میں چار پیارے چچاؤں کی موت بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ لیکن موت پہ کس کا زور چلا ہے۔

شائستہ عمر صاحبہ کافی عرصے بعد نظر آئیں۔ کہاں غائب ہوتی ہیں؟ ثوبین خان آپ کہاں غائب ہیں، سنبل عروج ماہین، آپ بھی؟ کہانیوں کا مطالعہ کیا لیکن ذہن کی حالت ابتر ہے۔ سو تبصرہ نہیں کر سکتی۔ سب کے لئے ڈھیر ساری دعا۔

☆☆ ساجدہ صاحبہ: آپ تمام اہل خانہ کا دکھ بہت بڑا ہے ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ تمام اہل خانہ پر اپنا فضل و کرم کرے، آپ سب کے دکھ کا خاتمہ کردے۔ اور آپ کے پیاروں کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے کر جنت میں اعلیٰ مقام دے اور تمام قلبی رشتوں کو صبر جمیل عطا کرے۔

شگفتہ ارم درانی پشاور سے، ڈر کی محفل میں شگفتہ کا سلام۔ بعد از سلام عرض کرتی ہوں کہ نومبر 2014ء کا ڈر ڈائجسٹ بہت بہترین تھا۔ تمام کہانیاں شاندار تھیں۔ میری کہانی شائع کرنے کے لئے ویری تھینکس۔ چونکہ ہم سب ایک خاندان کی طرح ہیں اور رشتہ اتنا پائدار، اٹوٹ اور مضبوط ہے کہ گلے شکوے کرنے کا حق بھی ہمیں حاصل ہے کیونکہ گلہ بھی اپنوں سے ہی کیا جاتا ہے تو لیجئے جناب بغیر بات کو گھمائے الجھائے ہم اپنے مدعا پر آتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہمارا دل اب تک بے چین ہے اور اپنے محبوب رسالے سے شکایت گزار ہے کہ آخر کیوں...... ہماری ''دلہن'' کو میرے اپنے لکھے اشعار کے زیورات سے محروم کیا گیا......؟ کتنے چاؤ سے ہم نے خالص کندن کے زیورات اور یاقوت ومرجان سے آراستہ وپیراستہ اشعار سے اپنی ''دلہن'' کو سجایا...... لیکن...... جج صاحب...... میری بیچاری نئی نویلی ''دلہن'' کے ساتھ یہ سوتیلوں والا سلوک...... کیوں......؟ جج صاحب...... آخر کیوں......؟ بندہ ناچیز نے اپنے وجود کے تخلیق کردہ اشعار خدمت میں پیش کئے تھے پر آپ صاحبان نے کہانی کی اصلاح اور نوک پلک سنوارنے کی آڑ میں میرا ''فن شاعری'' قربان کردیا۔ ''آخر کیوں......'' اب میں اپنے دل کی اس عدالت میں کیا جواب دوں...... اچلئے شکوے شکایتیں ایک طرف...... ہم نے پھر سے ایک نئی تحریر کے لئے قلم اٹھالیا ہے...... اور اس مرتبہ ہمیں یقین ہے کہ ہماری تحریر کو ''کاٹ کوٹ'' کے لئے بے رحم قلم کو لگام دیا جائے گا۔ آئندہ ماہ تک کے لئے اجازت، ڈر کی ترقی کے لئے دعاگو۔

☆☆ شگفتہ صاحبہ: آئندہ آپ کی خوشیوں کا خیال رکھا جائے گا، جو ہونا تھا ہوگیا اور آپ کی دلہن کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔ خوش ہوجائیں اور حسب وعدہ خاص نمبر کے لئے کہانی جلد از جلد ارسال کردیں، شادی کی مٹھائی...... کھلانا بھولئے گا نہیں۔

سحرش حنیف کراچی سے، السلام علیکم! بے شک جن وانس کو خدا نے اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے اور جنات کا وجود برحق ہے۔ اگر ان کو تنگ نہ کیا جائے تو یہ ہمیں بھی تنگ نہیں کرتے۔ مجھے ماورائی کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق ہے، ڈر ڈائجسٹ سے میرا رشتہ بہت پرانا نہیں ہے، میں نے حال ہی میں اسے پڑھنا شروع کیا ہے۔ میں بی۔ ایس۔ سی سال دوئم کی طالبہ ہوں۔ لہٰذا مصروفیات ہونے کی وجہ سے زیادہ مطالعہ سے قاصر ہوں لیکن آج کل مصروفیات کم ہونے کی وجہ سے یہ رسالہ میں نے بہت کم دنوں میں پڑھ ڈالا۔ اکتوبر کا سالگرہ نمبر کا شمارہ میری نظر سے گزرا۔ جہاں تک کہانیوں کی بات ہے، تمام کہانیاں بہت عمدہ ہیں۔ اس شمارے کی میری پسندیدہ کہانیاں سفید حویلی، جنی، پراسرار آئینہ، روح کا راز اور کالی چڑیل ہیں۔ بلاشبہ کالی چڑیل سب سے طویل کہانی ہے۔ لیکن اس کہانی سے ایک سبق بھی حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ضد کا انجام بہت برا ہوتا ہے۔ یہ کسی بھی ڈائجسٹ میں میرا پہلا خط ہے، امید ہے ضرور حوصلہ افزائی ہوگی۔

☆☆ سحرش صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ کا خط پہلے ماہ لیٹ موصول ہوا، جس کی وجہ سے شائع نہ ہوسکا، ہم معذرت خواہ ہیں، ڈر ڈائجسٹ کی کہانیاں آپ کو پسند ہیں اس کے لئے بہت بہت شکریہ، امید ہے آپ آئندہ بھی اپنی رائے بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گی۔

طاہرہ آصف ساہیوال سے، السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ ادارے کے سارے لوگ خیریت سے ہوں گے، میری لکھی ہوئی پہلی دو تحاریر کو آپ لوگوں نے شرف قبولیت بخشا، میرے لئے یہ بہت خوشی کی بات ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میں پہلی بار ہی کسی اچھے ڈائجسٹ کا حصہ بن جاؤں گی، بہرحال پہلے تو باری تعالیٰ اور پھر آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے موقع دیا۔ میں نے اب پھر دو تحریریں تیار کی ہیں، ایک تو بالکل حقیقی واقعات پر مبنی ہے اور دوسری طبع زاد نجانے کیوں مجھے اس بار اپنی طبع زاد کچھ خاص پسند نہیں آئی، شاید کچھ ہے جو شامل ہونے سے رہ گیا ہے لیکن حتمی فیصلہ تو آپ سب نے کرنا ہے سچ تو یہی ہے کہ جیسا آپ نے کہا لکھتے لکھتے ہی لکھنا آئے گا، اگلی بار کوشش کروں گی کہ کچھ اچھا اور کچھ نیا لکھ سکوں، میں تھوڑی سی وضاحت کروں گی کہ میں عرصہ تک انسان اور منقلب سانپوں کے واقعات کو غیر یقینی تصور کرتی تھی لیکن کچھ کھنڈر بزرگوں اور کچھ مستند تحریروں سے پتہ چلا کہ تاریخ میں ایسا اکا دکا واقعات ہیں جو مختلف سانپوں کا پتہ دیتے ہیں اسی بنیاد پر میں نے یہ تحریر لکھی ہے۔ آخری بات کہ مجھے کہانی کا نام سوچنا خاصا مشکل لگتا ہے یہ کام میں آپ پر چھوڑتی ہوں، مزید اس میں کوئی قطع برید کرنا چاہیں تو

بھی اچھا ہے اس سے تجھے اصلاح ملے گی۔

☆☆ طاہرہ صاحبہ: یہ حقیقت ہے کہ لکھتے لکھتے آدمی لکھاری بن جاتا ہے۔ ہر چیز کی کامیابی اور عروج کے لئے وقت درکار ہوتا ہے اور اس کے لئے انتھک کوشش خیر خوش ہو جایئے۔ آپ کی ''دختر آتش'' بھی شامل اشاعت ہے، لیکن اس خوشی میں آئندہ تبصرہ بھیجنا بھول نہ جایئے گا نہیں۔

دینا زہرہ ہاشمی جھنگ صدر سے، السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ سب خیریت سے ہوں گے اور ہنستے مسکراتے ہوں گے، نومبر کا ڈر 27 اکتوبر کو ملا، پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں جس سے بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کو ملا۔ اس کے بعد کہانیوں کی طرف بڑھی تو پہلے بھائی خالد شاہان کی اسٹوری محبت کی بازی پڑھی جو کہ بہت اچھی لگی، اس کے بعد ایم اے راحت کی زندہ صدیاں پڑھی جو کہ زبردست تھی، اے وحید کی رولوکا، ایم الیاس کی عشق ناگن اور بھائی محمد بلال کی خوش نصیب بھی کمال کی تھیں، شمارے میں شامل باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ میرے دوست مصباح کریم، ابوذر غفاری، ابو ہریرہ بلوچ کو خصوصی سلام خدا کرے کہ آپ ہمیشہ خوش اور سلامت رہیں۔ دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ ہر وہ منزل اور مرتبہ پائے جس کا یہ مستحق ہے۔

☆☆ دینا صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں ویلکم، کہانیوں کی پسندیدگی اور آئندہ بھی انہیں اپنی رائے بھیجنے کے لئے شکریہ قبول کریں۔

عاصمہ احمد آہیر جنڈانوالہ بھکر سے، السلام علیکم! ڈر ڈائجسٹ کا مطالعہ کافی عرصے سے کر رہی ہوں، مگر تحریر فرسٹ ٹائم بھیج رہی ہوں، اور میری کہانی ڈر کے معیار پر پوری اترے تو ضرور شائع کیجئے گا امید ہے کہ ادارہ مایوس نہیں کرے گا۔

☆☆ عاصمہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، آپ کی کہانی پراسرار مندر کمپوز ہو چکی ہے اور آئندہ ماہ ضرور شائع ہوگی، آئندہ خط کے ساتھ تبصرہ ضرور ارسال کیجئے گا۔

کوثر جہاں کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے، ڈر ڈائجسٹ کی محفل میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں، قاری تو بہت پرانی ہوں، لیکن قلم آج اٹھایا ہے، ڈر ڈائجسٹ نے متوجہ تو اس وقت کیا جب اس کے سرورق پر نظر پڑی اور اتنا اچھا سرورق دیکھ کر ہم رسالہ خریدے بغیر نہ رہ پائے اور جب خرید لیا تو پڑھے بغیر نہ رہ پائے جب تک پورا رسالہ پڑھ نہ لیا چین نہ آیا، ایک سے ایک بہترین کہانیاں جب سے ہم اس رسالے کے دیوانے ہیں یہ کافی پرانی بات ہے۔ آج قلم اٹھانے کی وجہ ماہ نومبر کا رسالہ ہے جو ہمارے ہاتھ میں ہے رسالہ پڑھ کر ہمیں اندازہ ہوا، معیاری اور حقیقت سے قریب کہانیاں بھی آج کل کے دور میں لکھی جاتی ہیں اور معیاری رسالے انہیں چھاپتے بھی ہیں، ماہ نومبر کے رسالے میں ویسے تو سب کہانیاں اچھی ہیں لیکن ضرغام محمود کی کہانی حسد نے ہمیں قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا، کہانی کیا ہے، ایک حقیقت ہے جو کہ آج کل معاشرے میں پھیلی ہوئی ہے۔ حسد، جیسے جذبہ نے آج ہر انسان کو تباہی کے راستے پر لا کھڑا کیا ہے، ضرغام محمود نے جس انداز میں اس کو لکھا ہے وہ تعریف کے قابل ہیں، ضرغام کے لئے تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں ''اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔'' (آمین) اس کے علاوہ رسالے میں ''سرد جہنم'' کہانی بھی قابل تعریف ہے۔ محبت کی بازی، جادوئی بساط وغیرہ بھی قابل تحسین ہے، رضوان بھٹی کی کاوش بھی دل کو چھوگئی، مجموعی طور پر ماہ نومبر کا رسالہ اے ون تحریروں پر مبنی ہے۔ ہماری دعا ہے ''ڈر ڈائجسٹ'' اللہ کرے دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرے اور ہم جیسے ایڈونچر سے بھرپور دل والے لوگوں کو سیراب کرتا رہے، خط کے آخر میں ڈر ڈائجسٹ کو سویٹ 16 سالگرہ مبارک ہو۔

☆☆ کوثر صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، قلبی لگاؤ سے ڈر ڈائجسٹ اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، آئندہ ماہ بھی آپ کے قلبی لگاؤ کا شدت سے انتظار رہے گا۔ شکریہ۔

نعیم بخاری آکاش اوکاڑہ سے، السلام علیکم! میں اللہ کے فضل و کرم سے ٹھیک ہوں اور رب العزت کے حضور آپ کی خیریت کے لئے دعا گو ہوں۔ محترم یوں تو ڈر کے ساتھ میرا تعلق عرصہ 7 سال سے ہے مگر چند معاملات کی وجہ سے میں لکھنے کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکا۔ مگر ڈر کا مطالعہ ضرور کرتا رہا ہوں اور مجھے یہ دیکھ کر بہت ہی خوشی ہوئی کہ ڈر کا معیار جوں کا توں برقرار ہے۔ اب آتے ہیں بزم بہاراں کی طرف شگفتہ ارم ہمدانی کی شادی کے بارے میں پڑھ کر خوشی ہوئی، محترمہ لکھنے کا سلسلہ جاری رکھیں، آپ کی تحاریر اچھی ہوتی ہیں۔ کہانیوں میں سب سے اچھی کہانی ''محبت کی بازی'' تھی۔ ''دلہن'' بھی قابل تعریف کہانی ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ سکندر حبیب کی ''نیک طاقتیں'' ''حسد'' ''پرانا قبرستان'' ''صدیوں کی آگ'' ''مسلسل سزا'' ''جادوئی بساط'' ''سرد جہنم'' اچھی تحاریر تھیں، رائٹرز نے محنت سے لکھی تھیں جبکہ رضوان بھٹی کی ''مجلس جنات'' عجیب سی کہانی تھی، حالانکہ وہ اچھا لکھ سکتے ہیں لیکن اس کہانی میں خوف کا عنصر محسوس نہیں ہوا۔ ایک کہانی ''خونی کموڈو

ڈریگون' حاضر خدمت ہے امید ہے شائع کرکے شکریہ کا موقع دیں، اب اجازت چاہتا ہوں، اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔ اللہ حافظ!

☆☆ نعیم صاحب: ایک طویل عرصہ بعد ڈر ڈائجسٹ میں حاضری خوشی کی بات ہے۔ ایک بار پھر خوش آمدید، اس خوشی میں 2011ء میں ارسال کردہ کہانی تڑپتی روح شامل اشاعت ہے۔ امید ہے آپ آئندہ بھی نوازش نامہ بھیجنا بھولیں گے نہیں۔

بشیر احمد بھٹی بہاولپور سے، محترم ایڈیٹر صاحب! آپ کو اور تمام ڈر کے اسٹاف کو السلام علیکم! ڈر بڑی خوب صورت حالت میں مارکیٹ میں اور قارئین کے دلوں میں جگہ بنائے ہوئے ہے۔ یہ سب آپ کی محنت کا نتیجہ ہے۔ نومبر کا خوب صورت شمارہ سامنے ہے۔ صرف ایک چھوٹی سی شکایت کی جسارت کررہا ہوں۔ ناراضگی معاف، اعزازی شمارہ حاصل کرنے کی خاطر کچھ لکھاری ہر ماہ اور ڈائجسٹوں سے کہانی نقل کرکے اپنے نام سے شائع کرادیتے ہیں۔ کبھی کبھار کی بات ہو تو فرق نہیں پڑتا۔ اکثر نئے شمارے میں ایک دو کہانیاں نقل ہوتی ہیں۔ نقل خوری بھی چوری ہے۔ آپ ان کو اس چوری سے بعض رہنے کی تلقین کریں۔ اکثر لطائف اور اقوال زریں بھی نقل ہوتے ہیں۔ خیر یہ کوئی المیہ نہیں۔ اب تو ماشاء اللہ ڈر شہروں کے علاوہ دیہاتوں تک جا پہنچا ہے۔ اسلامی کالونی میں اقبال ٹی اسٹال ہے۔ پچھلے دنوں میں وہاں بیٹھا تھا۔ ایک لڑکے کے ہاتھ میں ڈر ڈائجسٹ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ کہاں رہتے ہو۔ وہ بولا۔ فلاں چک میں رہتا ہوں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ڈر اب دیہاتیوں کو بھی ڈرانے چکوں میں جا نکلا ہے۔

☆☆ بشیر صاحب: خط لکھنے کو اور دل کو لگتی باتوں کے لئے شکریہ، نقل شدہ کہانیوں کی آپ بالکل ثبوت دے سکتے ہیں۔ آپ تمام قارئین کی محبت ہے کہ ڈر ڈائجسٹ اب دیہاتوں میں بھی لوگوں کے شوق کی تسکین کررہا ہے۔ اور ہاں یاد آیا آپ کی ایک کہانی کیا چھپی کہ اب دوبارہ.....

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! خیروعافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں، روزانہ شہر جاتا ہوں۔ مگر ابھی تک ماہ نومبر 2014ء کا ڈر ڈائجسٹ کا تازہ پرچے کا دیدار نصیب نہیں ہوا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہوئے پھر دوبارہ بکسٹال پر گیا تو تازہ پرچہ دیکھ کے میرا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ سرورق پہلے سے زیادہ بہتر اور خوب صورت تھا، خط اور غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ ڈر ڈائجسٹ کے سارے سلسلے اپنی اپنی جگہ پر انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ ہیں، کافی دنوں سے خط تحریر کرنے کا سوچ رہا تھا مگر مشکل سے وقت ملا اور یہ حقیر سی تحریر آپ کی نذر کررہا ہوں، یہ ایک معیاری پرچہ ہے، ہر ماہ کے آخر پر ہمیں اس کا بڑی شدت سے انتظار ہوتا ہے۔ خط سے آدھی ملاقات ہوجاتی ہے ویسے بھی آج کل ساری فضا سوگوار ہے محرم کی وجہ سے ہر طرف ماحول پر جمود ساطاری ہے، آہستہ آہستہ موسم تبدیل ہوگیا ہے اور سردی کا آغاز ہوا جاتا ہے۔ آپ کی محنت اور قارئین کی دعاؤں سے ڈر ڈائجسٹ پہلے سے زیادہ بلندیوں کو چھو رہا ہے اور اسے کامیابی سے ہمکنار کرے۔

☆☆ جاوید صاحب: یہ حقیقت ہے کہ آپ کا قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا خط پڑھ کر دل خوش ہوجاتا ہے۔ آپ کی چاہت ڈر ڈائجسٹ سے واقعی قابل دید ہے۔ اور ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اور تمام قارئین اور ان کے اہل خانہ پر اپنا فضل وکرم رکھے اور ہر ماہ ہماری آدھی ملاقات بذریعہ خط ہوا کرے۔

محمد ابوہریرہ بلوچ بہاولنگر سے، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امید کرتا ہوں کہ ڈر ڈائجسٹ کا تمام عملہ، رائٹرز اور قارئین خیریت سے ہوں گے، نومبر 2014ء کا ڈر اس دفعہ 26 اکتوبر کو موصول ہوگیا تھا۔ پچھلے ماہ دوستوں کی بزم میں شرکت نہ کرسکا وجہ یہ ہے کہ کچھ دنوں سے ایک اسٹوری لکھنے میں مصروف تھا جو کہ بفضل خدا مکمل ہوگئی ہے۔ انشاء اللہ چند دن بعد بھیج دوں گا کیونکہ اب بھی اس میں کچھ غلطی کی اصلاح کرنی ہے امید ہے جلد کرلوں گا۔ اور آئندہ حاضری کو مسلسل اور یقینی بناؤں گا انشاء اللہ۔ نومبر کا شمارہ ہاتھ میں آتے ہی حسب معمول خطوط کی محفل میں حاضری دی اور پھر قرآن کی باتیں پڑھ کر خود کو قیمتی موتیوں سے مستفید کیا۔ اس کے بعد کہانیوں کی طرف گئے تو سب سے پہلے ایم اے راحت کی اسٹوری زندہ صدیاں پڑھی جو کہ واقعی کمال اور لاجواب تھی۔ پھر انکل خالد شاہان کی کاوش محبت کی بازی پڑھی تو دل خوش ہوگیا۔ واہ انکل جی کمال کردیا اتنی زبردست اسٹوری لکھنے پر مبارکباد، پھر اے وحید کی رولوکا، عابد علی جعفری کی مسلسل سزا، ایم الیاس کی عشق ناگن، خوش نصیب محمد بلال، سردجسم ایس امتیاز، اور رضوان بھٹی کی مجلس جنات اچھی تھی۔ باقی کہانیاں بھی عمدہ تھیں۔ آخر میں میرے دوست پروفیسر محمد اختر بلوچ، عمر فاروق بہاولنگر، محمد ابوذر بلوچ اور دیناز ہرہ ہاشمی کو خصوصی سلام اور ندیم عباس سیوانی کو بھی سلام۔

☆☆ ابوہریرہ صاحب: قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا نوازش نامہ پڑھ کر خوشی ہوئی، کہانی جتنی جلدی ہوسکے بھیج دیں، کہانیوں کی تعریف اور

آئندہ ماہ بھی خط بھیجنے کے لئے شکریہ قبول کریں۔

عمران پشاور سے، السلام علیکم! سب سے پہلے سب کو سلام امید ہے کہ سب خیریت سے ہوں گے، میں ایک عرصہ سے ڈرڈائجسٹ پڑھ رہا ہوں، یعنی فرسٹ ایئر سے، اور اب تک پڑھ رہا ہوں اور میں اب تھرڈ ایئر میں پڑھ رہا ہوں، یعنی تین سال سے پڑھ رہا ہوں، ڈرڈائجسٹ کی ساری کہانیاں، بہت پسند آتی ہیں اور اچھی لگتی ہیں۔ تمام رائٹر خوب سے خوب تر کہانیاں لکھ رہے ہیں، میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈرڈائجسٹ کو ہمیشہ قائم ودائم رکھے، یہ میرا پہلا خط ہے۔ اور قوی امید ہے کہ اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو آئندہ بھی خط لکھتا رہوں گا۔

☆☆ عمران صاحب: ڈرڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ کو ڈرڈائجسٹ اور اس کی کہانیاں پسند ہیں، اس کے لئے بہت بہت شکریہ، امید ہے آئندہ ماہ بھی خط لکھنا بھولیں گے نہیں۔

شکیل نیازی میانوالی سے، السلام علیکم کے بعد عرض ہے کہ میں کافی وقت سے ڈرڈائجسٹ پڑھ رہا ہوں اور سوچ رہا تھا کہ اپنی کوئی تحریر ارسال کروں اور پھر اسی سوچ سوچ میں ایک طویل عرصہ نکل گیا، خیر میں نے اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنا دیا اور ایک ادنیٰ سی کاوش لے کر حاضر ہوا ہوں، امید ہے حوصلہ افزائی ہوگی اگر تحریر قابل اشاعت یا نہ ہو تب بھی ضرور آگاہ کیجئے گا۔ جوابی لفافہ ارسال ہے۔

☆☆ شکیل صاحب: سب سے پہلے تو ڈرڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، ابھی تحریر پڑھی نہیں مگر انداز تحریر دیکھ کر امید ہے کہ تحریر بہتر ہوگی۔ آپ کا ارسال کردہ لفافہ ارسال کیا جارہا ہے کہ آپ کی تحریر کس ماہ میں شامل اشاعت ہوگی، لیکن آئندہ ماہ نوازش نامہ بھیجنا بھولئے گا نہیں۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈوالہ یار سے، محترم خالد صاحب ڈھیروں دعائیں، نیک خواہشات کے ساتھ لبوں پر مسکراہٹ کے پھول سجائے، ڈر کی محفل میں حاضری دے رہا ہوں، اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ ہمیشہ آپ کو ڈر کے تمام اسٹاف، قارئین، لکھاریوں کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ دوستوں کی محفل بھی سجی رہے۔ انیلہ صاحبہ کے خیالات ایم الیاس کے بارے میں مکمل اتفاق ہے۔ ایم الیاس، ایم اے راحت جاسوسی سمیت ہر موضوع پر لکھنے کے بادشاہ ہیں۔ قاضی حماد سرور کے تبصرے سے بھی اتفاق کرتے ہیں، رائٹر صاحبان غور فرمائیں۔ سیدہ عطیہ زاہرہ کے چاچا کے لئے مغفرت کے لئے بے انتہا دعائیں۔

☆☆ شریف الدین صاحب: آپ کا خلوص قابل دید ہے، آپ جس طرح سب کو قلبی لگاؤ کے ساتھ یاد کرتے ہیں، اس کے لئے شکریہ، قارئین اور ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر وقت اپنے حفظ وامان میں رکھے۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! ماہ نومبر 2014 کا شمارہ ہمارے سامنے ہے، خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ اسٹوریز خوب سے خوب ہیں۔ ہمارے تجزیے کی پسندیدگی اور ہماری اسٹوریز پسند کرنے کا شکریہ...... میٹر آپ کے پاس ہے۔ پلیز دیکھئے گا...... مزید Ad میٹر میں...... وہ آواز کس کی ہے......؟ غزل، مراسلہ، ارسال خدمت ہے۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ تجزیہ، Next شمارے میں بھیجیں گے، ہماری طرف سے آپ کو اور دیگر اسٹاف اور "ڈر ڈائجسٹ" کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے ویورز کو دعا سلام۔ پلیز اپنا خیال رکھئے گا۔"

☆☆ امتیاز صاحب: اس مرتبہ تبصرہ کرنے میں فراخ دلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ امید ہے آئندہ ضرور شکریہ کا موقع دیں گے۔

نعیم اللہ بڈالی سے، امید کرتا ہوں کہ ڈر کا سارا اسٹاف اور قارئین بخیر وعافیت ہوں گے۔ میں "ڈر" کو بہت شوق سے پڑھتا ہوں، اور پہلی بار خط لکھ رہا ہوں، میں ڈر کے لئے ایک کہانی لکھ رہا ہوں مکمل ہوگی تو بھیج دوں گا، پسند آئے تو ضرور شائع کیجئے گا۔ ڈر کی تمام کہانیاں اچھی ہوتی ہیں، میں ڈر کا بہت بڑا فین ہوں، اللہ تعالیٰ ڈرڈائجسٹ اور اس کے لئے کام کرنے والوں کو دن بدن ترقی عطا فرمائے، اگر میری حوصلہ افزائی کی گئی تو انشاءاللہ ہر ماہ باقاعدگی سے "ڈر" ڈائجسٹ میں حاضری دیتا رہوں گا۔

☆☆ نعیم صاحب: ڈرڈائجسٹ میں ویلکم، چلئے حوصلہ افزائی ہوگئی اور حسب وعدہ ہر ماہ خط لکھنا بھولئے گا نہیں، آپ کے خط کا ہر ماہ انتظار رہے گا۔

قاسم رحمان ہری پور سے، السلام علیکم! نومبر 2014ء کے ڈرڈائجسٹ پر نظر پڑتے ہی دل خوشی سے اچھلنے لگا اور پھر میں نے اسے خرید لیا، جلدی جلدی گھر آیا اور دل کی تسکین کے لئے پڑھنے بیٹھ گیا۔ قرآن کی باتیں اور خطوط میں پہنچا ہی تھا ایک اہم کام کے لئے والدہ کی آواز نے چونکا دیا، اور پھر اس کام کے لئے دل پر جبر کرنا نہیں پڑا، خیر بعد میں دل کو سکون ملا، کس کس کہانی کی تعریف کروں، بلکہ یہ کہنا زیادہ

درست ہوگا کہ ساری کہانیاں اپنی اپنی جگہ پرفیکٹ ہیں۔ چار سال سے میں ڈر ڈائجسٹ پڑھ رہا ہوں، مگر فرسٹ ٹائم ایک کہانی ”شہر خموشاں کے باسی“ ارسال کر رہا ہوں، اس امید پر کہ حوصلہ افزائی ہوگی۔ اس کے لئے بہت بہت شکریہ۔

☆☆ قاسم صاحب: خط لکھنے، کہانیوں کی تعریف اور کہانی ارسال کرنے کے لئے بہت بہت شکریہ قبول کریں، خوش ہو جایئے، آپ کی شہر خموشاں شامل اشاعت ہے۔ اور اب امید ہے کہ آئندہ بھی اپنی کاوشیں ضرور ارسال کرتے رہیں گے۔ Thanks۔

فلک فیضان رحیم یار خان سے، السلام علیکم! تمام رائٹرز، اسٹاف اور قارئین کو سلام اور نیک تمنائیں، اس ماہ کا ٹائٹل اچھا لگا۔ کہانیاں سب بالترتیب پڑھیں، خالدہ شاہان نے بہت اچھے انداز میں لکھا، نیک طاقتیں ایک اچھی تحریر تھی۔ دلہن بھی پسند آئی، رولو کا ہمارے رسالے کی شان، تیزی سے کامیابی کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ سرد جہنم امتیاز بھیا اس دفعہ بھی ہمیشہ کی طرح ایک منفرد تحریر لائے، ہم سب کے لئے، احسان سحر کم لکھتے ہیں مگر اچھا لکھتے ہیں۔ ہماری باریک بین مصنفہ عطیہ زاہرہ نے بھی خوب لکھا، باقی سب رائٹرز کی کہانیاں مسلسل سزا، عشق ناگن، خونی دنیا، خوش نصیب، حسد، غیبی آواز، مجلس جنات سب پسند آئیں۔ اللہ تعالیٰ تمام اہل اسلام کو اپنے امان میں رکھے۔ آمین۔

☆☆ فلک فیضان صاحب: نوازش نامہ میں کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

عامر ملک راولپنڈی سے، ایڈیٹر صاحب آداب، خدا کرے آپ بہ خیریت ہوں، نومبر کا ”ڈر“ ڈائجسٹ ملا شکریہ۔ مگر ”صائمہ“ نہیں بھیجا، برائے کرام ”صائمہ“ بھی بھجوادیا کریں ناں، ممنون ہوں گا۔ کسی مصروفیت کی بنا پر اس بار کہانیاں نہیں پڑھ پایا۔ دو کہانیاں ارسال ہیں۔ ایک ”ڈر“ اور ایک ”صائمہ“ کے لئے۔ ڈر والی کہانی کا عنوان نہیں تھا۔ آپ ہی کوئی لکھ دینا، شکریہ دیگر خیریت ہے۔ تمام اسٹاف کو آداب۔

☆☆ عامر صاحب: نئی کہانی موصول ہوئی، اس کے لئے بہت بہت شکریہ، اس ماہ کہانی لیٹ ہونے کی وجہ سے شائع نہ ہو سکی اس کے لئے معذرت، اگلے ماہ ضرور شائع ہوگی۔

قاضی حماد سرور اوکاڑہ سے، سلام عقیدت! ماہ نومبر 2014ء کا ”ڈر ڈائجسٹ“ اپنی تمام رعنائیوں، ودلچسپیوں کے ساتھ موجود ہے۔ قارئین کی محفل میں حاضر ہونے سے پہلے بارہا سوچا کہ ”قدر کھو دیتا ہے روز روز کا آنا“ مگر اہل دل ہونے کی بنا پر دوبارہ ڈر کی بزم یاراں میں جسارت کر رہا ہوں یہ سوچ کر کہ ڈر کے ایڈیٹر صاحب تو قارئین کے خطوط کی بھی ایڈیٹنگ کر جاتے ہیں۔ یہ معلوم ہوا اپنا خط پڑھ کر، حالانکہ میری نظر میں خطوط جوں اور جیسے کی بنیاد پر چھاپا جانا چاہئے، اس سے ہر قاری کی ڈر کے بارے میں سوچ اور خیالات کی عکاسی ہوتی ہے۔ البتہ کہانیوں کی کانٹ چھانٹ ادارہ کا حق ہے۔ ڈر ڈائجسٹ سے ایک ناطہ ہونے کی بنا پر اپنی چند گزارشات پیش کرنا چاہوں گا۔ جن سے ادارہ، رائٹرز یا قارئین کا متفق ہونا ضروری نہیں، ہاں اگر پسند آئیں تو شکریہ کا موقع ضرور دیں۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ ڈر ڈائجسٹ کا سالگرہ نمبر ہر سال اکتوبر میں ہوتا ہے تو کیوں نا ادارہ کی جانب سے قارئین ورائٹرز کی حوصلہ افزائی کے لئے یہ کیا جائے کہ (1) ہر سالگرہ نمبر (اکتوبر) میں پورے سال کی سب سے بہترین اور ٹاپ کہانی کو انعام دیا جائے، (2) پورے سال کے سب سے اچھے خط پر انعام رکھا جائے، (3) پورے سال کی بہترین غزل/اشعار پر انعام سے نوازا جائے۔ مگر یہ استدعا ہے کہ سال کی سب سے بہترین واچھی کہانی/غزل/خط کے ہونے کا فیصلہ کرنے کے ساتھ ساتھ حوصلہ افزائی یا انعام کا حتمی فیصلہ بھی ڈر کی انتظامیہ خود کرے۔ باقی رہی اس ماہ نومبر کی کہانیوں کی تو معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ ابھی باعث مصروفیت ایک بھی کہانی نہ پڑھ سکا ہوں، اس لئے کسی قسم کا تبصرہ کرنے سے اجتناب کروں گا۔ البتہ اپنی کہانی لکھی ایک غذل ارسال کر رہا ہوں، قابل اشاعت سمجھیں تو مہربانی ہوگی۔ ویسے میں باقاعدہ لکھاری تو نہیں مگر دل میں شوق ضرور رکھتا ہوں اور جو چیز دل میں ہو اسے صرف اہل نظر ہی دیکھ سکتے ہیں۔ آخر میں ایک بات سب سے ضرور شیئر کروں گا کہ ہم انسان کسی بھی حال میں خوش نہیں رہتے؟ کیونکہ ہم نے صبر اور شکر کا دامن چھوڑ دیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اللہ رب العزت کی عنایتیں اور محبتیں صرف اور صرف صبر و شکر سے ہی حاصل ہوتی ہیں۔ اللہ پاک آپ سب کو خوش رکھے اور ”ڈر ڈائجسٹ“ کو اور زیادہ ترقی وکامیابی عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆ حماد صاحب: آپ کی تمام باتیں درست ہیں، مگر میرے بھائی خطوط کے لئے محدود صفحات اور ویسے تمام اہم باتیں ضرور شامل اشاعت ہوتی ہیں۔ امید ہے آپ ضرور غور فرمائیں گے۔ اور آپ کے مشورے نوٹ کر لئے گئے ہیں، امید ہے اس پر پیش رفت ہوگی۔ اور قوی امید ہے کہ آپ آئندہ ہر ماہ اپنا نوازش نامہ بھیج کر ضرور شکریہ کا موقع دیں گے۔

طاہر اسلم بلوچ سرگودھا سے، السلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ آپ سب خیریت سے ہوں گے، میں کچھ اشعار غزلیں وغیرہ ارسال کر رہا ہوں، امید کرتا ہوں کہ ضرور شائع کریں گے مجھے خوشی ہوگی۔ ماہ اکتوبر کے شمارے میں ایس امتیاز احمد کی کہانی نئی قبر اور ساجدہ راجہ کی انوکھی

ہمدردی عطیہ زاہرہ کی کہانی روح کا راز اور مدثر بخاری کا جادوئی چکر کہانی بلکہ سب نے بہت خوب صورت انداز میں لکھا ہے۔ ڈر ڈائجسٹ میں تمام لکھنے والے رائٹرز بہت اچھا لکھتے ہیں، میری طرف سے ڈر ڈائجسٹ میں لکھنے والے اور تمام پڑھنے والوں کو اسپیشل دعا سلام قبول ہو۔

☆☆ طاہر صاحب: ہر ماہ آپ کے خط کا انتظار رہتا ہے، ہر ماہ نوازش نامہ بھیجنے کے لئے شکریہ قبول کریں۔

نور محمد کاوش سلانوالی سے، محترم جناب ایڈیٹر صاحب، السلام علیکم! علاوہ ازیں تمام دوست احباب کی خدمت میں بھی سلام الفت پیش کرتا ہوں۔ اس بار تو سالگرہ نمبر نے حقیقت میں رنگ جما دیئے ہیں۔ بہت ہی پیارے انداز میں تمام دوستوں نے کہانیاں لکھی تھیں۔ خاص کر سلسلہ نمبر جو چل رہے ہیں اور جو نیا شروع ہوا ہے۔ ہر کہانی اپنی جگہ اپنی تعریف کی حامل ہے۔ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی، دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ یقین مانیے چار دنوں کے اندر اندر ڈائجسٹ پڑھ لیا۔ دل نہیں کر رہا تھا کہ ڈائجسٹ کو رکھ دوں بلکہ کچھ کہانیاں ایسی تھیں جنہیں بار بار پڑھنے کو من چاہ رہا تھا۔ یہ آپ کی عنایت ہے۔ اس تحریر کے بعد اب "عقرب" کے نام سے ایک تحریر ارسال کر رہا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ اب آپ دوسرے ڈائجسٹ والوں کی طرح ہمیں نظرانداز نہیں کریں گے۔ جناب! ایک اور بات اگر آپ کو برا محسوس نہ ہو تو پوچھنا چاہتا ہوں کہ ڈائجسٹ کے اندر شائع ہونے والی سلسلہ وار کہانیوں کو ادارہ ہذا کی طرف سے کتابی شکل دی جاتی ہے یا اس کا خرچہ رائٹر حضرات سے وصول کیا جاتا ہے اور دوسرا سوال کہ سلسلہ وار کہانیوں کے علاوہ جو کہانیاں ہر ماہ شائع ہوتی ہیں، انہیں بھی کتابی شکل دی جاتی ہے کہ نہیں۔ معذرت کے ساتھ ان کے جواب پوچھنا چاہوں گا۔ علاوہ ازیں "اپسرا" کے نام سے ایک سلسلہ وار کہانی لکھ رہا ہوں، انشاء اللہ بہت جلد امید ہے وہ مکمل ہو جائے گی اور آپ کے حضور وہ بھی ای میل کردوں گا۔ آخر میں دونوں سوالوں کے جواب ضرور دینے کی درخواست کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔ دعاؤں کا طالب۔

☆☆ نور صاحب: آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ اپنی کہانیاں بھیج رہے ہیں، آپ یقین رکھیں کہ ڈر ڈائجسٹ اپنے رائٹر حضرات کو بہت عزت واحترام سے نوازتا ہے۔ کسی کے ساتھ بھی ناانصافی نہیں ہوتی لیکن شرط ہے کہ کہانی کا موضوع ڈر کے مطابق ہو۔ لیجئے یہ خوشی کی بات ہے کہ "عقرب" شامل اشاعت ہے اور اب نئی کہانی کا شدت سے انتظار۔ سلسلے وار اور دیگر مکس کہانیاں بھی کتابی شکل میں آتی ہیں، وقتاً فوقتاً اور اس کا خرچ رائٹر سے نہیں لیا جاتا اور اگر کوئی رائٹر اپنی تمام جمع شدہ کہانیاں الگ سے چھپوانا چاہتا ہے تو اس کا سارا خرچ خود رائٹر کو اٹھانا پڑتا ہے۔

راجہ باسط مظہر بھٹی گوجر خان سے، السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوگا، ماہ اکتوبر 2014ء کا سالگرہ نمبر ہاتھ میں ہے، سب سے پہلے "قرآن کی باتیں" جو ہمارے لئے مشعل راہ ہیں...... اس کے بعد خطوط کی فہرست میں "ایڈیٹر صاحب کا پیغام" کہ ڈر ڈائجسٹ کا جنوری 2015ء کا شمارہ خاص نمبر ہوگا۔ جس میں آپ تمام قارئین کی اچھی اچھی تحریریں جلوہ گر ہوں گی۔" چلئے دیکھ لیتے ہیں...... اس کے بعد پہلا خط" شگفتہ ارم درانی پشاور سے" 10 سال بعد دوبارہ سے ڈر کی محفل میں شامل ہوئیں Welcome Back، اس کے بعد دوسرا خط، ہمیں بہت اچھا لگا...... "ایس حبیب خان کراچی سے" آپ کو سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ "ساجدہ راجہ" کا خط پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ چچا کی ڈیتھ پر...... ہماری دعا ہے اللہ آپ کو صبر وجمیل عطا کرے، "ایس امتیاز احمد کراچی سے" اچھا تبصرہ تھا...... "ناصر محمود فرہاد فیصل آباد سے" آپ کے والد کا سن کر بچ دل سے بہت افسوس ہوا کیونکہ دنیا میں ماں باپ سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہوتا۔ باقی تمام لوگوں کے خطوط نے بھی ڈر ڈائجسٹ کی خطوط کی محفل کو چار چاند لگا دیئے۔ اب آتے ہیں کہانیوں پر...... "آخری اچھا" ایس حبیب خان دی بیسٹ رہی۔ "خونی ہیولے" شائستہ سحر جی پراسرار خونی خوف کے لبادے میں لپٹی تحریر سالگرہ نمبر کے لئے لائی ہیں...... "قبر کی چوری" ناصر محمود فرہاد آپ کی تحریر کا تو ایک عرصہ سے انتظار تھا...... آخر سالگرہ نمبر میں انتظار پورا ہوا...... یہ تھیں ٹاپ تھری اسٹوریز جو ہمیں پسند آئیں۔ ایڈیٹر صاحب اب ذرا ہمارا بھی خیال کیجئے گا۔ خط کے ہمراہ ماہ دسمبر کے لئے ایک خوب صورت غزل اور جنوری 2015ء کے خاص شمارے کے لئے ایک خوب صورت نظم حاضر خدمت ہے...... برائے مہربانی ہماری شاعری کے ساتھ ہماری تحاریر بھی شامل اشاعت کیجئے گا۔

☆☆ باسط صاحب: قلبی لگاؤ سے لکھا ہوا حال دل پڑھ کر خوشی ہوئی۔ جناب بھیانک عاشق زیادہ طویل ہونے پر التوا کا شکار ہوگئی۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں اکثر اپنا مقام بناتی رہتی ہیں۔ خیر آئندہ آپ کو شکایت نہیں ہوگی، شاعری شامل اشاعت ہے۔ لیکن ہر ماہ ایک خط لکھنا نہ بھولا کریں۔ Thanks۔

☆☆☆

ابلتا لہو

سیدہ عطیہ زاہرہ۔لاہور

قاتل نے اپنے سامنے کھڑے نوجوان کو آناً فاناً دبوچ لیا اور پلک جھپکتے ہی تیز دھار چھرا نوجوان کی گردن پر پھیرنے لگا کہ چشم زدن میں نوجوان کا سر دھڑ سے الگ ہوگیا مگر یہ کیا نوجوان کا الگ پڑا سر دوبارہ دھڑ سے جڑگیا۔

عجیب وغریب خوف وہراس کے سمندر میں غوطہ زن جسم وجاں کے رونگٹے کھڑے کرتی کہانی

میں بارہ سال کا تھا۔ جب ابا نے مجھے اپنے ساتھ کام پر لگالیا تھا۔ میں ہر روز بھینس، بیل، بکرے کٹتے ہوئے دیکھنے لگا، کیونکہ میرا ابا قصائی تھا۔ ابا سے کام سیکھنے کے بعد جب میں نے پہلی بار ایک بکرے کی گردن پر چھری پھیری۔ ''کیا بتاؤں؟ ایک ناقابل برداشت مسرت...... ایک عجیب سرور کا احساس ہوا۔'' اور میں نے سوچا۔ ''اس سے اچھا کام اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔'' اسی لئے تھوڑے ہی دنوں میں، میں اتنا ماہر ہوگیا کہ اچھے اچھوں کے کان کاٹنے لگا۔

سترہ سال کی عمر تک میں یہ کام کرتا رہا، لیکن اب مجھے جانوروں کو ذبح کرنے سے دلچسپی نہیں رہی تھی۔ بہت دن سے میرے دل میں ایک خواہش جنم لے رہی تھی۔ ''کسی انسان کی گردن پر چھری پھیروں اور پھر اس کے کٹتے ہوئے نرخرے سے بہتے ہوئے خون اور تڑپتے ہوئے جسم کو دیکھوں۔'' لیکن اب میں بچہ نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ انسان کی گردن پر چھری چلانے کی کیا سزا ہوتی ہے اور اسی سزا کے خوف سے میں نے خود کو کافی عرصہ تک باز رکھا۔

لیکن ایک دن وہ سب کچھ ناگہانی طور پر ہوگیا۔ جس کی مجھے خواہش تھی۔

ہوا کچھ یوں کہ ''مذبح خانہ'' میں ایک دوسرے قصائی سے لڑائی ہوگئی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ابا تو بس برائے نام ہی لڑ رہے تھے۔ اصل میں تو وہ دوسرا بندہ جس کا نام شیدا قصائی تھا۔ ابا کے گلے پڑ رہا تھا۔ کچھ دیر تو میں یہ تماشا دیکھتا رہا، اس کے بعد میں نے ہاتھ میں پکڑی چھری کو دیکھا۔ اسی چھری سے ابھی ابھی میں نے ایک بکرا گرایا تھا۔ اور اب میری نظریں شیدے پر تھیں۔ میں انتہائی سکون سے آگے بڑھا اور اس کی ٹانگوں میں قینچی مار کر اسے نیچے گرالیا اور پلک جھپکتے میں اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔

میں بڑے بڑے سرکش بیلوں کو نیچے گراچکا تھا۔ شیدا میرے آگے کیا بیچتا تھا۔ میرے ہاتھ میں چھری دیکھ کر وہاں موجود کئی لوگ چلائے، لیکن ان کی یہ چیخ میری سماعت سے دور تھی۔

شیدے کا ابھرا ہوا نرخرہ میرے سامنے تھا۔ اور میں نے نہایت صفائی سے اس پر چھری پھیر دی۔ خون ابل پڑا اور اس کا جسم اچھلنے لگا۔ میں اطمینان سے کھڑا ہوگیا۔ میری آنکھیں نشیلے انداز میں بوجھل ہو رہی تھیں۔ مجھے بے پناہ سرور محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے میں نے اپنی برسوں کی پیاسی روح کو

تسکین دے لی ہے۔ میرا ابا مجھے جھنجوڑ رہا تھا۔ دوسرے قصائی بھی خوف سے چیخ رہے تھے۔ پھر میرا ابا مجھے لے کر وہاں سے چلا آیا۔

"تڑپتا ہوا جسم میری نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا۔ اس لئے میں ہوش میں آ گیا۔ کوئی دم میں پولیس ہمارے گھر آنے والی تھی۔ چنانچہ میرے ماں باپ نے مجھے لباس تبدیل کروایا اور کچھ رقم دے کر گھر سے بھگا دیا۔ میں بے وقوف نہیں تھا۔ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ میں کیا کر چکا ہوں۔

بہر حال میں وہاں سے چلا آیا اور بغیر کسی حادثے کے ایک دوسرے شہر پہنچ گیا۔ کافی دنوں تک ایک معمولی سی سرائے میں مقیم رہا! مجھے آج تک نہیں معلوم ہوسکا کہ میرے آنے کے بعد میرے والدین پر کیا گزری۔

سرائے کی زندگی مجھے پسند نہیں تھی۔ نئے شہر میں آ کر مجھے نئی نئی چیزیں دیکھنے کو ملیں۔ لیکن میری طبیعت بے کل رہتی، میں نے سوچا یہاں بھی اپنا آبائی کام شروع کردوں، لیکن یہ بھی احساس تھا کہ پولیس مجھے اس شکل میں آسانی سے تلاش کرلے گی۔ چنانچہ عقل مندی سے کام لیتے ہوئے میں نے پہلے اپنا حلیہ بدلا۔ پہلے میں تہمند باندھتا اور کرتا پہنتا تھا۔ میری نوکدار مونچھیں تھیں۔ میں نے مونچھیں صاف کرادیں۔ بازار سے اپنے ناپ کی پتلون اور قمیض خریدی اور سر کے بالوں کا اسٹائل بھی بدل دیا۔ میں آئینے میں خود کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ کیونکہ اب تو میں شہر کا بابو معلوم ہونے لگا تھا۔

میرے پاس سے رقم کھسکتی جارہی تھی۔ اور اب میں سوچ رہا تھا کہ کوئی کام کروں۔ چنانچہ تھوڑے دنوں کے بعد میں نے ایک مل میں ملازمت اختیار کرلی۔ باپ کی دی ہوئی رقم میں سے جو آخری نوٹ بچا۔ اس کی میں نے ایک عمدہ سی چمکدار اور خوب صورت تیز دھار چھری خریدی۔ یہ چھری ہر وقت میرے پاس رہتی تھی۔

پھر ایک دن دوپہر میں مزدور کھانے کی چھٹی پر تھے۔ کینٹین کے ایک بیرے سے میرا جھگڑا ہوگیا، اور انتہائی کوشش کے باوجود میں خود کو باز نہ رکھ سکا۔ ایک بات میں ضرور بتادوں، کہ جھگڑے کے وقت مجھے اس پر غصہ آ گیا تھا۔ لیکن جب میں نے اسے قتل کرنے کا فیصلہ کیا، تو میرا غصہ اتر چکا تھا۔ اور وہی پیاس ابھر آئی تھی۔ "خون کی پیاس!"

میں نے بیرے کو اطمینان سے نیچے گرایا۔ چھری نکالی اور اس کی گردن پر پھیر دی۔ وہی سرور، وہی نشہ، وہی مست کن کیفیت، بہت عرصے کے بعد مجھے یہ سرور حاصل ہوا۔ اور محویت سے اس کے پھڑکتے ہوئے جسم کو دیکھتا رہا، لیکن یہ سرور انگیز کیفیت میرے لئے نقصان دہ ثابت ہوئی۔

بہت سے لوگوں نے مجھے پکڑلیا، میری چھری چھین لی گئی اور مجھے مارا جانے لگا۔ اس وقت تک مجھے پیٹا جاتا رہا۔ جب تک میں بے ہوش نہ ہوگیا۔ اور پھر مجھے اسپتال میں ہوش آیا، میرے چاروں طرف پولیس تعینات تھی۔ پولیس کو دہرے قتل کا مجرم مل گیا تھا۔

میری گرفتاری کے بعد پولیس میرے بارے میں سراغ لگا رہی تھی کہ اسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ میں پہلے بھی ایک قتل کرچکا ہوں۔

بعد کی تفصیل بے کار ہے، مجھے شناخت کرنے کے لئے میرے پڑوس کے کچھ قصائی بھی آئے، انہوں نے مجھے شناخت کرلیا۔ لیکن میں نے ان سے اپنے والدین یا بھائیوں کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ میرے صحت یاب ہونے کے بعد مجھ پر مقدمہ چلنے لگا۔ اور مقدمے کے دوران مجھے جیل پہنچادیا گیا۔ لیکن جیل میں ملنے والے استاد فضلو کا ذکر میں ضرور کروں گا۔

وہ پہلا شخص تھا جس نے مجھے زندگی کی صحیح راہ دکھائی، نجانے کیسے فضلو نے میرے جوہر بھانپ لئے اور اس نے اپنے فرار کے منصوبے میں مجھے بھی شامل کرلیا۔ بعد میں مجھے فضلو کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ جب اس کے گرگوں نے اس کے فرار کے وقت جیل کی پولیس سے اسٹین گنوں سے مقابلہ کیا اور استاد فضلو کو صاف نکال لائے۔ میں بھی استاد کے ساتھ تھا۔

ایک اسٹیمر نے ہمیں ایک دوسرے شہر لا کر چھوڑ دیا۔ استاد فضلو بہت بڑا اسمگلر تھا۔ ملک کے بہت سے شہروں میں اس کے جوئے خانے تھے۔ شراب کی بھٹیاں تھیں۔ اور نجانے کیا کیا تھا۔ استاد فضلو نے مجھے اپنے ساتھ رکھا۔ وہ کافی دنوں تک خاموشی سے چھپا رہا۔ اس کے گرگے اسے پولیس کی کارروائیوں کے بارے میں اطلاع دیتے رہتے تھے۔ اور جب بقول ان کے مطلع صاف ہوگیا تو استاد نے اپنا کام دوبارہ شروع کردیا۔

میرے بارے میں استاد فیصلہ نہ کرسکا تھا کہ مجھے کیا کام دیا جائے۔ میں کوئی باصلاحیت انسان نہیں تھا۔ البتہ ایک سفاک قاتل ضرور تھا۔ چنانچہ استاد کے ٹولے میں میری حیثیت ایک جلاد کی سی تھی۔ لیکن اس شکل میں بھی کامیاب نہ رہ سکا۔ استاد اگر کسی کو صرف سزا دلوانا چاہتا تو میں اسے قتل کردیتا، اس طرح میں نے استاد کے کئی ساتھیوں کو قتل کردیا۔ ایک بار استاد مجھ پر بگڑ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا اگر میں آدمی نہ بنا تو وہ مجھے قتل کردے گا۔ وہ مجھے زندگی سے محروم کردے گا۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑ سکتا تھا کیونکہ میں اس کے بہت سے رازوں سے واقف ہوگیا تھا۔

خود میرا دل بھی استاد سے اکتا گیا تھا۔ یہاں مجھے قتل کرنے کی آزادی نہ تھی۔ استاد کے اشاروں پر بھی میں نہیں چل سکتا تھا کہ استاد کی ملک بھر میں رسائی ہے۔ میرے فرار ہونے کے بعد وہ مجھے ضرور تلاش کرالے گا۔ چنانچہ میں نے استاد ہی کا پتہ صاف کردینے کا فیصلہ کیا اور ایک رات خاموشی سے اپنی خوب صورت اور چمکدار نئی چھری لے کر استاد کے پاس پہنچ گیا۔

استاد فضلو اس وقت شراب پی رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اب میں اس کے پاس سے چلا جانا چاہتا ہوں۔ جس پر استاد فضلو بولا کہ وہ مجھے اجازت نہیں دے سکتا، اس نے پھر وہی دھمکی دی کہ اگر میں نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ مجھے قتل کرادے گا۔

چنانچہ میں نے اطمینان سے استاد کو کھڑا کیا۔ پھر اپنے مخصوص داؤ کے ذریعے نیچے گرا کر اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔ استاد کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی۔ وہ بھی کوئی کمزور آدمی نہیں تھا۔ لیکن ایک تو شراب کے نشے میں تھا۔ دوسرے دھوکے میں مار کھا گیا۔ اور میری چمکدار چھری نے اس کے نرخرے کو آخر تک کاٹ دیا۔

سرخ سرخ خون ابل پڑا۔ اور میرے جسم میں سرور کی لہریں دوڑنے لگیں۔ استاد کا کانپتا ہوا جسم اذیت سے زمین پر ہلکی ہلکی آواز کرتے ہوئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ وہ منظر مجھے بے خود کررہا تھا۔ میں نے اطمینان سے چھری صاف کی اور باہر نکلنے سے پہلے استاد کی جیبیں صاف کیں، خاصی رقم تھی، میں یہ رقم لے کر باہر نکل آیا۔ استاد کے ساتھ رہتے ہوئے مجھے خاصی عقل آگئی تھی۔ اور اب میں پہلے جیسا بے وقوف نہیں تھا۔ میں نے اسی رات وہ شہر بھی چھوڑ دیا۔ اور ایک چھوٹے سے قصبے میں آگیا۔

درحقیقت اصل معنوں میں، میں نے اپنی زندگی کا آغاز اسی قصبہ سے کیا۔ میرا تعارف طویل ہوتا جارہا ہے۔ اصل کہانی پیچھے جارہی ہے۔ چنانچہ میں چاہتا ہوں کہ اب اصل کہانی شروع کی جائے۔ میری شاندار زندگی کو بارہ سال گزر چکے تھے۔ اور ان بارہ سالوں میں، میں کرائے کا قاتل بن چکا تھا اور اپنے دشمنوں سے نجات حاصل کرتے، شراب، ریس اور جوا میری زندگی تھی، حسین عورتوں کا مجھ جیسا قدردان پورے شہر میں کوئی نہیں تھا۔

میں بے تحاشا دولت کماتا اور سب اڑا دیتا۔ اس لئے کام کا آدمی کبھی نہ بن سکا، ہزاروں روپے میرے پاس ہوتے لیکن دوسری صبح ناشتہ کرنے کے پیسے نہ ہوتے، یہ فطرت میری زندگی بن چکی تھی اور میں اس میں کوئی تبدیلی بھی نہیں چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

ان دنوں میرا ہاتھ تنگ تھا، کوئی کیس نہیں ملا تھا، اور بڑی مشکل سے زندگی بسر ہورہی تھی، یوں تو بہت سی صورتیں ایسی تھیں جن سے میں دولت حاصل کرسکتا تھا۔ لیکن مجھے ایک ہی جرم پسند تھا، اور وہ تھا قتل! یہ ہی کام تو

میرا پسندیدہ تھا اور جس سے دولت بھی ملتی تھی، لیکن نجانے ان دنوں لوگ اتنے امن پسند کیوں ہو گئے تھے؟ نجانے انہوں نے دشمنی کیوں چھوڑ دی تھی؟ میں اس صورت حال سے بہت بے چین تھا۔ ایک تو کافی دنوں سے میرا شوق پورا نہیں ہوا تھا۔ دوسرے مالی طور پر بھی تنگ تھا۔

چنانچہ اس رات میں نے فیصلہ کیا کہ میں کسی ایسے شخص کو اپنا شکار بناؤں۔ جس کی جیب میں اچھی خاصی رقم ہو۔ میں اسے قتل کردوں۔ اور اس کی جیب سے رقم نکال لوں۔ ایسی شکل میں دونوں کام ہو سکتے تھے۔ چنانچہ میں لباس وغیرہ تبدیل کر کے اور اپنی چھری کو اپنے لباس میں چھپا کر نکل پڑا۔ میری عقابی نظریں اپنے شکار کو تلاش کر رہی تھیں۔ ہنی مون نائٹ کلب کے کمپاؤنڈ کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے ایک کار دیکھی۔ جس سے ایک آدمی نیچے اتر رہا تھا۔ قیمتی کار تھی۔ اور اس سے اترنے والا بھی قیمتی لباس میں ملبوس تھا۔ اس نے اعلیٰ درجے کا سوٹ اور ہیٹ پہنا ہوا تھا۔ ہیٹ اس انداز سے اس کی پیشانی پر جھکا ہوا تھا کہ اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ یقیناً اس کی جیب بھی اس کے لباس کی طرح قیمتی ہوگی۔ میں نے سوچا اور میں بھی کلب میں داخل ہو گیا۔ میں اس کا تعاقب کر رہا تھا۔

لیکن اس نے کلب کے اندر داخل ہونے کے بجائے اس کی عقبی سمت اختیار کی اور ایک جگہ رک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ میں پام کے بڑے بڑے گملوں کی اوٹ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ کے بعد اس نے ایک بیرے کو اشارہ کیا اور بیرا اس کے قریب پہنچ گیا، میں نے اسے جیب سے کچھ نکالتے دیکھا اور پھر نوٹ کی کھڑکھڑاہٹ سنی، اس کے بعد اس کی آواز ابھری۔ ''اندر ہال میں ایک لڑکی موجود ہے۔ اس کا نام شیلی ہے۔ اس نے سرخ پتلون کے ساتھ پیلے رنگ کی شرٹ پہن رکھی ہے اور اس کے بال سنہرے ہیں۔ اس سے کہو کہ آلڈس باہر اس کا انتظار کر رہا ہے۔''

''یس سر!'' بیرے نے کہا اور اندر چلا گیا۔

میں اپنے کام کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کا مطلب کہ یہ شخص اندر جانے کا ارادہ نہیں رکھتا، بہر حال اس لڑکی سے بھی مل لینے کے بعد اپنا کام شروع کرنا چاہتا تھا۔ میں انتظار کرتا رہا اور چند منٹ کے بعد مجھے ایک لڑکی بیرے کے ساتھ آتی ہوئی نظر آئی۔ بیرے نے تاریکی میں کھڑے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کیا اور واپس چلا گیا۔ لڑکی اس کے قریب پہنچ گئی۔ ''یس مسٹر آلڈس!'' اس نے مترنم آواز میں کہا۔

''اوہ! بے بی ادھر سے گزر رہا تھا۔ میں نے سوچا۔ اگر تم چل رہی ہو تو ساتھ لے چلوں۔'' تاریکی میں کھڑے آدمی نے کہا۔

''آپ حکم دیں تو میں چلنے کے لئے تیار ہوں۔ ورنہ میرا ارادہ تھا کہ کلب کا آخری پروگرام دیکھ کر ہی آؤں۔ یوں بھی کل اتوار ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں نے بتایا ناں کہ ادھر سے گزرتے ہوئے میں آ گیا۔ تم پروگرام دیکھ کر ہی آؤ۔ میں تمہارے لئے کار چھوڑے جا رہا ہوں۔ ورنہ تمہیں ٹیکسی ملنے میں دشواری ہوگی۔''

''لیکن آپ کو تکلیف ہوگی جناب!'' لڑکی نے ممنونیت سے کہا۔

''نہیں میرا چہل قدمی کرنے کا موڈ ہے۔ ٹہلتا ہوا چلا جاؤں گا۔ ٹھیک ہے تم جاؤ!'' آلڈس نے کہا۔

اور میں دل ہی دل میں مسرور ہونے لگا۔ میرا کام اور آسان ہو گیا تھا۔ اس نے لڑکی کو کار کی چابی دی۔ اور لڑکی شکریہ ادا کر کے کلب کی عمارت کی طرف چل دی۔ فلیٹ ہیٹ والا آدمی باہری راستے کی طرف مڑ گیا۔ اور میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ با اطمینان قدموں سے چلتا ہوا کلب کمپاؤنڈ سے نکل آیا۔ اور میں ہوشیاری سے اس کا تعاقب کرنے لگا۔

مجھے کسی مناسب جگہ کی تلاش تھی۔ رات کا وقت تھا۔ اس لئے سڑکیں سنسان ہو چکی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی کار گزر جاتی اور اس کے بعد پھر سناٹا! وہ ماحول سے بے خبر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ بالآخر ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں میرا کام آسان

تھا۔ میں نے اپنی رفتار تیز کردی اور جلد ہی اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے بھی شاید میرے قدموں کی آواز سن لی تھی۔

چنانچہ وہ رک کر مجھے دیکھنے لگا۔ میری تیز چھری باہر نکل آئی۔ اور میں اس پر حملہ کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے بھاری آواز میں پوچھا۔

اس کی آواز میں خوف نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا۔ وہ کوئی دلیر آدمی ہے۔ لیکن اب میں اچھے اچھے دلیروں سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب نہ دیا اور اس پر جھپٹ پڑا۔ اپنے مخصوص داؤ سے میں نے اسے با آسانی نیچے گرالیا اور اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔

دوسرے ہی لمحے میری چھری اس کے حلقوم پر تھی۔ وہ کوئی احتجاج بھی نہ کرسکا۔ اور چھری اس کی گردن پر چل گئی۔

میں اپنی چھری کی دھار ہمیشہ ایسی رکھتا تھا کہ میرے شکار کو ذبح ہونے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کے نرخرے پر میری چھری اس تیزی سے نہ چل سکی۔ تاہم وہ اپنا کام کررہی تھی۔ اور چند ساعت میں اس کی گردن علیحدہ ہوگئی۔ میری منتظر آنکھیں ابلتے ہوئے خون کا دل کش منظر دیکھنا چاہتی تھیں۔

لیکن اس وقت میں حیرت سے اچھل پڑا۔ جب میں نے اس کی گردن سے خون کا ایک قطرہ بھی نکلتے نہ دیکھا۔

گو رات کا وقت تھا۔ اور یہ جگہ بھی روشن نہ تھی۔ تاہم اتنی روشنی ضرور تھی کہ میری آنکھیں اپنا پسندیدہ منظر دیکھ لیں۔ لیکن میں اس منظر سے محروم رہا! میں نے اس کی کٹی ہوئی گردن پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ لیکن میرے ہاتھوں کو بھی خون کی نمی کا احساس نہ ہوا۔

میں حیرت زدہ انداز میں چھری کو دیکھتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ کسی چلتے پھرتے انسان کی گردن علیحدہ ہوجائے، اور اس سے خون نہ نکلے۔

میرے کھڑے ہونے کے بعد اس کے ہاتھ پاؤں ہلے۔ وہ ہاتھ کا سہارا لے کر کھڑا ہورہا تھا۔ لیکن اس کی گردن علیحدہ پڑی تھی۔ سر کا فلیٹ ہیٹ گرتے وقت منہ پر آپڑا تھا۔ بالآخر وہ کھڑا ہوگیا۔ اس نے جھک کر اپنی کٹی ہوئی گردن اٹھائی اور اسے شانوں پر جمانے لگا۔

چند ساعت کے بعد وہ اس میں کامیاب ہوگیا۔

اور پھر اس نے اپنا ہیٹ اٹھا کر سر پر جمالیا۔

میں فرط حیرت سے ساکت کھڑا تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس منظر سے خوفزدہ ہوکر چیختا ہوا بھاگ کھڑا ہوتا۔ لیکن میری پچھلی زندگی کی تفصیل سن کر آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میں کتنا سفاک ہوں اور میرا خیال ہے میرے سینے میں دل کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ یا پھر ہے بھی تو اس میں رحم، خوف اور دوسرے جذبات جو میری مرضی کے تابع نہ ہوں، جنم نہیں لے سکتے۔ البتہ میں اس منظر پر حیران ضرور تھا۔

''تمہیں شاید دولت کی ضرورت ہے؟'' اس کی بھاری آواز مجھے سنائی دی۔ اور میں چونک پڑا۔ میں نے اس کے سوال کا جواب نہ دیا اور خاموشی سے اسے دیکھتا رہا!

''کتنی رقم درکار ہے؟'' اس نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

میں پھر بھی کچھ نہ بولا۔ تو اس نے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر میری طرف بڑھادی اور بولا۔ ''فی الحال اس سے کام چلاؤ۔ تم دلیر انسان معلوم ہوتے ہو۔ انسانوں کی گردن پر تمہارا خنجر بڑی روانی سے چلتا ہے۔ مجھے یہ بات بہت پسند آئی ہے۔ اگر مناسب سمجھو تو مجھ سے اس پتے پر مل لینا، میں تمہیں دولت میں تول سکتا ہوں!''

''اس نے گڈی میری جیب میں ٹھونس کر دوبارہ جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کارڈ نکال کر میری طرف بڑھادیا۔ میں نے کارڈ لے لیا۔

''بس اب جاؤ، عیش کرو۔ کل شام سات بجے

میں تمہارا اس پتے پر انتظار کروں گا!'' وہ مڑا اور آگے بڑھ گیا۔

میں حیرت کے عالم میں کھڑا رہ گیا، اور اس وقت تک اسے دیکھتا رہا، جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوگیا۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہوجانے کے بعد میں نے ایک گہری سانس لی۔ اور اپنی جیب میں ٹھنسی ہوئی گڈی نکال لی۔ سو سو کے نوٹ تھے۔ دس ہزار روپے تھے۔ نوٹ اصلی ہی معلوم ہوتے تھے۔ ''لیکن وہ کون تھا؟ اس کی گردن دوبارہ کیسے جڑ گئی؟'' یہ تمام باتیں انتہائی کوشش کے باوجود بھی میری سمجھ میں نہیں آسکیں۔

میں نے گردن جھٹک دی اور واپس کلب کی طرف چل دیا۔ کلب کے بار میں پہنچ کر میں نے شراب طلب کی اور شراب نے تمام الجھنیں میرے ذہن سے دور کردیں۔

دوسرے دن میری جیب میں دو تین ہزار باقی بچے تھے۔ جن سے میں نے دن بھر عیش کیا اور شام کو میری جیب حسب معمول ہلکی ہوگئی۔ بیرے کو نوٹ دیتے ہوئے میرا ہاتھ اس سفید کارڈ سے ٹکرایا جو اس پراسرار انسان نے مجھے دیا تھا اور میں نے کارڈ نکال لیا۔

استاد فضلو کے گروہ میں رہ کر میں نے پڑھنے لکھنے میں تھوڑی سی شد بد حاصل کرلی تھی۔ اس لئے کارڈ پر لکھے ''یو۔ این آلڈس'' کے الفاظ میں نے پڑھ لئے اور پھر اٹک اٹک کر اٹھارہ برج اسکوائر کے الفاظ بھی پڑھے اور اس شخص کے بارے میں سوچنے لگا۔ ''اگر مناسب سمجھو تو مجھ سے اس پتے پر مل لینا۔ میں تمہیں دولت میں تول سکتا ہوں۔ کل شام سات بجے میں تمہارا اس پتے پر انتظار کروں گا۔''

میں نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ پونے چھ بجے تھے۔ کیا کروں؟ کیا اس کے پاس جاؤں؟ ممکن ہے آج بھی کچھ رقم حاصل ہوجائے، کل اس نے بغیر کسی لالچ کے دس ہزار روپے دے دیئے تھے۔ ٹھیک ہے، اگر وہ کوئی کام لینا چاہتا ہے، تو کیا حرج ہے۔ میں نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ پونے چھ بجے تھے۔ کیا کروں؟

میں نے دوبارہ سوچا اور پھر تیار ہونے کی غرض سے اپنے فلیٹ کی طرف چل دیا۔ فلیٹ سے تیار ہوکر نکلا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ڈرائیور سے برج اسکوائر چلنے کے لئے کہہ دیا۔ ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے میں نے اس کی پراسرار شخصیت کے بارے میں سوچا۔ ''کیا وہ انسان نہیں تھا؟ بے شک وہ کوئی مافوق الفطرت شخصیت تھی۔ ورنہ گردن کٹنا، خون نہ نکلنا اور پھر دوبارہ گردن جوڑ کر گفتگو کرنا انسان ہونے کی نشانی تو نہ تھا۔ وہ مجھے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے؟'' میں نے سوچا اور پھر اپنی بزدلی پر خود کو برا بھلا کہنے لگا۔

وہ کوئی بھی ہو، مجھے تو دولت کی ضرورت تھی۔ خون بہانے کے شوق کو تو میں کسی بھی جگہ پر پورا کرسکتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ اگر کچھ دولت بھی حاصل ہوجائے تو کیا حرج ہے؟ تھوڑی دیر کے بعد ٹیکسی برج اسکوائر پہنچ گئی اور ڈرائیور نے مجھے اس کے بارے میں اطلاع دی۔ ''ہاں ٹھیک ہے، یہیں روک دو۔'' میں نے کہا اور بچے ہوئے چند نوٹ نکال کر ڈرائیور کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

اب میری جیب میں ایک کوڑی بھی نہیں تھی۔

برج اسکوائر میں چھوٹے چھوٹے خوب صورت بنگلے بنے ہوئے تھے۔ جو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ علاقہ پوری طرح آباد نہیں تھا۔ اس لئے بہت سے بنگلے خالی پڑے تھے۔ اٹھارہ نمبر بنگلہ تلاش کرنے میں مجھے کوئی مشکل نہیں ہوئی، بنگلے کے پھاٹک پر نیم پلیٹ بھی موجود تھی۔ جس پر یو، این، آلڈس لکھا صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ اور کہیں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔

تھوڑی دیر کے بعد گیٹ کے دوسری طرف ایک خوب صورت سی لڑکی نظر آئی۔ دراز قد کی یہ خوب صورت خدوخال والی لڑکی مجھے پسند آئی۔ وہ لمبے قد کے باوجود بے حد گداز اور دل فریب جسم کی مالک تھی۔ میں نے مسکرا کر اسے دیکھا اور وہ بھی اخلاقاً مسکرا دی۔ ''فرمایئے؟''

''مسٹر آلڈس سے ملنا ہے۔'' میں نے کہا۔
''آپ کل رات ان سے ملے تھے؟'' لڑکی نے کہا۔
''جی؟''
''تب اندر آ جایئے۔ وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں!'' لڑکی نے کہا۔ اور میں اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ لڑکی نے گیٹ بند کر دیا اور ہم دونوں عمارت کے دروازے کی سمت چل پڑے۔
''میرا نام شیلی ہے۔'' راستے میں لڑکی نے اپنے بارے میں بتایا۔
''اوہ! میں نے آپ کو رات ہنی مون نائٹ کلب میں دیکھا تھا۔ لیکن تاریکی کی وجہ سے آپ کو پہچان نہ سکا تھا۔''
''کیا آپ وہاں کے ممبر ہیں؟''
''نہیں میں ایسے ہی وہاں پہنچ گیا تھا۔ آپ کو میں نے اس وقت دیکھا۔ جب مسٹر آلڈس نے آپ کو اپنی کار کی چابی دی تھی۔ کیا مسٹر آلڈس نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ میری ان سے کیسے ملاقات ہوئی تھی؟''
''نہیں!''
''آپ مسٹر آلڈس کی کون ہیں؟''
''سیکریٹری!'' لڑکی نے کہا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ ''مسٹر آلڈس سامنے والے کمرے میں موجود ہیں۔ اندر چلے جایئے۔'' اس نے کہا اور خود رک گئی۔
میں جھجکتا ہوا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ چند لمحات تک میری آنکھیں تاریکی سے مانوس نہ ہوئیں۔ پھر مجھے کچھ کچھ نظر آنے لگا۔ میں نے ایک صوفہ پر آلڈس کو بیٹھے دیکھا۔ حسب معمول وہ سیاہ سوٹ اور فلیٹ ہیٹ میں ملبوس تھا!
''بیٹھو!'' آلڈس نے بدستور بھاری آواز میں کہا۔
اور میں اس کے سامنے پڑے ہوئے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ پچھلی رات میں نے آلڈس کو جس انداز میں دیکھا تھا۔ اسے مدنظر رکھتے ہوئے مجھے خوف محسوس ہونا چاہئے تھا۔ لیکن میں بتا چکا ہوں کہ خوف و دہشت جیسی چیزوں کا میرے پاس سے گزر نہیں تھا۔
میں لاپرواہی سے اس کے سامنے بیٹھا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہا ہو۔ پھر اس نے پوچھا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''
''شمشیر خان! تم مجھے خان کہہ سکتے ہو؟''
''شمشیر ہی کی مانند تیز بھی ہو۔'' اس نے تحسین آمیز انداز میں کہا۔
میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ تو وہ پھر بولا۔
''رات کو تم نے مجھے رقم حاصل کرنے کے لئے ہی قتل کرنے کی کوشش کی تھی؟''
''ہاں!'' میں نے جواب دیا۔
''اس سے پہلے کتنے لوگوں کو قتل کر چکے ہو؟''
''بے شمار! میرے پاس صحیح اعداد و شمار نہیں!''
''بہت خوب، جیل گئے ہو؟''
''صرف ایک بار!''
''قتل کے الزام میں؟''
''ہاں!''
''بری ہو گئے؟''
''نہیں فرار ہوا تھا۔'' میں نے بے خوفی سے کہا۔
''ویری گڈ! باصلاحیت آدمی ہو، کچھ اور کام کرتے ہو یا صرف لوٹ مار؟''
''میرا محبوب مشغلہ صرف قتل کرنا ہے۔ دوسروں کے لئے بھی کام کرتا ہوں۔ اور جب دوسروں کا کام نہیں ملتا تو خود اپنے لئے، آج کل تنگدست ہوں۔'' میں نے کہا۔
''یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ یوں سمجھ لو، تمہاری تنگدستی دور ہو گئی، میری خواہش ہے کہ تم میرے لئے کام کرو، میں کچھ لوگوں کو قتل کرانا چاہتا ہوں، اس کے صلے میں، میں تمہیں اتنی دولت دوں گا کہ شہنشاہی کی زندگی بسر کرو گے اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میں تمہاری حفاظت کروں گا، اور تمہیں پولیس اور تمہارے دوسرے دشمنوں سے باخبر رکھوں گا۔''
''مجھے منظور ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں

خوش ہوتے ہوئے کہا۔
''یہاں تمہارا اور کوئی ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''تھے، اب کوئی نہیں ہے۔''
''کبھی ملک سے باہر گئے ہو؟''
''کبھی نہیں!''
''خواہش ہے؟''
''کوئی حرج بھی نہیں ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''تب ٹھیک ہے۔ رہتے کہاں ہو؟''
''ایک فلیٹ میں!''
اسے چھوڑ دو، آج سے میرے ساتھ رہو، شیلی بھی میرے ساتھ رہتی ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کوئی نہیں ہے، ہم سب ساتھ رہیں گے، کچھ دن قیام کرنے کے بعد یہاں سے باہر چلے جائیں گے، تمہیں مختلف ملکوں میں میرا کام کرنا ہے۔''
مجھے اس شہر اور اس ملک سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے مجھے فلیٹ چھوڑنے اور اس کے ساتھ رہنے میں کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ چنانچہ میں تیار ہوگیا۔ اور اس نے مجھے میری آمادگی پر مبارکباد دی۔ پھر اس نے صوفے میں لگی ہوئی ایک گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دیا اور چند لمحوں کے بعد شیلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ ''شیلی!'' اس نے لڑکی سے کہا۔ ''یہ آج سے ہمارے ساتھ شامل ہوگئے ہیں۔ تمہیں خوشی ہونی چاہئے کہ تمہاری تنہائی بھی دور ہوگی۔''
''میں خوش ہوں جناب!'' لڑکی نے کہا۔
''ٹھیک ہے فی الحال ان کی پسند کے مطابق ایک کمرہ تیار کردو۔ اور ان کی ہر ضرورت کی چیز مہیا کرو۔ انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔'' اس نے کہا۔ اور لڑکی نے گردن ہلادی۔ ''تم ان کے ساتھ جاسکتے ہو شمشیر، ضرورت پڑنے پر میں تم سے ملاقات کروں گا۔
اور میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ باہر نکل کر میں نے مسکرا کر شیلی کی طرف دیکھا، اور وہ بھی مسکرادی۔ ''تم درحقیقت تنہائی سے اکتائی ہوئی ہو۔'' میں نے پوچھا۔
''ہاں، مجھے تمہاری آمد سے بہت خوشی ہوئی ہے۔ اب ہم اکٹھے کلب چلا کریں گے ہر وقت ساتھ رہیں گے۔'' لڑکی نے کہا۔
''مسٹر آلڈس کی سیکریٹری کب سے ہو؟''
''میرے نزدیک یہ ایک ذاتی سوال ہے۔ جب تک مسٹر آلڈس مجھے اجازت نہیں دیں گے۔ میں تمہیں اپنے اور مسٹر آلڈس کے بارے میں کچھ نہ بتا سکوں گی۔ امید ہے تم اس بات کا خیال نہ کرو گے۔'' لڑکی نے کہا۔ اور میں خاموش ہوگیا۔
بات بھی کسی حد تک ٹھیک ہی تھی۔ ''وہ رفتہ رفتہ ہی میرے اوپر اعتماد کریں گے۔'' میں نے سوچا۔ بہرحال اعتماد کریں نہ کریں، مجھے کیا پرواہ، میرا کام بن گیا تھا۔ میں نے شیلی سے کہا۔
''مجھے سونے کے لئے ایک بستر سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ تم تیار ہوکر میرے ساتھ یا تو کلب میں چلو، یا کسی بار میں، میں شراب کی ضرورت محسوس کررہا ہوں۔''
''ٹھیک ہے آؤ۔ تم اس کمرے میں بیٹھو، میں تیار ہوکر آتی ہوں۔'' سیلی نے کہا اور وہ مجھے ایک کمرے میں بیٹھا کر چلی گئی۔ میں نے صوفے کے سامنے پڑی ہوئی میز سے ایک میگزین اٹھالیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔
تھوڑی دیر بعد شیلی اندر آگئی۔ اس نے نئے ڈیزائن کی چست پتلون پہنی تھی اور سیاہ شرٹ، بالوں میں سفید ربن لگا ہوا تھا میں اسے دیکھ رہا تھا۔ جبکہ وہ بولی۔ ''آؤ......!''
میں اس کے ساتھ باہر چلا آیا۔ وہ کار میں میرے ساتھ بیٹھی اور کار اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی۔ تھوڑی دیر کے بعد کار ایک خوب صورت اور اعلیٰ درجے کے بار کے سامنے رک گئی۔ اور ہم دونوں اتر کر بار میں داخل ہوگئے۔ وہاں سے تقریباً آدھی رات گزر جانے کے بعد ہم واپس آئے اور اپنے اپنے کمرے میں جاکر سوگئے۔
اگلی صبح جب وہ مجھے ناشتے کے لئے بلانے

آئی۔ اس کے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ غسل کر کے آئی تھی۔ میں نے بھی باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور ناشتہ کرنے آ بیٹھا۔ "کیا مسٹر آلڈس ہمارے ساتھ ناشتہ نہیں کریں گے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں!" وہ مختصراً بولی اور میں خاموش ہوگیا۔

بھوک کے سامنے مجھے کسی چیز سے دلچسپی نہیں تھی۔ اور جب میں نے پیٹ بھر کر ناشتہ کر لیا تب اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ کھانے کی عادی تھی، اور اپنے خوب صورت دانتوں سے سلائس کاٹ رہی تھی۔

"مسٹر آلڈس کا شغل کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔ اور اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔

پھر بولی۔ "ابھی اجازت نہیں، میں مسٹر آلڈس سے اجازت لے لوں۔ پھر بتا سکتی ہوں۔"

"تو جلدی سے اجازت لو۔ میں الجھنیں پالنے کا عادی نہیں ہوں۔" میں نے غراتے ہوئے کہا۔

اور وہ نظریں اٹھا کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور نہ جانے کیوں میری پلکیں جھپک گئیں۔ اس کی آنکھوں میں خونخوار بلی کی سی چمک تھی۔ عجیب وحشت خیز آنکھیں تھیں۔ میں دوبارہ اس کی آنکھوں میں نہ دیکھ سکا۔ لیکن اس کے اس طرح دیکھنے پر مجھے بہت غصہ آیا۔ اس نے خاموشی سے برتن ٹرالی پر رکھے اور باہر نکل گئی۔

گیارہ بجے تک میں ٹہلتا رہا، نہ وہ کمرے میں آئی، اور نہ میں باہر نکلا، سوا گیارہ بجے میں نے خود غسل خانہ تلاش کیا اور غسل کیا۔ پھر کچن تلاش کرنے لگا، وہ مجھے کچن میں ہی ملی، شاید وہ دوپہر کے لئے کھانا تیار کر رہی تھی۔ "مجھے شراب چاہئے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا اور وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔

ایک اور کمرے میں پہنچ کر اس نے الماری کھولی، میں اس کے پیچھے پیچھے تھا، الماری کے اندر دیکھ کر میری آنکھیں جگمگا اٹھیں۔ اس میں دنیا کی بہترین کوالٹی کی شراب کی بوتلیں نیچے سے اوپر تک چنی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ اور خود اپنی پسند کی شراب نکالنے لگا۔ وہ دروازہ سے باہر نکل گئی۔ ایک بجے تک میں پیتا رہا۔ پھر ایک بجے اس نے مجھے کھانے کی اطلاع دی۔ اور کھانے کے بعد میں سو گیا۔

اس پورے وقت میں آلڈس مجھے ایک بار بھی نظر نہیں آیا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں جا مرا تھا۔ شام کا پروگرام پہلے دن کے مطابق تھا۔ اور رات بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ شام ہوتے ہی شیلی دن کی رنجشیں بھول گئی۔ دوسرے دن میں کافی حد تک پرسکون تھا۔

اس طرح دن گزرتے رہے، میں نے اب آلڈس کو پوچھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ مجھے کیا پڑی تھی؟ کہ اس کی ٹوہ میں لگا رہوں۔ ایک دن میں نے شیلی سے پوچھا۔ "شیلی کیا تم نے کسی کو قتل کیا ہے؟"

"کیوں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"ایسے ہی پوچھ رہا ہوں۔"

"نہیں میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔ مگر تم نے یہ سوال کیوں کیا؟"

"ہاں...... تم قتل کی لذت کو کیا جانو، اگر تم پسند کرو، تو ہم آج رات کسی کو قتل کر دیں؟ تمہارے ساتھ رہ کر نہ جانے کیوں ابھی تک میری طبیعت خون کی طرف مائل نہیں ہوئی۔ ورنہ میں اتنے دن صبر کا عادی نہیں ہوں۔"

میری اس گفتگو پر وہ مجھے اس انداز سے دیکھنے لگی۔ جیسے میں پاگل ہوگیا ہوں۔ میں نے اس کی حیرت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں نہیں پتہ شیلی میں خون کرنے کا عادی ہوں۔ شراب، ریس، جوا اور عورت سے بھی زیادہ دلکش، میرے لئے بہتا ہوا خون ہے، تم نے مجھے آلڈس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ لیکن میں تمہیں یہ سب بتانے میں عار نہیں محسوس کرتا کہ پہلی ملاقات میں، میں نے مسٹر آلڈس کو بھی قتل کرنے کی کوشش کی تھی میرے اس انکشاف پر اسے ضرور یقین ہوگیا تھا کہ آج مجھے ضرور چڑھ گئی ہے۔

وہ دل چسپ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ جیسے میں کوئی لطیفہ سنا رہا ہوں۔ ''تم میری بات کو جھوٹ سمجھ رہی ہو؟'' میں نے دانت پیستے ہوئے کہا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

میں نے اپنے کوٹ کی آستین سے اپنی چھری نکال لی، اور خونی نظروں سے اسے دیکھنے لگا، میں نے سوچا کہ ''کیوں نہ میں اپنی خون کی خواہش پوری کرلوں۔'' اور میں یہ خواہش پوری کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ لیکن قبل اس سے کہ میں اس پر حملہ کرتا مجھے اپنی پشت سے آلڈس کی آواز سنائی دی۔ ''یہ درست کہہ رہا ہے شیلی! یہ خون خوار چیتا ہے۔ جسے خون سے زیادہ دلکش چیز اور کوئی نہیں لگتی۔ یہ خون بہائے بغیر سکون سے نہیں بیٹھ سکتا!'' پھر آلڈس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آج کی رات تم آزاد ہو شمشیر! تم اپنی خواہش پوری کرو، شیلی بھی تمہارے ساتھ رہے گی۔ اور پھر میں تمہارے سپرد، نیا کام کروں گا۔'' اس کی گفتگو سے میرا غصہ سرد ہوگیا۔

یوں بھی وہ اتنے دن کے بعد میرے سامنے آیا تھا۔ چنانچہ میں نے چھری اپنے کوٹ کی آستین میں رکھتے ہوئے اس سے اس کے بارے میں پوچھا۔

''تم اتنے دن کہاں غائب رہے؟''

''میں!'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''میں کہاں جاسکتا ہوں؟ میں ان دنوں اپنے کمرے میں تھا۔ ہمیشہ وہیں رہتا ہوں۔ تم جب بھی مجھ سے ملنا چاہو۔ میرے کمرے میں آسکتے ہو۔''

''اوہ!'' میں تعجب میں رہ گیا۔ یہ تو بڑی حیرت انگیز بات ہے۔ یہ شخص اتنے دنوں سے اپنے کمرے میں محصور تھا، باہر ہی نہیں نکلا تھا۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا! لیکن مجھے تو اس کی پر اسرار فطرت کے ایک ایسے پہلو کا علم تھا جس کے بعد دوسری کسی بات میں حیرت کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی تھی۔

چنانچہ میں نے اس سلسلے میں اس سے مزید کوئی سوال نہ کیا۔ اور شیلی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اپنی جگہ کھڑی سپاٹ نظروں سے ہم دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ پھر آلڈس واپس مڑتے ہوئے بولا۔ ''تم ان کا پورا خیال رکھو گی شیلی! میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ یہ ہمارے لئے بہت اہم شخص ہے۔ اسے کوئی تکلیف پہنچی تو ہمارے لئے بہت سخت نقصان کی بات ہے۔''

''میں احتیاط رکھوں گی جناب!'' شیلی نے دھیمی آواز میں کہا۔ اور آلڈس واپس اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔

میں نے شیلی کی طرف دیکھا، اور شیلی آہستہ سے مسکرادی۔ ''تم سچ مچ ناراض ہوگئے تھے ڈیئر!'' اس نے محبت بھری آواز میں کہا۔

''اگر آلڈس اس وقت نہ آجاتا تو تمہیں میری ناراضگی کا عملی ثبوت مل جاتا!'' میں نے کہا۔

''گویا تم مجھے قتل کردیتے؟'' وہ بولی۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، اور برا سا منہ بناتے ہوئے اس کی شکل دیکھنے لگا۔ ''اگر تم مجھے قتل کردیتے ڈارلنگ تو تم بور ہوجاتے!''

''فضول گفتگو مت کرو۔ بار بار قتل کا نام نہ لو۔ شام ہولینے دو، میرا موڈ اس وقت ہی درست ہوسکتا ہے۔ جب میری پیاس بجھ جائے۔'' میں نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ درحقیقت زندگی میں پہلی بار میری چھری کسی پر نکل آنے کے بعد پیاس بجھائے بغیر ہی آستین میں واپس چلی گئی تھی۔

اگر آلڈس نہ آجاتا، تو شیلی کی لاش ایک حسین منظر پیش کررہی ہوتی، پھر میرا ذہن آلڈس کی طرف چلا گیا۔ اور میں نے شیلی سے پوچھا۔

''کیا آلڈس درحقیقت اسی کمرے میں رہتا ہے؟''

''ہاں! مسٹر آلڈس نے تمہیں خود بتایا ہے۔''

''اس دوران وہ کسی کام سے باہر نہیں نکلتا ہے؟''

''نکلتے ہیں۔''

''میں نے کبھی نہیں دیکھا۔''

''اتفاق ہے۔'' شیلی نے کہا۔

آلڈس کے بارے میں گفتگو کرنے سے میری جھنجھلاہٹ قدرے کم ہوگئی تھی۔ اور پھر میں بالکل پرسکون ہوگیا۔

شام کو حسب معمول ہم تیار ہوکر باہر نکل آئے۔ شیلی روز کی طرح آج بھی حسین لگ رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ کار میں جارہا تھا۔ راستے میں میرے ذہن میں ایک عمدہ ترکیب آئی اور میں نے ڈرائیونگ کرتی ہوئی شیلی سے پوچھا۔ ''کیا تم انسانی قتل سے متاثر ہوتی ہو شیلی؟''

''کیوں؟'' تم نے یہ سوال کیوں کیا؟'' اس نے سامنے نظریں جمائے ہوئے پوچھا۔

''میں تمہیں اپنے پروگرام میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔ سنو، میرا پروگرام یہ ہے کہ آج تم کسی خوب صورت نوجوان کو پھانسو، ہم اسے لے کر کسی سنسان علاقے میں چلیں گے، اور پھر وہاں اسے قتل کرکے لطف اندوز ہوں گے۔'' میری اس بات سے اس کی نظروں میں الجھن کے آثار پیدا ہوئے، پھر اس نے آمادگی ظاہر کردی، اور ہم ایک خوب صورت سے ہوٹل میں پہنچ گئے۔

ایک میز پر بیٹھ کر میں نے چاروں طرف دیکھا اور پھر ایک گورے رنگ کے ایک قوی ہیکل نوجوان کی طرف اشارہ کیا، جو ایک کرسی پر تنہا بیٹھا تھا۔

''وہ ٹھیک ہے میرا خیال ہے تم کوشش کرو۔'' میں نے کہا۔ اور شیلی نے گردن ہلادی۔

میں نے حسب معمول اپنے لئے شراب منگائی۔ شراب پینے کے دوران میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ شیلی نے اپنا کام شروع کردیا ہے۔ اور نوجوان اس کے اشارے کنایوں کا جواب دے رہا ہے۔ میں اطمینان سے شراب پیتا رہا۔ پھر رقص کا پروگرام شروع ہوگیا۔ اور شیلی اٹھ کر چلی گئی۔ میں ڈانس فلور پر اسے نوجوان کے ساتھ رقص کرتے دیکھ رہا تھا۔

شیلی نے دوسرے راؤنڈ میں بھی نوجوان کے ساتھ رقص کیا۔ اور اس کے خاتمے کے بعد وہ میرے پاس آگئی۔ ''تیسرے راؤنڈ کے خاتمے سے پہلے ہی باہر نکل جانا اور کار سڑک پر نکال کر ہمارا انتظار کرنا، ہم بلو مل جائیں گے۔ بلومل کی ہٹ نمبر گیارہ اس کی ہے۔'' اس نے بتایا اور میں نے گردن ہلادی۔

کام نہایت آسان ہوگیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دونوں باہر نکلتے نظر آئے اور پھر ایک سرخ رنگ کی کار میں بیٹھ کر باہر کی طرف نکلے، میں نے نوجوان کو دیکھا وہ ایک ہاتھ سے کار چلارہا تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ یقیناً شیلی کی کمر پر ہوگا۔ میں دل ہی دل میں مسکرایا۔ آخری وقت میں اگر وہ تھوڑی دیر کے لئے کسی لڑکی کے قرب سے لطف اندوز ہولے تو کیا حرج ہے؟ میں نے سرخ کار کے قریب سے تعاقب مناسب نہ سمجھا۔ جس جگہ وہ جارہے تھے۔ وہ مجھے معلوم ہی ہوگئی تھی۔ چنانچہ میں اطمینان سے چلتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد ہم بلومل پہنچ گئے۔

سنسان جگہ تھی۔ صرف بڑے لوگوں کی عیاشی کے لئے تھی۔ اس لئے یہاں کوئی دخل اندازی بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ہٹ نمبر گیارہ تلاش کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کیونکہ اس کے سامنے سرخ رنگ کی کار کھڑی تھی۔ میں نے کافی فاصلے پر اپنی کار روک دی اور انجن بند کرکے نیچے اتر آیا۔ پھر اطمینان سے ٹہلتا ہوا ہٹ نمبر گیارہ کے قریب پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یقیناً یہ شیلی کی چالاکی ہوگی۔ ورنہ دروازہ کھلا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں بے آواز اندر داخل ہوگیا۔ اور پھر ایک کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جس سے روشنی چھن رہی تھی۔ شیلی بہت اچھی لڑکی تھی۔ کیونکہ اس نے میرے کام میں کوئی دقت نہیں چھوڑی تھی۔ اس کمرے کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا، اور اندر داخل ہوگیا۔

شیلی بستر پر تھی، اور وہ نوجوان بھی اس کے ساتھ تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بری طرح اچھل پڑا۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے شیلی کی طرف دیکھا۔ اور شیلی اپنا لباس درست کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

میری چھری آستین سے نکل آئی اور نوجوان کا

چہرہ دہشت سے سفید پڑ گیا۔ ''مم، میں معافی چاہتا ہوں، یہ...... یہ خود مجھے یہاں لے آئی تھی۔'' اس نے لرزتے ہوئے کہا۔ لیکن میری آنکھیں تو تصور میں اس کی گردن سے بہتے ہوئے سرخ خون کو دیکھ رہی تھیں۔ سرخ سرخ، گرم ابلتا ہوا خون، میرے کانوں میں اس کے الفاظ گونج تو ضرور رہے تھے، اور پھر میں نے کسی باز کی طرح جھپٹا مارا، نوجوان خاصا طاقتور تھا، لیکن اس وقت اس کے قویٰ مفلوج تھے۔ وہ خود کو چور سمجھے ہوئے تھا۔ اس لئے مداخلت نہ کر سکا۔ اور دوسرے لمحے میں اس کے سینے پر سوار تھا۔ اور پھر اس کے حلق سے خرخراہٹ نکلنے لگی۔ میں نے اس کا نرخرہ کاٹ دیا تھا۔ اور سرخ سرخ خون...... میری پسند جو کہ میرے ہاتھوں کو رنگین کر رہا تھا۔ میں اس لمحے کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا، میری آنکھیں نشہ سے بوجھل ہوتی جا رہی تھیں۔

شیلی دیوار سے لگی کھڑی تھی، میں نوجوان کے پھڑ پھڑاتے ہوئے جسم سے اٹھ گیا تاکہ میرے خوف سے اس کے تڑپنے کی قوت کم نہ پڑ جائے۔ بڑا جاندار نوجوان تھا۔ اس نے کٹی ہوئی گردن کے ساتھ کئی بار ہاتھ ٹیک کر اٹھنے کی کوشش کی، لیکن گردن پچھلی سمت لٹک گئی تھی۔ اس لئے کامیاب نہ ہو سکا اور گر پڑا۔

ہٹ کا فرش اس کے خون سے سرخ ہو گیا۔ بہت عرصہ کے بعد شکار ملا تھا۔ لیکن بھرپور شکار تھا۔ اس لئے میری طبیعت شیر ہو گئی۔ میں نے چھری اس کے جسم سے صاف کر کے آستین میں رکھی، ہٹ میں واش بیسن تلاش کر کے خون سے لتھڑے ہوئے ہاتھ دھوئے اور پھر شیلی کے ساتھ باہر نکل گیا۔

شیلی پھر بھی خاموش تھی۔ وہ مجھ سے کچھ مرعوب ہو گئی تھی۔ آج شاید اسے احساس ہوا تھا کہ مسٹر آلڈس نے کیوں میری ناز برداریوں کا فیصلہ کر لیا تھا۔ رات حسب معمول گزری۔

دوسرے دن ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اچانک ایک کریہہ چیخ سنائی دی۔ یہ گھنٹی کی آواز تھی۔ جو میں نے پہلی بار سنی تھی۔ شیلی مجھ سے معذرت کر کے چلی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آئی اور مجھ سے کہا۔

''مسٹر آلڈس آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔'' میں نے گردن ہلا دی اور اٹھ کر اس کمرے کی طرف چل دیا جس میں، میں نے پہلی مرتبہ مسٹر آلڈس سے ملاقات کی تھی۔ اس شخص نے میرے لئے جس قدر آسائشیں مہیا کی ہوئی تھیں۔ ان کا میں شکر گزار تھا۔ بذات خود وہ کچھ بھی ہو، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔

بہرحال میں اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ نیم تاریک کمرے میں وہ بدستور اسی صوفے پر آ بیٹھا ہوا تھا۔ ''آؤ شمشیر۔'' اور میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

میرے بیٹھ جانے کے بعد وہ بولا۔ ''میں اب یہاں سے جانے کا پروگرام بنا رہا ہوں، شمشیر سب سے پہلی بات یہ بتاؤ کہ کیا تم میرے ساتھ رہ کر مطمئن ہو؟''

''ہاں، مکمل طور پر!'' میں نے جواب دیا۔

''میرے ساتھ تمہیں ایسی کوئی الجھن تو نہیں ہے۔ جس سے تم مجھ سے ناراض ہو کر علیحدگی اختیار کر لو۔''

''نہیں!''

''اگر شیلی سے تمہارا دل بھر جائے تو تمہیں دوسری لڑکیاں بھی مہیا کی جا سکتی ہیں۔ اس کی فکر نہ کرنا، رہا شراب کا سوال تو تم دنیا کی قیمتی سے قیمتی شراب استعمال کرو۔ تمہیں فراہم کی جائے گی اور دولت اگر تم چاہو تو دنیا کے کسی بھی بینک میں تمہارے لئے رقم محفوظ کر دی جائے گی کہ تم اپنی زندگی عیش سے گزار سکو۔ اس کے عوض مجھے صرف تمہارے اعتماد کی ضرورت ہے۔''

''میں تمہارے اعتماد پر پورا اتروں گا، اطمینان رکھو، اس کے علاوہ اگر مجھے تم سے کوئی شکایت ہوئی تو صاف کہہ دوں گا۔''

''یہ بہت اچھی بات ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''یہاں تمہیں میرا ایک کام کرنا ہے، آج ہی رات اور ممکن ہے، کل رات ہم یہاں سے تھائی لینڈ روانہ ہو جائیں۔''

''میں تیار ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اس کا نام پروفیسر رازی ہے۔ اعلیٰ حیثیت کا حامل ہے۔ رات کو ٹھیک گیارہ بجے وہ ڈریم کلب سے واپس چلے گا، تمہیں راستے میں ہی اسے روک کر اس کی گردن کاٹنی ہے، میں اور شیلی بھی تمہارے ساتھ ہوں گے اور تمہاری مدد کریں گے، تم اس کی گردن اس کے شانوں سے علیحدہ کرکے لے آؤ گے۔''

''مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔ میں آسانی سے اپنا کام کرلوں گا۔'' میں نے کہا۔

''ہم خود بھی تمہارے ساتھ ہوں گے۔ شیلی تمہیں اس کے بارے میں بتائے گی۔ لو یہ پستول رکھ لو۔'' اس نے ایک سیاہ رنگ کا پستول میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا اور میں نے حقارت سے پستول دیکھا۔ ''مجھے اس سے نفرت ہے۔ پستول سے کسی کو قتل کرنے کے بعد میں خودکشی کرلوں گا۔ کیونکہ مجھے پستول سے قتل کرنے میں ذرا بھی لطف نہیں آتا۔ یہ بزدلانہ طریقہ ہے اور اس سے شکار کوئی جدوجہد نہیں کرتا۔''

''میں حفاظت کے خیال سے کہہ رہا تھا۔ بہرحال ٹھیک ہے ہاں تو آج رات!''

''تم مطمئن رہو۔'' میں نے کہا اور بے چینی سے رات کا انتظار کرنے لگا۔ ڈریم نائٹ کلب میں شیلی نے مجھے میرے شکار کی شکل دکھائی۔ ادھیڑ عمر انسان تھا، لیکن مضبوط جسم اور اچھی صحت کا مالک میں نے اس کی گردن دیکھی اور میرے ہاتھوں میں کھجلی ہونے لگی۔

بہرحال ابھی ساڑھے نو بجے تھے۔ شیلی حسب معمول میرے ساتھ تھی۔ لیکن اس نے تمام میزوں پر نظریں دوڑانے کے باوجود آلڈس کو نہ دیکھا، اور آخر شیلی سے پوچھ بیٹھا۔ ''مسٹر آلڈس نے کہا تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہوں گے، لیکن میں انہیں کہیں نہیں دیکھ رہا۔''

''آج شام تم انہیں دیکھ لوگے۔'' شیلی نے مجھ سے عجیب لہجے میں کہا۔ میں اس کے الفاظ سمجھ نہ سکا تاہم خاموش ہوگیا۔

ٹھیک گیارہ بجے شیلی نے مجھ سے اٹھنے کے لئے کہا۔ اور میں نے چونک کر شکار کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اٹھ رہا تھا۔ چنانچہ ہم باہر نکل آئے۔ اسٹیئرنگ شیلی نے ہی سنبھالا اور ہم شکار کا تعاقب کرنے لگے، وہ اپنی کار میں تنہا تھا۔ اس لئے میرا کام مشکل نہ تھا، ایک سنسان سڑک پر شیلی نے اپنی کار کی رفتار تیز کردی۔ اور پھر اس کی کار سے آگے نکل کر اس نے کار اس طرح روکی کہ رازی کو بھی اپنی کار روکنی پڑی وہ غصیلے انداز میں غراتا ہوا کار سے نیچے اتر آیا اور ہم سے ہماری اس بدتمیزی کی وجہ پوچھنے لگا۔ لیکن ظاہر ہے وجہ تو اسے عملی طور پر سمجھانی تھی۔

میں کار سے اتر گیا اور اس سے قبل کہ وہ پستول نکالے میں نے اسے کسی شاہین کی طرح دبوچ لیا۔ پھر اسے میرے ہاتھ سے کون بچا سکتا تھا۔ لیکن آج میرا ہاتھ سخت تھا۔ پہلے میں نرمی سے صرف نرخرہ کاٹ دیتا تھا۔ لیکن آج میں نے پہلی بار اپنے شکار کی گردن اتاری۔

شیلی ایک سیلوفین کا تھیلا لئے ہوئے کھڑی تھی۔ گردن تھیلے میں ڈال کر میں نے اس سے دوسرے اقدام کے بارے میں پوچھا۔ لیکن اس سے قبل کہ شیلی کوئی جواب دیتی۔

ہمیں آلڈس کی آواز سنائی دی۔ ''باقی کام میں خود کرلوں گا شیلی، تم لوگ چلو۔''

اور میں چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ لیکن آلڈس نہ جانے کہاں چھپا ہوا تھا۔ میں اسے تلاش کرنے لگا، تو شیلی نے میرا شانہ تھپتھپا کر کہا۔ ''دیر کرنا مناسب نہیں، اس سڑک پر آمد و رفت رہتی ہے۔ آؤ چلیں۔'' اور میں اس کے ساتھ چل پڑا۔

''اس گردن کا کیا کرنا ہے۔''

''یہ تو مسٹر آلڈس ہی بتا سکیں گے۔'' شیلی نے جواب دیا۔

بنگلے پر پہنچ کر ہم آلڈس کا انتظار کرنے لگے۔ کٹی ہوئی گردن ایک میز پر رکھی تھی۔ اور سیلوفین کی تھیلی میں

اس سے بہا ہوا خون بھر گیا تھا۔ میرے لئے یہ منظر بھی دلچسپ تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد باہر قدموں کی چاپ سنائی دی اور آلڈس اپنے مخصوص لباس میں اندر داخل ہوگیا۔ اس کا ہیٹ اس کے چہرے کو چھپائے ہوئے تھا۔ ''کیا تم ہو شیلی؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں مسٹر آلڈس!''

''میں چاہتا ہوں مسٹر شمشیر کو بھی اپنے کام میں شامل کرلیا جائے۔ بے شک یہ قابل اعتماد ہیں، ہم ان کی خوبیوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔'' پھر وہ میری طرف مخاطب ہو کر بولا۔ ''کیا تم میرے لئے کچھ اور تکلیف کرو گے؟ براہ کرم میری مدد کرو۔ میں ایک مظلوم انسان ہوں، مجھے نئی زندگی کی خواہش ہے۔ جس کے لئے میں تمہاری مدد چاہتا ہوں۔''

''میں تیار ہوں دوست، میں وعدہ کر چکا ہوں کہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہوں گا۔ تمہارا راز میرا راز ہے، اور پھر میں تو تمہیں اپنے رازوں کا امین بنا چکا ہوں۔ میں کون سا نیک نام ہوں۔ تم بے تکلفی سے مجھے بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے؟'' میں نے خلوص سے کہا۔

''آؤ شیلی، یہ سر اٹھاؤ، اور ہاں اسے دھولاؤ؟'' اس نے کہا اور شیلی سر اٹھا کر باہر نکل گئی۔

آلڈس مجھے لئے ہوئے ایک کمرے میں آیا، میں بھی اس کمرے کو پہلے دیکھ چکا تھا۔ لیکن اس کا مصرف میری سمجھ سے باہر تھا، کمرے کے درمیان میں ایک سفید رنگ کی میز پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک الماری بھی موجود تھی۔ مجھے کسی سلسلے میں کرید کی عادت نہیں ہے۔ صرف اپنے کام سے کام رکھتا ہوں۔ اس لئے میں نے شیلی سے ان چیزوں کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ اس وقت بھی میں نے مسٹر آلڈس سے یہاں آنے کا مقصد نہیں پوچھا۔ اور اس کے اشارے پر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

خود آلڈس ایک دوسری کرسی پر بیٹھ کر شیلی کا انتظار کرنے لگا۔ چند منٹ کے بعد شیلی واپس آگئی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں دھلا ہوا سر موجود تھا۔ جسے اس نے میز پر رکھ دیا اور آلڈس کی طرف دیکھنے لگی۔

''سامان نکال لو۔'' آلڈس نے کہا۔ اور شیلی نے الماری کھول کر عجیب قسم کے آلات نکال کر میز کے قریب ایک اسٹول پر رکھ دیئے، اور پھر آلڈس نے اپنا ہیٹ اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔

میری متجسس نظریں اس کا چہرہ تلاش کرنے لگیں، میں نے اپنے پراسرار دوست کا چہرہ آج تک نہیں دیکھا تھا۔ مجھے اس کا چہرہ دیکھنے کا شوق تھا۔ لیکن تیز روشنی میں مجھے ایک سیاہ کپڑا نظر آیا۔ جو شاید اس کے چہرے پر بندھا ہوا تھا، نہ جانے کیوں؟ شاید چہرہ چھپانے کے لئے، لیکن اس کے بعد اس نے اپنے کان کے قریب کوئی چیز ٹٹولی اور اسے علیحدہ کرنے لگا۔ سیاہ کپڑے کی پٹی تھی۔ جو بہت لمبی تھی۔ وہ اسے اپنے چہرے سے کھول رہا تھا۔ بس پٹی کے خاتمے کے بعد اس کے چہرے کے نمودار ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اور پھر میں نے حیرت سے اس کا سر غائب ہوتے دیکھا۔

یقیناً اب پیشانی سے نیچے کا حصہ باقی رہ گیا تھا۔ اور وہ مسلسل پٹی کھولے جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی گردن غائب ہوگئی۔ بے سر کا انسان میرے پاس بیٹھا تھا۔ اور اس کے سامنے سیاہ کپڑے کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔

''میرے خدا! کیسا عجیب ہے میرا دوست!'' میں نے سوچا۔

ایک مخصوص حد تک پٹیاں کھولنے کے بعد اس نے شیلی سے قینچی مانگی، اور شیلی نے قینچی لے کر پٹی کاٹ دی۔ پٹیوں کے ڈھیر کو اس نے پاؤں سے ایک طرف کر دیا۔ اور آگے بڑھ کر سفید میز پر لیٹ گیا۔ اب وہ بالکل خاموش تھا۔

شیلی نے مجھے اشارہ کیا۔ میں کھڑا ہوگیا۔

''تمہاری ذرا سی غفلت مسٹر آلڈس کی زندگی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر سکتی ہے؟'' اس نے کہا اور پھر اس نے میری مدد سے کٹی ہوئی گردن کو آلڈس کے بقیہ جسم سے جوڑ دے۔ پھر اس نے ایک سوئی لے کر گردن کو آلڈس کے

جسم سے ٹانکا، اور پھر دوسری کارروائی کرنے لگی۔

میں حیرت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں نے وہی کیا جو شیلی کہتی گئی، پورے ایک گھنٹے بعد ہم اپنے کام سے فارغ ہوگئے۔ آلڈس اسی طرح بے سدھ میز پر لیٹا تھا، آخر میں شیلی نے ایک زرد رنگ کے سیال کی بوتل نکالی اور اسے نلکیوں سے منسلک کرکے اسٹینڈ پر لٹکا دیا، جس طرح انسان کو خون یا گلوکوز دیا جاتا ہے، نلکیاں اس نے سوئی کے ذریعہ آلڈس کی گردن کی رگوں سے منسلک کردیں، اور پھر تمام سامان سمیٹنے لگی، اس کے چہرے پر اطمینان کے آثار تھے، تمام سامان سمیٹنے کے بعد اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''آؤ شمشیر چلیں!''

''اور مسٹر آلڈس؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ اب ٹھیک ہیں؟'' اس نے جواب دیا اور میں اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔ راستے ہی میں، میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا مسٹر آلڈس کا اپنا چہرہ نہیں تھا؟''

''نہیں ان کا کچھ بھی اپنا نہیں، ہمیں انہیں ان کا پورا جسم مہیا کرنا ہے۔ تاکہ وہ بھی انسانوں کی طرح زندگی گزار سکیں۔''

''مگر یہ کیسے ممکن ہے؟'' میں نے شدید حیرت سے پوچھا۔

''اس کے بارے میں مسٹر آلڈس ہی تمہیں بتائیں گے۔'' اس نے خشک لہجے میں کہا، اور میں خاموش ہوگیا۔ لیکن اس واقعے نے مجھے کافی متاثر کیا۔

دوسرے روز میں نے آلڈس کو دیکھا۔ اس نے اپنا چہرہ نہیں چھپا رکھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا دیا۔ اور اس نے مقتول رازی کے ہونٹوں سے میرا شکریہ ادا کیا۔ آلڈس کے کہنے پر ہم اسی رات ایک جہاز سے "Bangkok" روانہ ہوگئے۔ آلڈس اب کھلے چہرے کے ساتھ سفر کررہا تھا، اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ایک زندہ انسان نہیں ہے۔ Bangkok کے ایک خوب صورت ہوٹل میں ہم نے قیام کیا اور پھر چند دن کے بعد ایک بنگلے میں شفٹ ہوگئے۔

یہاں میرا شکار ایک اور آدمی بنا۔ جس کے بارے میں معلومات مجھے آلڈس نے مہیا کی تھیں۔ شیلی میرے ساتھ تھی۔ میں نے اطمینان سے اس شخص کی گردن، ہاتھ اور پاؤں علیحدہ کردیئے، اور بے سر اور ہاتھ پاؤں کا جسم لے کر اپنے بنگلے میں آگئے اس رات پھر وہی عمل دہرایا گیا اور اب آلڈس کو ایک جسم بھی مل گیا تھا۔

مجھے ایک بات پر شدید حیرت تھی۔ اور وہ یہ ہے کہ آلڈس چاہتا تو ایک ہی آدمی سے یہ تمام چیزیں حاصل کی جاسکتی تھیں۔ لیکن نجانے کیوں وہ مختلف لوگوں کے جسمانی اعضاء کو اپنا رہا تھا۔

"Bangkok" میں ایک ماہ گزارنے کے بعد ہماری اگلی منزل "Kuala Lampur" تھا۔ "Kuala Lampur" کے ایک ڈاکٹر کے صرف مجھے پاؤں درکار تھے، لیکن میں اس کی موٹی تازی گردن کیسے چھوڑ سکتا تھا؟ چنانچہ آلڈس کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ میں نے اپنا شوق بھی پورا کرلیا۔

ہماری اس سے اگلی منزل "Mexico City" تھا۔ اور اگر میرا اندازہ درست تھا، تو اب آلڈس کو صرف ہاتھ درکار تھے۔ اپنے چوتھے شکار کے بارے میں بھی اس نے مجھے جلد ہی بتادیا۔

یہ ایک مشہور ڈاکٹر تھا۔ میرے تمام شکاروں سے زیادہ طاقتور، قوی ہیکل اور خطرناک اور پھرتیلا بھی، اگر آلڈس اسے مارنے میں میری مدد نہ کرتا تو شاید آج میں آپ کو یہ کہانی سنانے کے لئے زندہ نہ ہوتا۔

بمشکل میں نے اس کے دونوں ہاتھ کاٹے اور پھر اس کی گردن کاٹ دی۔ اس رات شیلی بہت خوش تھی۔ اس نے میری مدد سے آلڈس کے دونوں ہاتھ بھی اس کے جسم کے ساتھ منسلک کردیئے، اور دوسری صبح زندگی میں پہلی مرتبہ آلڈس ناشتے کی میز پر ہمارے ساتھ تھا، اس کے چہرے سے مسرت پھوٹی پڑ رہی تھی۔

ناشتہ کرتے ہوئے اس نے شکر گزار نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شمشیر میرے دوست مجھے بلاشبہ تمہارے جیسے انسان کی تلاش تھی۔ تم نے دوستی کا

پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ اگر مجھے بہت سے کام نہ کرنے ہوتے تو میں شاید پوری زندگی تمہارے ساتھ گزار دیتا۔

بہرحال میرا خیال ہے کہ میں اپنے بارے میں تمہارے ذہن سے تمام الجھنیں دور کردوں۔ میرا نام آلڈس ہے۔ اگر تمہیں سرجری کے بارے میں معلومات ہو، تو میرا نام تمہارے لئے اجنبی نہ ہوتا، پوری دنیا نے میری صلاحیتوں کا لوہا مانا ہے۔ میں نے انسانی جسم کے ایک ایک عضو کو کھول کر اسے دوبارہ جوڑلیا ہے اور میری تجرباتی انسان آج تک زندہ ہیں۔ انہیں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ اور وہ انتہائی پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔

کسی باصلاحیت انسان کے دشمن بھی ہزار ہوتے ہیں۔

چنانچہ ان چاروں افراد نے مل کر میرے خلاف سازش کی۔ ہماری آپس کی دوستی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ میں ان سے مخلص تھا۔ لیکن وہ چاروں ایک منصوبے کے تحت مجھ سے مل رہے تھے۔

شیلی میری بیٹی ہے۔ پوری دنیا میں میرا واحد سہارا، یہ میری دوست بھی ہے۔

ان دنوں ہم ایک عجیب تجربہ کررہے تھے۔ اور یہ تجربہ تھا، جسم سے روح کو علیحدہ کرنے کا، ہم کسی بھی نیم مردہ انسان کے جسم سے روح نکال کر اسے محفوظ کرسکتے تھے۔ پھر اس روح کو کسی مردہ انسان کا جسم کہا جاسکتا تھا۔ ہمارا خیال تھا۔ کہ ہم مصنوعی جسم بھی تیار کریں گے۔ اور اس طرح ہم محفوظ روحوں کو مصنوعی جسم دے کر زندہ رکھ سکیں گے۔

ہم دونوں نے مل کر چند تجربات کئے اور اس میں کامیاب رہے، لیکن ہمارے دشمنوں نے مجھے مہلت نہ دی۔

ایک رات میرے چاروں دوست میرے پاس آئے، ان کے چہرے صاف تھے لیکن دلوں میں سیاہی تھی۔ انہوں نے موقع پاتے ہی مجھے قتل کردیا۔ میرے جسم کے کئی ٹکڑے کرڈالے، شیلی موجود نہ تھی۔

اتفاق سے وہ ان کے جانے کے چند منٹ بعد ہی آگئی۔ اور اس نے اپنے حواس کنٹرول رکھتے ہوئے میری روح کو کنٹرول کرلیا۔

میں اپنا جسم کھوچکا تھا۔ لیکن میری روح موجود تھی۔

ہم دونوں باپ بیٹی مجبور تھے۔ مظلوم تھے، بالآخر ہم نے ایک فیصلہ کیا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم اپنے دشمنوں کے اعضاء سے ایک جسم ترتیب دیں گے۔ اور پھر وہ جسم میرا ہوا۔ یہ کام تنہا شیلی نہ کرسکتی تھی۔ میں بھی نہ کرسکتا تھا۔ پھر تم مل گئے اور تم نے ہماری مشکل آسان کردی۔

ہم تمہارے شکرگزار ہیں۔ میں وعدے کا پابند ہوں۔ تمہارا کام ختم ہوگیا ہے۔ میں نے مقامی بینک میں تمہارے نام سے ایک بڑی رقم جمع کرادی ہے۔ اتنی رقم کہ تم عیش سے زندگی گزار سکو۔" اور پھر آلڈس نے بینک کے کاغذات نکال کر میرے حوالے کردیئے۔

☆......☆......☆

سرجری، روح کا کنٹرول، انتقام اور دشمنی میری سمجھ سے باہر ہیں، نہ ہی ان چیزوں سے واقف ہوں، اور نہ ہی مجھے ان سے دلچسپی ہے۔ البتہ مجھے اعتراف ہے کہ آلڈس وعدے کا پابند اور نہایت شریف انسان تھا۔ اس نے مجھے اتنا کچھ دیا ہے کہ میں عیش سے زندگی گزار رہا ہوں، نجانے اب وہ کہاں ہے؟ اور کیا کررہا ہے؟ لیکن میں ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل کا مالک ہوں۔ میرے پاس کئی کاریں اور درجنوں ملازم ہیں۔ میرا جنون اب بھی تازہ ہے۔ اور میرے ملازم آج بھی حیران ہیں کہ کون سا ایسا دشمن ہے۔ جو تین چار یا چھ ماہ میں ایک آدھ بار ان کے کسی ساتھی کو قتل کردیتا ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ میں اب بوڑھا ہوچکا ہوں، میرے قویٰ اب اتنے مضبوط نہیں کہ ہر شکار پر قابو پالوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ دو چار ماہ میں ایک آدھ شکار مل جائے، لیکن اگر اس میں بھی ناکام رہتا ہوں تو کسی ملازم سے ہی کام چلالیتا ہوں۔ کیونکہ یہ میری مجبوری ہے۔

درندہ صفت

صبا محمد اسلم۔ گوجرانوالہ

وہ حسن اخلاق رحم دل غریب پرور لوگوں کے دکھ درد کو محسوس کرنے والا اور بڑھ چڑھ کر لوگوں کے کام آنے والا مگر درپردہ اس کی شخصیت بھیانک تھی اور جب اس کا راز کھلا تو پھر......

ظلم وستم اور شقی القلبی کی ایک حیرت انگیز خوف ناک دردناک اور خونی کہانی

رات کے بے کراں سناٹے میں کرمو کی کانپتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”اسد صاحب، یہ دیکھیں۔“ میں نے ٹارچ سے اس جگہ روشنی ڈالی جس کی نشاندہی کرمو کررہا تھا۔ یہ ایک گڑھا تھا لیکن جونہی میری نظر اس پر پڑی تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ کیونکہ اس جگہ بربریت شدہ ایک برہنہ لاش پڑی تھی۔ جس کے بازوؤں اور ٹانگوں کا گوشت غائب تھا۔

کرمو سخت خوف زدہ ہوچکا تھا اس نے کانپتے لہجے میں کہا۔ ”اسد صاحب واپس چلیں یہ کسی جن بھوت کا کام ہے۔“ لہٰذا میں بغیر کچھ کہے سنے واپسی کے لئے مڑ گیا۔

میرا نام اسد سعید ہے۔ اور میں کرائم رپورٹر ہوں ان دنوں میں اپنے خالہ زاد کزن شاہد کی شادی میں آیا ہوا تھا۔ شاہد کا گھر جان پور نامی ایک

گاؤں میں تھا۔اس لئے میں نے چار دن کی چھٹی لی اور اپنی امی کے ساتھ جان پور آ گیا۔شاہد نہ صرف میرا کزن تھا بلکہ اچھا دوست بھی تھا۔ آج بارات جانی تھی۔ چنانچہ بارات گئی اور دلہن کو لے کر واپس آ گئی۔دوسرے دن ولیمہ تھا اکثر گاؤں دیہاتوں میں دن کو شادی ہوتی ہے۔کیونکہ زیادہ تر گاؤں میں بجلی کا مناسب انتظام نہیں ہوتا۔

ہم شام کا کھانا کھا کر فارغ ہوئے تھے کہ کھڑا کھڑاہٹ کی آواز سنائی دی ۔ شاہد کا گھر ایک پہاڑی کے ساتھ تھا۔ پہاڑی کیا تھی درختوں کی جھرمٹ تھی۔ دن کے وقت بھی ہلکا سا اندھیرا رہتا۔رات میں تو وہاں جانے سے بھی ڈر لگتا تھا۔

بہرحال کھڑ کھڑاہٹ کی آواز سننے کے بعد سب کے سب سہم گئے اور ایک دوسرے کے چہروں کی طرف دیکھنے لگے گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال پوچھتے ہوں۔

میں نے وہاں کھڑے دو نو جوان لڑکوں سے کہا۔''اس طرف چل کر دیکھتے ہیں۔ کیا ماجرا ہے۔؟'' مگر انہوں نے جانے سے انکار کر دیا۔

آخر کرمو نے جو شاہد کا پڑوسی تھا کہا۔''اسد صاحب! چلیں میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔'' میں یہ سن کر حیران رہ گیا جہاں جوان جانے سے ڈر رہے ہیں وہاں ایک ستر سالہ بوڑھا جانے کو تیار ہو گیا۔

بہرحال میں نے ایک طاقتور ٹارچ لی اور ہم دونوں جنگل میں داخل ہو گئے کرمو میرے ساتھ تھا پھر ہم نے لاش دریافت کر لی۔ اور اب واپس آ رہے تھے جونہی میں گھر میں داخل ہوا تو شاہد نے پوچھا۔''ہاں رپورٹر صاحب! جنگل سے کیا خبر دریافت ہوئی ہے۔؟''

میں نے کہا۔''طنز نہ کرو۔خبر کے بارے میں سنو گے تو تھرا کر رہ جاؤ گے۔'' ادھر کرمو نے سب کو بتانا شروع کر دیا۔''غضب ہو گیا! غضب ہو گیا۔ ادھر جنگل میں ایک لاش پڑی ہوئی ہے کسی جن نے اس کا گوشت کھا لیا ہے۔''

لاش اور جن کا سن کر تو وہاں کھڑا ہر شخص سخت خوف زدہ ہو گیا۔شاہد غصے سے بولا۔''اسد تم بھی منہ سے کچھ پھوٹو گے یا......''

شاہد کی بات سن کر میں نے کہا۔''بات یہ ہے کہ کھڑ کھڑاہٹ کی آواز سن کر میں کرمو کے ساتھ جنگل میں گیا تو کھڑ کھڑاہٹ کا جواز ڈھونڈتے ہوئے کرمو کو ایک جگہ ایک لاش پڑی دکھائی دی۔اس کے بازوؤں اور ٹانگوں کا گوشت غائب تھا، جیسے کسی نے بڑے ماہرانہ انداز سے کاٹ لیا ہو۔'' تفصیل سن کر سب حیران ہو گئے عورتیں توبہ توبہ کرنے لگیں۔

گاؤں کے ایک آدمی نے کرمو سے پوچھا۔ بابا وہ لاش کس کی تھی اس کے چہرے سے کچھ پتا چلا؟ کرمو ابھی تک اچنبھے میں تھا، وہ بولا۔''مجھے نہیں معلوم، میں نے تو صرف اس کی ٹانگیں دیکھ کر آنکھیں بند کر لی تھیں یہ تو اسد صاحب کا حوصلہ ہے کہ انہوں نے اسے بہت غور سے دیکھا۔''

کرمو کی بات سن کر شاہد بولا۔''اسد تو ہے ہی کرائم رپورٹر، پتہ نہیں کتنی لاشیں اس نے دیکھی ہوں گی اپنی دس سالہ ملازمت میں۔'' وہ ٹھیک کہہ رہا تھا مگر لاش کی اتنی بھیانک حالت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

شاہد کے گھر میں موجود افراد جن میں کچھ مہمان تھے اور کچھ گاؤں کے تھے سب ڈرے ڈرے نظر آنے لگے تھے۔ یہ جان پور میں اپنی نوعیت کا پہلا کیس تھا۔

''مسٹر کرائم رپورٹر! اس طرح کھڑے رہنے یا ڈرنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ بہتر ہے کہ تھانے فون کیا جائے۔'' یہ آواز ماسٹر سفیر کی تھی، جو اس گاؤں کے واحد پرائمری اسکول کے واحد استاد تھے۔

میں خود ہی پولیس کو کال کرنے کا سوچ رہا تھا ۔لہٰذا میں نے موبائل نکالا اور پولیس اسٹیشن کا نمبر ملایا۔ میں عام طور پر اپنا تعارف اسد سعید CR کے نام سے کراتا تھا یہاں CR کا مطلب ہے۔''کرائم رپورٹر۔'' لہٰذا میں نے یہی نام پولیس

آپریٹر کو بتایا۔ وہ نیند میں تھا CR کو نہ جانے کیا سمجھا اور ہڑبڑا کر بولا۔ ”یس سر! عبداللہ اسپیکنگ۔“

میری ہنسی چھوٹ گئی۔ ”او بھائی میں چیف منسٹر نہیں ہوں بلکہ کرائم رپورٹر ہوں۔“

”جی جی فرمائیے ہمارے لئے CM کے برابر ہیں۔ آپ“ وہ جلدی سے بولا۔

میں نے خوشامد کو نظر انداز کر کے سیدھی بات بتائی۔ ”جان پور میں ایک شخص کا مرڈر ہوا ہے بڑے بھیانک انداز میں۔“ میں نے مزید باتیں بھی اسے بتادیں اور فون بند کردیا۔

ماسٹر سفیر کہنے لگے۔ ”ایس ایچ او حیات خان صاحب بڑے فرض شناس آدمی ہیں جلد ہی پہنچ جائیں گے۔“ پھر ہم اسی موضوع پر بات چیت کرنے لگے۔

ایک بزرگ بولے۔ ”یہ کام کسی بدروح کا ہوسکتا ہے بعض بدروحیں جب انتقام لینے پر آتی ہیں تو ایسے کام کرجاتی ہیں۔“

”ہوسکتا ہے...... یہ کام کسی شیر نے کیا ہو چونکہ جنگل بہت گھنا ہے اور شیر آسکتا ہے۔“ ایک آدمی نے رائے دی۔

تو ایک اور بزرگ بولے۔ ”تم سب کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ بدروح نے تو خون پینا ہوتا ہے۔ مگر اس لاش کا گوشت کھایا ہوا ہے۔“ بزرگ نے اپنی دانست میں بڑا اچھا نکتہ پکڑا تھا۔ مگر میں اس سے متفق نہ تھا۔

چنانچہ میں نے کہا۔ ”بزرگوار! بدروح والی بات پر میں یقین نہیں رکھتا۔ یہ توہم پرست لوگوں کی باتیں ہیں۔“

”درست کہا آپ نے مسٹر جرنلسٹ۔ یہ ہمارے خیال کا قصور ہے کہ ہر انوکھا واقعہ جنوں، بھوتوں اور روحوں سے منسلک کردیتے ہیں۔“ ماسٹر سفیر صاحب میری تائید میں بولے۔

اتنے میں پولیس آگئی ایس ایچ او حیات خان اپنے ساتھ چار سپاہی لائے تھے۔ میں نے ان سے ہاتھ ملایا۔ ”میں اسد سعید ہوں کرائم رپورٹر اور میں نے ہی آپ کو فون کیا تھا۔“

”آپ کو کون نہیں جانتا۔ اسد صاحب۔“ ایس ایچ او نے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ جائے وقوعہ کے بارے میں بتائیں۔“

”جی آپ میرے ساتھ چلیں میں دکھاتا ہوں۔“ یہ بول کر میں نے ٹارچ لی اور ان کو لے کر جنگل کی طرف چل پڑا۔

”اوہ خدایا۔“ لاش کو دیکھ کر ایس ایچ او کے منہ سے نکلا۔ ”اتنی بھیانک لاش یقیناً یہ تو کسی درندے کا کام ہے۔“ ایس ایچ او پھٹی پھٹی آنکھوں سے بولے۔ باقی سپاہی بھی ڈر گئے تھے۔ بہرحال ڈرنے سے کچھ نہیں ہونا تھا۔ لاش کو اٹھالیا گیا۔

☆......☆......☆

جان پور بہت خوب صورت گاؤں تھا۔ صبح کے وقت ہوا میں کسی شوخ حسینہ کے رقص کرتے بالوں کی مانند جھولتے ہوئے درخت، چڑیوں کی چہچہاہٹ اور سوندھی سوندھی خوشبو ایک ایسا منظر پیش کرتی کہ دل کی دنیا عجیب ہونے لگتی اور پھر طلوع آفتاب کا منظر لہلہاتے کھیتوں پر پڑتی سورج کی کرنیں۔ یہ سب دیکھ کر بے اختیار شاعری کرنے کو دل چاہتا مگر آج صبح دل کی دنیا عجیب نہیں ہوئی۔ شاعری کرنے کو دل نہیں چاہا۔ یہ خوب صورت گاؤں خوف و ہراس کی لپیٹ میں آگیا۔ اس لاش کے دریافت ہونے پر اور پھر وہ کٹی پھٹی کسی بدنصیب کی لاش، جس نے دلوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ پولیس والے لاش کو لے گئے تھے اور پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوادیا تھا۔ پتہ نہیں وہ کون بدنصیب تھا لیکن کسی کا مرنا دنیا والوں کے کاموں میں رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ اس لاش نے بھی نہیں رکاوٹ ڈالی اور شاہد کی ولیمہ کی تقریب شروع ہوگئی۔

دن گزرا رات آگئی۔ مہمان واپس چلے گئے۔ مجھے بھی جانا تھا مگر شاہد کے بے حد اصرار کی وجہ سے نہیں گیا۔

رات گزری، صبح ہوگئی مگر ایک ہولناک منظر کے ساتھ ہوا یوں کہ صبح کے وقت گاؤں کی عورتیں کنویں پر پانی بھرنے گئیں تو شور مچ گیا۔ وہ اپنے گھڑے وغیرہ وہیں چھوڑ کر۔ ''بھوت بھوت'' کہتی ہوئی واپس آگئیں میں نے شور سنا تو جلدی جلدی وہاں پہنچا۔ وہ ایک دل ہولا دینے والا منظر تھا۔

ایک لاش ...... جس کی کھوپڑی آدمی غائب ،جس کے بازوؤں اور ٹانگوں کا گوشت غائب۔ ''اوہ خدایا'' سورج تو نئے دن کی نوید لے کر طلوع ہوتا ہے مگر آج ...... وہاں گاؤں کے اور بھی افراد اکٹھے ہوگئے تھے۔ کرمو بولا۔ ''اسد صاحب۔ یہ بھی اسی جن کا کام ہے۔''

میں سوچ رہا تھا۔ ''ایسا کرنے والا کتنا ظالم ہوگا۔'' جن بھوت والی کہانی کو میں مان نہیں رہا تھا ۔''مگر کوئی انسان یہ کام کرسکتا ہے؟ اگر کرسکتا ہے تو وہ کتنا درندہ صفت ہے۔''

اچانک ایک آدمی بولا۔ ''ارے یہ تو گاما ہے۔ گاما کمہار'' یہ سن کر وہاں کھڑے لوگوں نے غور کیا۔ اور پھر وہاں جیسے بھگدڑ مچ گئی ۔ ایک جوان سی لڑکی دوڑتی ہوئی آئی۔ ''میرے بابا، میرے بابا۔'' یہ کہتی ہوئی وہ لاش پر گرگئی۔ وہ روئے جارہی تھی۔ ''بابا آپ کہاں چلے گئے بابا۔ اپنی رانو کو چھوڑ کر اب میں ، میں اس دنیا میں اکیلی رہ گئی۔ آپ نے یہ بھی نہ سوچا رانو کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ اومیرے خدا......'' وہ روئے جارہی تھی اور میرا دل پھٹا جارہا تھا۔

کرمو کہنے لگا۔ ''اسد صاحب! یہ اس کی بیٹی ہے۔ گامے کی۔ چھوٹی سی تھی جب ماں مرگئی۔ باپ نے ماں بن کر پالا لیکن آج یہ تنہا رہ گئی۔'' اور یہ بول کر کرمو آنسو چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔

میری کیفیت بھی عجیب سی ہورہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ ''یہاں کیوں آیا تھا؟ بہتر ہوتا اگر میں یہاں نہ آتا۔ یہ تلخ اور ہولناک واقعات کو تو نہ دیکھتا۔'' یہ سوچتے ہی میرا ذہن اس آدمی کی طرف چلا گیا جس دن میں جان پور آیا تھا۔

راستے میں مجھے ایک آدمی ملا تھا۔ کافی سرخ وسپید اور ہٹا کٹا تھا وہ۔ میں نے اس سے پوچھا، آپ کا نام کیا ہے اور کہاں جارہے ہیں۔''

وہ اپنے بارے میں بتانے لگا کہ۔ ''اس کا نام بشیر ہے اور وہ جان پور میں ایک تاجر کے پاس جارہا ہے وہ تاجر لاہور کا رہنے والا ہے۔ مگر شہر کی رنگینیوں سے اکتا کر گاؤں کے قدرتی مناظر کی سیر کو آیا ہوا ہے۔ اس کا نام اکبر خان ہے۔''

''اسد صاحب پولیس آگئی ہے۔'' کرمو کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے دیکھا تو حیات خان صاحب سپاہیوں کے ہمراہ آگئے تھے۔ وہ آتے ہی مزاقاً بولے۔ ''کیا حال ہے رپورٹر صاحب! کیا شہروں میں خبریں ختم ہوگئی ہیں کہ گاؤں میں تلاش کرنے آگئے ہیں۔''

''نو سر......!'' میں نے ہنس کر بولا۔ ''پتہ نہیں کیوں یہ واقعات وقوع پذیر ہورہے ہیں۔''

پھر وہ لاش کا معائنہ کرنے لگے۔ ان کے چہرے پر فکر و تردد کے اثرات تھے۔

میں نے دیکھا۔ رانو خاموشی سے بیٹھی ہوئی تھی ۔اس کی نظریں باپ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اچانک میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ ایک انوکھا احساس اور میں نے سر جھٹک کر ایس ایچ او کی طرف دیکھا۔ وہ لاش کے قریب ہی کھڑے تھے۔ مگر ان کے ساتھ اب ایک اور شخصیت بھی کھڑی تھی بھاری بھرکم، عمر تقریباً 45یا50 سال ۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے بھی نظریں اٹھائیں اور میری طرف دیکھا۔ پھر وہ میری طرف آنے لگا۔ ''السلام علیکم! میرا نام اکبر خان ہے اور میں لاہور کا بزنس مین ہوں۔''

میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور سوچنے لگا اکبر خان کا نام میں نے پہلے بھی سنا تھا کہیں...... پھر مجھے یاد آگیا، اکبر خان تجارت کے سلسلے میں افریقہ کی طرف

جارہا تھا کہ اس کا جہاز سمندری طوفان کی زد میں آکر ڈوب گیا۔ اکبرخان کے بارے میں کچھ پتہ نہ چلا کہ وہ زندہ ہے کہ مردہ۔

پھر تقریباً نوسال بعد اور ایک سال پہلے وہ دوبارہ منظر عام پر آیا۔ ایک عجیب کہانی کے ساتھ کہ اسے بحری جہاز نے کشتی کے ذریعے کنارے پر آنے میں مدد ملی اور جہاز ڈوب گیا۔ اس طویل عرصے میں وہ ایک افریقی قبیلے میں رہا اور ان کے طور طریقے دیکھتا رہا وغیرہ وغیرہ ۔''اب آپ مجھے پہچان گئے ہیں نا۔'' اکبرخان نے اپنی ایکسرے نما نظریں گھماتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بالکل! آپ تو ایک افریقی قبیلے کو شکست دے کر آئے ہیں۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ بھی مسکرانے لگا۔

☆......☆......☆

میں اس وقت تھانے میں موجود تھا۔ ایس ایچ او حیات خان الجھن کے عالم میں کہہ رہے تھے۔''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں دو لاشیں دریافت ہو چکی ہیں۔ مگر قاتل کا کوئی پتہ نہیں۔ حکام بالا سے الگ دباؤ پڑ رہا ہے کہ قاتل کو بے نقاب کیا جائے۔''

گامے کی لاش پوسٹ کے لئے روانہ ہو چکی تھی ۔مگر قاتل کا کوئی پتہ نہیں چلا تھا اس لئے وہ پریشان تھے۔ ایسا کام کسی جن کا ہی ہو سکتا ہے مگر جنوں پر آج یقین کون کرتا ہے۔ یہ تو کسی درندہ نما انسان کا کام ہے۔'' ایس ایچ او نے کہا۔

پھر میں بولا۔''سر! یہ کسی اذیت پسند آدمی کا کام ہو سکتا ہے۔''

وہ بولے۔''آپ ہی دیکھئے ناں اسد صاحب! کتنا اذیت ناک اور سفاکانہ انداز قتل کرنے کا۔ یہ میں نے اپنی سروس بلکہ اپنی ساری زندگی میں اس سے پہلے نہیں دیکھا۔

پھر ہم اس کیس پر گفتگو کرنے لگے۔ چونکہ میں ایک کرائم رپورٹر تھا۔ اس لئے حیات صاحب میری بڑی عزت کرتے تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا۔'' سر! یہاں بشیر نامی ایک بندہ آیا تھا اکبرخان کے پاس۔'' میں نے اسی خیال کے تحت پوچھا۔'' کیونکہ پہلے والے آدمی کے بارے میں کوئی پتہ نہیں چلا تھا کہ کہاں کا ہے۔ وہ اور یہاں کیوں آیا ہے۔ ایک دن پہلے وہ لاش دیکھ کر مجھے شک سا ہوا تھا کہ اس آدمی کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ ایس ایچ او سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں نے کہا۔'' کہیں وہ پہلی لاش اسی آدمی کی تو نہیں تھی۔''

ایس ایچ او نے چونک کر مجھے دیکھا۔''اس کا مطلب ہے کہ آپ اسے جانتے ہیں کیوں ناں اکبرخان کو بلا......'' ان کا فقرہ منہ میں ہی رہ گیا۔

ایک سپاہی نے آکر اطلاع دی کہ اکبرخان آیا ہے اور ایس ایچ او سے ملنا چاہتا ہے ایس ایچ او نے اندر آنے کو کہا۔ اکبرخان اندر آیا اور ہاتھ ملا کر بیٹھ گیا۔ پھر بولا۔''انسپکٹر صاحب! میرا ایک نوکر غائب ہے۔''

ایس ایچ او نے پوچھا۔''کون ہے اور اس کا کیا نام ہے۔؟''

''اس کا نام بشیر ہے۔ اور میرا پرانا نوکر ہے۔ یہاں میرے پاس آیا تھا مدد کے لئے۔''

ایس ایچ او نے میری طرف دیکھا۔ پھر بولے۔'' کہیں وہی بشیر تو نہیں ہے جو آپ کو ملا تھا۔''

میں نے کہا۔''وہی ہوگا سر! کیوں کہ اس نے اکبرخان کی طرف جانے کا ذکر کیا تھا۔'' پھر ایس ایچ او نے میری بات سے متفق ہو کر اکبرخان کو یہ بتا دیا کہ ''پہلے دریافت ہونے والی لاش بشیر ہی کی تھی۔''

یہ سن کر اکبرخان گلوگیر آواز میں بولا۔'' وہ اپنی بیٹی کی شادی کرنے والا تھا۔ اسے پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس لئے میرے پاس آیا تھا مگر اسے کیا پتا تھا کہ واپس نہیں جا سکے گا۔''

میں افسردہ سا سانس خارج کر کے رہ گیا۔

☆......☆......☆

میں گھر پہنچا ہی تھا کہ شاہد نے سوال داغ دیا ۔''ہاں جی رپورٹر صاحب کیا کہہ رہا تھا ایس ایچ او۔''

وہ کیا کہے گا۔ خود پریشان ہے۔ ایسے انوکھے کیس کی وجہ سے، ہاں پہلی لاش کے بارے میں پتہ چل گیا ہے۔'' پھر میں نے اسے بشیر کے بارے میں بتایا۔

اتنے میں میری اماں جان آگئیں۔ ''بیٹا! یہ کیا ہو رہا ہے۔ قتل پر قتل، چلو واپس چلتے ہیں۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔ پھر یہ دن بھی گزر گیا۔ رپورٹر کی حیثیت سے مجھے کیس کی مکمل رپورٹ لے جانی تھی کہ اپنے اخبار میں شائع کرا سکوں۔

رات آ گئی۔ گاؤں میں ایک طرف سے رونے کی آواز آنے لگی۔ بڑی دردناک آواز تھی۔ یہ رانو تھی۔ اپنے باپ سے جدائی کا غم تھا اسے۔ ویسے وہ کتنا درندہ صفت تھا مارنے والا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ اس کے مرنے سے کتنی آنکھوں میں آنسو آئیں گے۔ رانو کی آواز سن کر میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ ''کیا یہ وہ لافانی جذبہ ہے؟ جسے ''محبت'' کہتے ہیں۔''

''لاحول ولاقوۃ۔'' میں نے سر جھٹکا! میں یہاں محبت کرنے نہیں آیا تھا۔

صبح ہو گئی۔ سورج طلوع ہوا دو خبریں لے کر ایک خوشی کی اور ایک غمی کی۔ گاؤں کے ایک اور آدمی فضلو کی لاش دریافت ہوئی۔ بڑے بھیانک انداز میں اور خوشی کی یہ کہ فضلو کو لاش بنانے والا بھی دریافت ہو گیا تھا۔

میں فٹافٹ تیار ہو کر تھانے پہنچا ایس ایچ او اپنے کمرے میں تھے وہ تھکے ہوئے نظر آ رہے تھے جیسے ساری رات جاگتے رہے ہوں۔ میں نے تجسس سے پوچھا۔ ''سر وہ درندہ کون ہے۔؟''

وہ مسکرائے اور بولے۔ ''اسد صاحب جلد آپ کو پتہ چل جائے گا۔'' پھر وہ مجھے لے کر حوالات کی طرف آ گئے۔ قاتل کو دیکھ کر میرے دماغ کا فیوز بھک سے اڑ گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ ایس ایچ او کہہ رہے تھے۔ ''وہی اسد صاحب تقریباً 9 سال افریقیوں میں رہنے کی وجہ سے یہ بھی آدم خور ہو گیا۔ وہاں سے کسی طرح بھاگ کر واپس تو آ گیا مگر آدم خوری کی لت نہ گئی۔ اسی لئے لاہور کو چھوڑ کر دور گاؤں میں ڈیرہ لگا لیا اس نے سوچا کہ گاؤں میں مزے سے آدم خوری کرے گا۔ مگر خدا ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔'' ایس ایچ او نے کہا۔

میں حیرت کے سمندر میں غوطے لگا رہا تھا۔

قارئین یقیناً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ قاتل کون تھا؟ نہیں سمجھے تو بتا دیتا ہوں کہ وہ کوئی جن نہیں تھا، بھوت نہیں تھا بلکہ لاہور کا معروف بزنس مین خونی درندہ اکبر خان تھا۔

☆......☆......☆

''رانیہ عرف رانو نے پوچھا اکبر خان کو قبیلے والوں نے کیوں نہیں کھایا؟'' میں نے جواب دیا۔ ''اس میں بھی یہ سبق ہے کہ اللہ چاہے تو کسی کو مگرمچھ کے منہ سے بھی زندہ سلامت نکال سکتا ہے۔ مگر ناشکرا انسان اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی بھول جاتا ہے۔ اکبر خان بچ کر تو آ گیا مگر دوسروں کو مارنے لگا یہ جانتے ہوئے بھی کہ جس اللہ نے اسے بچایا ہے، وہ دوسروں کو بھی بچا سکتا ہے۔'' رانو معصومیت سے مجھے دیکھ رہی تھی پھر اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں جیسے لاکھوں تارے جھلملانے لگے ہوں۔ میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ ''اب مت رونا! جب تم روتی ہو تو میرا دل کٹنے لگتا ہے۔ دیکھو مجرم اپنے انجام کو پہنچ گیا ہے چپ ہو جاؤ۔'' میں اسے دلاسہ دینے لگا۔

میں اب اس کا مجازی خدا ہوں۔ جی ہاں! وہ لافانی جذبہ ''محبت'' مجھے شکار کر گیا تھا اس لئے میری خواہش کے مطابق رانو سے میری شادی ہو گئی۔

ایک سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔ ہم محبت بھری زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر اس خونی درندہ صفت کو نہیں بھول پائے۔ جس کا نام اکبر خان تھا۔

تڑپتی روح

نعیم بخاری آکاش۔اوکاڑہ

نوجوان کو اچانک کرخت کھرکھراتی اور دل کو دہلاتی آواز سنائی دی تو نوجوان اس آواز کو سنتے ہی حواس باختہ ہوگیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک لولہان پرہیبت منظر رونما ہوا جس نے......

خودغرضی اور مطلب پرستی کی کہانی جوکہ پڑھنے والوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دے گی

''اب تو غریب آدمی کے لئے آلو گوبھی پکانا دوبھر ہوگیا ہے۔'' آپا رشیدہ نے آلو پر چھری چلاتے ہوئے شکوہ کیا۔''اور اوپر سے بجلی گیس کے بل پتا نہیں یہ غریب مکاؤ اسکیم کب ختم ہوگی۔''

''آپا سارا قصور حکومت کا بھی نہیں ہے ایک تو ہمارے ملک میں سیلاب آیا ہے پھر عالمی سطح پر پیٹرول کی قیمت بھی تو بڑھ گئی ہے۔ پھر ہماری حکومت اتنی بھی بری نہیں ہے۔'' بلقیس نے آپا رشیدہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اصل میں بلقیس ایک سرکاری اسکول میں ٹیچر تھی اور کسی حد تک حکومت کی لارچاریوں کو سمجھتی تھی۔

''ارے خاک اچھی ہے۔'' آپا رشیدہ نے برا سامنہ بناتے ہوئے کہا۔'' ہمارے زمانے میں 15 روپے میں ایک مہینہ نکل جایا کرتا تھا اور اب

دیکھو شفیق کے ابا کی پنشن 3 ہزار اور شفیق کی 7 ہزار تنخواہ ملا کر بھی گزارا نہیں ہوتا۔"

بلقیس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔"کفایت شعاری بھی کسی چیز کا نام ہے آپا...... پھر ہر سال ہماری تنخواہ میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور یہ اضافہ مہنگائی کی اوسط نکال کر کیا جاتا ہے۔"

"اچھا اچھا ٹھیک ہے...... اب ہانڈی چڑھا دو ورنہ شفیق آتے ہی چلائے گا۔" آپا نے کٹی ہوئی سبزی کی ٹوکری بلقیس کو تھماتے ہوئے کہا تو بلقیس فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

بلقیس آپا رشید کی پڑوسن تھی اس کی شادی کو چار سال ہونے کو آئے تھے لیکن یہ ابھی تک اولاد جیسی نعمت سے محروم تھی اکثر اسکول سے واپسی پر آپا رشیدہ کے گھر آ جایا کرتی تھی کیونکہ اس کے میاں کی کریانے کی دکان تھی اور رات کو ہی لوٹتا تھا۔

بلقیس نے ہانڈی چولہے پر رکھتے ہوئے آپا کو مخاطب کیا۔"آپا جی اب شفیق کی شادی کر دیں اور پھر بے فکر ہو جائیں۔ بہو آپ کی خدمت بھی کرے گی اور آپ پوتے پوتیوں سے کھیلا بھی کریں گی۔ زندگی کا تو پتہ نہیں ہوتا آپا کب ساتھ چھوڑ جائے۔"

"ہاں بلقیس بس کوئی اچھی لڑکی مل جائے تو میں شفیق کی شادی کر دوں۔" آپا نے بھی تائید کی۔

"اچھی لڑکی کیوں نہ ملے گی آخر بیٹا سرکاری ملازم ہے۔ چاہے نوکری چوکیدار کی ہے لیکن ہے تو پکی ناں۔" بلقیس نے ہنستے ہوئے کہا۔

شفیق کے والد صاحب پہلے سرکاری ملازم تھے ایک اسکول میں چوکیدار تھے ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد شفیق کو والد کی وجہ سے نوکری آسانی سے مل گئی۔ جبکہ آج کل نوکری ملنا ناممکن سی بات ہے اور شفیق کے والد اب گھر پر ہی ہوتے تھے۔ شفیق کا کچھ ہی عرصہ پہلے تبادلہ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اسی شہر میں تھا۔

"ذرا بات سنیے گا۔" شفیق نے کوریڈور سے گزرنے والی ایک دراز قامت لڑکی کو مخاطب کیا۔ وہ لڑکی رک گئی اور سوالیہ نظروں سے شفیق کو دیکھنے لگی۔ وہ بایو کلر کی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھی ان کپڑوں میں وہ بہت خوب صورت اور نکھری نکھری لگ رہی تھی۔"ہفتے کو آپ نے لائبریری کھولنے کا کہا تھا آپ کو کچھ کتابیں لینی تھیں۔" شفیق نے یاد کرانے کی کوشش کی۔"میں نے کہا تھا کہ لائبریری بند ہو گئی ہے۔"

لڑکی ہولے سے مسکرائی تو اس کے گال پر ڈمپل پڑ گئے۔ اس نے بالوں کی ایک لٹ کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔"جی کتابیں تو لینی ہیں، لیکن لائبریری کا ٹائم ختم ہو گیا ہے۔ پھر چھٹی بھی ہو گئی ہے اور لائبریرین کے بغیر کتابوں کا اندراج کون کرے گا۔؟"

"اس بات کی آپ فکر نہ کریں۔" شفیق نے جلدی سے وضاحت کی۔"آپ کتابیں لے لیں اور ایک چٹ بنا کر دے دیں میں لائبریرین سے خود ہی کل لکھوا دوں گا۔"

لڑکی نے کچھ دیر توقف کیا پھر بولی۔"شکریہ...... آپ میرے لئے اتنی تکلیف کر رہے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں...... آپ کی پڑھائی کا حرج نہ ہو اس لئے کہہ رہا ہوں۔" شفیق نے کہا۔

لڑکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔"ٹھیک ہے۔ بس 15 منٹ میں کتابیں نکال لوں گی۔" لڑکی نے کہتے ہوئے لائبریری میں گھس گئی۔

شفیق نے دائیں بائیں دیکھا اور دروازہ بند کر دیا اور چند ہی سیکنڈ بعد تین اوباش قسم کے لڑکے شفیق کے پاس آئے۔ ان میں سے ایک لڑکے نے سگریٹ سلگائی ہوئی تھی جو کہ کافی مہنگی برانڈ تھی۔ پھر سگریٹ والے لڑکے نے سرگوشی کی۔"وہ اندر ہے؟"

شفیق نے صرف گردن ہلانے پر اکتفا کیا گھبراہٹ کی وجہ سے اس کی پیشانی پر پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔

"گڈ......" لڑکے نے فاتحانہ مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا اور سگریٹ کی ڈبیہ نکال کر شفیق کو تھما دی۔ اور پھر اپنا پھولا ہوا پرس کھولا اور 10 ہزار

نکال کر شفیق کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ پھر اس نے سگریٹ کا گہرا کش لیا اور دھواں نکالتے ہوئے بولا۔ ''فکر مت کرنا پہلے والا چوکیدار بھی مالا مال ہوگیا تھا اور کسی بھی پریشانی کی صورت میں تم پر الزام نہیں آئے گا۔'' اس کے بعد وہ تینوں لڑکے لائبریری میں گھس گئے۔ شفیق نے فکر مندی سے دائیں بائیں نظر دوڑائی۔ حالانکہ چھٹی ہو چکی تھی لیکن پھر بھی دو، تین اسٹوڈنٹ کہیں نہ کہیں سے نمودار ہو ہی جاتے تھے۔

الماری کے قریب پہنچ کر ماجد نے لڑکی کو دیکھا وہ کتابیں دیکھنے میں مگن تھی۔

ماجد نے کہا ''کچھ ہیلپ کروں آپ کی۔''

لڑکی نے چونک کر دائیں جانب دیکھا اور دنگ رہ گئی۔ اس کے سامنے ماجد کھڑا تھا۔

یہ لڑکا شروع دن سے ہی تہمینہ کا پیچھا کر رہا تھا تہمینہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ وہ فلرٹی تھا اور اپنے باپ کی دولت کی وجہ سے بدمعاشی کرتا تھا۔ تہمینہ اکثر اس سے کتراتی تھی لیکن آج یہ اس کے سامنے کھڑا تھا تہمینہ گھبرا گئی۔ اس نے کتاب واپس الماری میں رکھی اور تیزی سے باہر کی جانب لپکی لیکن ماجد نے دوڑ کر تہمینہ کی نازک کلائی دبوچ لی۔ تہمینہ چلائی۔

''چھوڑو مجھے ورنہ میں شور مچادوں گی۔''

''چپ کرو شور مچانے سے بدنام میں نہیں تم ہوگی، کالج سے نکال دی جاؤ گی پھر پولیس آئے گی اور ریپ کی رپورٹ درج ہوگی کس کس کو منہ دکھاؤ گی کیا بتاؤ گی کہ ریپ نہیں ہوا تھا کون یقین کرے گا تمہارا۔'' ماجد نے خباثت سے کہا۔

''پلیز چھوڑ دو مجھے ...... ماجد۔'' تہمینہ کی آواز رندھ گئی تھی۔ ''تمہیں خدا کا واسطہ میری زندگی برباد مت کرو۔''

''تمہاری کوئی بھی التجا میرے اس اقدام کو نہیں روک سکتی۔ کمال اس کے ہاتھ باندھ دو۔'' کمال نے آگے بڑھ کر تہمینہ کے ہاتھ سختی سے پکڑ لئے جبکہ دل نواز نے ایک رسی سے تہمینہ کے ہاتھ باندھ دیئے۔

تہمینہ نے اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کی لیکن وہ نازک اندام تھی اور تین مردوں کو شکست دینا اس کے بس کی بات نہیں تھی ماجد نے آگے بڑھ کر تہمینہ کے منہ پر پٹی باندھ دی اس کے بعد شیطانی کھیل شروع ہوگیا تہمینہ کی عزت تار تار کی جانے لگی جس کا مستقبل روشن تھا وہ تاریک کر دیا گیا جو عزت کی مثال تھی وہ بے آبرو ہوگئی...... وہ بے بس تھی۔

☆......☆......☆

لڑکی آپا رشیدہ کو بہت پسند آئی تھی۔ سگھڑ تھی، پڑھی لکھی تھی بلکہ ابھی بھی تعلیم حاصل کر رہی تھی اور بلا کی خوب صورت تھی آپا رشیدہ لڑکی کے گھر بیٹھی چائے اور بسکٹ سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ لڑکی والوں نے اچھی خاطر تواضع کی تھی جبکہ آپا رشیدہ آنکھوں کے اشارے سے بلقیس کو اپنی رضا مندی ظاہر کر چکی تھیں کیونکہ گھر بلقیس نے ڈھونڈا تھا اور ان لوگوں کو اچھی طرح جانتی تھی۔ آپا رشیدہ کا اشارہ پاتے ہی بلقیس وہاں سے اٹھ گئی کمرے میں داخل ہوتے ہی بلقیس نے دیکھا کہ لڑکی ایک صوفے پر سہمی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے جبکہ اس کے برابر میں بیٹھی اس کی ماں اسے کچھ سمجھا رہی تھی۔

بلقیس کے اندر داخل ہوتے ہی وہ خاموش ہوگئی۔ بلقیس نے کہا۔ ''میں پھر آجاتی ہوں آپ بات کرلیں۔''

''کوئی بات نہیں بہن آجاؤ۔'' لڑکی کی والدہ نے خوش اخلاقی سے کہا۔

بلقیس اس کے برابر میں ہی بیٹھ گئی۔ اور لڑکی سے مخاطب ہوئی۔ ''فکر مت کرو لڑکا بہت ہی اچھا ہے تمہیں خوش رکھے گا۔ میں جانتی ہوں کہ ماں باپ کا گھر چھوڑنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔'' بلقیس رکی اور اپنے پرس سے شفیق کی تصویر نکال کر دکھانے لگی۔

لڑکی نے حیرانگی سے تصویر کو دیکھا پھر اس نے اپنی والدہ کی طرف دیکھا اور بولی...... ''امی جان مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے۔''

☆......☆......☆

''آپا رشیدہ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی پر خوب ارمان پورے کئے۔ بہترین قسم کا کھانا تھا لائٹنگ بھی ایسی کی گئی جیسے پورے محلے کی شادی ہو، پوری برادری میں آپا رشیدہ کے نام کا ڈنکا بج اٹھا تھا۔ آپا رشیدہ نے دلہن کے لئے مہنگے سے مہنگا کپڑا اور دوسرا سامان خریدا تھا۔ شفیق کے لئے بھی بہترین قسم کا تھری پیس سوٹ تھا۔ جس میں شفیق خوب جچ رہا تھا۔

تمام رسمیں ادا ہونے کے بعد وہ حجلہ عروسی میں جانے کے لئے بے تاب تھا۔ کیوں کہ یہ ارینج میرج تھی اور آپا رشیدہ ذرا پرانے خیالات کی تھیں۔ اسی لئے تو اب تک شفیق اپنی دلہن کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس نے بلقیس کو کہہ کر دلہن کی تصویر بھی منگوانے کی کوشش کی تھی لیکن بلقیس کو خود لڑکی نے منع کر دیا تھا۔

بہرحال شفیق کو اس بات کا علم تھا کہ وہ لڑکی بہت ہی خوب صورت ہے۔

آخر کار وہ وقت ہی آ گیا جب شفیق کمرے میں داخل ہوا۔ دلہن بیڈ پر سرخ رنگ کا لہنگا زیب تن کئے بیٹھی تھی۔ اس نے لمبا سا گھونگھٹ نکالا ہوا تھا۔

شفیق نے اپنی دلہن کے لئے مناسب الفاظ سوچے پھر کوٹ کی جیب سے سونے کی چین نکالی اور بیڈ پر بیٹھ کر دلہن کا گھونگھٹ اٹھایا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے وہ جھٹکے سے اٹھ گیا۔ وہ ہکا بکا سا دلہن کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

یہ تہمینہ تھی، وہی بے قصور لڑکی جس کی زندگی شفیق نے دس ہزار لے کر برباد کرا دی تھی۔

''تم......؟'' شفیق صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

لڑکی کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ ''کیوں اس میں حیرانگی کی کیا بات ہے، مجھے تمہاری ماں نے پسند کیا ہے...... اور کسی خوبی کی وجہ سے تمہارے لئے پسند کی گئی ہوں۔''

شفیق کو شاک لگا تھا اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن تہمینہ اس کی بیوی کے روپ میں اس کے سامنے ہو گی۔ وہ بمشکل بولا۔ ''یہ ممکن نہیں کہ تم میری بیوی کی حیثیت سے میرے ساتھ زندگی بسر کرو۔''

''اور اس کی وجہ کیا بتائیں گے آپ...... کہ آپ نے خود میری زندگی جہنم میں دھکیلی ہے۔'' تہمینہ نے جواب طلب نظروں سے شفیق کی طرف دیکھا۔

شفیق اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ ''یہ غلط ہے...... تمہیں پتہ تھا کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے پھر بھی تم نے میرے ساتھ شادی کی۔'' شفیق نے بے بسی سے کہا۔

''تو کیا آپ کو نہیں پتہ تھا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ پھر بھی آپ نے مجھے دھوکے سے لائبریری میں بھیجا...... آپ اس جرم میں سب سے بڑے گناہ گار ہیں۔'' تہمینہ نے سخت لہجے میں کہا۔

''میں تمہیں ابھی طلاق دے دوں گا۔'' شفیق نے اپنا فیصلہ سنایا۔

تہمینہ نے اطمینان سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''شاید آپ نکاح نامہ کی شرائط بھول گئے ہیں طلاق کی صورت میں پانچ لاکھ روپے اور ماہانہ 10 ہزار روپے دینے ہوں گے کیا یہ سب کچھ ہے آپ کے پاس......؟ شفیق شاید آپ اس وقت مجھ سے بھی زیادہ بے بس ہیں کیوں کہ آپ کو ساری عمر اب اس لڑکی کے ساتھ گزارنی پڑے گی جس کا جسم آپ نے خود بیچا تھا۔''

شفیق نے غصے سے چین دیوار پر دے ماری اور کمرے سے باہر نکل گیا اور تہمینہ نے غصے سے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور ایک سکون بھرا گہرا سانس لیا اور بیڈ کے ساتھ ٹیک لگالی وہ اپنے آپ کو بہت ہی ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ لیکن ابھی تک اسے آخری کام کرنا تھا۔

☆......☆......☆

صبح کا دن نکلتے ہی آپا رشیدہ کے گھر قیامت کی طرح شروع ہوا جو گھر کل خوشیوں کے قہقہوں سے گونج رہا تھا وہ آج سراپا ماتم بنا ہوا تھا۔ تہمینہ نے خودکشی کر لی

تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی رگیں کاٹ لی تھیں جبکہ وہاں سے ایک کاغذ ملا تھا جس پر اس نے لکھا تھا۔ ''وہ اپنی مرضی سے خودکشی کررہی ہے۔'' اس مختصر سی عبارت کے نیچے تہمینہ کے سائن تھے۔ شفیق بھی عجیب کشمکش میں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ خوش ہو یا ماتم کرے۔ وہ اسی ادھیڑبن میں مبتلا تھا۔

ایک ہفتہ گزرگیا تہمینہ کو سپرد خاک کردیا گیا تھا۔ اس دن شفیق نے الماری سے اپنا سوٹ نکالا تو اسے احساس ہوا کہ سامنے والی جیب میں کوئی کاغذ ہے۔ شفیق نے کاغذ نکالا تو وہ تہمینہ کی ہینڈ رائٹنگ تھی اس پر لکھا تھا۔ ''شفیق میری زندگی بہت ہی خوش خرم گزررہی تھی اور میں زندگی سے بہت پیار کرنے والی لڑکی تھی۔ پڑھ لکھ کر اپنے ماں باپ کا خواب پورا کرنا چاہتی تھی لیکن تم نے میری زندگی برباد کردی میری معصوم خواہشوں کا گلا گھونٹ دیا۔ مجھے تو اسی دن مرجانا چاہئے تھا جس دن میرے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ میں ہر پل کس کرب واذیت سے گزرتی تھی تم اندازہ نہیں کرسکتے۔ لیکن یہ خدا کی قدرت تھی کہ میری شادی تمہارے ساتھ ہوگئی۔ صرف تم کو احساس دلانے کے لئے میں نے یہ کام کیا تاکہ تم دوبارہ یہ گناہ نہ کرو اور کسی کی بیٹی کی عزت خراب نہ ہو۔ اسی لئے میں نے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا مناسب سمجھا کیونکہ میں اپنے پیٹ میں پلنے والے بچے کو تمہارے سر نہیں تھوپنا چاہتی تھی۔

آج ایک نہیں بلکہ دو زندگیوں کا خاتمہ ہورہا ہے۔ میں تو جارہی ہوں مگر تمہاری زندگی کو میں ناقابل فراموش کرب واذیت سے دوچار کردوں گی تم موت مانگو گے مگر موت دور کھڑی قہقہہ لگاتی رہے گی۔ میری تڑپتی روح تمہیں چین نہ لینے دے گی۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے ہزاروں خواب دیکھے تھے، ہزاروں منصوبے بنائے تھے جو چکنا چور ہوگئے، تم اس کا اندازہ نہیں لگاسکتے کہ موت کو گلے لگانا کتنا مشکل کام ہے۔''

تہمینہ کی موت کے بارہویں رات میں شفیق اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا کہ رات کے کوئی ڈھائی بجے اچانک دلخراش چیخ مار کر اٹھ بیٹھا اور اپنے کمرے سے بدحواس ہوکر باہر نکلا اور چیخنے لگا۔

''تہمینہ مجھے ماردے گی وہ مجھے مارنے آئی ہے، وہ میرا گلا گھونٹ رہی ہے...... وہ مجھے ماردے گی۔ مجھے ماردے گی......''

گھر کے سارے افراد اس کے گرد جمع ہوگئے۔ ہر فرد عجیب انداز سے اسے دیکھ رہا تھا، سب کے ذہن میں تھا کہ تہمینہ کی جدائی یہ برداشت نہ کرسکا ہے اور اس کا ذہنی توازن خراب ہوگیا ہے۔

اسی وقت محلے کے ڈاکٹر کو بلایا گیا...... ڈاکٹر نے نیند کا انجکشن لگایا اور چند گولیاں دیں اور بولا۔ ''انہوں نے بیوی کی موت کا اپنے اوپر صدمہ لے لیا ہے...... خیر ایک، دو روز میں ٹھیک ہوجائیں گے۔'' اور ڈاکٹر چلا گیا۔ نیند کے انجکشن نے اپنا کام کردکھایا اور شفیق گہری نیند سوگیا۔

لیکن فجر کی اذان ہوتے ہی وہ پھر چیختا چلاتا کمرے سے باہر کو بھاگا۔ ''تہمینہ میرا گلا دبارہی ہے...... وہ مجھے ماردے گی...... وہ دیکھو سامنے کھڑی ہے...... دیکھو دیکھو سامنے ہے اور مسکرارہی ہے۔'' اور اسی قسم کی باتیں وہ کرتا رہا۔

ہر دن ہر رات صبح ہو یا شام وہ چیختا چلاتا...... مگر کسی کے پاس اس کا حل نہ تھا۔ گھر والوں کو دم دعا اور جھاڑ پھونک پر عقیدہ نہ تھا۔

گھر والوں نے کوئی ڈاکٹر نہ چھوڑا اور پھر تھک ہار کر اسے پاگل خانے میں داخل کرادیا، لیکن پاگل خانے میں بھی تہمینہ کا نام لے کر وہ چیختا چلاتا اور آہنی سلاخوں سے اپنا سر ٹکرا کر لہولہان ہوجاتا۔

اور پھر چند ماہ بعد صبح کے وقت لوگوں نے دیکھا کہ وہ اپنے کمرے کے فرش پر مردہ پڑا تھا۔

تحریر: اے وحید

قسط نمبر:115

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

اتش ہوشیار ہوجا۔ یہ سنتے ہی دینو بابا کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ دینو بابا کی غیر ہوتی حالت کو دیکھ کر رولوکا بولا۔ اتش گھبرائیں نہیں دراصل یہ زالوشا...... آپ کو ہراساں کرنا چاہتا ہے۔ اس کی کوشش ہوگی کہ آپ مجھ سے کوئی مدد نہ لیں، میں کسی صورت بھی زالوشا کو اب تک پھٹکنے نہیں دوں گا۔ اس کے بعد رولوکا اس جگہ سے اٹھ گیا۔ ادھر زالوشا نے فیصلہ کرلیا کہ اپنی مخفی قوت اور زیادہ مضبوط کرے گا اور اس کے لئے دوبارہ شابولا کی جاپ شروع کرکے اس کو اپنے قابو میں کرے گا۔ اس خیال کے آتے ہی اس نے کسی مخفی جگہ کی تلاش شروع کردی اور پھر انتھک کوشش کے بعد ہمالیہ کی ترائی میں ایک گپھا سے نظر آیا تو وہ اس گپھا میں بیٹھ گیا۔ اس جگہ ٹھوس برف موجود تھی۔ زالوشا نے ایک مضبوط چھری سے ایک حصار قائم کیا اور اس حصار میں بیٹھ کر شابولا کو قابو کرنے کے لئے جاپ شروع کردیا اور چونکہ رولوکا کے کارندے زالوشا کے پیچھے لگے پڑے تھے، انہوں نے ایک چال چلی اور گپھا کے اندر کی برف کو خفیہ طور پر پگھلانا شروع کردیا اور برف کو پگھلتے ہی زالوشار حصار ٹوٹ گیا۔ حصار کے ٹوٹتے ہی کسی اندیکھی طاقت نے زالوشا کو گپھا کے اندر سے باہر کو پھینک دیا اور پھر ایسا ہوتے ہی زالوشا خوفزدہ ہوکر کسی سمت کا تعین کیے بغیر ہوا میں تحلیل ہوکر بھاگ کھڑا ہوا، اور ایک جنگل میں جاکر بے سدھ ہوکر پڑ گیا۔ رولوکا جب اپنے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ تین شخص بیٹھے تھے خیر رولوکا اپنی جگہ بیٹھ گیا اور بولا اور فرمائیں کیسے آنا ہوا؟ ان میں سے ایک شخص بولا سرکار میرا نام رام داس ہے، میں ان دنوں بہت پریشان ہوں۔ رات میں میرے لہلہاتے کھیت تہس نہس ہورہے ہیں جبکہ رات میں کوئی بھی جنگلی جانور نہیں آتا۔ ایک رات میں نے دیکھا کہ بجوکا جسے میں نے کھیت کی حفاظت کے لئے لگا رکھا ہے وہ اپنی جگہ سے ہٹا اور اس کے ساتھ کئی اور نے مل کر کھیت کا ستیاناس کرنا شروع کردیا۔ یہ سن کر رولوکا نے اپنی اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ پھر چند لمحے بعد رولوکا نے اپنی آنکھیں کھولیں اور بولا۔ دراصل بجوکا میں ایک بھٹکی ہوئی آتما سرایت کرجاتی ہے اور یہ سارا کیا دھرا اس کا ہے اچھا ہوا کہ آپ آگئے نہیں تو چند دن بعد آپ کا جانی نقصان ہوجاتا۔ پھر رولوکا نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور چند منٹ ہی گزرے تھے کہ کمرے میں زور کی ہوا چلنے لگی اور پھر کمرے کے کونے میں سے دھواں اٹھتا نظر آیا، پھر سارا دھواں جمع ہوکر ایک ہیولہ کی شکل اختیار کرلی۔ پھر اس ہیولہ میں سے آواز آئی۔ ”حضور آپ کے بلانے پر میں حاضر ہوں۔ (اب آگے پڑھیں)

پھر ہیولہ بولا۔ ”حضور آپ نے جس مقصد کے لئے بلایا ہے تو میرا یہ کہنا ہے کہ اس میں میرا اپنا کوئی دوش نہیں...... حضور میں تو حکم کا غلام ہوں...... مجھے اپنے وش میں کرنے والا عامل جو حکم دیتا ہے وہ میں کرنے پر مجبور ہوں...... جب آپ اپنے علم سے مجھے حاضر کرسکتے ہیں تو...... آپ یہ بھی معلوم کرسکتے ہیں کہ مجھے اس کام پر لگانے والا کون ہے اور کس شکتی کا مالک ہے۔“ یہ بول کر ہیولہ خاموش ہوگیا۔

رولوکا بولا۔ ”تمام باتیں میں تو معلوم کرہی سکتا ہوں...... مگر تیری زبانی میں سننا چاہتا ہوں کہ تو کچھ تفصیل بتا تاکہ تیری باتیں سن کر رام داس جی کے سامنے حقیقت کھل جائے...... تو بلا جھجک ساری باتیں بتادے...... اور میں تیری حفاظت کا وعدہ کرتا ہوں کہ تو جس کے وش میں ہے وہ تیرا بال تک بیکا نہیں کرسکتا...... اور میں تجھے یہیں سے اس کی گرفت سے آزاد کردوں گا۔ تو بالکل نہ گھبرا اور نہ ڈر...... تیرا عامل لاکھ کوشش کے باوجود بھی تیرا پتہ بھی نہیں کرپائے گا۔“

چند لمحے ہیولہ خاموش رہا پھر گویا ہوا۔ ”حضور

مرتیو کے بعد میری آتما بیاکل ہو کر بھٹکتی رہی...... کسی اور بھی چین نہیں ملتا تھا......

حضور ویسے میں اعتراف کرتا ہوں کہ جب میں زندہ تھا تو میں بہت پاپی تھا...... رات کے اندھیرے میں، میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر اکثر پاپ کرتا تھا، اس پاپ میں میرے اور کئی ساتھی شریک ہوتے تھے۔ میں ذات کا چمار تھا۔

ہماری بہت بڑی بستی تھی...... جب میں جوان ہوا تو مجھے دارو کی لت پڑ گئی...... ماں باپ کام کاج کا کہتے تو مجھے بہت برا لگتا...... خیر جب میرے باپ نے مجھ پر زیادہ سختی کی تو میں مجبوراً اپنے باپ کے کاموں میں ہاتھ بٹانے لگا۔

اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے ہم دونوں باپ بیٹے گھر آ جاتے۔ اور پھر رات کا بھوجن کرنے کے بعد ہم تمام ساتھی اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر کسی نہ کسی طرف نکل پڑتے...... سب سے پہلے دارو سے شغل کرتے اور اس کے بعد من مستی کا پروگرام بناتے۔

حضور ان دنوں جہاں ہم جیسے چھوٹے لوگ رہتے تھے ان علاقوں میں پکے مکانات اور نہ ہی بڑی اونچی دیواروں کے مکانات ہوتے تھے۔

ہم نے کافی پیسے دے کر ایک وید سے بے ہوشی کی دوا حاصل کر لی تھی...... اور پھر جب دوا ختم ہو جاتی تو اور رقم دے کر دوا لے لیتے تھے۔ گھروں میں چھوٹی چھوٹی دیواریں ہوتی تھیں اور پھر دروازے پر کوئی کواڑ نہیں ہوتا تھا بلکہ دروازے پر کوئی ٹاٹ کا پردہ لگا دیا جاتا تھا۔

ہم دبے پاؤں کسی نہ کسی گھر میں داخل ہو جاتے اور اس گھر سے جواں سال لڑکی یا پھر جوان عورت کو بے ہوشی کی دوا سونگھا کر اٹھا لے جاتے اور پھر گھر سے تھوڑی دور سنسان جگہ پر موج مستی کرتے۔ یہ سلسلہ کافی عرصہ تک چلتا رہا۔

ایک دن میری نظر مندر میں موجود کالی ماتا کی سیوک راگنی آ گئی۔ اس کا کسا کسا بدن، ابلتی ہوئی جوانی، دل کو گدگداتی چال، مدہوش کرتا رنگ و روپ اور نیند سے بے دار کرتا خیال اور مستی بھری آنکھیں بیاکل کر گئیں۔ اسے دیکھ کر جیسے میں اپنا حواس کھو بیٹھا، میری سانس اتھل پتھل ہونے لگی، میرے کان کی دونوں لوئیں گرم ہو گئیں، دل اپنی رفتار سے کئی گناہ تیز دھڑکنے لگا۔ آنکھوں میں جلن ہونے لگی اور میرے پورے وجود پر جیسے خمار سا چھا گیا۔

اور پھر میں نے پل بھر میں فیصلہ کر لیا کہ آج کا ہمارا شکار راگنی ہوگی۔ اور میں نے اپنے ساتھیوں کو راضی کر لیا۔

ہم نے پروگرام بنایا کہ شام کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ایک بندہ مندر کے چار دیواری کے اندر جا کر چھپ جائے اور پھر وقت مقررہ پر چار دیواری کا مین دروازہ اندر سے کھول دے گا، اس کے بعد ہم تینوں اندر داخل ہو کر بے ہوش کر کے راگنی کو اٹھا لائیں گے۔

اور پھر حسب پروگرام ایسا ہی ہوا، راگنی کو اس کے کمرے سے بے ہوشی کی دوا سونگھا کر اٹھا کر مندر کی چار دیواری سے باہر لے گئے، ہم چاروں بہت دلیر تھے، اور پھر ایک عرصہ سے یہ کھیل کھیل رہے تھے، کسی قسم کا ڈر و خوف ہم کو چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔

راگنی کو اٹھا کر ہم اسے مندر کے پچھواڑے باغیچہ میں لے گئے۔ اسے زمین پر لٹا کر اس کے کپڑے اتارنے کے لئے اس پر میں جھکا کہ اچانک کسی نے میرے منہ پر ایک زبردست گھونسہ مارا، وہ گھونسہ اس قدر زوردار تھا کہ میں جیسے اڑتا ہوا اس جگہ سے کافی دور جا گرا، اور پھر میرے ساتھیوں کی یکے بعد دیگرے چیخ اور کراہیں سنائی دیں۔

اس کے بعد پھر ایک تیز دھار تلوار میری گردن سے ٹکرائی اور میری گردن آدھی سے زیادہ کٹ کر میرے شانے پر سے دور گر گئی اور میں دھڑام سے زمین پر گر گیا۔

اور پھر ہم چاروں کو ایک گہرے گڑھے میں ڈال کر مٹی ڈال دی گئی۔ ہمارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا۔ وہ سب کرنے والا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی

اندیکھی طاقت وہ سب کرگزری تھی۔ اور پھر سب کچھ شانت ہوگیا، ہمیں یہ نہ پتہ چلا کہ راگنی کا کیا بنا۔

چونکہ ہمیں چتا پر جلایا نہیں گیا تھا، ہماری کریا کرم نہیں کی گئی تھی، لہٰذا ہماری آتمائیں بے یار و مددگار بھٹکنے لگیں۔ چونکہ ہماری آتمائیں ابھی نئی نئی تھیں اور ہمیں اپنے ٹھکانے کا یا کہیں آنے جانے کا پتہ نہ تھا، لہٰذا ہم بہت بیاکل تھے کہ اب ہم کریں تو کیا کریں اور جائیں تو کہاں جائیں۔

دوسری رات ہمیں دو آتمائیں نظر آئیں، ہمیں خوفزدہ اور سہا ہوا دیکھ کر ہمارے پاس آئیں اور پھر ہماری کتھا سنی، اس کے بعد انہوں نے ہمیں آتماؤں کی دنیا کی حقیقت سے روشناس کرایا، اس کے بعد ہم لوگ آتماؤں کی دنیا کے ماحول سے مانوس ہوتے گئے۔ اب ہم لوگ کافی حد تک اپنے حالات سے مانوس ہوچکے تھے۔

ابھی تک ہم چاروں اکٹھے ہی تھے۔ ایک رات ہم چاروں مندر کی اور چلے گئے تو دیکھا کہ راگنی مٹکتی ہوئی آگے ہی آگے جارہی تھی۔

ہم نے سوچا کہ اب ہم اس سے اپنی بربادی تباہی اور ناقابل بیان حالات کا بدلہ لیں، اس نیت سے ہم اس کے قریب گئے اور چاہا کہ اسے دبوچ کر اس کی گردن توڑ دیں کہ اتنے میں اس کے جسم سے ایک لہراتی ہوئی روشنی نکلی اور ہمیں زبردست جھٹکا لگا۔ وہ ایسا جھٹکا تھا کہ جیسے زبردست کرنٹ کا جھٹکا۔

ہم نے کئی بار کوشش کی مگر ہم اپنی کوشش میں ناکام رہے اور پھر ہمیں جو آخری جھٹکا لگا اس سے ہم مندر سے کافی دور جا گرے، پھر ہم چاروں نے فیصلہ کیا کہ راگنی کو نقصان پہنچانا ہمارے بس سے باہر ہے اور ہم نے اس کا ارادہ ترک کرکے اس علاقے سے بہت دور نکل گئے اور ایک جگہ کو اپنا ٹھکانہ بنا کر رہنے لگے۔ اس طرح سال بلکہ دو سال گزر گئے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ مجھ میں کھنچاؤ ہونے لگا، ایسا لگتا تھا کہ کوئی اندیکھی طاقت مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور پھر اس کھنچاؤ میں دن بدن اضافہ ہونے لگا۔ میرے وجود میں جیسے چنگاری سی بھرنے لگی۔ ہوا مجھ کو ایک طرف کھینچے لگتی...... اور پھر ایک روز میں خود بخود کھنچتا ہوا ایک طرف کو بڑھنے لگا اور پھر ایک جنگل میں پہنچ گیا۔ دیکھا تو اس جگہ ایک جھونپڑی تھی، اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا، میں اندر داخل ہوگیا، تو نظر آیا کہ ایک سادھو اپنی آنکھیں بند کیے کچھ پڑھنے میں مصروف تھا۔

جو اندیکھی طاقت مجھے کھینچ کر وہاں لائی تھی وہ مجھے اس جگہ جکڑے موجود تھی۔ میں نے اندازہ کیا کہ وہ سادھو کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔ پھر اس کے پڑھنے میں روانی آگئی اور چند منٹ ہی گزرے ہوں گے میرے وجود میں جیسے آگ لگ گئی۔

اور میں چیخ پڑا۔ ”مہاراج مجھ پر دیا کریں...... مجھے بہت کشٹ ہورہا ہے...... مہاراج...... مہاراج......“

کرب و اذیت میں ڈوبی میری آواز سن کر جھٹ اس نے اپنی بند آنکھیں کھول دیں اور اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر بولا۔

”بڑا ضدی لگتا ہے، تونے آنے میں بہت دیر لگادی، تو آتا کیسے نہیں...... اگر ایک گھنٹہ تک اور نہیں آتا تو تیرا وجود اگنی میں جل کر بھسم ہوجاتا۔ آج سے تو میرا غلام ہے اور جو کچھ میں بولوں گا تو وہی کرے گا اور اگر تو نے انکار کیا تو میں تیرے وجود کو جلا کر بھسم کردوں گا، لہٰذا میری باتوں کو دھیان میں رکھنا نہیں تو پچھتائے گا۔“

یہ سن کر میں بولا۔ ”مہاراج آپ نے مجھے اپنے وش میں کرلیا...... اب تو میں آپ کا حکم ماننے پر مجبور ہوں۔ لیکن مہاراج میری یہ بنتی ہے کہ آپ مجھ سے انیائے والا کام مت لیجئے گا...... کیونکہ ویسے ہی میں بہت پاپی ہوں...... زندہ تھا تو میں نے بہت سارے پاپ کیے ہیں۔“

”اوئے تو میرا ہر کام کرنے کا پابند ہے...... جو میں چاہوں گا تجھے کرنا پڑے گا...... اور یہ کان کھول کر سن لے تو نے کسی بھی کام کے لئے انکار کیا تو اچھا نہیں ہوگا...... تو نے میری شکتی دیکھ لی ہے...... تیرا نام کیا

ہے؟ اور تو کس ذات سے تعلق رکھتا ہے...... چل بتا۔"

یہ سن کر میں بولا۔ "مہاراج میرا نام کرشن ہے اور میری ذات چمار ہے۔"

"ٹھیک ہے کرشن اب تو جا اور میرے حکم کا انتظار کر۔" یہ سن کر میں اس جنگل سے باہر نکل گیا......

اور پھر اس کے بعد میں اس کا پابند بن گیا......

وہ مجھ سے ہر کام لینے لگا...... اچھے تو کیا...... زیادہ تر برے کام مجھ سے لیتا رہا......

ایک دن اس نے مجھے بلایا اور بولا۔ "کرشن تجھے ایک کام سونپ رہا ہوں۔ اس کام کا اصل تو تو ہی ہوگا، مگر رات سے تو اپنے ساتھیوں کو بھی اس کام میں لگالینا، کام یہ ہے کہ فلاں جگہ چند کھیت ہیں...... ان کھیتوں کا مالک رام داس نامی شخص ہے...... رات میں تم لوگوں نے اس کے کھیت کا ستیاناس کرنا ہے مگر یہ کام ذرا آہستہ آہستہ کرنا ہے...... کیونکہ اگر یہ کام جتنا جلدی ہوگا تو رام داس کو زیادہ کشٹ نہیں ہوگا...... آہستہ آہستہ سے یہ ہوگا کہ رام داس جیسے ہر روز آگ پر لوٹے گا...... اسے کسی پل چین نہیں ملے گا۔

رام داس کا چچیرا بھائی تلسی ہے...... جو کہ رام داس کا دشمن بن گیا ہے...... اس کام کو تم نے بڑی ہوشیاری سے کرنا ہے...... اور ہاں یہ بھی یاد رہے کہ رام داس کو بھی ہلکان کرنا ہے اور اسے اس مقام پر لانا ہے کہ اس کا جینا محال ہو جائے...... اور پھر آخر میں رام داس کا خاتمہ ہے...... اب تو جا اور آج رات سے ہی اپنے کام پر لگنا ہے...... اور ہاں...... یاد رکھنا ہے کہ کھیت میں جو بجوکا لگا ہے اس میں تو نے رہنا ہے تاکہ ہر سے کی تو خبر رکھ سکے۔"

اور حضور میں اس دن سے اسی کام پر لگا ہوں...... اب میں بہت زیادہ نرم دل ہو گیا ہوں...... میں یہ سمجھ چکا ہوں کہ کسی کا انیائے کرنے والا سکھی نہیں رہ سکتا۔ مگر اب میں مجبور ہوں...... اس سادھو نے مجھے تو اپنا غلام بنالیا ہے...... آپ کی بڑی کرپا ہوگی کہ آپ مجھے اس سے آزادی دلادیں۔ اس سادھو کا نام گوپی ہے اور وہ گاؤں سے باہر جو جنگل ہے وہیں پر اپنی لُٹیا میں رہتا ہے۔" یہ بول کر کرشن کی آتما خاموش ہوگئی۔

یہ سن کر رام داس سے رولوکا بولا۔ "رام داس آپ نے ساری حقیقت سن لی کہ یہ کام آپ کا چچیرا بھائی کرا رہا ہے۔ اب آپ بولیں کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

رام داس بولے۔ "سرکار اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں...... اب میں تو تلسی جیسا نیچ نہیں بن سکتا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ اس رام لیلا سے ہماری جان چھوٹ جائے۔ ہماری فصل آئندہ خراب نہ ہو...... ہم اور ہمارا گھرانہ ہر طرح کے کشٹ سے بچ جائے۔

حضور میں تو تلسی جیسا اوچھا نہیں بن سکتا......

اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ آئندہ تلسی کے دماغ میں ہمارے متعلق کوئی غلط خیال نہ آئے۔"

رولوکا بولا۔ "ٹھیک ہے رام داس...... آپ فکر نہ کریں...... میں اس کا اپائے کردوں گا کہ تلسی کے دماغ میں آپ کے لئے کوئی غلط خیال نہ آئے۔"

پھر رولوکا کرشن کے ہیولہ سے مخاطب ہوا۔ "کرشن میں تمہارے گرد سے سادھو گوپی کا حصار ختم کرتا ہوں، تم بلاخوف وخطر یہاں سے سیدھے اس علاقے سے نکل جانا...... اور ہاں اپنے ساتھیوں کو بھی اپنے ساتھ لے جانا...... اور یہ کام رات ہونے سے پہلے پہلے کرلینا یعنی رات ہونے سے پہلے اس علاقے سے چلے جانا...... نہیں تو گوپی تمہیں اپنے وش میں کرنے کے لئے ہاتھ پیر چلائے گا۔ ابھی تم چند لمحے ٹھہرو......" اور یہ بول کر رولوکا منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا...... اور پھر اس نے اپنی انگلی سے اشارہ کیا تو انگلی سے ہلکا سفید سفید دھواں نکلا اور اوپر کو بڑھ کر کرشن کے ہیولہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

یہ دیکھ کر رولوکا بولا۔ "کرشن اب تو آزاد ہے میں نے تیرے گرد بہت مضبوط حصار قائم کردیا...... اب سادھو گوپی کوئی بھی ہتھکنڈہ استعمال نہیں کرسکتا...... تمہارے گرد قائم میرا یہ حصار تمہارے اس علاقے سے

جاتے ہی ختم ہو جائے گا...... اس کے بعد تم آزاد ہو گے...... پھر الگ سے بھی میں ایک حصار قائم کر دوں گا تا کہ سادھو کا کوئی بھی عمل تم تک نہ پہنچ سکے۔ چند دن تمہارے لئے سادھو کو بھی بہت زیادہ پریشان رہے گا اور تمہاری ذات کو اپنے وش میں کرنے کے لئے اپنی ساری طاقت استعمال کر بیٹھے گا...... اپنے چھوٹے بڑے سارے بیروں کو کونے کونے میں بھیجے گا...... لیکن تم نے یہاں سے جا کر کسی بھی ٹھکانے پر رک جانا اور پھر اس جگہ سے تین دن تک کہیں بھی نہیں جانا...... تین دن کے بعد سادھو تھک ہار کر خاموش ہو جائے گا۔ اور ویسے بھی میں اپنے چند کارندے سادھو کے ارد گرد لگا دوں گا تا کہ سادھو تمہارے اور میرے لئے زیادہ اچھل کود نہ کر سکے۔ اور اس صورت میں سادھو کے بیر زیادہ دور تک نہ جا سکیں گے۔

سادھو کی بڑی کوشش ہو گی کہ اس کے اس کام میں کس نے رکاوٹ ڈالی ہے...... کیونکہ جب کسی عامل کا عمل کام کرنے سے رک جاتا ہے اور اس کا عمل آگے کو نہیں بڑھتا تو عامل بہت بے چین ہو جاتا ہے اور پھر اس کے لئے وہ اپنے سارے زور لگا دیتا ہے...... خیر یہ تمام باتیں بعد کی ہیں...... کرشن اب تم یہاں سے جاؤ...... بالکل بھی ڈرنا نہیں اور تین دن کے بعد اس علاقے میں آنا نہیں...... اور اگر بھول کر بھی ادھر آ گئے تو پھر دوبارہ سادھو کے چنگل میں پھنس جاؤ گے، اچھا اب جاؤ۔'' اور یہ بول کر رولو کا نے اپنی نظریں کرشن کے ہیولہ پر مرکوز کر دیں۔

رولو کا حکم سنتے ہی وہ ہیولہ کمرے سے باہر کی جانب چلا گیا...... اس کے بعد رولو کا رام داس سے مخاطب ہوا...... ''رام داس...... نقصان کرنے والا تو گیا اب آپ بھی بے فکر ہو جائیں...... اور ان باتوں کا ذکر بھول کر بھی آپ کسی اور سے نہ کیجئے گا۔ اگر کھیتوں میں فصل کی نقصان پر کوئی تذکرہ بھی کرے تو آپ یہ بول دینا کہ بھگوان کی اچھا پر میں کیا بول سکتا ہوں...... میں تو بھگوان سے صرف پرارتھنا ہی کر سکتا ہوں۔

اگر آپ نے طیش میں آ کر اپنی زبان کھول دی تو آپ کا دشمن پھر کمر باندھ لے گا، دوڑتا ہوا دوبارہ سادھو کے پاس جائے گا اور جب سادھو نا کام ہو گا تو دیگر لوگوں کے پاس بھی جائے گا۔ کیونکہ وہ آپ کا نقصان کرنے پر تل گیا ہے۔

آپ گھبرائیں نہیں، میں تلسی کے لئے بھی کچھ نہ کچھ کروں گا تا کہ اس کا دماغ آپ کی طرف سے ہٹ جائے اور پھر وہ خاموش نہیں بیٹھا تو پھر کچھ اور اس کے ساتھ کرنا پڑے گا۔'' یہ بول کر رولو کا منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا......

چند لمحے ہی گزرے تھے کہ ایک عجیب طرح کی سیٹی کی آواز سنائی دی...... سیٹی کی آواز کو سنتے ہی رولو کا نے اپنے سیدھے ہاتھ کی سیدھی انگلی سے اشارہ کیا اور پھر کسی انجان زبان میں بولنے لگا اور پھر اپنی جیب سے ایک پڑیا نکالی...... جب اس نے پڑیا کھولی تو نظر آیا کہ اس پڑیا میں سیندور تھا۔

رولو کا نے پڑیا کو اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اوپر کو کیا تو پڑیا میں موجود سیندور اوپر کو اٹھنے لگا۔ اور پھر اوپر کو اٹھ کر ایک جگہ جمع ہوا، پھر رولو کا نے اپنی انگلی کا اشارہ کیا تو اس سیندور نے ایک جال کی صورت اختیار کر لی...... اور اس جال میں ایک پر ہیبت شکل نظر آئی...... پھر رولو کا نے اپنی انگلی کا اشارہ کیا، باہر کی طرف تو وہ جال نما سیندور کمرے سے باہر نکل کر غائب ہو گیا۔

رولو کا بولا۔ ''رام داس جی میں نے آپ کا کام کر دیا...... اب آپ ہنسی خوشی بے فکر ہو کر جائیں...... دل میں کسی قسم کا بھی اندیشہ نہ لانا...... اور اگر آپ کا بھائی تلسی اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو پھر بہت بھاری جانی و مالی نقصان اٹھائے گا...... اگر شانت ہو کر بیٹھ رہے گا تو نقصان میں نہ رہے گا...... لیکن کچھ بھی ہو جائے آپ اپنی زبان بند رکھئے گا...... بلکہ اس مسئلہ کا ذکر اپنے گھر والوں بیوی بچوں سے بھی نہیں کرنا...... نہیں تو پھر خاندانی دشمنی سے تباہی بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں ملتا...... آپ کا کام ہو گیا...... اس سے بڑھ کر اور کچھ بھی نہیں۔'' اور پھر رولو کا سے مصافحہ کر کے رام

داس اپنی جگہ سے اٹھے...... اور گویا ہوئے۔ ”حکیم صاحب یہ آپ کا ہمارے پریوار پر بہت بڑا احسان ہے تازندگی میں آپ کی سکھ شانتی کے لئے بھگوان سے پرارتھنا کرتا رہوں گا۔“ اور پھر رام داس کمرے سے نکل گئے۔

رام داس جب اپنے گھر پہنچے تو گھر نے پوچھا ”کہاں گئے تھے اور اتنے گھنٹے اس جگہ رہے۔“ یہ سن کر رام داس بولے۔ ”میں اپنے ایک جاننے والے کے پاس گیا تھا...... وہ بہت اچھا آدمی ہے اس نے بیٹھالیا...... چونکہ ہم دونوں ایک طویل عرصہ بعد ملے تھے اس لئے ہم دونوں میں سے کسی کا دل نہیں چاہتا تھا کہ ایک دوسرے کے پاس سے اٹھ جائیں۔“

اس کے بعد رام داس اپنے دیگر کاموں میں لگ گئے۔ رات ہوئی تو رام داس ڈرتے ڈرتے کھیت میں گئے۔ اور پھر کھیت میں موجود مچان پر چڑھ کر بیٹھ رہے...... مچان پر بیٹھے بیٹھے کئی گھنٹے ہوگئے مگر تمام کھیتوں میں سے کسی قسم کی بھی کوئی غیر آواز سننے کو نہ ملی، ورنہ یہ ہوتا تھا کہ آدھی رات کے ہوتے ہی عجیب عجیب آوازیں سنائی دینے لگتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ بے شمار گدھے نما جانور دوڑ رہے ہوں اور ان جانوروں کے ساتھ کئی افراد بھی ہوتے تھے...... اس کے بعد وہ افراد آپس میں دنگل کرنے لگتے تھے۔ گدھے ڈھینچوں ڈھینچوں کی آوازیں نکالتے جسے سن کر کلیجہ منہ کو آتا۔

لیکن ان آوازوں کو صرف اور صرف رام داس یا پھر ان کا لڑکا ہی سنتے تھے...... ان کے پاس پڑوس کے کھیتوں میں موجود دوسرے لوگ قطعی کوئی آواز نہیں سنتے تھے۔ رام داس باتوں باتوں میں گھما پھرا کر رات کے واقعات کا تذکرہ کرتے مگر سب کے سب یہی جواب دیتے کہ ”ہم تو رات بھر آرام سے مچان پر سوتے رہے۔“

خیر ایک دن دو دن اور اسی طرح دس بارہ دن گزر گئے...... ایک دن تلسی آیا اور پرنام وغیرہ کے بعد گویا ہوا...... ”بھیا...... آج کل آپ بڑے خوش اور سکھ شانتی میں لگ رہے ہیں...... مجھے لگتا ہے کہ آپ کے کھیتوں میں فصل کا جو نقصان ہوتا تھا اب وہ رک گیا ہے...... ان تمام واقعات سے میں بھی بہت ان شانتی رہتا تھا اور بھگوان سے پرارتھنا کرتا تھا کہ بھیا رام داس کے ساتھ جو کچھ بھی ہورہا ہے...... وہ اچھا نہیں ہورہا...... یہ بات تو واقعی اچنبھے والی تھی کہ کھڑی فصل کو رات میں جنگلی جانور نقصان پہنچائیں...... خیر یہ اچھا ہی ہوا کہ اب فصل کو کوئی نقصان نہیں ہورہا......“

تلسی کی بات سن کر رام داس بولے۔ ”تلسی اب میں واقعی بہت شانتی سے ہوں...... میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ سوائے بھگوان سے پرارتھنا کے...... میں ہر روز مندر جاتا اور دیوی ماتا کے آگے ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کرتا...... بھگوان اور دیوی ماں نے کرپا کردی کہ اب فصل کو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا ہے اور اس وجہ سے میں دلی طور پر شانتی محسوس کررہا ہوں......

اچھا اب تم بیٹھو جل پانی کرو...... میں ذرا چلتا ہوں...... گیہوں کی کٹائی شروع ہوگئی ہوگی...... صبح سے میں گیا نہیں...... بڑے پتر کو بھیج دیا تھا کہ کاٹنے والوں کی نگرانی کرے۔“

یہ سن کر تلسی بولا۔ ”نہیں بھیا جل پانی کی ضرورت نہیں...... میں بھی چلتا ہوں...... ایک ضروری کام سے ایک جگہ جانا ہے...... کئی دن ہوگئے یہ سوچتے ہوئے کہ میں اس جگہ جاؤں گا مگر سستی کی وجہ سے جا نہیں سکا۔“ اور پھر تلسی نے رام داس کو پرنام کیا اور وہاں سے چلا گیا۔ تلسی کے جانے کے بعد رام داس بھی اٹھے اور کھیتوں کی طرف چلے گئے جہاں کہ گیہوں کی فصل کٹ رہی تھی۔

خیر اسی طرح شب و روز گزرتے رہے......

ایک رات اچانک تلسی کے گھر میں شور اٹھا......

تلسی اپنے کمرے میں سویا پڑا تھا کہ اس کے پیٹ میں ناقابل فراموش درد اٹھا...... درد اتنا زبردست تھا کہ اس کی برداشت سے باہر...... درد کی شدت سے وہ تڑپنے لگا...... جلدی جلدی گاؤں کے وید کو بلایا گیا۔

وید نے دوا دی...... اور چلا گیا...... مگر درد میں کوئی بھی افاقہ نہ ہوا...... جب درد زیادہ زور پکڑتا تو اس کا چہرہ پہلے سرخ اور پھر سیاہی مائل ہو جاتا۔

وہ بن جل مچھلی کی مانند تڑپنے لگا...... وہ کمرے کے فرش پر اٹھتا اور تڑپ کر دوبارہ نیچے گر جاتا...... دن کا اجالا جب پھیلا تو گھر والے اسے لے کر شہر کے بڑے اسپتال گئے...... اس کی ماہی بے آب جیسی حالت دیکھ کر ڈاکٹروں نے سب سے پہلے تین انجکشن لگائے مگر بے سود اسے فائدہ نہ ہوا...... بلکہ پہلے سے اس کی حالت مزید بگڑ رہی تھی...... یہ دیکھ کر ڈاکٹروں نے اسے بے ہوشی کا انجکشن لگا دیا...... انجکشن کے لگتے ہی چند لمحے میں تلسی بے سدھ ہو کر رہ گیا۔

بے ہوشی کے عالم میں بھی اس کے چہرے سے لگتا تھا کہ اندرونی طور پر وہ بہت کشٹ میں ہے۔ وہ تین دن تک اسپتال میں رہا...... چوتھے دن وہ گھر آیا تو اس کی حالت بہت زیادہ دیگر گوں تھی...... ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس کے پورے بدن پر ہلدی مل دی گئی ہو...... اس کا رنگ بالکل زرد ہو کر رہ گیا تھا۔

رات کا اندھیرا پھیلتے ہی وہ درد سے تڑپنے لگتا...... اور پھر صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی اس کا تمام درد بالکل ختم ہو جاتا...... ایسا لگتا کہ کبھی درد سے اس کا پالا پڑا ہی نہیں...... اور پھر وہ درد سے مچلنے لگتا، ڈاکٹر وید حکیم بلکہ جھاڑ پھونک کرنے والوں کو بلایا گیا مگر کوئی فائدہ نہیں......

ایک دن ایک بہت بڑے شکتی شالی گیانی کو بلایا گیا...... وہ تلسی کے کمرے میں بیٹھا...... اور اپنے سامنے بہت سارے پھل فروٹ سیندور اور دھونی دینے کے لئے آگ سلگائی اور پھر بلند آواز میں اشلوک پڑھنے لگا۔

کافی دیر اشلوک پڑھنے کے بعد ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ”مہاراج...... آپ کے بلانے پر شنکانی حاضر ہے۔ حکم کریں مجھے کیوں بلایا ہے؟“

”شنکانی میں نے تجھے یوں کشٹ دیا کہ تو یہ بتا کہ تلسی کی بیماری کیسی ہے...... اور درد میں اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے...... تو اس کا کارن کیا ہے؟“

گیانی کی بات سن کر نادیدہ طاقت جو کہ کسی شنکانی نامی عورت کی آتما تھی اس نے جواب دیا۔

”مہاراج! انہوں نے دوسروں کے ساتھ بہت انیائے کیا ہے؟ یہ دوسروں کا ہنستا بستا اور سکھ شانتی دیکھتے ہیں تو ان کا دل مسوس کر رہ جاتا ہے...... اور یہ ان لوگوں کی برائی میں لگ جاتے ہیں...... اور انہی تمام تر حرکتوں اور جادو کرانے سے بھی نہیں ہچکچاتے...... اور جب سامنے والا دکھ مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے تو انہیں شانتی ملتی ہے اور یہ اندرونی طور پر بہت خوشی مناتے تھے۔ آخر میں انہوں نے ایک اور کا بہت نقصان کرنا چاہا جانی و مالی، میں اس کا نام نہیں بتا سکتی۔

جب اس کا بہت زیادہ نقصان ہونے لگا تو وہ بے چارہ بھاگا بھاگا ایک بہت ہی شکتی شالی منش کے پاس گیا...... اس کا اتنا زیادہ نقصان ہو چکا تھا کہ بیان سے باہر...... اس کے بعد اس کا جانی نقصان ہونے والا تھا پھر اس کے بعد اس کے پریوار کا نمبر آتا۔

تمام پتا کو سن کر اس بھلے منش نے اس انیائے کا توڑ کر دیا...... اس کا جب نقصان ہونے سے بچ گیا تو یہ دیکھ کر تلسی داس تلملا اٹھے...... اور پھر اس گیانی کے پاس گئے جس نے ان کے کہنے پر اپنے بیروں سے نقصان کرا رہا تھا...... اس نے صاف صاف جواب دے دیا۔ تلسی داس اب تمہارا کام میرے بس سے باہر ہو گیا ہے۔ اب آئندہ میرے پاس نہ آنا......“

یہ سن کر یہ واپس آ گئے اور پھر دوبارہ بھاگ دوڑ کرنے لگے...... کام کرنے والے تو پیسے کے لوبھی ہوتے ہیں...... کئی لوگوں نے بہت زیادہ رقم لے کر ان کا کام کرنا شروع کر دیا...... اور پھر ان کا جادو ٹونا جو انہوں نے کرانا شروع کر دیا تھا...... وہ الٹ ہو کر ان پر آن پڑا ہے۔

اور انہوں نے اس کا توڑ نہ کرایا تو یہ جان سے

چلے جائیں گے..... جس نے ان کے کرتوتوں کا توڑ کیا ہے وہ بہت زیادہ شکتی شالی ہے۔

مہاراج میں آپ سے بول رہی ہوں کہ آپ اس کام سے اپنا ہاتھ ہٹالیں..... نہیں تو آپ کا بھی نقصان ہوسکتا ہے..... کیوں کہ الٹ کرنے والا بہت ہی شکتی شالی ہے۔" یہ بول کر شنکالی کی آواز آنا بند ہوگئی۔

یہ سن کر گیانی بولا۔ "تلسی داس ساری باتیں آپ کے سامنے آ گئی ہیں..... اور میں اس کام میں ہاتھ نہیں ڈال سکتا..... آپ نے جس کے ساتھ انیائے کیا ہے..... وہ کون ہے یہ تو آپ بخوبی جانتے ہیں"

اتنے میں پھر شنکالی کی آواز سنائی دی۔ "مہاراج وہ شکتی شالی..... یہاں سے کافی دور دلی شہر میں ہے..... حکیم وقار کے دواخانے میں اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں بتا سکتی..... اب میں چلتی ہوں....." اور شنکالی کی آواز بند ہوگئی تو گیانی بولا۔ "ٹھیک ہے شنکالی اب تو جا۔"

پھر گیانی تلسی داس سے بولا۔ "اب یہ آپ کا کام ہے کہ دلی شہر میں جا کر اس شکتی شالی کے پاؤں پکڑ لیں اور گڑگڑا کر اپنی غلطیوں کی معافی مانگیں..... شنکالی نے جن الفاظ میں اس مہاپرش کا ذکر کیا ہے اس سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ مہاپرش واقعی بہت نرم دل کا مالک ہے..... میرا مشورہ ہے کہ جتنی جلدی ہوسکے آپ دلی شہر میں حکیم وقار کے دوا خانہ میں پہنچ جائیں..... اگر آپ دیر لگائیں گے تو آپ کا زیادہ سے زیادہ نقصان بھی ہوسکتا ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔" اور یہ بول کر وہ گیانی اٹھا اور چلا گیا۔

تلسی داس کی حالت زار سن کر سارے پریوار والے رونے دھونے لگے..... شام کا سمے ہونے والا تھا اس لئے سب نے مشورہ کیا کہ کل کا سورج طلوع ہوتے ہی تلسی داس کو لے کر گھر والے دلی شہر حکیم وقار کے دوا خانہ میں جائیں گے اور وہاں موجود اس مہاپرش کے پاؤں پر گر کر التجا کریں گے کہ وہ تلسی داس کو معاف کردے اور ان کا علاج کردے۔

رات کا اندھیرا پھیلتے ہی تلسی داس کے جسم میں بے چینی پھیل گئی، اور روزانہ ہونے والے درد نے انہیں تڑپانا شروع کردیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگے..... سارے گھر والوں نے آنکھوں میں نیند کاٹی..... سارے گھر والے بھی رات بھر بے چین رہتے تھے۔

خیر رات بھر پرارتھنا کرتے کرتے رات کٹی..... صبح کا سپیدہ پھیلتے ہی گھر والوں نے گاڑی کا انتظام رات میں کرلیا تھا۔

گاڑی میں تلسی داس، ان کی پتنی، ان کا بڑا بیٹا اور ان کا چھوٹا بھائی..... دلی شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔ ڈھائی گھنٹے کے سفر کے بعد وہ لوگ حکیم وقار کے مطب کے سامنے پہنچ گئے۔

گاڑی کا دروازہ کھول کر تلسی داس کو ایک طرف سے بھائی اور دوسری طرف سے بیٹا نے سہارا دے کر اتارا اور پھر انہیں لے کر وہ حکیم وقار کے مطب میں پہنچے۔

انتظار گاہ میں بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگے..... اور پھر یہ اتفاق ہوا کہ پندرہ منٹ بعد ہی ان کو مطب کے ایک ملازم نے مخاطب کیا۔ "آپ لوگ اندر چلیں۔"

ملازم کے ساتھ تلسی داس کو لے کر وہ لوگ حکیم وقار کے کمرے میں پہنچے۔ حکیم وقار نے انہیں بنچ پر بیٹھایا اور حال پوچھا۔

حکیم وقار کے مطب میں روایت تھی کہ سب سے پہلے آنے والے کو حکیم وقار کے سامنے لے جایا جاتا..... حکیم وقار اس سے مرض کے مطابق دریافت کرتے..... کوئی جسمانی بیماری ہوتی تو اس کا علاج حکیم وقار خود کرتے اور اگر بیماری روحانی ہوتی تو اس مریض کو ردلوکا کے کمرے میں بھیج دیتے یا پھر اس مریض کے ساتھ خود ردلوکا کے کمرے میں جاتے اور مریض کو ردلوکا کے کمرے میں چھوڑ کر چلے آتے۔

حکیم وقار نے تلسی داس اور ان کے ساتھ آئے لوگوں سے مرض کا دریافت کیا تو ان کے بتانے کے

مطابق ان کا مسئلہ روحانی تھا۔ لہٰذا حکیم وقار نے اپنے ایک ملازم کے ہمراہ ان لوگوں کو رولوکا کے پاس بھیج دیا، جب وہ سب رولوکا کے سامنے پہنچے تو رولوکا نے انہیں بہت ہی شفقت سے مسکراتے ہوئے انہیں اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا۔

رولوکا کے کمرے میں میز کرسی نہیں بلکہ فرشی نشست ہوتی تھی۔

رولوکا کے سامنے بیٹھتے ہی جھٹ سے تلسی داس اٹھے اور پلک جھپکتے ہی رولوکا کے پاؤں پکڑ لئے اور بولے۔ ''حکیم صاحب میں بہت پاپی اور سنگدل ہوں۔ میں نے بہت انیائے کئے ہیں...... اب میں مرنے جوگ ہوگیا ہوں...... مجھے معاف کردیں...... مجھ پر دیا کریں۔''

رولوکا نے جلدی سے اپنے پاؤں ان کی گرفت سے چھڑا لئے اور انہیں سیدھا کرکے بیٹھا دیا...... اور بولا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں...... آرام سے بیٹھیں اور بتائیں کہ آپ کو تکلیف کیا ہے؟''

تلسی داس اور ان کی پتنی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے تھے۔ تلسی داس گلوگیر آواز میں بولے۔ ''حکیم صاحب مجھے میرے غلط کاروں کی سزا مل رہی ہے، یہ سزا میرے برداشت سے کہیں بڑھ کر ہے، میں بلا ناغہ ہر رات مرتا ہوں اور جیتا ہوں...... آپ نے ایک بھلے مانس پر کیا ہوا جادو کا توڑ کیا...... اور اس کے بعد مزید ادھر ادھر بھاگتا رہا...... اور پھر میرا کرایا ہوا جادو مجھ پر الٹ گیا۔'' اور یہ بول کر تلسی داس زاروقطار رونے لگا۔

تلسی داس کی باتیں سن کر رولوکا اپنی گردن جھکا کر بیٹھ گیا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔ پھر چند منٹ بعد اپنا سر اوپر کو اٹھایا اور بولا۔ ''تلسی داس تو یہ معاملہ ہے۔ خود اپنے دام میں صیاد آ گیا۔''

''حکیم صاحب آپ کو میں مالا مال کردوں گا...... آپ کی بڑی کرپا ہوگی...... مجھے مرنے سے بچالیں۔'' تلسی داس نے کہا۔

یہ سن کر رولوکا بولا۔ ''تلسی داس ہم کوئی پائی پیسہ نہیں لیتے...... خیر جب آپ آگئے اور اپنی غلطی کا اعتراف کررہے ہیں تو میں دیکھتا ہوں کہ اصل معاملہ کیا ہے اور اس کا سدباب کیسے ہوسکتا ہے۔

اور ہاں یہ کام بھی آپ نے اچھا کیا۔ جلدی سے آگئے ورنہ آپ اگر تین روز نہ آتے تو چوتھے روز آدھی رات کے وقت آپ کا جانی نقصان ہوجاتا۔

ایک تو عمل سیدھا چلتا ہے اور پھر جو عمل الٹ ہو کر واپس ہوتا ہے تو وہ بہت خطرناک ہوتا ہے اور اس میں صرف اور صرف جانی نقصان ہوتا ہے یعنی عمل الٹ کر جس پر آتا ہے وہ بہت تھوڑے وقت میں مرجاتا ہے خیر آپ پریشان نہ ہوں، میں کوئی اپائے کرتا ہوں۔''

یہ بول کر رولوکا خاموش ہوگیا اور اپنی آنکھیں بند کرکے بیٹھ گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ کسی بہت اہم مسئلہ پر غور کررہا ہے۔ اور پھر رولوکا نے ایک بہت لمبا سانس کھینچا اور اپنی آنکھیں کھول دیں۔ پھر اس نے قلم کاغذ اٹھا کر کاغذ پر کسی انجان زبان میں تین لائنیں لکھیں اس کے بعد اس نے شیشے کے ایک گلاس میں چند گھونٹ پانی لیا اور اس پانی میں لکھا ہوا کاغذ ڈال دیا۔ اور اسے بغور دیکھنے لگا۔

کاغذ کا پانی میں گرنا تھا کہ پانی کا رنگ ہلکا پیلا ہوگیا۔ پھر کاغذ کو گلاس سے نکال کر تلسی داس سے بولا۔ ''آپ اس پانی کو پی لیں اور اگر جی متلانے لگے تو سامنے غسل خانہ ہے وہاں جاکر منہ ہاتھ دھولیں۔ چند منٹ میں آپ کی طبیعت بحال ہوجائے گی۔

رولوکا کی بات سن کر تلسی داس نے گلاس رولوکا کے ہاتھ سے لے لیا اور گلاس میں موجود تین چار گھونٹ جو پانی تھا اسے پی لیا۔

پانی پینے کے بعد تلسی داس کو رولوکا بغور دیکھنے لگا اور پھر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر تلسی داس کی طرف پھونک ماری۔

پھونک کے بعد تلسی داس نے ایک بہت لمبا سانس کھینچا اور جیسے ان کی آنکھیں ہلکی ہلکی بند ہونے

لگیں۔اس کے بعد تلسی داس بولے۔ ”حکیم صاحب میری طبیعت گھبرا رہی ہے اور ساتھ ہی گرمی بھی لگ رہی ہے۔“

رولوکا بولا۔ ”آپ غسل خانہ میں جائیں اور ہاتھ منہ دھوکر آئیں اور اگر الٹی آجائے تو الٹی کرلینا لیکن گھبرانا نہیں۔“ یہ سنتے ہی تلسی داس اٹھے اور غسل خانہ میں چلے گئے۔

جب تلسی داس غسل خانہ میں گئے تو انہیں ایک بہت بڑی الٹی آئی۔الٹی میں کالا کالا پانی نکلا، اور پھر الٹی کے بعد ان کی طبیعت ہلکی ہوگئی تو انہوں نے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھویا اور غسل خانہ سے باہر آگئے اور پھر واپس آکر رولوکا کے سامنے بیٹھ گئے۔

رولوکا کے سامنے بیٹھ کر تلسی داس لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ چند لمحے بعد رولوکا بولا۔ ”تلسی داس کیا الٹی بھی آئی ہے؟“

”جی بہت بڑی الٹی آئی ہے اور الٹی میں کافی کالا کالا پانی نکلا ہے۔سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ الٹی میں کالا پانی کیوں نکلا ہے جبکہ میں نے تو ایسی کوئی کالی چیز نہیں کھائی تھی۔“

یہ سن کر رولوکا بولا۔ ”تلسی داس کالا پانی دراصل آپ کے اندر جو غلط چیز بیٹھ گئی تھی اور وہی چیز درد پیدا کرتی تھی۔وہ چیز سانس کے ذریعہ آپ کے پیٹ میں اتر گئی تھی۔آپ کے پیٹ کا معاملہ تو اب ٹھیک ہوگیا۔ اب میں آپ کا اوپر کا معاملہ بھی ٹھیک کئے دیتا ہوں۔ ورنہ اوپری چیز بھی آپ کو ہلکا پریشان کرے گی۔“

پھر رولوکا نے آواز دی تو فوراً ایک ملازم آیا اور بولا۔ ”جی حکیم صاحب حکم کریں۔“

ایسا کرو کہ انگیٹھی میں کوئلہ سلگا کر فوراً لے آؤ کوئلے زیادہ نہ ہوں تین چار ٹکڑے بہت ہوں گے۔“

یہ سن کر ملازم بولا۔ ”جی ابھی لایا۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

رولوکا اپنی جگہ بیٹھا منہ ہی منہ میں نہ جانے کیا پڑھنے لگا۔

تھوڑی دیر میں ملازم انگیٹھی لے آیا۔انگیٹھی میں چند کوئلے دہک رہے تھے۔ملازم نے انگیٹھی لاکر رولوکا کے سامنے رکھ دی۔تو رولوکا نے پاس پڑے پیالے میں سے تھوڑا سا سفوف ہاتھ میں لیا اور اس سفوف پر پھونک مار کر اس سفوف کو انگیٹھی میں دہکتے کوئلوں پر ڈال دیا۔سفوف کا آگ پر گرنا تھا کہ سفید سفید دھواں نکلنے لگا۔اور پھر ایک وقت آیا کہ آگ سے دھواں نکلنا بند ہوگیا۔اس کے بعد سارا دھواں تلسی داس کے گرد پھیل گیا۔یعنی تلسی داس کے پورے وجود کا احاطہ کرلیا۔چند لمحے ایسا رہا اس کے بعد سارا دھواں لکیر کی صورت سے باہر نکلتا چلا گیا۔ پھر رولوکا کی آواز سنائی دی۔

”تلسی داس آپ گھبرا تو نہیں رہے؟“

”جی نہیں...... جب آپ سامنے ہیں تو گھبرانا کیا...... یہ تو آپ کی کرپا ہے اور جو دیا آپ مجھ پر کررہے ہیں اسے میں ساری زندگی نہیں بھولوں گا بلکہ اٹھتے بیٹھتے آپ کے لئے ایشور سے پرارتھنا کروں گا آپ ہر لحہ سکھ شانتی سے رہیں۔“

یہ باتیں ہورہی تھیں کہ جو دھواں باہر کو نکلا تھا وہ واپس آگیا اور کمرے میں آتے ہی سارے کا سارا دھواں انگیٹھی میں موجود آگ میں سما گیا۔واپسی پر دھوئیں کا رنگ کالا تھا۔

جب سارا دھواں انگیٹھی کی آگ میں سما گیا تو رولوکا بولا۔ ”تلسی داس اب آپ بالکل ٹھیک ہوگئے، اب اپنے دل سے شک وشبہ نکال دیں۔اب آپ کی طبیعت ٹھیک رہے گی...... ویسے اگر نزلہ زکام یا بخار وغیرہ ہو تو گھبرانا نہیں کیونکہ وہ آپ کی عام بیماری ہوگی۔

آپ یہ باتیں گرہ میں باندھ لیں کہ اب آپ کسی کا برا نہ کیجئے گا...... کھائیں پئیں اور خوش رہیں...... جو کسی کے ساتھ برا کرتا ہے تو اس کے ساتھ برا ہونا شروع ہوجاتا ہے، برے کا نتیجہ ہمیشہ برا ہی ہوتا ہے...... کوئی کسی کو دکھ دے کر زیادہ عرصہ تک سکھ شانتی سے نہیں رہ سکتا۔وہ کسی نہ کسی صورت برا کرنے والا دکھ

درد اور کرب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ہاتھ پیر ٹوٹنے یا پھر بستر پر گرنے کو ہی ہم عذاب الٰہی نہیں کہہ سکتے بلکہ کسی انسان کے لئے عذاب تو وہ بھی ہے کہ اس انسان کو کسی پل یا دن رات میں قلبی سکون نہ ملے...... وہ ایسے دکھ اور تکلیف سے دوچار ہو جاتا ہے کہ اس کا ذہنی سکون چھن جاتا ہے اور وہ بے چین رہنے لگتا ہے۔

وہ ہر وقت سوچتا ہے کہ کاش! میں بھی سکھ شانتی سے رہ سکوں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ دوسروں کے ساتھ برا کرنے والا کسی نہ کسی جسمانی، ذہنی یا قلبی تکلیف میں رہنے لگتا ہے، اور جو لوگ دوسروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں، اپنی ذات سے کسی کو دکھ تکلیف نہیں پہنچاتے وہ حقیقی معنوں میں ذہنی اور قلبی طور پر بہت ہی پرسکون ہوتے ہیں۔ اچھے لوگوں کو مرنے کے بعد بھی سکھ شانتی ملتی ہے اور برے لوگ مرنے سے پہلے ہی دنیا میں عبرت کا نشان بن جاتے ہیں۔ اسی دنیا میں ایسے ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں ذرا برابر بھی ذہنی سکون نصیب نہیں ہوتا اور پھر وہ سکون کی دوا کھا کر بھی بے سکون رہتے ہیں، دن کا چین اور رات کی نیند ان سے کوسوں دور چلی جاتی ہے۔

خیر آپ بے فکر ہو کر جائیں، کسی بات کا دل دماغ میں شک وشبہ نہ رکھیں لیکن میری باتوں کو گرہ میں باندھ لیجئے گا کہ اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ دیجئے گا نہیں تو پھر اس مرتبہ اگر آپ کی جان شکنجے میں پھنسی تو پھر آپ کا بچنا ممکن نہیں ہوگا۔ اور پھر وہ وقت آپ کا آخری وقت ہوگا۔"

تمام باتیں سننے کے بعد تلسی داس بولے۔ "حکیم صاحب آپ کا بہت بہت دھنے واد میں مرتے دم تک آپ کا یہ احسان یاد رکھوں گا...... اور میں یہ کوشش کروں گا کہ میں اپنی زندگی بھگوان کی اچھا میں گزاروں، مجھے بہت بڑا سبق مل گیا...... میں یہ جان گیا کہ دوسروں کی خوشی میں خوش رہنے والا ہی سکھ شانتی سے رہ سکتا ہے میں وقتاً فوقتاً آپ سے ملتا رہوں گا تاکہ مجھے زیادہ سے زیادہ شانتی ملے۔"

تلسی داس کی پتنی نے بھی ہاتھ جوڑ کر رولو کا شکریہ ادا کیا اور پھر ساتھ ہی تلسی داس کے بھائی اور بیٹے نے بھی رولو کا شکریہ ادا کیا۔ اور پھر وہ لوگ رولو کی اجازت سے ہنسی خوشی اپنے گھر کو لوٹ گئے۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد رولو کا اپنے کمرے سے نکلا اور حکیم وقار کے کمرے میں آ گیا...... حکیم وقار ابھی فارغ ہی بیٹھے تھے، دن کے دو بج رہے تھے، رولو کا کو دیکھ کر مسکرائے اور بولے۔ "حکیم صاحب تشریف رکھیں۔"

رولو کا ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "ابھی ابھی جو صاحب آئے تھے انہوں نے بغض حرص اور لالچ میں اپنے ہی بھائی کا جینا حرام کر دیا تھا...... کبھی کبھی انسان نہ جانے کیوں کسی کے جان کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ ایک ذات اوپر بیٹھی ہے جو کہ سب کچھ دیکھ رہی ہے جو کہ بہت منصف ہے اور جب اس کی پکڑ ہوتی ہے تو انسان کہیں کا نہیں رہتا اور پھر اس کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔"

حکیم وقار بولے۔ "جی حکیم صاحب یہ حقیقت ہے کہ کچھ لوگ اپنے مفاد کے لئے دوسروں کا گلا کاٹتے وقت نہیں سوچتے کہ کل کو میرا گلا بھی کٹ سکتا ہے اگر وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچ لیں تو وہ بعد کے خسارے سے بچ جائیں...... انسان اپنی مفاد پرستی میں کبھی کبھی تو بے شمار لوگوں کو نیست ونابود کر دیتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو خون کی ندیاں بہانے پر بھی نہیں چوکتا۔

اب دیکھیں ناں جو بڑی بڑی جنگیں ہوتی ہیں...... دونوں طرف فوجیں صف آراں ہوتی ہیں اور پھر جب جنگ چھڑ جاتی ہے تو سیکڑوں نہیں بلکہ لاکھوں انسان لقمہ اجل بن جاتے ہیں...... اور جس کی خواہش و منشا پر جنگ ہوتی ہے وہ دور بیٹھا موج مستی میں لگا رہتا ہے...... لڑنے والے لڑتے ہیں اور مرتے ہیں۔ اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ جو دوسروں کو موت سے ہمکنار کراتا ہے۔ وہ خود بھی اذیت ناک کرب میں مبتلا ہو کر نشان عبرت بن جاتا ہے۔ مگر اسے دیکھ کر پھر بھی

دوسرے سبق حاصل نہیں کرتے۔"
اتنے میں حکیم وقار نے ملازم کو آواز دی تو ملازم فوراً حاضر ہوگیا تو حکیم وقار بولے۔ "بھئی ڈھائی بج رہے ہیں جلدی سے کھانا لگاؤ۔"
حکیم وقار کی بات سن کر ملازم بولا۔ "جی حکیم صاحب...... میں ابھی کھانا لگوائے دیتا ہوں......" یہ بول کر ملازم چلا گیا اور پھر کوئی پندرہ منٹ بعد آیا اور بولا۔ "حکیم صاحب کھانا لگ گیا ہے۔"
حکیم وقار رولوکا سے بولے۔ "حکیم صاحب تشریف لے چلیں کھانا کھاتے ہیں۔" اور پھر دونوں کھانے کے کمرے میں پہنچے۔ حکیم وقار ہمیشہ فرشی نشست پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ خیر رولوکا اور حکیم وقار دونوں نے کھانا کھایا، کھانے کے بعد چائے کا دور چلا اور دونوں نے چائے پی۔
رولوکا اور حکیم وقار کھانا کھا کر ابھی فارغ ہی ہوئے تھے کہ ایک عمر رسیدہ خاتون اور ایک شخص آئے، دونوں بہت ہی گھبرائے ہوئے حواس باختہ تھے، مطب میں آتے ہی شخص نے کہا۔ "مجھے حکیم وقار سے فوراً ملنا ہے۔ آپ برائے مہربانی مجھے حکیم وقار کے پاس لے چلیں......" ملازم سے ضعیف شخص نے کہا۔
ملازم بولا۔ "جناب اس وقت مطب کا وقت ختم ہوچکا ہے۔ اور اس وقت حکیم وقار آرام فرماتے ہیں...... آپ برائے مہربانی کل تشریف لے آئیں۔"
یہ باتیں ہورہی تھیں کہ درمیان میں عمر رسیدہ خاتون بول پڑیں...... انہوں نے لمبی سی چادر لے رکھی تھی...... چہرہ مہرہ سے لگتا تھا کہ وہ ضعیف شخص اور خاتون باادب باشعور، کسی سلجھے ہوئے خاندان کے لگتے تھے۔ خاتون بولیں ملازم سے۔ "بیٹا میں مانتی ہوں کہ یہ وقت حکیم وقار کے آرام کا ہے مگر کسی کی مصیبت سے بڑھ کر آرام تو نہیں...... میں تمہیں الفاظ میں نہیں بتا سکتی کہ اس وقت ہم لوگ کس بھیانک اور ناقابل بیان مصیبت سے دوچار ہیں...... بیٹا آپ کی مہربانی ہوگی۔ آپ جا کر حکیم وقار کو خبر کردو کہ جاگیردار سلیم الزماں کے گھر سے دو افراد آئے ہیں، جو کہ بہت زیادہ پریشان ہیں اور فوراً آپ سے ملنا چاہتے ہیں...... مجھے امید ہے کہ حکیم صاحب ہم سے ضرور ملاقات کریں گے۔"
جب خاتون نے جاگیردار سلیم الزماں کا نام سنا تو وہ سمجھ گیا کہ یقیناً حکیم وقار جاگیردار صاحب کو جانتے ہوں گے، اس وجہ سے خاتون جاگیردار صاحب کا نام لے رہی ہیں۔ ملازم بولا۔ "اچھا آپ دونوں انتظار گاہ میں تشریف رکھیں میں جا کر حکیم وقار کو خبر کرتا ہوں۔" اور یہ بول کر وہ چلا گیا۔
وہ حکیم وقار کے کمرے میں پہنچا اور باادب ہو کر حکیم وقار سے بولا۔ "حکیم صاحب ایک عمر رسیدہ شخص اور ایک خاتون تشریف لائی ہیں...... اور وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں...... میں نے تو بہت منع کیا اور بولا کہ مطب کا وقت ختم ہوگیا ہے، آپ لوگ کل تشریف لائیں، مگر وہ آپ سے ملنے پر بضد ہیں اور خاتون کا کہنا ہے کہ "بیٹا تم جا کر حکیم وقار سے کہو کہ جاگیردار سلیم الزماں کے گھر سے ہم آئے ہیں۔"
سلیم الزماں کا نام سننا تھا کہ حکیم وقار بولے۔ "چلو میں خود چل کر ان سے ملتا ہوں...... ارے بھئی وہ میرے بہت قریب کے ہیں، جاگیردار سلیم الزماں کے اس مطب پر بہت احسانات ہیں......" اور حکیم وقار رولوکا سے بولے۔ "حکیم صاحب آپ تشریف رکھیں، میں ان سے ملتا ہوں نہ جانے آنے والے کس تکلیف میں مبتلا ہوں......" یہ سن کر رولوکا بولا۔ "حکیم صاحب میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں......" اور پھر دونوں انتظار گاہ میں آئے تو دیکھا کہ آنے والے دونوں عمر رسیدہ خاتون و شخص بیٹھے تھے۔
انتظار گاہ میں بیٹھے شخص پر نظر پڑتے ہی حکیم وقار نے جھٹ ان صاحب سے مصافحہ کیا، پھر بولے۔ "ارے سلیم صاحب آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیوں کی، خبر بھجوادی ہوتی میں فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاتا۔ آپ اندر تشریف لائیں......" اور پھر رولوکا سے حکیم وقار بولے۔ "حکیم صاحب یہ ہیں سلیم

الزماں صاحب۔"

یہ سن کر رولوکا نے بھی سلیم الزماں سے مصافحہ کیا۔

اور پھر حکیم وقار انہیں لئے ہوئے اپنے کمرے میں آئے اور ملازم کو آواز دے کر بولے۔"بھئی جلدی سے ٹھنڈا شربت بنا کر لاؤ۔ گرمی بہت ہے۔"

سلیم الزماں بولے۔"حکیم صاحب تکلیف کی ضرورت نہیں...... ہم اس وقت بڑی مصیبت سے دو چار ہیں...... اور اس بنا پر ہم خود چل کر آئے ہیں...... بات ہے گھر کی اور عزت کی۔"

یہ سن کر حکیم وقار بولے۔"آپ حکم کریں میرے لائق جو خدمت ہے۔"

اتنے میں ملازم دو گلاس شربت بنا کر لے آیا...... تو حکیم وقار خاتون اور سلیم الزماں سے بولے۔"آپ فکر نہ کریں شربت پئیں......"

خیر ان دونوں نے شربت پیا...... پھر سلیم الزماں بولے۔"حکیم صاحب کیا بتاؤں...... میری بچی نگہت...... کل رات چودھویں کی رات تھی۔ چاندنی زیادہ تھی...... سب سہیلیاں گھر کے سامنے بنے پھولوں کے لان میں کھیل کود اور گپ شپ میں مصروف تھیں...... رات دس بجے میں نے آواز بھی اٹھادی۔"بچو! اب گھر میں آجاؤ......" تو سب نے کہا......"جی ہم تھوڑی دیر میں آتے ہیں۔"

اور پھر اسی درمیان میری آنکھ لگ گئی...... پھر صبح کے وقت میں نے سنا کہ وہ سب کے سب رات ساڑھے بارہ بجے گھر میں آئیں اور ضروریات سے فارغ ہو کر اپنے اپنے کمروں میں سوگئیں...... لیکن رات کے تین بجے نگہت کی طبیعت خراب ہوگئی...... بیگم نے مجھے اٹھایا اور میں اس کے کمرے میں گیا تو دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ نگہت اپنے بستر پر بیٹھی جھوم رہی تھی اور اس طرح سانس لے رہی تھی کہ جیسے بہت دور سے بھاگتی ہوئی آئی ہو۔ میں نے آواز دی۔"نگہت بیٹا کیا بات ہے؟"

خواب

"اس دن پارٹی میں میرے باس کی بیگم کس قدر خوبصورت لگ رہی تھیں، تب سے مسلسل میرے خوابوں میں آرہی ہیں۔" شوہر نے بیوی سے ازراہ مذاق کہا۔

"بیوی نے شوہر کے خلاف توقع سوال کیا۔""اکیلے آتی ہیں۔"

"ہاں"

"لیکن تمہیں کیسے معلوم۔" شوہر نے حیرانی سے پوچھا۔

کیوں کہ تمہارے باس میرے خوابوں میں آرہے ہیں۔" بیوی نے مسکرا کر جواب دیا۔

(شرف الدین جیلانی-ٹنڈوالہ یار)

میری بات سن کر جو اس نے نگاہ اوپر کی تو میں جیسے سکتے میں آگیا...... اس کی آنکھیں انگارہ مانند تھیں، اور ساتھ ہی آنکھوں میں عجیب وحشت تھی...... اس کی آنکھیں دیکھ کر حقیقت میں مجسم سہم کر رہ گیا...... خیر میں نے ہمت یکجا کی اور نگہت کی کلائی پکڑلی...... کلائی کا میں نے پکڑنا تھا کہ نگہت نے ایک زبردست تھپڑ میرے گال پر جڑ دیا...... تھپڑ اتنا زبردست تھا کہ میں لڑکھڑا گیا اور اپنا گال سہلانے لگا۔ اور پھر نگہت کے منہ سے کھر کھراتی ہوئی کرخت مردانی آواز نکلی۔

"اوئے تو نے ہمت کیسے کی میری کلائی پکڑنے کی...... فوراً میرے سامنے سے چلا جا...... یہ لڑکی مجھے بہت پسند آگئی...... اب یہ میری ہے...... میں اس سے دست بردار نہیں ہوسکتا...... اور اگر تم لوگوں نے زور زبردستی کی تو میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

یہ سن کر حکیم وقار بولے۔"آپ گھبرائیں نہیں...... اطمینان رکھیں اللہ نے چاہا تو بہت جلد یہ مسئلہ

حل ہوجائے گا۔"

سلیم الزماں بولے۔ "حکیم صاحب عزت کی بات ہے...... نگہت کی شادی میں دو ماہ رہ گئے ہیں...... اس بات کو ہم نے پھیلنے نہیں دی...... کیونکہ لڑکی کا معاملہ ہے۔ اگر کسی کو میں آپ کی خدمت میں بھیجتا تو یقیناً بات دوسروں تک جا پہنچتی...... اور اسی لئے ہم خود دوڑے دوڑے آگئے، میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس ایک صاحب ہیں جو کہ روحانی علاج میں اپنا ثانی نہیں رکھتے...... اللہ نے انہیں بہت اونچا مقام عطا کیا ہے...... بہت رحم دل اور شفیق انسان ہیں...... آپ ان سے ملا دیں میں ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دوں گا۔"

حکیم وقار بولے۔ "سلیم الزماں صاحب...... آپ فکر نہ کریں...... یہ ہیں حکیم کامل اور یہی روحانی علاج کرتے ہیں......"

یہ سن کر سلیم الزماں صاحب نے جھٹ رولوکا کا ہاتھ پکڑلیا...... اور بہت ہی التجائیہ انداز میں روہانسی الفاظ میں بولے۔ "حکیم صاحب...... آپ کا ہم پر احسان عظیم ہوگا...... بچی کا معاملہ ہے...... آپ اندازہ کرسکتے ہیں...... ہماری پریشانی کا...... پتہ نہیں وہ آسیب گھر میں کیا ادھم مچا رہا ہوگا...... گھر میں بیگم اور بچے ہیں اور میرے ساتھ یہ میری ہمشیرہ ہیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی...... آپ کو خدا کا واسطہ...... میرے ساتھ تشریف لے چلیں......"

حکیم وقار بولے۔ "سلیم الزماں صاحب آپ اطمینان رکھیں......ہم آپ کے ساتھ چلتے ہیں......"

پھر رولوکا بولا سلیم الزماں سے۔ "چلئے ہم چلتے ہیں...... آپ اپنے دل کو قابو میں رکھیں۔" اور پھر وہ لوگ گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

سلیم الزماں اپنی گاڑی میں آئے تھے...... گاڑی میں ان کی ہمشیرہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئیں اور سلیم الزماں، رولوکا اور حکیم وقار پچھلی سیٹ پر براجمان ہوگئے۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گاڑی سڑک پر اپنی رفتار سے دوڑنے لگی۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد ڈرائیور نے ایک حویلی نما مکان کے سامنے گاڑی روک دی۔

گاڑی سے سب سے پہلے سلیم الزماں اترے اور پھر ڈرائیور اترا اور اس نے گاڑی کا اگلا دروازہ کھول دیا تو فرنٹ سیٹ سے خاتون اتریں۔ پچھلا دروازہ سلیم الزماں پہلے ہی کھول چکے تھے۔

خاتون گاڑی سے اترتے ہی گھر میں چلی گئی تھیں۔ اس کے بعد سلیم الزماں کے پیچھے پیچھے رولوکا اور حکیم وقار حویلی میں داخل ہوئے۔ اور ایک کمرے کے پاس جاکر سلیم الزماں رک گئے اور بولے۔ "حکیم صاحب یہی کمرہ نگہت کا ہے۔" اور دروازہ کھولنے میں وہ کچھ ہچکچانے لگے تھے جسے رولوکا نے محسوس کرلیا تھا۔ پھر رولوکا بولا۔ "آپ ہٹیں میں دروازہ کھولتا ہوں۔" اور رولوکا نے دروازے پر اپنے ہاتھ کا زور ڈالا تو دروازہ اندر کو کھلتا چلا گیا۔

رولوکا نے کمرے کے اندر قدم رکھا اور بولا۔ "السلام علیکم" اور جواب موصول نہیں ہوا۔

کمرے میں موجود مسہری پر ایک خوب صورت لڑکی چادر اوڑھے دراز تھی۔

کمرے میں مسہری کے علاوہ کوئی اور چیز یعنی کرسی یا بنچ وغیرہ نہیں تھی...... دبیز قالین پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ سب سے پہلے رولوکا نیچے بیٹھ گیا۔ اس کے بعد حکیم وقار بیٹھے۔ اس کے بعد رولوکا سلیم الزماں سے بولا۔ "آپ آدھا گلاس پانی لے آئیں۔"

یہ سن کر سلیم الزمان بولے۔ "جی حکیم صاحب!" اور فوراً کمرے سے باہر نکل گئے...... اور چند لمحے بعد ہی شیشے کے گلاس میں آدھا گلاس پانی لائے اور رولوکا کو گلاس پکڑا دیا۔

گلاس لینے کے بعد رولوکا منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا......

مسہری پر لڑکی ابھی تک ہر بات سے بے خبر بے سدھ پڑی تھی۔ اس بات سے وہ بالکل بے خبر تھی کہ اس کے سامنے کمرے میں تین اشخاص بیٹھے ہیں۔

چند منٹ تک کچھ پڑھنے کے بعد رولوکا نے گلاس کے پانی پر پھونک ماری...... اس کے بعد تھوڑا سا پانی ہاتھ کے چلو میں لے کر پانی کو لڑکی کے چہرے پر پھینک دیا۔

پانی کا چہرے پر پڑنا تھا کہ لڑکی کے منہ سے غیض وغضب کی حالت میں زبردست پھنکار جیسی آواز نکلی اور ساتھ ہی وہ طیش کے عالم میں اٹھ کر مسہری پر بیٹھ گئی اور قہر برساتی آنکھوں سے رولوکا کو گھورنے لگی۔ اس وقت اس کی آنکھوں کی رنگت...... خدا کی پناہ!!

ایسا لگتا تھا کہ جیسے دودہکتے ہوئے انگارے اس کی آنکھوں میں رکھ دیئے گئے ہوں۔ اس کی سانسوں کی آواز پورے کمرے میں گونج رہی تھی۔ ایسا دل خراش منظر تھا کہ اگر رولوکا نہ ہوتا تو سلیم الزمان اور حکیم وقار یقیناً کمرے سے نکل گئے ہوتے۔

رولوکا کی آواز سنائی دی۔ ''ہاں بھئی تم نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا...... کیا یہ اچھی بات ہے؟'' مگر رولوکا کی بات کا اب بھی کوئی جواب نہیں ملا بلکہ لڑکی کی آنکھیں مزید سرخ ہو کر قہر برسانے لگیں اور ساتھ ہی اس کی سانس اور زور زور سے چلنے لگی۔ سانس کی آواز سن کر ایسا لگتا تھا کہ جیسے کوئی زبردست لحیم شحیم سانپ پھنکار رہا ہو اور پھر اچانک کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا...... اب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسا ہونے پر جھٹ رولوکا نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر سلیم الزماں اور حکیم وقار کی طرف کر دیئے وہ اس لئے کہ اگر لڑکی پر سوار نادیدہ قوت کی طرف سے کوئی آواز ہوتی تو وہ دونوں اس آواز سے محفوظ رہیں...... رولوکا پر تو اس کا کوئی وار کارگر ہو نہیں سکتا تھا کیونکہ رولوکا ہر وقت بدنی حصار میں رہتا تھا...... اور یہ حقیقت ہے کہ تمام عامل ضروریات سے فارغ ہوتے ہی بدنی حصار میں رہتے ہیں کیونکہ انہیں ڈر ہوتا ہے کہ کوئی بھی نادیدہ طاقت موقع ملتے ہی ان پر کوئی وار کر سکتی ہے۔

اندھیرے میں رولوکا کی آواز سنائی دی۔ ''اپنے اوچھے ہتھکنڈے سے باز رہ نہیں تو میں بھی اس کا سخت جواب دوں گا...... تو تیرے پاس پچھتانے کے سوا کچھ نہ رہے گا۔''

اس آواز کے فوراً بعد کمرے میں اجالا پھیل گیا۔ لیکن لڑکی کا انداز وہی باغیانہ تھا۔

''ہاں بھئی تو کون ہے اور تیرا نام کیا ہے؟ اور تو نے بچی کو کیوں پریشان کیا...... تیرا مقصد کیا ہے؟'' رولوکا بولا۔ اور اپنی نظریں اس پر مرکوز کر دیں۔

جواب پھر ندارد...... رولوکا کی آواز آئی......

''میری بات کا جواب دے...... نہیں تو یہ پانی تجھ پر پھینکتا ہوں۔''

یہ سن کر لڑکی کے منہ سے پھنکارتی ہوئی آواز نکلی۔ ''اس میں تیرا بھلا ہے کہ تو یہاں سے چلا جا...... نہیں تو تو خود پچھتائے گا...... میرا نام یوناش ہے اور میرا تعلق سورج کے پجاری جنات قبیلے سے ہے...... میں یہاں سے گزر رہا تھا کہ اس لڑکی کے لہراتے بل کھاتے بال، انداز بانکپن اور دل موہ لینے والے قہقہے نے میرے قدم روک لئے...... دل کو مست کرتی چاندنی...... اور پھولوں بھرا لان...... کاش! کہ اگر کوئی بھی اس وقت کا منظر دیکھتا تو اپنا دل تھام کر رہ جاتا۔ اور اب اس لڑکی سے میری دست برداری ناممکن ہے...... میں اپنی جان تو دے سکتا ہوں مگر اس کے وجود کو نہیں چھوڑ سکتا...... لہٰذا تو اپنی فکر کر اور یہاں سے چلا جا...... یہاں سے جانے کے بدلے میں اگر تو چاہے تو میں سونا چاندی اور جواہرات سے تیرا گھر بھر دوں گا...... یا پھر......''

اور لڑکی کے منہ سے آواز آنا بند ہو گئی کیونکہ رولوکا بول پڑا تھا۔ ''تو اپنا مشورہ اپنے پاس رکھ...... اور دیکھ ضد اچھی نہیں ہوتی...... جب پانی تجھ پر پڑا تھا تو تجھے اندازہ ہو گیا ہوگا اپنی اور میری طاقت کا...... میں تجھے نرم الفاظ میں مشورہ دے رہا ہوں کہ تو بچی کی جان چھوڑ دے۔

میں مانتا ہوں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ تو جوانی اور جوانی کی سوچیں باغیانہ ہوتی ہیں...... اپنی خواہش اور

سوچ کے آگے دوسروں کے مشورے برے لگتے ہیں...... اس عمر میں ہر کوئی باشعور نہیں ہوتا، اسے آنے والے وقت کا اندازہ نہیں ہوتا...... بھری ہوئی سوچیں جن وانس میں رچی بسی ہوتی ہیں جو کہ کبھی کبھار باعث ہلاکت ہو جاتی ہیں۔

''ابھی بھی کچھ بگڑا نہیں...... میری بات مان لے...... اور اپنے آپ پر رحم کھا...... بچی کی جان چھوڑ دے۔'' رولوکا بولا۔ کہ اتنے میں لڑکی کے سارے بال تنکوں کی طرح سر کے اوپر کھڑے ہو گئے اور پھر سارے بالوں سے ہلکی ہلکی آگ کی چنگاریاں نکلنے لگیں...... جسے دیکھ کر کمزور دل ہر کوئی دہل جاتا اور کمرے سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلتا...... مگر رولوکا اپنی جگہ بیٹھا مسکراتا رہا۔ رولوکا کے پیچھے سلیم الزماں اور حکیم وقار سہمے ہوئے بیٹھے تھے اور کمرے میں دل دہلاتے منظر کو دیکھ رہے تھے۔

پھر اچانک لڑکی کا سر چاروں طرف گھومنے لگا...... ''اوہ خدایا! جسم وجاں پر سکتہ طاری کرتا...... جسم کے سارے رونگٹے کھڑے کرتا اور رگوں میں گردش کرتا لہو کو منجمد کرتا منظر اور اس پر لڑکی کے کان پھاڑ بے ہنگم قہقہے جو کہ ناقابل بیان تھے...... یہی وجہ تھی کہ رولوکا نے کسی اور فرد کو کمرے میں ٹھہرنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ ایسے معاملات میں اکثر کمزور دل حضرات دل دہلاتا خطرناک منظر کو دیکھ کر اپنا ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

اور پھر اسی پر اکتفا نہیں ہوا...... ساتھ ہی ساتھ لڑکی کے منہ سے اس کی بالشت بھر لمبی زبان نکل کر لپ لپ کرنے لگی...... اور زبان میں سے بھی چنگاریاں نکلتی نظر آنے لگیں۔

اور پھر رولوکا کی غضبناک آواز کمرے میں گونجی۔ ''بند کر یہ اپنے اوچھے ہتھکنڈے...... ان حرکتوں سے تو مجھے مرعوب نہیں کر سکتا...... تم جیسے ایسے اوچھے ہتھکنڈے میں اکثر دیکھتا رہتا ہوں...... تجھ جیسے کم ظرف جنات اس قسم کے شعبدہ بازی سے لوگوں کو ڈراتے ہیں......

جو عملی عامل ہوتے ہیں وہ تو ان شعبدہ بازیوں سے مرعوب ہو کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور پھر تم لوگ خود کو بہادر سمجھتے ہو۔

انسان کی طرح تم لوگ بھی خدا کی تخلوق ہو...... خدا نے تمہیں ایسی طاقت دی ہے کہ تم خود کو انسان کی نظروں سے پوشیدہ رکھ سکتے ہو...... تو کیا یہ زیب دیتا ہے کہ تم دیگر تخلوق خدا کو تکلیف میں مبتلا کر دو، اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ تم سب طیش میں آ کر لوگوں کا ناقابل تلافی نقصان کر بیٹھتے ہو۔

تم نے تو اپنے اوچھے ہتھکنڈے آزما لئے، میری باتوں کو رد کر دیا...... میرے مشورے کو بالائے طاق رکھا...... کیا یہ اچھا لگے گا کہ میں تم پر سختی کروں جسے تم برداشت نہ کر سکو...... اور اگر یہی بات ہے تو یہ لو۔'' اور یہ بولتے ہی رولوکا نے اپنا سیدھا ہاتھ اس کی طرف کر دیا۔ ہاتھ کی ہتھیلی کا رخ مسہری کی طرف ہونا تھا کہ لڑکی نے جھٹ اپنی گردن دونوں ہاتھ سے پکڑ لی اور اس کے منہ سے ایسی آواز نکلنے لگی جیسے کہ کوئی نادیدہ طاقت اس کی گردن دبا رہی ہو۔

''اوئے میری گردن چھوڑ دے...... چھوڑ دے میری گردن نہیں تو بہت پچھتائے گا...... چھوڑ دے جلدی سے نہیں تو......'' اور پھر لڑکی کے دونوں ہاتھ گردن سے ہٹ گئے اور وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی۔

اب اس کے سارے بال اصلی حالت میں آ چکے تھے اور اب آنکھوں سے چنگاریاں بھی نہیں نکل رہی تھیں، اور اب اس کی گردن کا گھومنا بند ہو گیا تھا۔

پھر لڑکی کا منہ بھاڑ جیسا کھلا اور منہ سے آندھی اور طوفان کی تیزی سے ایک پر ہیبت ڈراؤنا سانپ نکلا اور چشم زدن میں رولوکا کی طرف بڑھا...... وہ منظر واقعی ہارٹ اٹیک والا تھا۔

مگر وہ سانپ رولوکا تک کیا پہنچتا...... رولوکا سے دو فٹ دوری پر ہی ہوا میں تحلیل ہو کر غائب ہو گیا۔ پھر ایسا ہوا کہ مسہری پر موجود لڑکی مسہری سے اوپر کو اٹھنے لگی اور پھر پلک جھپکتے ہی اس کے نیچے شعلے بھڑک نے

لگے۔ اس طرح وہ کافی اوپر ہوا میں معلق ہوگئی اور بدستور اس کے نیچے شعلے بھڑکتے رہے۔

یہ دیکھ کر رولوکا نے اپنے ہاتھ کی سیدھی انگلی سے مسہری کی طرف اشارہ کیا تو یکدم شعلے بھڑکنا بند ہوگئے اور لڑکی آہستہ آہستہ اوپر سے نیچے کو آتے آتے مسہری پر ٹک گئی۔

پھر رولوکا اپنی جگہ سے اٹھا اور کافی جگہ لے کر سلیم الزماں حکیم وقار اور اپنے گرد ایک حصار قائم کردیا اور پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

اس کے بعد لڑکی بھی مسہری سے نیچے اتری اور نیچے بیٹھ کر اپنے گرد اپنے دونوں ہاتھوں کی دونوں انگلیوں سے حصار قائم کرلیا۔ اس کا کھلا مطلب یہ تھا کہ اب رولوکا اور لڑکی پر سوار جن نے اپنے اپنے گرد حصار قائم کرکے نئے وار کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔

اپنے گرد حصار قائم کرنے کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخالف سمت سے کیا گیا وار کارگر نہیں ہوتا اور حصار کرنے والا حصار میں محفوظ ہوتا ہے کسی بھی کاری اذیت سے۔

پھر لڑکی کے ہونٹ حرکت کرنے لگے اس کا مطلب یہ تھا کہ لڑکی پر سوار جن کسی جنتر منتر کا ورد کرنے لگا تھا...... پھر اس نے اپنا منہ اوپر کرکے پھونک ماری۔ اس کے چند لمحے بعد ایسا محسوس ہوا کہ کمرے کی فضا میں گرمی سرایت کررہی ہے اور پھر کمرے میں گرمی کا اضافہ ہوتے ہوتے ناقابل برداشت گرمی ہوگئی۔

اس کے بعد پھر ٹمپریچر اتنا بڑھا کہ جیسے کمرہ انگارے کی طرح دہکنے لگا مگر کمال کی بات یہ تھی کہ رولوکا نے جو حصار کھینچا تھا، گرمی اس حصار کے باہر باہر تھی۔ جب وہ جن اس سے بھی تھک گیا تھا تو اس نے ایک اور دل دہلاتا حالات سے دوچار کردیا۔

اچانک کمرے میں دہشت ناک ڈراؤنے سانپ پھنکارتے ہوئے نمودار ہوگئے۔

''خدا کی پناہ۔''...... ان سانپوں کی پھنکار سے پورا کمرہ لرزنے لگا...... پورے جسم پر سکتہ طاری ہونے لگا مگر رولوکا حکیم وقار اور سلیم الزماں کے ساتھ آرام وسکون سے بیٹھا رہا...... اور پھر رولوکا نے اپنے ہاتھ کی انگلی سے ایک طرف اشارہ کو تو پلک جھپکتے ایک کیم شحیم اژدھا نہ جانے کہاں سے اچانک نمودار ہوا اور اس نے اپنا سانس اس زور سے اندر کو کھینچا کہ تمام کے تمام سانپ اس کے منہ میں تنکے کی طرح کھنچے ہوئے اندر چلے گئے۔

یہ دیکھتے ہی لڑکی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اب اس کی آنکھ میں وحشت صاف نظر آرہی تھی۔

حصار سے پہلے رولوکا نے اپنے پاس ایک درمیانے سائز کی چاپچی رکھ لی تھی نہ جانے کیوں اور ساتھ ہی پانی کا ایک جگ اور دو شیشے کے گلاس۔

اب رولوکا نے اپنے سیدھے ہاتھ کی سیدھی انگلی پر پھونک مار کر انگلی کو نیچے رکھی اور انگلی کا رخ اس حصار کی طرف کردیا جس طرف لڑکی بیٹھی تھی۔

رولوکا کی انگلی سے ایک سرخ روشنی کی لکیر نکلی اور مخالف حصار کی طرف بڑھنے لگی۔ اس سرخ لکیر کا حصار سے ٹکراتے ہی زور کی چنگاری نکلی اور پھر اس کے بعد لڑکی جسم فرش پر لوٹنے لگی اس کے منہ سے غضب کی آواز نکلنے لگی...... ''مجھے چھوڑ دے...... ارے مجھے چھوڑ دے...... جلدی سے مجھے چھوڑ...... ورنہ میں تیرا حشر نشر کردوں گا۔'' اور پھر اس طرح کی دیگر باتیں لڑکی کے منہ سے نکلنے لگی تھیں۔

چند منٹ کے بعد لڑکی اپنی جگہ خاموش ہوکر بیٹھ گئی۔

رولوکا کی آواز سنائی دی۔ ''یوناش اب تیرا ارادہ کیا ہے؟...... جلدی سے بول کہ تو اس بچی کی جان چھوڑتا ہے کہ نہیں...... یا پھر میں تیرا مکمل علاج کردوں۔''

لڑکی پر سوار جن غراتے ہوئے بولا۔ ''میں کسی صورت بھی اس کی جان چھوڑ کر نہیں جاؤں گا...... اور اگر جاؤں گا تو اسے ساتھ ضرور لے کر جاؤں گا۔

اور یہ تو نے اچھا نہیں کیا کہ پورے کمرے کے

گرد حصار قائم کردیا ہے اگر یہ حصار پورے کمرے کے اندر اور باہر قائم نہ ہوتا تو ابھی تک میری ایک آواز پر میرا پورا قبیلہ میری مدد کو آجاتا۔ مگر تو میرے ساتھ چھل کرگیا۔ مگر میں بھی تجھے آخری وقت تک نہیں چھوڑوں گا۔" اور پھر وہ زور زور سے ڈکرانے لگا...... اس کی آواز سے پورا کمرہ جیسے دہلنے اور لرزنے لگا۔ مگر وہ تمام آوازیں کمرے کے اندر ہی گونج رہی تھیں۔ کمرے سے باہر کوئی بھی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔

لیکن دوسرے کمرے میں بیٹھے ہوئے سارے گھر والے اللہ اللہ کررہے تھے۔ کوئی تسبیح پڑھ رہا تھا تو کوئی آیت کریمہ اور کوئی ہاتھ اٹھائے گڑگڑاتے ہوئے اللہ سے دعا کررہا تھا کہ "یا اللہ نگہت پر اپنا رحم و کرم اور اس کم بخت منحوس جن سے اس کی جان چھڑا دے۔"

جب رولو کا ہر طرح سے سمجھا بجھا کر تھک گیا اور اس جن پر اس کی باتوں کا کوئی اثر ہو کے نہیں دے رہا تھا تو پھر رولو کا نے اپنے دل میں حتمی فیصلہ کرلیا کہ اب اس جن کا مکمل علاج کرنا ہی پڑے گا۔ اس کے بعد ایک بار پھر رولو کا نے اسے سمجھایا مگر وہ ضدی ہٹ دھرم جن ٹس سے مس نہ ہوا تو پھر رولو کا نے ایک لمبا سانس کھینچا یعنی رولو کا نے اب آخری وار کے لئے خود کو تیار کرلیا۔

رولو کا نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر اپنی انگلی پر پھونک ماری تو انگلی سے سرخ شعلہ نکلا اور پھر وہ شعلہ لڑکی کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے لڑکی کے جسم سے ٹکرایا۔ اور پھر لڑکی کا پورا وجود شعلوں میں گھر گیا۔

اب جو لڑکی کے منہ سے مردانی فلک شگاف چیخیں نکلیں تو ایسا لگا کہ پورا کمرہ ہی زمین بوس ہوجائے گا۔ پھر تمام شعلہ لڑکی کے وجود سے اوپر کو اٹھتے اٹھتے کافی اوپر جاکر معلق ہوگیا۔ اب سارے شعلے ایک جگہ سمٹنے لگے اور پھر ایک بہت چھوٹی گیند کی شکل اختیار کرلیا۔

شعلے سے جیسے ہی لڑکی کا وجود الگ ہوا تو مجسم لڑکی فرش پر گر کر بے سدھ ہوگئی۔

پھر وہ گیند نما شعلہ اڑتا ہوا چلمچی کے پاس آیا اور چلمچی میں دھپ سے گر گیا۔ اس کا چلمچی میں گرنا تھا کہ چلمچی سے گاڑھا گاڑھا دھواں اوپر کو اٹھنے لگا۔ دھوئیں کے اٹھنے سے ایسی بو پھیلی جیسے کہ انسانی گوشت جل رہا ہو۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارا دھواں بھی ختم ہوگیا۔

اب چلمچی میں تھوڑی سی کالی راکھ پڑی تھی۔

اسے دیکھ کر رولو کا بولا۔ "خس کم جہاں پاک۔" اور رولو کا لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ چند لمحے ایسا ہی ہوتا رہا پھر رولو کا بولا۔ "سلیم الزماں صاحب اب آپ کی بچی بالکل ٹھیک ہے۔ اس وقت یہ بے سدھ ہوکر گہری نیند میں ہے۔ اسے اٹھا کر مسہری پر لٹادیں اور جب تک سوتی رہے اسے اٹھایئے گا نہیں۔ یہ خود اپنی نیند سے اٹھے گی۔ جب یہ جاگ جائے تو اسے گرم پانی سے نہلا دیجئے گا۔ یہ بالکل اپنے نارمل حالت میں ہوگی۔ گھر والوں کو منع کردیجئے گا کہ بیتے ہوئے لمحات کا اس کے سامنے تذکرہ نہ کریں۔

اور ہاں اس بات کا اور خیال رکھیے گا کہ آپ کی بچی گیارہ دن تک مغرب کے بعد پھولوں کے لان میں نہ جائے اور یہ بھی ضروری ہے کہ ان دنوں میں گھر سے بھی باہر قدم نہ نکالے۔ وجہ یہ ہے کہ جب یہ جن کافی وقت گزرنے کے اپنے قبیلہ یا اپنے گھر میں نہیں پہنچے گا تو اس کے گھر والے تشویش میں مبتلا ہوکر اس کی کھوج میں نکلیں گے اور اس کی بو سونگھتے پھریں گے اور پھر انہیں پتہ چل جائے گا کہ اب یہ دنیا میں موجود نہیں تو پھر وہ غمزدہ ہوکر بے چین ہوجائیں گے اور یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ کس لئے اور ایسا کرنے والا کون ہے۔

اور وہ جب جان جاتے ہیں کہ اس کے ساتھ برا کرنے والا کوئی طاقتور عامل ہے تو پھر رو دھو کر خاموش ہو بیٹھتے ہیں...... اور پھر یقیناً اپنے دل میں یہ بیٹھا لیتے ہیں کہ مرنے والا ضرور کچھ نہ کچھ ایسا کیا ہوگا جس سے تنگ آکر عامل نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے۔

کیونکہ تمام نادیدہ قوتوں کو معلوم ہے کہ کبھی بھی کوئی بڑا عامل کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا۔ جب ان میں سے کوئی بہت انتہائی ناقابل برداشت قدم اٹھاتا ہے

تو کوئی عامل بہت مجبور ہو کر اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے اور دل برداشتہ ہو کر انتہائی مرنے مارنے والا قدم اٹھاتا ہے اور اس ضدی نافرمان اور ہٹ دھرم وجود کا خاتمہ کردیتا ہے کہ وہ دوبارہ کوئی خطرناک جان لیوا قدم اٹھا کر انسان کو نقصان نہ کر بیٹھے اور یہ ضروری ہوتا ہے کہ ایک ضدی اور ہٹ دھرم جن طیش میں آکر اپنے مخالف انسان کا ناقابل برداشت اور جان لیوا نقصان کر بیٹھتا ہے۔

سلیم الزماں صاحب اب شک وشبہ اور ڈر وخوف کی کوئی گنجائش نہیں، آپ اور گھر والے بالکل بھی اپنے دل میں ذرہ برابر بھی ڈر آنے نہ دیجئے گا۔ میں نے تمام معاملہ مضبوطی سے حل کردیا ہے بلکہ میں نے آپ کے گھر کے گرد ایک مضبوط حصار قائم کردیا ہے۔ جس کی وجہ سے اب کبھی بھی کوئی نادیدہ قوت اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن پھر بھی ہر انسان کو احتیاط کرنی چاہئے اور خاص طور پر جب بچیاں جوان ہوجائیں تو خاص احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ مغرب کے بعد بچیوں کو کھلے بال رہنا ٹھیک نہیں اور پھر باغ باغیچہ میں بھی جانے سے احتیاط کرنی چاہئے اور عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ علاقے جو کہ زیادہ کھلے ہوتے ہیں جہاں گنجان آبادی نہیں ہوتی ان علاقوں میں نادیدہ طاقتیں زیادہ آیا جایا کرتی ہیں۔

شہر یا شہری علاقوں سے ایسی طاقتیں دور رہتی ہیں۔ پہاڑی یا میدانی علاقوں میں یہ طاقتیں رہائش پذیر ہوتی ہیں۔ یا پھر ان جنگلات میں جہاں گنجان پن نہیں ہوتا اور جس طرح انسان کے محلے قبیلے اور خاندان ہوتے ہیں یہ طاقتیں بھی انسان ہی کی طرح اپنا بود وباش کرتی ہیں......ان کے بھی بڑے ہوتے ان کے یہاں بھی عدل وانصاف ہوتا ہے......ان کے یہاں بھی نافرمانی پر سزائیں دی جاتی ہیں......ان کے یہاں بھی شادی بیاہ اور رشتے ناطے ہوتے ہیں...... ان کے یہاں بھی کوئی کسی غیر لڑکی کے ساتھ زور زبردستی اور چھیڑ چھاڑ نہیں کرسکتا......ان کے یہاں بھی پیدائش اور موت کا سلسلہ جاری ہے......انسان کی عمریں کم ہوتی ہیں اور ان کی عمریں ہزاروں سال کی ہوتی ہیں۔

سلیم الزماں صاحب خیر جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا، اب ہمیں اجازت دیں...... اس کے بعد اگر کوئی ضرورت پڑی تو ہم حاضر ہیں آپ بلا جھجک آسکتے ہیں۔'' اور یہ بول کر رولوکا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ حکیم وقار بھی کھڑے ہوگئے۔ سلیم الزماں بولے۔ ''حکیم صاحب ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں اور پھر حکیم وقار کی طرف مڑ کر بولے۔ ''حکیم صاحب یہ تھوڑے سے پیسے ہیں آپ قبول کرلیں......مطب کے کام آئیں گے۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ حکیم کامل ایک پیسہ بھی قبول نہیں کرتے۔''

یہ سن کر رولوکا بولا۔ ''سلیم الزماں صاحب بس آپ ہمارے حق میں دعائیں کرتے رہیے گا۔''

پھر حکیم وقار بولے۔ ''سلیم الزماں صاحب ان پیسوں کو ہماری طرف سے مستحقین میں بانٹ دیجئے گا۔''

''اچھا اب ہمیں اجازت دیں اور ایک مہربانی یہ کریں کہ ڈرائیور کو بولیں کہ ہمیں مطب تک چھوڑ دے۔''

یہ سن کر سلیم الزماں بولے۔ ''حکیم صاحب ڈرائیور کیا بلکہ میں بھی ساتھ چلوں گا، آپ لوگوں کو مطب تک پہنچھوڑوں گا۔ اتنی خدمت تو ہمارا حق بنتا ہے۔ چلئے ساتھ چلتے ہیں۔'' اور یہ بول کر سلیم الزماں کمرے سے نکلتے چلے گئے۔ باہر جا کر انہوں نے ڈرائیور کو آواز دی تو ڈرائیور گاڑی کے قریب ہی موجود تھا بولا۔ ''جی حضور حکم کریں۔''

سلیم الزماں صاحب بولے۔ ''سلامت ہمارے ساتھ چلو حکیم صاحب کو دلی مطب میں چھوڑنا ہے گاڑی اسٹارٹ کرو۔''

یہ سن کر ڈرائیور نے جھٹ دروازہ کھول دیا تو رولوکا اور حکیم وقار گاڑی میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور سامنے سیٹ پر سلیم الزماں بیٹھے اور گاڑی اسٹارٹ ہو کر سڑک پر دوڑنے لگے۔

اور پھر ڈیڑھ گھنٹہ کی مسافت کے بعد گاڑی کو ڈرائیور نے مطب کے سامنے روک دیا اور جھٹ باہر نکل کر گاڑی کا دروازہ کھول دیا تو رولوکا اور حکیم وقار گاڑی سے باہر نکلے...... سلیم الزماں پہلے ہی گاڑی سے باہر نکل چکے تھے۔ اس کے بعد سب نے ایک دوسرے سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا اور پھر خدا حافظ بول کر سلیم الزماں گاڑی میں بیٹھ کر واپس آ گئے۔

رولوکا اور حکیم وقار اپنے کمرے میں بیٹھے تو حکیم وقار بولے۔ ''حکیم صاحب کم بخت بہت ہی ضدی جن تھا۔'' اور پھر ملازم کو بلا کر حکیم وقار بولے۔ ''بھئی ذرا جلدی سے دو گلاس شربت لاؤ۔'' اور یہ سنتے ہی ملازم شربت لینے چلا گیا۔

رولوکا بولا۔ ''حکیم صاحب اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی جوان جن کسی خوب صورت لڑکی پر فریفتہ ہوتا ہے تو بہت مشکل سے جان چھوڑتا ہے یا پھر ضد میں آ کر عامل کے ہاتھوں ضائع ہو جاتا ہے اور یہی کچھ یہاں پر ہوا ہے۔'' باتیں ہو رہی تھیں کہ ملازم دو گلاس شربت لے آیا اور میز پر رکھ کر چلا گیا۔ حکیم وقار بولے۔ ''حکیم صاحب شربت پئیں۔'' اور پھر رولوکا اپنا گلاس اٹھا کر شربت پینے لگا۔

شربت پینے کے بعد رولوکا بولا۔ ''اچھا حکیم صاحب اب میں اپنے کمرے میں چلتا ہوں کیونکہ کارندوں کی طرف سے کچھ سگنل موصول ہو رہے ہیں۔ چل کر دیکھتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے؟''

یہ سن کر حکیم وقار بولے۔ ''حکیم صاحب کھانے میں ایک گھنٹہ رہ گیا ہے...... وقت پر آ جایئے گا تاکہ مل کر ساتھ کھانا کھائیں۔''

رولوکا بولا۔ ''ٹھیک ہے میں وقت پر پہنچ جاؤں گا۔'' یہ بول کر رولوکا اٹھا اور حکیم وقار کے کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

رولوکا اپنے کمرے میں پہنچا تو اس کے کارندے اپنے اپنے کاموں کی تفصیل بتانے لگے...... یہ وہ کام تھے جن پر رولوکا نے اپنے کارندوں کو خبر گیری کے لئے لگایا تھا۔

پھر سب سے آخر میں رولوکا نے جاگتے الوے پوچھا۔ ''ہاں بھائی تمہاری کیا خبر ہے؟ زالوشا کے متعلق؟'' تو الو گویا ہوا۔ ''جناب! زالوشا ان دنوں اپنے آپ میں بہت بے چین ہو رہا ہے اس کی کوشش ہے کہ جلد از جلد التمش عرف دینو بابا اور مانی پہلوان کو مسل کر رکھ دے۔ لیکن جنگل میں رہائش زنتاش جن نے اسے زبردستی روک رکھا ہے کہ وہ چند دن اور جنگل میں قیام کرے...... کیونکہ ایسا کرنے سے...... دینو بابا اور مانی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جو آپ ہیں...... تو زیادہ دن ہونے کے باعث آپ کا دھیان زالوشا کی طرف سے ہٹ جائے گا...... اور جب آپ کے ذہن سے زالوشا نکل جائے گا تو اس صورت میں زالوشا اپنے دشمنوں پر بھاری پڑے گا۔

اور سب سے پہلا وار آپ پر کرے گا...... پھر اس کے بعد دینو بابا اور مانی اس کے لئے تو کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے، انہیں تو وہ چٹکیوں میں مسل کر رکھ دے گا۔

ویسے زنتاش نے زالوشا سے یہ بات کی ہے کہ سب سے پہلے تم اپنی راہ کی رکاوٹ دشمن کا اتہ پتہ بتاؤ تاکہ میں جا کر اسے اپنے تئیں تولوں کہ وہ کتنے پانی میں ہے اور یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہوگا کیونکہ اگر تم گئے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم طیش میں آ کر اس کے ساتھ بھڑ جاؤ اور پھر اس کا نقصان کرنے کے بجائے اپنا نقصان کر بیٹھو۔''

لیکن زالوشا...... نے زنتاش کی بات ماننے سے یکسر منع کر دیا ہے اور بولا ہے کہ ''زنتاش اپنے کندھے کا بوجھ میں تم پر نہیں ڈال سکتا...... میں خود ہی اکیلا کافی ہوں اپنے دشمن کے لئے۔''

میں تو رولوکا کو تگنی کا ناچ نچا کر اتنا ہلکان کر دوں گا کہ اسے دنیا میں کہیں پناہ نہیں ملے گی...... اور جب اس کے ساتھ ایسا ہوگا اور وہ تھک کر چور چور ہو جائے گا تو میں اس کے ساتھ بلی اور چوہے والا کھیل کھیل کر مزہ لوں گا...... اور پھر آخر میں اس کا خاتمہ کر دوں گا۔

اور رہا التمش تو اس کے ساتھ تو ایسا انتقام لوں گا

کہ وہ تھرا اٹھے گا۔ وہ بھی جن ہے اور میں بھی جن ہوں اور یہ تو تمہیں بھی معلوم ہے کہ جب دو جن آپس میں ٹکراتے ہیں تو کیا کچھ نہیں ہوتا......

میں التمش کو اپاہج کر کے گھونٹ گھونٹ پانی کے لئے ترسا دوں گا...... وہ میرے پاؤں پکڑ کر گڑگڑائے گا...... میرے تلوے چاٹے گا...... وہ مجھ سے اپنی موت مانگے گا مگر میں اسے موت کے لئے ترسا دوں گا...... وہ ماہئی بے آب کی طرح تڑپے گا...... وہ جاں کنی کے عالم میں زالوشا...... زالوشا...... پکارتا رہے گا...... اور رہا مانی پہلوان تو وہ میرے مقابلے کا ہے ہی کہاں...... وہ تو میرا کوئی سا بھی ایک ادنیٰ وار برداشت نہ کر سکے گا اور موت سے ہمکنار ہو جائے گا...... بس تم دیکھتے جاؤ کہ میں کیا کرتا ہوں۔“

زالوشاہ...... کی یہ باتیں سن کر زنتاش بولا۔

”زالوشا...... میں چونکہ تمہاری مدد کا وعدہ کر چکا ہوں تو میں تمہاری مدد کرنے سے پیچھے نہیں ہٹوں گا...... میں مانتا ہوں کہ ہم الگ الگ شکتیوں کے پوجنے والے ہیں مگر ہیں تو جنات ناں...... ویسے تمہاری عام باتوں سے میں نے ایک نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر تم نے مکمل تیاری سے قدم آگے نہیں بڑھایا تو تمہارا دشمن تمہیں دبوچ لے گا۔

ایک بات اور میرے دماغ میں آ رہی ہے کہ کیوں ناں تم اپنے دشمن سے دست بردار ہو جاؤ...... اس سے یہ ہوگا کہ تم خواہ مخواہ ہلکان ہونے سے بچ جاؤ گے...... اور پھر تم ایک نئی زندگی شروع کرو گے...... میرا تو مشورہ ہے کہ کم کھاؤ...... غم نہ کھاؤ......

اور بقول تمہارے کہ جب تم شابولا کا جاپ شروع کرتے ہو تو اس میں رکاوٹ آتی ہے...... اور اگر اس طرح ہر مرتبہ شابولا کو حاصل کرنے کے جاپ میں رکاوٹ آتی رہی تو تم اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے اور ایک وقت آئے گا کہ شابولا تم پر نظر کرم کرنا چھوڑ دے گا، اور اگر ایسا ہو گیا تو تمہاری پوری زندگی اکارت ہو جائے گی۔

ایک تو تم اپنی ضدی طبیعت اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے قبیلہ بدر کر دیئے گئے ہو...... ضدی اور ہٹ دھرم کا ویسے بھی زیادہ ساتھی نہیں ہوتے...... اور کہیں ایسا......“ اور پھر زنتاش کی بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اس وقت ایک جن آ دھمکا۔

”ہاں بھئی کنتاش! یہاں پر کیسے آنا ہوا؟“ زنتاش نے پوچھا۔

کنتاش بولا۔ ”زنتاش بھائی آپ کو سردار نے فوراً بلایا ہے...... اور سردار نے ہی فرمایا تھا کہ تم اس جگہ ملو گے تو میں دوڑا دوڑا چلا آیا...... ویسے نہ جانے سردار کا موڈ کیوں بگڑا ہوا ہے...... لگتا ہے سردار نے تمہیں کسی کام پر لگانا ہے۔“ اور یہ بول کر کنتاش خاموش ہو گیا۔

زنتاش بولا۔ ”اچھا زالوشا...... میں چلتا ہوں نہ جانے کیوں سردار نے یاد کیا ہے! اور اچانک کسی کو سردار جب بلاتا ہے تو ضرور کچھ نہ کچھ دال میں کالا ہوتا ہے۔ میں سردار سے مل کر آتا ہوں...... ویسے تم آرام کرو...... اور اپنے آگے کا سوچو کہ کیا کرنا ہے۔“ اور یہ بول کر کنتاش کے ساتھ زنتاش چلا گیا۔

زنتاش جیسے ہی نظروں سے اوجھل ہوا تو اچانک چھ سات جن اس جگہ نمودار ہوئے اور پلک جھپکتے ہی زالوشا کو آہنی زنجیروں میں جکڑ دیا...... یہ کام اتنا آناً فاناً ہوا کہ زالوشا اچنبھے میں پڑ گیا کہ ان سب نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا......“ فوراً اس کے دماغ میں آیا کہیں میرے دشمن نے تو یہ قدم نہیں اٹھایا۔“

ادھر جب کنتاش کے ساتھ زنتاش سردار کی خدمت میں حاضر ہوا تو سردار کی قہر برساتی نظروں نے اس کا استقبال کیا...... سردار کی نظروں میں غیض و غضب دیکھتے ہی زنتاش اندرونی طور پر سہم کر رہ گیا۔ مگر اس میں ہمت نہ تھی کہ وہ سردار سے کچھ پوچھتا۔

سردار متواتر اسے گھورتا رہا کہ اتنے میں کئی جن اس جگہ نمودار ہوئے...... اور ان کے نرغے میں زالوشا...... زنجیروں میں جکڑا پڑا تھا۔

زالوشا پر سردار کی نظریں پڑتے ہی سردار کی غضبناک آواز سنائی دی۔ ”تو یہ ہے وہ نافرمان جو کہ

بغیر میری اجازت کے ہمارے قبیلے کی حدود میں چین کی بانسری بجا رہا ہے۔ اس نے ذرا بھی نہ سوچا کہ بغیر کسی کی اجازت کے کسی کے علاقے میں جانا جرم ہوتا ہے۔ اس نے ہماری آنکھوں میں دھول جھونکا ہے۔

لیکن دوسرا جرم زنتاش نے کیا ہے کہ اس کے متعلق اس نے مجھے نہیں بتایا...... اور اس کے ساتھ راز و نیاز کی باتوں میں معروف رہا...... قبیلے کا قاعدہ قانون اس نے بھی توڑا ہے لہٰذا یہ بھی سزا کا مستحق ہے۔"

یہ سن کر زنتاش گویا ہوا۔ "سردار میں اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔ یہ میری غلطی ہے...... کہ میں نے اجنبی کے متعلق آپ کو بتایا نہیں...... اور جب میں اجنبی کے پاس آیا تو دیکھا کہ اجنبی اپنے آپ میں نہیں تھا...... اس کی حالت بہت غیر تھی...... اس میں اتنی سکت بھی باقی نہیں تھی کہ ہل جل سکے...... اس کی ناگفتہ حالت دیکھ کر مجھے اس پر رحم آ گیا...... اور جب اس نے اپنے حواس پر قابو پایا تو اس نے اپنی درد بھری روداد سنائی، جسے سن کر میرا دل پسیج گیا...... ویسے میں نے یہ سوچا ضرور تھا کہ اسے لے کر میں آپ کی خدمت میں حاضر کروں گا ضرور...... اس کا کوئی بہت بڑا اور قوی دشمن ہے جو اس کے پیچھے پڑا ہے...... اور یہ اس دشمن سے چھپتا چھپاتا یہاں انجانے میں آ گیا اور اسے یہ خیال نہ آیا کہ یہ کسی اور کا علاقہ ہے......

میں ایک مرتبہ پھر آپ سے معافی کا خواستگار ہوں...... اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اس سے پہلے میری ذات سے کسی قسم کی کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔" اور اتنا بول کر زنتاش نے گردن جھکالی۔

سردار کی پھر آواز سنائی دی۔ "اجنبی کیا یہ حقیقت ہے جو زنتاش بول رہا ہے...... کسی کے پیچھے دشمن لگا ہو، کوئی بدحواس ہو، اسے کچھ بھائی نہ دیتا ہو لیکن اس کا یہ مقصد تو نہیں کہ کوئی کسی کے گھر میں دندناتا ہوا گھس جائے...... اور ویسے بھی تمہاری جناتی طاقتیں کہاں گم ہو گئی تھیں اور تم کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر ہو گئے تھے، میں تمہاری بات مان لیتا ہوں اور زنتاش کی بتائی ہوئی باتوں پر یقین کر لیتا ہوں کیونکہ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ زنتاش جھوٹ نہیں بولتا اور یہ بہت لائق ہے۔

اور جب تک میں تمہاری ذات کے متعلق تمہارے قبیلے کے سردار سے مکمل معلومات حاصل نہ کر لوں اس وقت تک تم ہماری قید میں رہو گے اور اگر تمہارے متعلق غلط خبر آئی تو تمہیں فوراً اس علاقے سے نکال دیا جائے گا...... اور اگر تم واقعی ہمدردی کے قابل ہوئے تو تمہارے ساتھ ہمدردی کی جائے گی...... لیکن سب سے اچنبھے والی بات ہے کہ ابھی تک تم اپنے قبیلے سے باہر ہو، اور تمہارے قبیلہ والوں نے تمہیں ڈھونڈا نہیں...... یہی بات مجھے تشویش میں ڈال رہی ہے...... خیر دو تین دن میں تمہاری اصلیت کھل کر سامنے آ جائے گی۔" اور پھر سردار نے حکم دیا کہ "اجنبی کو قید میں ڈال دیا جائے۔"

اور زالوشا کو قید میں ڈال دیا گیا...... زنتاش کو تنبیہ کر کے چھوڑ دیا گیا۔

چوتھے روز سردار نے زنتاش کو بلا کر بولا۔ "زنتاش اجنبی جن نے غلط بیانی کی ہے...... یہ اپنے قبیلہ کا ضدی ہٹ دھرم نافرمان اور باغی جن ہے...... اور اس سے پہلے کہ میرا غصہ عروج پر پہنچے اس سے کہو کہ فوراً ہمارے علاقے کو چھوڑ کر کہیں بھی چلا جائے اور اگر یہ نہیں گیا تو اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔" اور یہ بول کر سردار نے زنتاش کو اپنے پاس سے جانے کو کہا۔

زنتاش قید خانے میں زالوشا...... کے پاس پہنچا تو زنتاش کو دیکھ کر زالوشا بہت خوش ہوا مگر پھر چند لمحے بعد ہی اس کی ساری خوشی کافور ہو گئی جب زنتاش نے زالوشا کو سردار کا حکم سنایا اور خود بولا۔ "زالوشا تم فوراً سے پیشتر اس علاقے سے نکل جاؤ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔" اور زالوشا کو زنجیروں سے آزاد کر دیا اور زالوشا نے نظر جھپکتے اس علاقے کو چھوڑ دیا۔

زالوشا کسی منزل کا تعین کئے بغیر سر پر پاؤں رکھ کر غائب حالت میں پرواز کرتا رہا...... کہ اچانک اسے ایک جگہ ایک بہت بڑا برگد کا درخت نظر آیا...... وہ بہت

سایہ دار درخت تھا..... گرمی اور کڑکتی دھوپ کی وجہ سے زالوشا کی حالت بہت خراب تھی..... لہٰذا زالوشا نے سوچا کہ کیوں نہ میں تھوڑی دیر تک اس برگد کے درخت پر آرام کرلوں..... اور جب میرے حواس قابو میں آجائیں گے تو کہیں اور کا سوچوں گا اور پھر اس خیال کے تحت زالوشا برگد کے درخت پر اتر گیا اور اس کے سائے میں آرام کرنے لگا، دن کے ڈھائی کا وقت تھا۔ زالوشاہ برگد کے سایہ میں پڑا رہا..... اور اس کا دماغ آندھی اور طوفان کی طرح پرواز کرتا رہا کہ اچانک اس کے دماغ میں ایک ترکیب آگئی۔

اور پھر صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے اس نے ایک سادھو کا روپ دھار لیا۔ درخت کے نیچے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا، دھڑ سے ننگ دھڑنگ اور پیٹ کو چھوتی ہوئی لمبی داڑھی پورے جسم پر بھبوت مل لیا، دیکھنے والے کو بہت ہی پہنچا ہوا دنیا و مافیہا سے بے خبر سادھو لگنے لگا، اور وقفے وقفے سے جے بھگوان کا نعرہ لگانے لگا۔

ایک ضعیف بوڑھا آدمی دودھ کی بالٹی لئے اس جگہ سے گزرا اور اس سادھو نے اپنی نظریں اس پر مرکوز کردیں اور پھر اپنی جناتی طاقت کے بل بوتے پر اس نے سارے کا سارا دودھ بالٹی سمیت نیچے گرادیا۔

دودھ کا نیچے گرنا تھا کہ بوڑھے کے منہ سے نکلا۔ ''ہائے بھگوان یہ کیا ہوگیا..... ٹھاکر تو میرا حشر نشر کردے گا، اب میں کیا کروں.....''

اتنے میں سادھو کی شکل میں بیٹھے زالوشا کی آواز سنائی دی۔ ''بالک کیوں روتا ہے ادھر آ۔'' اس کی آواز کا سننا تھا کہ بوڑھے نے بھرپور نظر سے سادھو کو دیکھا اور پھر سادھو کی طرف بڑھا..... قریب آکر بولا۔ ''مہاراج میرا سارا دودھ نہ جانے کیسے گر گیا..... ٹھاکر نے میری ایسی تیسی کردینی ہے۔ میں غریب اب کہاں سے دودھ لاؤں۔''

یہ سن کر سادھو مسکرانے لگا اور پھر بولا۔ ''تمہارا دودھ گرا تو نہیں۔ پورے کا پورا دودھ بالٹی میں موجود ہے۔'' یہ سن کر جب بوڑھے نے بالٹی کی طرف نظر کی تو حیران رہ گیا کیونکہ اب پوری بالٹی دودھ سے بھری پڑی تھی..... پہلے بالٹی میں آدھی بالٹی دودھ تھا مگر اب بالٹی لبالب دودھ سے بھری پڑی تھی۔

یہ دیکھتے ہی وہ بوڑھا زالوشا کے قدموں پر گر گیا..... اپنا ماتھا اس کے قدموں پر ٹیک دیا۔

''مہاراج..... آپ کا بہت بہت دھنے واد..... آپ نے تو چمتکار کردیا..... آدھی بالٹی کے بجائے بالٹی کو لبالب بھردیا۔ آپ نے مجھ غریب پر دیا کردیا.....''

''اب تو جا..... تجھے دیر ہورہی ہے، ٹھاکر تیرا انتظار کررہا ہوگا.....'' زالوشا بولا۔

اور بوڑھا زالوشا کو بلند آواز سے دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

زالوشا جو کہ سادھو کے روپ میں بیٹھا تھا اونچی آواز میں بولا۔ ''جے رام.....'' اور مسکرانے لگا۔

بوڑھے نے اس چمتکار کے متعلق دو چار لوگوں کو بتایا اور پھر یہ بات سارے گاؤں میں پھیل گئی کہ ''برگد کے درخت کے نیچے ایک بہت پہنچا ہوا سادھو بیٹھا ہے جو کہ بھگوان کا اوتار ہے۔'' لوگ جوق در جوق آنے لگے، بلکہ دو چار گھنٹے میں سارا گاؤں امڈ پڑا۔

برگد کے درخت کے نیچے لوگوں کی بھیڑ لگ گئی۔ لوگ آتے رہے اور سادھو کے چرن چوتے رہے۔ ایک بوڑھا آیا..... اس کے ساتھ اس کی جواں سال بیٹی تھی۔ سادھو کے قریب آتے ہی اس نے سادھو کے چرن چھوئے اور بولا۔ ''مہاراج یہ میری پتری ہے..... آج ایک ہفتہ ہوگیا..... بخار اس کی جان نہیں چھوڑ رہا۔'' آپ کی بڑی کرپا ہوگی اس پر دیا کردیں۔''

اور پھر سادھو نے اپنی آنکھیں کھول کر جواں سال رکمنی کو بغور دیکھا اور پھر اپنی نظریں اس کی آنکھوں میں مرکوز کردیں اور پھر اس کے ماتھے پر اپنا سیدھا ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''اوئے تو تو چنگی بھلی ہے، تجھے تو کوئی بخار نہیں۔'' اور اس آواز کا سادھو کے منہ سے نکلنا تھا کہ رکمنی کا بخار یکدم غائب ہوگیا۔

اور پھر جھٹ رکمنی نے سادھو کے پاؤں پر اپنا سر

رکھ دیا۔ اب تو وہاں پر موجود مرد اور عورتوں نے با بلند آواز..... ''جے مہاراج..... جے مہاراج'' کا نعرہ لگانا شروع کردیا۔

اتنے میں ایک بوڑھا آیا..... اسے دو لوگوں نے سہارا دے رکھا تھا..... وہ بوڑھا سادھو کے قریب آیا اور بولا۔ ''مہاراج میں کمر درد میں ایک مہینہ سے پریشان ہوں درد ہے کہ کسی بھی اپائے سے جا نہیں رہا..... اب تو ہلنا جلنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ مہاراج آپ کی بڑی کرپا ہوگی۔ مجھ غریب پر نظر کرم کردیں.....''

سادھو کے پاس ہی ایک پیتل کا لوٹا پڑا تھا۔ اور اس لوٹے میں پانی بھرا تھا..... سادھو نے لوٹے میں اپنا سیدھا ہاتھ ڈالا، اپنے چلو میں پانی لیا اور بوڑھے پر وہ پانی چھڑک دیا..... اور پھر بوڑھے کے ساتھ پلک جھپکتے ہی واقعی چمتکار ہو گیا..... بوڑھا بغیر سہارے کے اٹھ کر کھڑا ہو گیا..... اور پھر تو جیسے وہ بوڑھا ناچنے لگا..... ''مہاراج کی جے ہو..... مہاراج کی جے ہو..... ارے بھائیو! دیکھو مہاراج کی کرپا سے میرا درد بھاگ گیا.....'' یہ بولتے بولتے بوڑھا جیسے اچھلنے لگا۔

پھر سادھو نے اپنے ہاتھ کا اشارہ کیا تو اس کے سامنے سفید سفید دھواں اٹھنے لگا، اور پھر جب دھواں چھٹا تو لوگوں نے دیکھا کہ اس جگہ ایک ٹوکری پڑی ہے اور اس ٹوکری میں تازے تازے موتی چور کے لڈو پڑے ہیں۔ یہ دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں اچنبھے سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور لوگ فلک شگاف آواز میں..... ''جے مہاراج'' کا نعرہ لگانے لگے۔

سادھو نے ایک ہٹے کٹے جوان کو اپنے قریب بلایا اور بولا۔ ''یہ لڈو سب میں بانٹ دے۔'' سادھو کی بات پر اس نوجوان نے پہلے تو سادھو کے چرن چھوئے اور پھر ٹوکری اٹھا کر لوگوں میں سارے لڈو بانٹ دیئے..... پھر سادھو بولا۔ ''یہ بچے ہوئے لڈو میری طرف سے ٹھاکر کو پہنچادے۔''

یہ سننا تھا کہ اس نوجوان نے ٹوکری اٹھائی اور ٹوکری میں موجود لڈو کو لے کر ٹھاکر کو دینے کے لئے اپنے قدم ٹھاکر کے گھر کی طرف بڑھادیئے..... اور جب وہ ٹوکری لے کر ٹھاکر کے گھر کے قریب پہنچا تو اب ٹوکری پوری کی پوری لڈوؤں سے بھر چکی تھی۔ یہ دیکھ کر وہ نوجوان اچنبھے میں پڑ گیا۔

ٹھاکر اپنی بیٹھک میں بیٹھا تھا اور اس کے سامنے چار لوگ بیٹھے تھے اور ان کے لبوں پر سادھو کی باتیں تھیں۔ نوجوان بولا۔ ''ٹھاکر صاحب سادھو مہاراج نے آپ کے لئے یہ لڈو بھیجے ہیں..... ٹھاکر صاحب جب میں یہ ٹوکری لے کر چلا تھا تو اس ٹوکری میں کوئی بیس پچیس کے لگ بھگ لڈو تھے مگر یہاں تک آتے آتے پوری ٹوکری لڈو سے بھر گئی۔ ٹھاکر صاحب سادھو مہاراج کا جواب نہیں..... چمتکار کرنا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ میں تو ان کا چمتکار اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آرہا ہوں۔''

ٹھاکر بولا۔ ''رامو یہ ٹوکری رکھ دے اور جب ٹھاکر نے ٹوکری میں موجود لڈو دیکھے تو ٹھاکر کی آنکھوں میں عجیب طرح کی چمک نظر آنے لگی۔ ٹھاکر نے اپنے ہاتھ میں جب دو لڈو اٹھائے تو وہ لڈو گرم تھے۔

''ارے یہ تو گرم گرم لڈو ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے کہ حلوائی نے ابھی ابھی بنائے ہیں۔''

یہ سن کر وہ نوجوان جو لڈوؤں کی ٹوکری لایا تھا بولا۔ ''ٹھاکر صاحب ہماری آنکھوں کے سامنے لڈوؤں سے بھری ٹوکری نہ جانے کیسے وہاں آگئی تھی۔''

ٹھاکر بولا۔ ''اچھا بھائیو! چلو ہم بھی سادھو مہاراج کا درشن کرتے ہیں۔'' اور یہ بول کر ٹھاکر اپنی بیٹھک سے نکلتا چلا گیا..... اور جاتے جاتے ٹھاکر نے اپنے بڑے لڑکے کو آواز دے کر بولا۔ ''لڈو اندر لے جا سادھو مہاراج نے بھیجے ہیں۔''

ادھر رولوکا اپنے کمرے میں بیٹھا تھا اور پل پل کی سادھو کی خبریں رولوکا کو مل رہی تھیں۔ رولوکا کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

(جاری ہے)

شہر خموشاں

محمد قاسم رحمان۔ ہری پور

گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اچانک دودھیا روشنی پھیل گئی اور ایک دلکش خوبرو حسینہ نظر آئی تو نوجوان اپنا حواس کھو بیٹھا اور وہ نوجوان اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ایک جگہ پہنچا اور جب اس کے حواس بحال ہوئے تو......

پورے وجود پر کپکپی اور جسم کے رونگٹے کھڑے کرتی پر ہول ماحول کی ناقابل بیان کہانی

میرا نام اکبر ہے۔ پیشے کے اعتبار سے میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ میری دہشت ناک داستان کا آغاز دو ماہ قبل اس وقت ہوا جب میرا ٹرانسفر ایک گاؤں گلاب پور میں ہوا، گلاب پور بہت خوب صورت گاؤں ہے جو کہ جہلم کے نزدیک جھنگ وسطی پنجاب سے لگ بھگ دو سو میل کے دوری پر واقع ہے۔ جب میرا ٹرانسفر گلاب پور میں ہوا تو مجھے بہت ناگوار لگا تھا۔ لیکن نہ جانا اپنی نوکری کو لات مارنے کے مترادف تھا۔ اس لئے میں نے جانے کی تیاری شروع کردی اور ضروری اشیاء کی پیکنگ کرنے لگا تھا۔

اس بھری ہوئی دنیا میں، میں اکیلا تھا نہ میرے کوئی آگے تھا نہ ہی پیچھے، صرف ایک والد تھے جو پندرہ دن قبل موت کی آغوش میں جا سوئے تھے۔ ماں میری پیدائش کے فوراً بعد مرگئی تھی۔ کوئی اور بہن بھائی نہ تھا

اس لئے تنہائی میں ماں کی یادیں اور کتابیں ہی میری ہمنوا ہوا کرتی تھیں اور ان کتابوں سے دوستی کے سبب ہی میں نے میڈیکل میں ٹاپ کیا تھا اس کے بعد ایک گورنمنٹ اسپتال میں جاب حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا کرپشن کے دور میں یہ جاب میرے لئے بہت ہی زیادہ اہم تھی۔ میری جاب کو دو تین ہفتے ہی گزرے تھے کہ میرے والد نے اس دنیا میں مجھے تنہا چھوڑ دیا تھا۔

گلاب پور میں ٹرانسفر ہونا میرے لئے تیسرا شاک تھا۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ مجھے گاؤں سے نفرت تھی بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ دیہات میں رہنا بہت کٹھن ہوتا ہے وہ بھی ایک ایسے انسان کے لئے جس نے ساری عمر شہر میں گزاری ہو۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میرا دل کسی انجانے خوف کی وجہ سے دھڑک رہا تھا میں اس خوف کو کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔

خیر میں نے پیکنگ کرلی اور سونے کے لئے لیٹ گیا اس وقت بھی میں گلاب پور کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ ''کہ نجانے وہاں کے رہنے والے لوگ کیسے ہوں گے؟'' میری معلومات اور نظریہ کے مطابق گاؤں یا دیہاتوں کے لوگ بہت ملنسار ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ پیار ومحبت اور خلوص کے ساتھ رہتے ہیں۔ کب خیالات کے سمندر میں غوطہ زن ہوکر نیند کی آغوش میں چلا گیا مجھے پتہ نہ چلا۔

صبح میری آنکھ اس وقت کھلی جب سورج کی کرنیں کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوچکی تھیں سامنے والا کلاک ساڑھے نو بجے کا ٹائم دکھا رہا تھا۔ میں نے فوراً کمبل کو پرے دھکیلا اور کمرے کے اٹیچ باتھ روم میں چلا گیا۔ دس منٹ میں، میں ریڈی ہوچکا تھا۔ میں نے ناشتہ کے نام پر ایک کپ کافی پی اور اپنا بیگ لے کر گھر سے نکل گیا۔ کیونکہ مجھے آج ہی اس گاؤں گلاب پور میں جانا تھا۔ میں نے رکشہ لیا اور بس اسٹاپ تک آ گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے تگ و دو کے بعد میں گلاب پور جانے والی بس کو ڈھونڈ چکا تھا۔ بس ابھی خالی تھی اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد اسے روانہ ہونا تھا۔ اس لئے میں نے ایک سیٹ پر اپنا بیگ رکھا اور باہر آ گیا۔

اسی وقت میری نظر سامنے ایک فقیر پر پڑی۔ وہ مجذوب سا تھا اس کے ہاتھ میں اسٹیل کا ایک پیالہ تھا جس میں دو اور ایک روپے کے سکے پڑے ہوئے نظر آرہے تھے۔ میں نے اپنے والٹ سے بیس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور پیالے میں ڈال دیا۔

مجذوب مجھے یک ٹک دیکھنے لگا۔ کبھی ترچھی نگاہ سے کبھی پیار بھری نگاہوں سے نیز ہر لمحہ یہ لمحہ اس کی نگاہ کا زاویہ تبدیل ہو رہا تھا۔ میں بہت الجھن محسوس کر رہا تھا۔ ''کیا بات ہے بابا ایسے کیوں دیکھ رہے ہو۔؟''

مجذوب بولا۔ ''بدروحوں کے چنگل میں تو پھنس جائے گا۔ پھنس جائے گا۔''

اور مجذوب قہقہے لگاتا ہوا غائب ہوگیا اور میں نے اسے پاگل سمجھتے ہوئے اسے اور اس کی بات کو نظر انداز کردیا۔

میں بس میں آکر بیٹھ گیا۔ پانچ منٹ بعد بس اپنے راستے پر چل پڑی اور میں دوڑتے ہوئے مناظر دیکھنے میں محو ہوگیا۔

کسی کی کھانسی کی آواز سنکر میں چونکا تھا میں نے نظر گھما کر وہاں دیکھا تو میرے ساتھ والی نشست پر ایک پچاس پچپن سالہ نیم بوڑھا براجمان تھا۔ اس بوڑھے نے مجھ سے شائستہ انداز میں پوچھا۔

''کیا آپ گلاب پور جارہے ہیں۔؟''

''جی انکل میرا وہاں پر ٹرانسفر ہوا ہے۔'' میں نے جواب دیا اور کھڑکی سے باہر دوڑتے ہوئے مناظر دیکھنے لگا۔

''مجھے ذاکر کہتے ہیں اور آپ کی تعریف۔؟'' بوڑھے نے پوچھا۔

مجھے ان سوالات سے شدید اکتاہٹ محسوس ہورہی تھی خیر میں نے جواب دیا۔ ''میرا نام اکبر خان ہے اور میں ایک ڈاکٹر ہوں۔''

''ارے یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہمارے گاؤں میں اب ایک ڈاکٹر موجود ہوگا۔'' ذاکر بابا

بولے۔

میں نے پوچھا۔ "کیا آپ گلاب پور کے رہائشی ہیں۔؟"

بابا نے جواب دیا۔ "ہاں بیٹا میں وہاں کا ہی باسی ہوں شکر ہے ہمارے گاؤں میں کوئی ڈاکٹر ہوگا۔"

خیر ذاکر بابا سے میری کافی علیک سلیک ہوگئی۔ انہوں نے بتایا۔ "پچھلے دنوں گاؤں میں ایک المناک حادثہ پیش آیا تھا۔ شہر کے کچھ نوجوان وہاں پکنک منانے آئے تھے، واپسی میں ان کی وین ایک درخت سے ٹکرا گئی اور فوراً پوری وین آگ کی لپیٹ میں آ گئی اور یہ دکھ کی بات ہے کہ کسی کو دروازہ کھولنے کی مہلت نہ ملی وہ سب جاں بحق ہوگئے۔ سب کی حالت بہت خستہ اور دردناک تھی لاش اٹھانے کے قابل نہ تھی لہٰذا انہیں وہاں دفن کردیا گیا لیکن اس کے بعد گاؤں میں عجیب پراسرار واقعات ہونے لگے۔ جن کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ قبرستان سے ہی ہے۔"

یہ سب جان کر میں حیرت میں پڑ گیا مگر جب تک گاؤں آ چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ گاؤں والوں کے چہروں پر ایک خوف ہے۔ ایک ایسا خوف جو انہیں آپس میں گھلنے ملنے نہیں دیتا۔

شاید وہ خوف اس المناک حادثے کے باعث تھا جو کچھ عرصہ پہلے رونما ہوا تھا۔ سب سے پہلے مجھے اپنی رہائش کا بندوبست کرنا تھا۔ گھر تلاش کرنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ ذاکر بابا نے میری بہت مدد کی اور ان کے بھائی کے دوست کا ایک گھر مجھے مل گیا۔

یہ گھر دو کمروں ایک کچن اور ایک ٹوائلٹ، ایک باتھ روم پر مشتمل تھا برآمدے کے آگے چھوٹا سا صحن تھا جس میں کچھ پھولوں والے پودے لگائے گئے تھے۔

میں نے ایک کمرہ اپنے لئے سیٹ کیا اور تین ماہ کا ایڈوانس کرایہ دے دیا۔ پورے گھر کی صفائی کے بعد جب میں فارغ ہوا تو مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں میں نے اپنے لئے ایک کپ چائے بنائی اور پینے لگا رات کا کھانا مجھے ذاکر بابا نے لادیا تھا۔ جسے میں کھا کر سو گیا۔

اگلے دن سے میں اسپتال جانے لگا۔ پانچ دن اسی طرح گزر گئے۔

چھٹا دن میری زندگی کا منحوس ترین دن تھا پورا دن اسپتال میں مصروف رہتے گزر گیا۔

رات کے کوئی 9:30 بجے کا عمل ہوگا جب میرے گھر کے دروازے کو بہت بری طرح سے دھڑ دھڑایا گیا میں نے جا کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک بوڑھا مرد اور ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔ میں نے مرد کو پہچان لیا وہ فضلو تھا۔ جو کھیتوں میں کام کرتا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ کو سوہنے رب دا واسطہ میرے بیٹے کو بچالیں۔" فضلو کی آواز میں درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

"ڈاکٹر پتر میں ساری جیون تیرے پیر دھو دھو کر پیوں گی میرے بیٹے کو بچالے۔" بڑھیا نے کہا اور اپنا دوپٹہ اٹھا کر میرے قدموں میں ڈال دیا۔

ان کے اس عمل سے میرا دل تڑپ اٹھا میں نے دوپٹہ اٹھا کر انہیں دیا اور کہا۔ "پلیز! آپ دو منٹ ویٹ کریں میں اپنا میڈیکل بکس لے کر آتا ہوں۔" میں نے کہا اور اندر سے میڈیکل بکس لے آیا اور ان کے ساتھ چل دیا۔

ان کے گھر پہنچا اور جب لڑکے کو چیک کیا تو ان کا بیٹا بخار میں تپ رہا تھا۔ نیز اسے ہسٹریائی کے دورے پڑ رہے تھے، میں نے جلدی سے ان کے بیٹے رحمت کو فوری ٹریٹمنٹ دیا اور ایک گھنٹے میں وہ بھلا چنگا ہوگیا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ کا بہت شکریہ۔" فضلو نے کہا اور میرے پیروں کو ہاتھ لگانے کے لئے نیچے جھکا تو میں نے اس کے کندھے کو پکڑ کر کہا۔

"آپ میرے والد کی جگہ ہیں اور ایک بیٹا کبھی یہ نہیں چاہے گا کہ اس کا باپ اس کے پاؤں پکڑے۔"

میری بات سن کر فضلو بولا۔ "جگ جگ جیو بیٹا تمہارے ماں باپ بہت خوش قسمت ہیں کہ انہیں تم

جیسا نیک اور فرمانبردار بیٹا ملا ہے۔'' بابا فضلو کی بات میرے دل میں کسی خنجر کی طرح پیوست ہوگئی کیونکہ مجھے میرے والدین یاد آگئے تھے۔

''اچھا بابا جی اب مجھے اجازت دیں، اب میں اپنے گھر کے لئے چلتا ہوں۔''

''نہ بیٹا میں تمہیں چھوڑ کر آؤں گا۔'' فضلو بابا بولے۔

''نہیں بابا میں چلا جاؤں گا۔ پلیز! مجھے اکیلے جانے دیں، آپ تکلیف نہ کریں۔''

''ٹھیک ہے بیٹا جیسے تمہاری مرضی۔'' فضلو بابا کی بیوی نے کہا۔

میں باہر نکل آیا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی چاند کی دسویں تاریخ تھی ہر چیز چاندنی کے سمندر میں نہائی ہوئی تھی۔ ایکا ایکی موسم بہت سہانا ہوگیا تھا میرا دل اس وقت قبرستان جانے کو چاہ رہا تھا، یہ خواہش شدت پکڑ رہی تھی کہ میں قبرستان جاؤں لیکن میں نے اس خواہش کو فوراً سے پیشتر رد کردیا اور اپنے گھر کی طرف قدم بڑھانے لگا۔

ابھی میں نے آدھا راستہ ہی طے کیا ہوگا کہ مجھے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا، میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک بہت خوب صورت نوعمر دوشیزہ میرے پیچھے آرہی تھی اس کی عمر سولہ سترہ سال کے لگ بھگ ہوگی پھر وہ میرے قریب سے ہوتے ہوئے آگے کو نکل گئی۔ اس کی زلفیں ہوا کے دوش پر لہرا رہی تھیں اور اس کے چلنے کے اسٹائل میں ایک عجیب مستی تھی جو کسی کو بھی اپنے پیچھے آنے پر مجبور کرسکتی تھی۔

وہ آگے کو چلنے لگی اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا میں اس کے حسن لازوال کے سحر میں مبتلا ہوچکا تھا اور اس کے قدموں کے نشانات پر میرے قدم بڑھتے چلے گئے۔ میں ایک انجانے سحر میں جیسے جکڑ چکا تھا میرا دل و دماغ میرے قابو میں نہیں تھا میں دل بے تاب کے تحت اس کے پیچھے ہی پیچھے چلتا رہا اور پھر مختلف راستوں سے گزرنے کے بعد وہ قبرستان کے گیٹ تک آچکی تھی۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا، اس نے چرچراہٹ کے ساتھ قبرستان کا گیٹ کھولا اور اندر داخل ہوگئی اور میں کسی ان دیکھی طاقت کے زیر اثر اندر داخل ہوگیا اور قبرستان کا گیٹ بند ہوگیا وہ لڑکی ایک قبر پر جا کر لیٹ گئی۔ اور دھواں بن کر قبر میں سما گئی۔

اب مجھے ہوش آیا تو پتہ چلا کہ میں بہت فاش غلطی کر بیٹھا ہوں۔ میں نے واپسی کے لئے قدم اٹھائے اور قبرستان کا گیٹ کھولنے کی کوشش کی مگر بے سود قبرستان کا وہ منحوس گیٹ ٹس سے مس نہ ہوا اور پھر دوبارہ سے گیٹ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

اچانک پیچھے سے ایک لرزہ براندام کرتی ہوئی چیخ سنائی دی۔ میں خوفناک دہشت ناک حالات سے دوچار تھا، دل کو دہلاتا وہ دہشت ناک صورت حال برداشت نہ کرسکا اور پھر اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میری پینٹ گیلی ہوچکی ہے۔

پھر میں نے اپنے اعصاب پر قابو پایا کیونکہ ان حالات میں یہ بے حد ضروری تھا میں نے مڑ کر دیکھا تو اب وہاں ہولناک سناٹے کا راج تھا۔ قبرستان میں لگے سفیدے کے درخت پر اور قبروں پر چاندنی کھل کر برس رہی تھی۔

''اکبر خان...... اکبر خان۔'' بہت ہی اعصاب شکن چیخوں میں میرا نام لیا جانے لگا۔

یا اللہ یہ میں کس کٹھن چکر میں پھنس گیا ہوں اب قبرستان میں پھر سے خاموشی کا راج ہوگیا میں نے دروازہ کھولنے کی بے حد کوشش کی مگر میری ساری کوشش رائیگاں ہوتی چلی گئی۔

اس دوران ایک اور مصیبت نازل ہوگئی۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا اور پورا قبرستان تاریکی میں چھپ گیا۔ میرے پاس روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا غصے اور خوف کی وجہ سے میں بابا فضلو کو کوسنے لگا جس کی وجہ سے صورت حال اس قدر دہشت ناک ہوگئی تھی۔

اچانک میں نے دیکھا کہ میرے پاس سے کوئی چل کر جا رہا ہے پھر وہ سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔

میں نے اندھیرے میں قدم آگے بڑھائے۔

''سنئے۔'' میں نے کہا اور وہ شخص پیچھے مڑنے لگا۔

عین اسی وقت چاند بادلوں کی اوٹ سے باہر نکل آیا اور ہر شے چاندنی کے سمندر میں نہا سی گئی۔ وہ شخص پیچھے مڑا اس کے جسم پر سفید لمبا سا چوغا تھا۔ اور اس نے سفید ٹوپی پہن رکھی تھی اور جب وہ پیچھے مڑا تو میرے حلق سے ایک خوف ناک چیخ خارج ہوئی۔

سفید ٹوپی میں اس کے چہرے پر ہڈیوں کے سوا کچھ نہ تھا بلکہ ٹوپی کے ہالے میں ایک خوف ناک ڈراؤنی دل کو دہلاتی کھوپڑی اور اس کے استخوانی ہاتھ نے میری کلائی پکڑ لی۔ اس کا استخوانی ہاتھ برف کی مانند یخ تھا خوف، دہشت، سنسنی خیزی کیا ہوتی ہے حقیقی معنوں میں مجھے آج پتہ چلا تھا۔

اور یکدم اس شیطانی ڈھانچے نے میری کلائی چھوڑ دی اور غائب ہوگیا۔

میں نے تہہ دل سے خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے اس منحوس شیطانی ڈھانچے سے نجات دلائی تھی......!

ایک مرتبہ پھر میں قبرستان کا گیٹ کھولنے کی سعی کرنے لگا۔ مگر وہ گیٹ انتہائی ڈھیٹ ثابت ہو رہا تھا اس لئے آدھے گھنٹے کی کوشش کے باوجود بھی ٹس سے مس نہ ہوا کہ اچانک میرے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ میں یہ گیٹ پھلانگ کر باہر نکل جاؤں میں حیران تھا خود پر کہ یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا تھا۔

خیر دیر آیا درست آیا کی مصداق میں نے گیٹ کو اوپر سے پکڑ کر جیسے ہی اپنے پاؤں زمین سے اوپر کیا تو کسی نادیدہ قوت نے مجھے پاؤں سے پکڑ کر نیچے کی طرف پھینک دیا اور میری کہنی ایک قبر کے کتبے سے جا ٹکرائی جس سے شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔

خوش قسمتی سے میرے ہاتھ میں فرسٹ ایڈ باکس تھا جو میں بابا فضلو کے بیٹے کے لئے لایا تھا۔ میں نے باکس میں سے دوا نکالی لیکن اچانک دوا میرے ہاتھ سے کسی نے چھین لیا اور باکس میں جا گرا، باکس بند ہوا اور ہوا میں اڑنے لگا جبکہ اس وقت ہوا نہ ہونے کے برابر تھی۔

خوف سے میں تھر تھر کانپنے لگا اور مجھے اس مجذوب کی بات یاد آ گئی۔ جو مجھے گلاب پور آتے ہوئے ملا تھا۔

اب میرے صبر کا پیالہ لبریز ہو چکا تھا سو میں پھٹ پڑا۔

''کیا چاہتے ہو تم لوگ کیوں میرا جینا اجیرن کر رکھا ہے۔''

خاموشی، موت جیسی گہری خاموشی چھا گئی۔ میں قبرستان کے وسط میں کھڑا تھا، میں نے دیکھا قبرستان کا گیٹ کھل رہا ہے، میں بھاگ کر وہاں گیا اور جیسے ہی میں گیٹ سے دو قدم کی دوری پر تھا کہ گیٹ اچانک بند ہوگیا۔

''یااللہ!'' میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں اس وقت کو کوسنے لگا جب میں اس قبرستان میں آیا تھا اور جب میرا ٹرانسفر گلاب پور میں ہوا تھا۔

بدروحیں میرے ساتھ خوف ناک کھیل کھیل رہی تھیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو میرے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے سامنے والی قبر میں ایک دراڑ

تحفہ

ایک شخص نے بک اسٹال سے ایک کتاب کے بارے میں دریافت کیا۔ ''لطیفوں کے اس مجموعے کی کیا قیمت ہے۔'' ''صرف دو سو روپے جناب۔'' لطیفے اس قدر دلچسپ ہیں کہ آپ کا ہنستے ہنستے دم نکل جائے گا۔'' دکاندار نے خوش اخلاقی سے کہا۔ ''واقعی تو پھر مجھے دو کتابیں دے دو۔'' ایک میری بیوی کیلئے اور دوسری میری ساس کیلئے۔''

(نصیر-کراچی)

پڑ چکی تھی اور قبر دو حصوں میں بٹ رہی تھی اور ساتھ ہی نہ جانے قبرستان میں روشنی کہاں سے پھوٹ پڑی تھی اور پھر ایک ساعت شکن دھما کہ ہوا اور قبر دو حصوں میں بٹ گئی اس میں سے ایک ہیولہ باہر نکلا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس ہیولے نے انسانی روپ دھار لیا۔ ایک نوجوان تھا شکل سے خوش مزاج لگتا تھا۔

''ہائے ڈاکٹر۔'' اس نے عام سے انداز میں کہا۔

''تم لوگ کیا چاہتے ہو مجھ سے۔؟'' میں نے ڈرتے اور کانپتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ہم شہر خوشاں کے باسی ہیں اور آج چاند کی دسویں تاریخ ہے چاند کی دسویں تاریخ کو ہی ہماری بس کا بریک گاؤں والوں میں سے کسی نے فیل کیا تھا اور ہم دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اور اب چاند کی ہر دس تاریخ تم گاؤں والوں کے لئے منحوس ثابت ہوگی اور ہم اس گاؤں والوں کو سسکا سسکا کر ماردیں گے۔ مرنے سے پہلے اور بعد میں ہم اپنوں کو نہ دیکھ سکے اس لئے تم بھی اپنوں کو نہ دیکھ سکو گے اس کام کے لئے کچھ طاغوتی طاقتیں بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ آج تم مرو گے اور تمہاری قبر اس قبرستان میں ہی بن جائے گی۔'' اتنا کہہ کر اس منحوس نے ہنسنا شروع کردیا۔

موت تو برحق ہے مگر جب انسان اپنی موت کو سامنے دیکھتا ہے تو کیا حالت ہوتی ہے یہ مجھے آج پتہ چلا تھا دیرے دھیرے تمام قبروں میں سے مردے باہر آنے لگے۔

سب نے بے ہنگم انداز میں رقص کرنا شروع کردیا ایک عورت بولی۔ ''تم گاؤں والوں نے ہمیں بے موت مارا تھا اب ہم تمہیں ماریں گے۔''

''سنو میری بات!'' میں نے چلا کر کہا۔

''سب نے مجھے ایسے دیکھا جیسے مجھے کچا چبا جائیں گے مجھے ایک ڈائری اور قلم دے دو تا کہ مرنے سے پہلے میں گاؤں والوں کو بتادوں کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔؟''

''بہت خوب!'' جو لڑکی مجھے اس منحوس قبرستان میں لے کر آئی استہزائیہ لہجے میں بولی۔

''ایک زاویے سے یہ ٹھیک بھی ہے گاؤں والوں کو پتہ چل جائے گا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔''

تھوڑی دیر میں مجھے ڈائری اور قلم مل گیا اور میں اپنی داستان قلم بند کررہا ہوں جو بھی یہ پڑھے وہ پلیز گاؤں والوں کو بتادے کہ اس منحوس قبرستان میں مت آنا۔ ورنہ میری طرح موت کی آغوش میں چلے جاؤ گے۔''

☆......☆......☆

صبح ہوئی گاؤں میں سب کے سب اپنے اپنے کاموں میں لگ چکے تھے گھر کے مرد کھیتوں میں کام کررہے تھے اور عورتیں گھروں کی صفائی ستھرائی اور دوسرے کاموں میں پوری طرح سے بری ہو چکی تھیں۔

ایسے میں کچھ لوگوں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر صاحب اب تک اسپتال نہیں آئے۔

اور پھر گاؤں والوں کو ''ڈائری'' سمیت ڈاکٹر کی لاش مل گئی۔

چاندنی اپنے خوبصورت نام کی طرح خود بھی بہت حسین تھی گاؤں کے تمام لڑکے اس کے قرب کے متمنی تھے۔ ہر خاندان یہ چاہتا تھا کہ چاندنی ان کے گھر کی بہو بنے کیونکہ ظاہری خوبصورتی کے علاوہ اس کا باطن بھی روشن اور منور تھا۔

چاندنی نے جب ڈاکٹر اکبر کو پہلی بار دیکھا تھا تو اپنا دل ہار بیٹھی تھی کیونکہ ڈاکٹر اکبر خوبصورت اور وجیہہ جوان تھا۔

اور اب ڈاکٹر کی ناگہانی موت نے چاندنی کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔

دراصل وہ پانی بھرنے کے لئے ٹیوب ویل تک گئی تھی وہاں پر اس نے شور سنا، شور قبرستان سے آرہا تھا

وہ دوڑ کر قبرستان میں گئی اور وہاں اس نے ڈاکٹر اکبر کی لاش دیکھی، اس نے ڈاکٹر کو ٹوٹ کر چاہا تھا جس کی خاطر وہ جہنم کے شعلوں میں جلنے کے لئے بھی تیار تھی، آنسو نجانے کب پلکوں کی باڑھ توڑ کر رخساروں کو چومتے ہوئے دھرتی کو بھگو رہے تھے اس کو پتہ ہی نہ چلا۔

''چاندنی کیا ہوا تو ٹھیک تو ہے۔؟'' اس کی سہیلی نگہت نے اس کو کندھوں سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

چاندنی کی نظر سامنے پڑی تو وہاں ایک ڈائری پڑی ہوئی تھی لوگوں کا ہجوم ڈاکٹر کی لاش کے اردگرد کھڑا تھا۔

چاندنی کے دل میں نجانے کیا سمائی اور اس نے آگے بڑھ کر وہ ڈائری اٹھالی۔

ڈائری کو جب اس نے پڑھا تو اس پر کپکپی طاری ہوگئی ڈائری میں جن دہشت ناک مناظر کی عکاسی کی گئی تھی وہ گاؤں کے ہر فرد کے ساتھ پیش آئے گی یہ سوچ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

☆......☆......☆

یک ماہ کا عرصہ گزر گیا چاند کی دس تاریخ کو قبرستان میں ذاکر کی لاش پائی گئی۔ گاؤں والے خوف زدہ تھے۔ ان کے خیالات کے مطابق یہ کسی درندے یا جنگلی جانور کا کام ہے گاؤں کا انسپکٹر یوسف نے نام نہاد انوسٹی گیشن کی اور خاموش ہوگیا۔

صرف چاندنی جانتی تھی کہ یہ کیا مسئلہ ہے وہ ذاکر کی موت کا ذمہ دار خود کو سمجھ رہی تھی کہ اگر وہ ایک ماہ پہلے کچھ کرتی تو یہ سب کبھی بھی نہ ہوتا۔

لیکن اب اسے گاؤں والوں کو مرنے سے بچانا ہے اور یہ سوچتے ہوئے وہ فائزہ کے گھر آئی، فائزہ اس کی بچپن کی سہیلی تھی۔

اس نے دستک دی تو دو منٹ بعد فائزہ کے بھائی فرہاد نے دروازہ کھولا۔

فرہاد ایک اچھا لڑکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اور دل میں چاندنی کی محبت کے دیپ جلتے تھے۔

''کیسی ہو چاندنی۔؟''

چاندنی نے جواب دیا۔ ''میں ٹھیک ہوں، کیا فائزہ گھر میں ہے۔؟''

''ہاں گھر میں ہے تم اندر آجاؤ۔'' اس نے کہا اور دروازہ کھول کر ایک طرف ہوگیا۔

فائزہ سامنے چارپائی پر بیٹھی ہوئی مٹر چھیل رہی تھی۔ چاندنی پر نظر پڑتے ہی بولی۔ ''ارے چندو کیسی ہو؟'' فائزہ ہمیشہ پیار سے اس کو چندو کہتی تھی۔

''فائزہ میں نے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔'' چاندنی بولی۔

''اچھا بیٹھو پہلے تمہارے لئے چائے بنالاؤں پھر تسلی سے بات کریں گے۔''

''نہیں فائزہ ضرورت نہیں، تم بیٹھو۔'' چاندنی بولی۔

''کیا بات ہے چندو تم بہت پریشان نظر آرہی ہو، سب ٹھیک تو ہے ناں۔'' فائزہ کے لہجے میں پریشانی وفکر نمایاں تھی۔

''کچھ ٹھیک نہیں ہے فائزہ۔'' پھر چاندنی نے تمام روداد فائزہ کو سنادی۔

''تو تمہارا مطلب ہے قبرستان میں بدروحیں رہتی ہیں اور انہوں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔؟'' فائزہ بولی۔

''ہاں۔'' چاندنی بولی۔

''چندو یار تم پاگل ہوگئی ہو، تمہیں کسی نفسیاتی ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ بدروحیں اور وہ بھی آج کے دور میں۔'' فائزہ اس کا مذاق اڑانے لگی۔

''چاندنی ٹھیک کہہ رہی ہے، فائزہ۔'' اچانک یہ آواز سن کر دونوں چونک پڑیں سامنے فرہاد کھڑا تھا۔

''فائزہ یہ سچ کہہ رہی ہے کیونکہ ڈاکٹر اکبر کی لاش سے تھوڑی دور میں نے ایک ڈائری پڑی ہوئی دیکھی تھی لیکن بعد میں نجانے وہ ڈائری کدھر چلی گئی لیکن اب پتہ چلا ہے کہ وہ نشاء کے پاس ہے۔ حقیقت یہ ہے

کہ جن نوجوان لڑکے لڑکیوں کا بس میں حادثہ ہوا تھا ان کی بدروحیں گاؤں والوں کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا رہی ہیں انہوں نے دو جیتے جاگتے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔'' دونوں نے فرہاد کی زبانی ساری باتیں سنیں تو فائزہ افسردہ سی ہوگئی۔

''چندو مجھے معاف کردو میں نے تمہارا دل دکھایا لیکن بدروحوں نے جو دو قتل کئے ہیں اس کا انہیں خمیازہ بھگتنا ہی ہوگا۔'' فائزہ کے لہجے میں جوش جھلک رہا تھا۔

فرہاد بولا۔ ''میرا ایک دوست ہے تنویر اس کے ماموں عامل ہیں ان کے قبضے میں موکل ہیں جن سے وہ کام لیتے ہیں اس کام کے لئے وہ کوئی فیس بھی نہیں لیتے ہمیں ان سے رجوع کرنا چاہئے۔''

''یو آر رائٹ۔'' چاندنی نے کہا۔'' میرے خیال میں ہمیں آج ہی تنویر کے ماموں سے ملنا چاہئے لیکن تم تنویر کو بدروحوں کے بارے میں بتاؤ گے۔''

''ہاں تنویر با اعتماد ہے اس سے میری کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے۔'' فرہاد نے کہا۔

☆......☆......☆

چاند کی دسویں تاریخ تھی اور ہر شے پر چاندنی مکمل کر برس رہی تھی وہ پانچ افراد تھے جو قبرستان کی طرف رواں دواں تھے۔

سب سے آگے رفیق بابا تھے۔ رفیق بابا بدروحوں کا خاتمہ کرنے کے لئے قبرستان جارہے تھے۔

ان سے پیچھے تنویر، فرہاد اور دیگر دو افراد اور تھے۔

سوائے رفیق بابا کے سب کے دل خوف کے باعث دھک دھک کررہے تھے۔ قبرستان کا گیٹ نظر آچکا تھا۔ بابا رفیق نے آگے بڑھ کر قبرستان کا گیٹ کھول دیا۔

قبرستان کا گیٹ خاموشی سے کھل گیا پھر جب یہ پانچ افراد پر مشتمل چھوٹا سا قافلہ قبرستان میں داخل ہوا تو گیٹ خود بخود بند ہوگیا۔

باباجی نے چاروں افراد کو ایک جگہ بیٹھا کر ان کے گرد حصار کھینچ دیا۔

اور باباجی خود قبرستان کے وسط میں کھڑے ہوگئے اور بلند آواز میں بولے۔''اے شرپسند بدروحو! تم سب کا عالم ارواح میں ٹھکانہ کیوں نہ بنا، تم سب گاؤں کے لوگوں کو کیوں پریشان کررہی ہو تم نے ذاکر بابا کو مارنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر اکبر کو بھی ماردیا جبکہ وہ اس گاؤں کا نہیں تھا۔''

باباجی کی بات ختم ہوتے ہی قبرستان میں خاموشی چھا گئی پھر دھیرے دھیرے تمام قبروں میں سے ہیولے نکلنے لگے ان میں سے ایک ہیولہ بولا۔

''جب گاؤں والوں نے ہمیں بے موت مارا تھا اس وقت تم کہاں تھے بڈھے کھوسٹ۔''

''ان معصوم گاؤں والوں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا تمہاری بس کے بریک فیل ہوگئے تھے۔'' رفیق بابا صبر وتحمل کا عملی نمونہ بنے ہوئے تھے۔

''مکار بڈھا ہم نہیں جائیں گے ان ہیولوں میں سے ایک نے چلا کر کہا۔

''تو پھر ٹھیک ہے جلنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔'' باباجی نے کہا اور ان کے لب ہلنے لگے۔

ان ہیولوں کی چلانے کی آوازیں اتنی تیز ہوگئیں کہ وہاں بیٹھے نفوس کو اپنے کانوں کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔

پندرہ منٹ بعد باباجی کا ورد ختم ہوا تو انہوں نے چاروں طرف پھونک ماری اب ہر طرف خاموشی چھا چکی تھی۔

دو ماہ بعد

آج گاؤں میں ہر طرف خوشیاں رقص کررہی ہیں۔ گاؤں کی تیسری گلی کے آخری مکان میں، کیونکہ وہاں آج فرہاد اور چاندنی کی شادی ہورہی ہے۔ چاندنی اپنے دل سے ڈاکٹر اکبر کی محبت نکالنے کی کوشش کررہی ہے۔ رب سے دعا ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہوجائے اور فرہاد کے ہمراہ خوش گوار زندگی بسر کرے۔

☠

مجبوری

ایس امتیاز احمد۔کراچی

انجان سنسان اور کسی بھی ذی روح سے خالی جزیرہ پر موجود لوگ فلقوں سے ہراساں نلقابل حالات سے دوچار موت کے منہ میں جانے لگے مگر ایک ایسا شخص بھی تھا جس کا وزن بڑھتا گیا آخر کیوں۔

لفظ لفظ اور سطر سطر دل و دماغ پر خوف کا سکہ بٹھاتی ــــ محیر العقول قابل غور کہانی

ٹونی گریک کو یقین تھا کہ نیلا آسمان کھلا سمندر اور خاموشی، مضطرب ذہن اور زخم خوردہ دل کے لئے مرہم ثابت ہوں گے لیکن تجربے نے اس یقین کو غلط ثابت کردیا۔ٹونی مختلف ماہناموں کے لئے سنسنی خیز مضامین لکھتا تھا۔اس نے کئی سوانح عمریاں بھی لکھی تھیں۔آمدنی بہت معقول تھی لیکن بیوی کو طلاق دینے کے بعد اس کے لئے دو مسئلے پیدا ہوگئے، پہلا مسئلہ مطلقہ کے ماہانہ خرچ کا تھا کیونکہ اس کا ایک سات سال کی عمر کا بچہ بھی تھا جو اپنی ماں کے ساتھ رہ رہا تھا...... اور دوسرا مسئلہ بیوی کی یاد کو دل سے بھلانا چاہتا تھا چنانچہ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ کسی ایسی جگہ چھٹیاں گزاری جائیں جہاں دور دور تک نیلا آسمان اور کھلا سمندر نظر آتا ہو جہاں سکون اور تنہائی ہو۔

اس نے اپنی چھٹی کا پہلا ہفتہ یونان کے ایک

جزیرے پر گزارا۔ وہ سارا دن ہوٹل میں اپنے کمرے میں لیٹا رہتا تھا۔ اس نے ساحل پر کھلے آسمان کے نیچے دراز ہو کر آفتابی شعاؤں سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کی لیکن اسے پہلے ہی روز اس امر کا احساس ہوگیا کہ وہ ایگورافوبیا کا شکار ہے اس لئے کسی بھی کھلی جگہ پر لیٹنے سے وہ دہشت زدہ ہوجائے گا۔

ایک ہفتہ بعد وہ ایک چھوٹے سے اسپینی جزیرے پر چلا گیا۔ وہاں بھی اسے سکون نہیں مل سکا حالانکہ اس جزیرے کی آبادی کم تھی اور جگہ بھی بہت پرسکون تھی۔ خوش قسمتی سے وہاں اس کی ملاقات کرنل ٹیکسرا سے ہوگئی تب اسے احساس ہوا کہ اسے زخموں پر مرہم لگانے کے لئے نیلے آسمان کھلے سمندر اور خاموشی کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اسے اپنی ذہنی غذا پر اسراریت کی ضرورت تھی جس کے بغیر وہ ہر وقت بے چین اور کھویا کھویا سا رہتا تھا۔

کرنل ٹیکسرا کو اس نے پہلی مرتبہ ساحل پر اپنی ٹوٹی پھوٹی کار میں بیٹھا ہوا دیکھا۔ وہ سگار نوشی کرتے ہوئے کھڑکی سے باہر خلا میں کچھ گھور رہا تھا۔ کرنل کا ڈرائیور خاکی وردی میں ملبوس ریت کے اندر گھونگے جمع کرنے میں مصروف تھا۔ کرنل پر پہلی نظر ڈالتے ہی اس کی یادداشت میں کھلبلی مچ گئی۔ کرنل کا چہرہ جانا پہچانا تھا اور اس کا نام اس کے ذہن میں آکر بار بار پھسلا جارہا تھا۔ ٹونی کو اپنی یادداشت پر بہت تعجب ہوا کیونکہ اس کی یادداشت غیر معمولی طور پر تیز تھی اور وہ لوگوں کے نام اور ان کے چہرے یاد رکھنے میں دور دور تک مشہور تھا لیکن اس وقت اسے کرنل کے متعلق کچھ بھی یاد نہیں آرہا تھا کہ یہ چہرہ اس نے کہاں دیکھا ہے؟ کرنل کا کیا نام ہے؟ اور کرنل کی وجہ شہرت کیا ہے؟

ہوٹل واپس آکر اس نے منیجر سے کرنل کے بارے میں دریافت کیا۔ کرنل کی شخصیت بے حد اسرار اور مشہور ثابت ہوئی۔ ہوٹل کے منیجر نے اس کو کرنل کا پورا نام بتلایا جو بہت طویل تھا اور اسے صرف کرنل ٹیکسرا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ کسی کو علم نہیں تھا کہ کرنل کا عہدہ اسے کیسے ملا ہے۔

جزیرے کی غربت کے پیش نظر کرنل کی معاشی حالت بہت اچھی تھی اور اسے دولت مند تصور کیا جاتا تھا کیونکہ اس کا اپنا ایک مکان تھا، ایک کشتی تھی، ایک موٹر تھی اور ایک ملازم تھا کرنل غیر شادی شدہ تھا کسی کو اس کے کسی عزیز رشتے دار کا علم نہیں تھا۔ پورے مکان میں وہ تنہا اپنے گونگے ملازم کے ساتھ رہتا تھا۔ ملازم کا نام ڈریگو تھا۔ وہی کرنل کا باورچی ڈرائیور کشتی کھینے والا گھر کی صفائی کرنے والا، پہرے دار اور سودا سلف لانے والا تھا۔ پہرے دار اور سودا سلف لانے والا تھا۔ کرنل کا مکان جزیرے میں سب سے اونچا تھا۔ اس کے مکان میں داخل ہونے کے لئے ایک سو پندرہ سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں۔ کرنل جزیرے کی آبادی سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔

ٹونی نے دوسری مرتبہ جب کرنل کو دیکھا تو ان کے درمیان صرف تین گز کا فاصلہ تھا۔ فاصلے کے بارے میں یقینی طور پر اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ وہ دونوں ایک تین گز لمبے کپڑے کے مخالف سروں پر کھڑے ہوئے تھے جسے اس دکان کی ملازم لڑکیوں نے تانا ہوا تھا۔ ٹونی اس روز جزیرے میں سیاحوں والے انداز میں بلامقصد گھومتا پھرتا ایک دکان میں گھس گیا۔ کرنل ٹیکسرا اس دکان میں سگار خریدنے آیا تھا جنہیں وہ دکاندار خاص طور پر کرنل کے لئے درآمد کرتا تھا۔ وہ کرنل کی آواز سن کر ہی چونکا تھا وہ دکاندار سے وہی سگار طلب کررہا تھا جو خود ٹونی کے پسندیدہ تھے۔ پسند کی یکسانیت نے دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کروایا۔ ٹونی کو یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ کرنل نہ صرف گفتگو پر رضامند نظر آتا ہے بلکہ وہ اس سے بڑی روانی کے ساتھ انگریزی میں گفتگو بھی کرسکتا ہے۔

کرنل درمیانے قد، دوہرے جسم اور کسرتی بدن کا مالک تھا۔ اندازاً اس کی عمر ستر سال کے لگ بھگ تھی اس کے چہرے کو غور سے دیکھ کر ایک مرتبہ پھر ٹونی کو شدت سے احساس ہوا کہ کرنل کا چہرہ اس کے لئے

اجنبی نہیں ہے لیکن باوجود ذہن پر زور دینے کے وہ کرنل فیکسرا اور اس چہرے میں کوئی تعلق پیدا نہیں کرسکا۔

جب وہ دونوں جدا ہونے لگے تو کرنل نے اخلاقاً اس سے دوبارہ ملنے کی خواہش کا اظہار کیا جسے ٹونی نے فوراً قبول کرلیا۔ اسے معلوم تھا کہ اسپین کے باشندے گپ شپ کے لئے اپنے دوستوں کو گھروں میں مدعو نہیں کرتے بلکہ کسی ریستوران میں محفل جمتی ہے اسی لئے اس نے کرنل سے ریستوران کا نام دریافت کیا جہاں وہ بیٹھ کر کچھ دیر گفتگو کرسکیں۔

کرنل نے ریستوران کا نام بتلایا جو جزیرے کے تین ہوٹلوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ وہ دونوں شام کو اس ریستوران میں ملنے کا وعدہ کرکے جدا ہوگئے۔

ٹونی طلاق کے اسباب اپنی بیوی اور اپنے بچے کو بھول کر تمام دن اسی الجھن میں مبتلا رہا کہ اس نے کرنل فیکسرا کو کہاں دیکھا ہے یہ تو ظاہر تھا کہ کرنل فیکسرا کا تعلق اسپین کی مسلح افواج سے رہا ہوگا، شام کو جب وہ کرنل سے گپ شپ کرنے کے لئے ریستوران پہنچا تو اس کو اپنا منتظر پایا۔ اس کے سامنے شراب کا گلاس رکھا ہوا تھا اور وہ آنکھیں بند کیے نشست سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ کرنل کی میز ریستوران میں بالکل علیحدہ اور ایک گوشے میں تھی۔ وہ دونوں بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ جزیرے کے متعلق جزیرے کے رہنے والوں کے متعلق سمندر اور اس کی مچھلیوں کے متعلق۔ دنیا بھر کی باتیں جب بھی ٹونی نے کرنل سے اس کے ماضی کے متعلق کوئی سوال کیا تو کرنل بڑی خوب صورتی سے سنی ان سنی کرکے ٹال گیا۔ گفتگو کے دوران کرنل کی یادداشت بیدار ہوتی لیکن اس عرصے میں ٹونی کو اس امر کا یقین ہوگیا کہ وہ اس شخص کو جانتا ہے اور اس شخص کے ماضی سے کوئی ایسا واقعہ وابستہ ہے جس کی وجہ سے اسے بے حد نیک نامی یا بدنامی ہوئی تھی کوئی مشہور واقعہ۔

ٹونی دور دور تک کرنل فیکسرا کے بارے میں سوچتا رہا۔ تیسرے روز وہ اسی ریستوران میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ اچانک اس کے ہاتھ سے کھانے کا کانٹا

چھوٹ کر زوردار آواز کے ساتھ فرش پر گر گیا۔ تو اسے کرنل کے ماضی کے ساتھ ہی وہ واقعہ بھی اچانک ہی یاد آ گیا تھا۔ اس واقعے کی یاد ہی اس قدر سنسنی خیز تھی کہ کانٹا نہ جانے کب اس کی انگلیوں سے پھسل کر گر گیا۔ اس واقعے کے ساتھ اسے کرنل کا اصلی نام بھی یاد آ گیا جو نقلی نام کی طرح بے حد طویل تھا لیکن مختصراً وہ کرنل ملاگرا کے نام سے مشہور تھا۔ جلدی جلدی کھانا ختم کرکے وہ کرنل کی آمد کا انتظار کرنے لگا لیکن اس رات کرنل ریستوران میں نہیں آیا۔

ٹونی کی چھٹیاں ختم ہونے میں صرف چار روز باقی تھے اور اسے اس وقفے میں اس سوال کا جواب حاصل کرنا تھا جس کا جواب اس کے ذہن میں تیار تھا۔ لیکن جس کی تصدیق یا تردید صرف اور صرف کرنل ملاگرا (یا کرنل فیکسرا ہی) کرسکتا تھا۔ دوسری شام وہ جلدی ریستوران پہنچ گیا۔ اس روز اسے مایوسی نہیں ہوئی کرنل کے بیٹھتے ہی وہ بلا کسی مقصد کے شروع ہوگیا۔

ٹونی نے کہنا شروع کیا ”جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو دوسرے لڑکوں کے برعکس مجھے ڈاک ٹکٹ سکے یا ایسی کسی چیز کے جمع کرنے کا شوق نہیں تھا بلکہ میں

پرانے رسالے جمع کرتا تھا مجھے پرانے رسالے جمع کرنے کا جنون تھا۔ ان رسالوں کے چند مضامین ایسے ہیں جو میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا خاص طور پر ایسے واقعات جو دنیا کے لئے آج تک معمہ بنے ہوئے ہیں۔

مجھے اس وقت ایسی ہی ایک کہانی یاد آرہی ہے جو اسپین کی مسلح افواج کے ایک افسر کے بارے میں تھی۔ یہ واقعہ 1933ء یا 1934ء میں پیش آیا تھا۔ اسپین کی فوج اس زمانے میں مسافر بردار طیاروں کے ذریعے دور دراز علاقوں میں فوجی نقل و حرکت کے تجربات میں مصروف تھی۔

ایک روز میڈرڈ سے صبح کے وقت ایک طیارہ اڑا جس میں فوج کے ایک اعلیٰ افسر کے ساتھ بارہ عدد جوان اور چھوٹے افسران تھے۔ وہ طیارہ اس صبح آسمانوں میں بلند ہوکر غائب ہوگیا۔ بے حد تلاش کے باوجود اس طیارے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ پھر ایک روز مچھیروں نے سمندر میں ایک ہوائی جہاز کے ٹوٹے ہوئے حصوں کو تیرتا ہوا دیکھ کر حکام کو اطلاع دی۔"

ٹونی نے خاموش ہوکر کرنل کے چہرے پر ردعمل دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسے بے حد مایوسی ہوئی کیونکہ کرنل کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

"مچھیروں کی اطلاع پر چھان بین کے لئے کئی پانی کے جہاز روانہ کیے گئے اور آخرکار ایک برطانوی تباہ کن جہاز اس مختصر سے جزیرے پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ جہاں وہ جہاز اس صبح میڈرڈ سے پرواز کر کے گر کر تباہ ہوا تھا۔ جہاز میں کل تیرہ فوجی تھے اور جب وہ برطانوی جہاز وہاں پہنچا تو صرف ایک مسافر زندہ تھا اور وہ مسافر اس طیارے کا کمانڈنگ آفیسر تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کمانڈنگ آفیسر کا زندہ بچ جانا اتنا بڑا معجزہ تھا کہ اس کے بارے میں رسالوں میں بے شمار مضامین لکھے گئے۔ ہر مصنف نے اس معجزے پر قیاس آرائی کی۔ مجھے ذاتی طور پر اتنی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی کہ میں نے لائبریری میں جاکر اس زمانے کے تمام اخبارات اور رسالے پڑھ ڈالے لیکن اس کے باوجود قیاس آرائی مجھے مطمئن نہ کرسکی۔ کہیں بھی مجھے حقیقت کا سراغ نہیں مل سکا کیونکہ زندہ بچنے والے کمانڈنگ آفیسر نے ایک بیان دے کر اپنی زبان بند کرلی تھی۔ اس افسر کا نام ملاگرا تھا۔ وہ کرنل ملاگرا کے نام سے مشہور ہوا۔"

ایک مرتبہ پھر ٹونی نے کرنل کا چہرہ غور سے دیکھا اسے ایک متوقع ردعمل کی تلاش تھی۔ اس مرتبہ اسے مایوسی نہیں ہوئی کیونکہ کرنل ملاگرا ساکت و جامد اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

کرنل ملاگرا کی کہانی بہت سیدھی سادھی تھی، ٹونی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔"اس کا بیان تھا کہ میڈرڈ سے پرواز کے بعد منزل مقصود سے کچھ فاصلے پر جہاز کے پیٹرول ٹینک میں سوراخ ہوگیا تھا۔"

ایک مرتبہ پھر ٹونی نے کرنل کا چہرہ غور سے دیکھا اسے ایک متوقع ردعمل کی تلاش تھی۔ اس مرتبہ اسے مایوسی نہیں ہوئی کیونکہ کرنل ملاگرا ساکت و جامد اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

کرنل ملاگرا کی کہانی بہت سیدھی سادی تھی، ٹونی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔"اس کا بیان تھا کہ میڈرڈ سے پرواز کے بعد منزل مقصود سے کچھ فاصلے پر جہاز کے پیٹرول ٹینک میں سوراخ ہوگیا۔ پائلٹ کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ سمندر میں پھیلے ہوئے ان چند جزیروں میں سے کسی ایک جزیرے پر طیارہ اتارنے کی کوشش کرے جو غیر آباد، سنسان اور چھوٹے چھوٹے تھے۔ پائلٹ نے اپنی پوری کوشش کی کہ وہ جہاز کو حفاظت سے کسی جزیرے پر اتار دے اور اس کی کوشش کسی حد تک بار آور ثابت ہوئی۔ اس نے طیارے کو آتش فشاں پہاڑ کے لاوے سے بنی ہوئی ایک پتلی اور لمبی سی چٹان پر اتار دیا۔ اس کوشش میں جہاز ٹوٹ پھوٹ گیا۔ طیارے کا پائلٹ اور دو فوجی ہلاک ہوگئے۔ لیکن بقایا مسافر زندہ بچ گئے جن میں سے چند ایک زخمی تھے۔

کرنل ملاگرا چونکہ اس مہم کا کمانڈنگ آفیسر تھا اس لئے صورتحال پر قابو پانے کی ذمہ داری اس کے

کاندھوں پر تھی۔ یہ اس کا فرض تھا کہ وہ زندہ بچ جانے والوں میں نظم و ضبط قائم رکھے اور انہیں اس وقت تک سنبھالے رکھے جب تک کوئی امدادی پارٹی انہیں تلاش کرتی ہوئی نہیں آجاتی۔ اس کی کوششوں کو بالآخر ناکام ہونا تھا اس جزیرے پر پینے کے پانی کے علاوہ کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ جھاڑیوں کے پتے بھی نہیں تھے۔ زندہ بچ جانے والوں کو اپنا انجام فوراً نظر آ گیا۔ ظاہر تھا اگر ان کی تلاش میں کوئی امدادی پارٹی وہاں نہیں پہنچتی تو فاقوں کی موت ان کا مقدر تھی اس لئے ان کا تمام وقت دعائیں مانگنے اور سمندر میں کسی جہاز کو دیکھنے میں صرف ہونے لگا۔ راتوں کو وہ خوابوں میں انواع و اقسام کے کھانے دیکھتے تھے......"

ٹونی نے کرنل کو ایک گہرا سانس لیتے ہوئے دیکھا۔ "کرنل ملاگرا کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اسے اس جزیرے پر آئے ہوئے کتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ اسے آٹھ ہفتے ہوئے تھے جزیرے پر فاقوں سے مرنے والوں کی کوئی لاش موجود نہیں کیونکہ لاشوں کے بے گور و کفن کھلے آسمان کے نیچے پڑے رہنے سے وبائی امراض پھیلنے کا اندیشہ تھا اس لئے کرنل نے حکم دیا کہ ہر مرنے والے کی لاش کو بھاری پتھروں سے باندھ کر سمندر میں پھینک دیا جائے اور یہ کام اس نے خود اپنے ذمے لے رکھا تھا۔

جزیرے کے قریبی سمندری علاقے کو جب کھنگالا گیا تو صرف دو لاشیں دستیاب ہوسکیں۔ لاشوں کی ظاہر حالت سے معلوم ہوتا تھا کہ انہیں سمندر کی خوفناک شارک مچھلیوں نے اپنا پیٹ بھرنے کے لئے استعمال کیا ہے کیونکہ لاشوں کے جسم جگہ جگہ سے نچے ہوئے تھے۔

کرنل کا اس طرح زندہ بچ جانا ہی سنسنی خیز تھا اس لئے دنیا بھر کے اخباروں نے اس واقعے کو خوب اچھالا لیکن پھر اچانک لوگوں کی توجہ چند دوسری حقیقتوں کی طرف مبذول ہوگئی جس پر پہلے کسی کی نظر نہیں پڑسکی تھی وہ سوال ایسا دہشت ناک تھا جسے کوئی بھی صحافی با آواز بلند دہرانا پسند نہیں کرتا تھا لیکن وہ سوال ہر صحافی کے ذہن سے چپکا ہوا تھا مختصر الفاظ میں اس سوال کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ جس روز طیارہ میڈرڈ سے اڑا تھا اس سے صرف ایک روز پہلے کرنل ملاگرا کا وزن کیا گیا تھا کیونکہ یہ ہوائی فوج کا ایک قاعدہ ہے۔ آٹھ ہفتوں کے دوران اس جزیرے پر آٹھ آدمی فاقوں سے ہلاک ہوگئے۔ لیکن خود کرنل ملاگرا کی صحت پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہوگئی، اس کے رخساروں پر سرخی آگئی تھی اور وہ مکمل طور پر صحت مند تھا......"

ٹونی نے رک کر کرنل کی آنکھوں میں جھانکا۔ اسے ان آنکھوں میں کچھ بھی نظر نہیں آیا۔

"ان حقائق کے سامنے آتے ہی طرح طرح کی افواہوں کا اڑنا قدرتی امر تھا۔" ٹونی نے اپنی کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لوگ آپس میں ایک دوسرے سے پوچھتے، بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ آٹھ انسان بھوک سے مرجائیں اور نواں آدمی اور موٹا تازہ ہوجائے؟"

کرنل نے اس سوال کا جواب ہنسی میں ٹالنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ "پرواز سے پہلے جس مشین پر اس کا وزن کیا گیا تھا اس میں یقیناً کوئی نقص تھا اور اس نے اس کا وزن زیادہ بتلایا تھا۔" کرنل نے یہ بھی کہا کہ "پرواز سے پہلے وہ اس سے بھی زیادہ موٹا تھا۔ جتنا وہ اب نظر آتا ہے۔" "لیکن کرنل کے ساتھیوں نے اس کی تردید کردی اور بتلایا کہ کرنل کی صحت پرواز سے پہلے اتنی عمدہ نہیں جتنی کہ اب ہے اور وہ بلاشبہ پہلے کی نسبت موٹا اور تندرست ہوگیا ہے۔"

ایک صحافی نے کسی طرح وزن کرنے کی اس مشین کو غائب کردیا جس پر پرواز سے ایک روز قبل کرنل کا وزن کیا گیا تھا۔ ماہرین نے معائنے کے بعد متفقہ طور پر اس مشین کو بالکل درست قرار دیا۔ ان پراسرار حقائق کے باوجود کرنل ملاگرا سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی گئی۔ اس پر کسی عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا گیا اس پر کوئی الزام عائد نہیں کیا گیا۔ اور کسی سرکاری کاغذ میں وہ

الفاظ استعمال نہیں کیا گیا جو سب کے ذہنوں میں گونج رہا تھا جو ہر شخص کے لبوں پر تھا۔ ''آدم خور......'' مگر کسی نے بھی بلند آواز سے کرنل ملاگرا کو آدم خور نہیں کہا۔''

کرنل ملاگرا نے بجھے ہوئے سگار کو دوبارہ جلایا اور ہاتھ کے اشارے سے ٹونی کو خالی گلاس میں مزید شراب انڈیلنے کا اشارہ کیا۔ ٹونی نے کرنل کا گلاس شراب سے بھر دیا اور پھر آگے جھکتے ہوئے اپنی کہانی دوبارہ شروع کی۔

''کرنل کے وزن بڑھنے کا جواب بہت آسان نظر آتا تھا۔ کرنل ملاگرا اس مہم کا کمانڈنگ آفیسر تھا۔ طیارے کی تباہی کے بعد بھی وہ کمانڈنگ آفیسر رہا۔ زندہ بچ جانے والوں میں نظم و ضبط برقرار رکھنا اس کی ذمہ داری تھی اور مردوں کو پتھروں سے باندھ کر سمندر میں پھینکنے کا اصول بھی اس نے وضع کیا تھا اور مردوں کو سمندر میں پھینکنے کا کام وہ خود ہی انجام دیتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ کرنل ان لاشوں کو سمندر میں ضرور پھینکتا تھا لیکن...... اپنا پیٹ بھرنے کے بعد۔''

کرنل ٹیکسرا نے شراب کے بڑے بڑے گھونٹ لے کر گلاس خالی کر دیا اور پھر اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔

''شب بخیر سینور'' کرنل نے کہا۔ ''اب میرے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں تمہاری مہمان نوازی اتنی عمدہ کہانی سے دل بہلانے پر بے حد مشکور ہوں۔''

ٹونی کرنل کو باوقار انداز میں جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ اس کے انداز نے اسے بے حد مرعوب کر دیا تھا۔ پھر اس نے دروازے کے قریب کرنل کو لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تو تیزی سے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا۔ کرنل کے احتجاج کے باوجود ٹونی اسے سہارا دیتا ہوا اس کی گاڑی تک لے آیا۔

''تم اس غلیظ کہانی کو آئندہ کبھی مت دہرانا۔'' کرنل ٹیکسرا نے عجیب انداز میں کہا۔ ''یہ سب بکواس ہے اور میں وہ کرنل نہیں ہوں! تم کیوں میرا سکون غارت کرنے پر تلے ہوئے ہو؟''

پھر کرنل نے جھنجھوڑ کر اسٹیئرنگ وہیل کے پیچھے اونگھتے ہوئے ملازم کو جگایا اس کا گونگا ملازم ہڑبڑا کر جاگ گیا۔ ٹونی اس وقت تک کرنل کی گاڑی کو دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

دوسری صبح کرنل کا گونگا ملازم اس کے پاس کرنل کا ایک تحریری پیغام لے کر آیا جس میں کرنل نے اس سے سہ پہر کے وقت اپنے گھر آنے کی درخواست کی تھی۔ ٹونی نے کرنل کی درخواست قبول کر لی اسے کرنل کے مکان تک پہنچنے کے لئے ایک سو پندرہ سیڑھیاں چڑھنی پڑیں۔ وہ مکان اتنا بڑا نہیں تھا جتنا وہ ساحل سے نظر آتا تھا۔ اس میں صرف چار کمرے تھے ایک کھانا کھانے کا، دوسرا کھانا پکانے کا، ایک خواب گاہ اور آخری کمرہ ڈرائنگ روم کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تھا مکان کا فرنیچر پرانی طرز کا تھا۔ کرنل ملاقات ہوتے ہی بغیر کسی مقصد کے مطلب کی طرف آ گیا۔

''تمہارے کیا ارادے ہیں سینور ٹونی؟'' کرنل ٹیکسرا نے پوچھا۔ ''تم نے بتایا تھا کہ تم ایک صحافی ہو اور ایک صحافی کی اخلاقی قدریں عام انسانوں سے مختلف ہوتی ہیں کیا تم اپنے ملک واپس جا کر دوبارہ اس کہانی کی تشہیر کرو گے؟''

ٹونی کوئی جواب دینے سے پہلے کچھ جھجکا۔

''ہاں کرنل میں اس مسئلے پر غور کر رہا ہوں۔'' ٹونی نے جواب دیا۔ ''لیکن تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں، میں یہ نہیں لکھوں گا کہ تم سے میری ملاقات کسی مقام پر ہوئی تھی اور میں تمہارا موجودہ نام بھی لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتا اس لئے تمہیں کسی قسم کی تشہیر سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں......؟''

''لیکن فکرمند ہونا اب میری عادت ہو گئی ہے سینور'' کرنل نے کہا۔ ''اس واقعے کو سینتیس سال گزر چکے ہیں۔ آج بھی جب میں گھر سے باہر نکلتا ہوں تو ہر وقت میرا دل اس لفظ کو سننے کے خوف سے لرزتا رہتا ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ خوف رہتا ہے کہ میری ملاقات کہیں کسی ایسے آدمی سے نہ ہو جائے جو میرے ماضی سے واقف ہو۔ اب تم سمجھے سینور۔ میں فطری طور پر تنہائی پسند

نہیں ہوں میری زندگی فوج میں گزری ہے، جہاں پہلے ہی روز سے دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہنا و کام کرنا سکھایا جاتا ہے۔ مجھے دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرنے کا بھی بہت شوق ہے۔ لیکن میں یہاں اس جگہ اس غیر معمولی اور مختصر سے جزیرے کی ایک پہاڑی پر تنہا اپنے ایک گونگے ملازم کے ساتھ اپنی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ کیوں؟ صرف مجبوری کے تحت! میں سیاحت نہیں کر سکتا، میں لوگوں کے ساتھ نہیں مل جل سکتا۔ میں تنہائی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں، میرے دوست مجھ پر دنیا کی ہر آسائش اور خوشی حرام ہو چکی ہے......"

"تم اس جزیرے سے باہر نہیں جاتے؟ میں نے سنا تھا کہ تمہاری اپنی ایک کشتی ہے۔" ٹونی نے کہا......

"بے شک میری اپنی کشتی ہے لیکن اسے صرف میرا ملازم استعمال کرتا ہے...... میں ایک قیدی ہوں۔ اپنی مرضی سے کہیں نہیں جا سکتا، میں اپنے خوف کا قیدی ہوں، پہچانے جانے کا خوف وہ خوف جس کی شدت میں پچھلے چھتیس سالوں سے کمی واقع ہو رہی تھی اب پھر تم آ گئے کسی دہشت ناک خواب کی طرح۔"

"کرنل ملاگرا" ٹونی نے کہا۔ "میں تمہیں دھوکا نہیں دینا چاہتا...... میں ایک صحافی ہوں اس لئے میں ان چیزوں کو فراموش نہیں کر سکتا جنہیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ میں یہ فرض نہیں کر سکتا کہ تمہارا کوئی وجود نہیں ہے اور مجھے تم سے ایسا کوئی دلی تعلق بھی نہیں ہے کہ اس محبت کی خاطر میں خاموش رہوں، لیکن یہاں ایک ایسی چیز بھی موجود ہے جو مجھے اپنے پیشے سے بھی زیادہ عزیز ہے۔"

"وہ کیا؟"

"سچائی جسے جاننے کے لئے میں بچپن ہی سے بے تاب ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں سینور؟"

"میں سچائی جاننا چاہتا ہوں کرنل، میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس جزیرے پر مرنے والے ان آٹھ آدمیوں کا دراصل کیا حشر ہوا تھا؟ جب تمہارے آٹھ ساتھی فاقوں سے ہلاک ہو رہے تھے تو آخر کیوں تمہارا وزن بڑھ رہا تھا اور چہرے پر سرخی آ رہی تھی؟ میں وہ جواب سننا نہیں چاہتا جو سینتیس سال پہلے تم نے اخباری نمائندوں کو دیا تھا کرنل...... میں حقیقت جاننا چاہتا ہوں جو مجھے مطمئن کر دے۔ اس کے عوض میں تمہیں زبان دیتا ہوں کہ جو کچھ تم مجھے بتلاؤ گے وہ ہمیشہ میرے سینے میں دفن رہے گا اور کبھی میرے قلم کی نوک پر نہیں آئے گا۔"

ٹونی کو دو باتوں کی توقع تھی حقیقت کے اظہار سے صاف انکار کر دیا اس بات پر اصرار کہ اس نے 37 سال پہلے جو کہا تھا وہی حقیقت تھی۔ کرنل اپنی نشست سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

وہ سگار نوشی کرتے ہوئے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر اچانک اس نے رک کر ٹونی کو دیکھا۔

"بہت اچھا سینور۔ مجھے تمہاری شرط منظور ہے ممکن ہے کسی کو سچائی بتلا کر میرے سینے کا بوجھ بھی کم ہو جائے۔" کرنل نے کہا اور باوقار انداز میں چلتا ہوا اس کے سامنے بیٹھ گیا...... پھر اس نے کہا......

"میں آدم خور نہیں ہوں سینور میں اس سے بھی بدتر ہوں......"

کرنل کے جواب سے ٹونی کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔

"چونکہ میں آدم خور سے بھی بدتر ہوں اس لئے میں 37 سال پہلے دنیا کو حقیقت سے آگاہ نہیں کر سکا۔ میری خاموشی سے انہوں نے نتائج اخذ کئے، وہ میرے لئے بالکل غیر متوقع تھے لیکن اس کے باوجود میری زبان بند رہی، میں اس کے بعد بھی دنیا کو سچائی سے آگاہ نہیں کر سکا۔ میں اپنے گندے کرتوتوں پر اس قدر شرمندہ تھا۔"

کرنل کی خاموشی ناقابل برداشت تھی اس لئے ٹونی نے فوراً ہی لقمہ دیا......

"آخر وہ کیا حرکت تھی کرنل جو آدم خوری سے بھی زیادہ بدتر ہو سکتی ہے؟"

"بزدلی۔" کرنل نے جواب دیا۔ پھر چند لمحے

توقف کے بعد اس نے کہا۔ "کچھ تفصیلات ایسی تھیں جو اخباروں میں شائع نہیں ہوئیں۔ مثلاً یہ حقیقت کہ اس طیارے میں بارہ سے زائد مسافر سوار تھے اور یہ حقیقت کہ اس طیارے میں کافی مقدار میں کھانے پینے کا سامان موجود تھا۔ تم حیران ہو رہے ہو سینور، واقعی اس طیارے میں کھانے پینے کی کافی مقدار موجود تھی۔ اتنی مقدار جو ایک طویل سفر کے دوران ایک درجن سے زائد مسافروں کا خوب اچھی طرح پیٹ بھر سکے وہ مقدار اتنی نہیں تھی جو درجن بھر آدمیوں کو دو ماہ تک زندہ رکھ سکے لیکن وہ غذا دو ماہ تک...... ایک انسان کو ضرور زندہ رکھ سکتی تھی......"

ٹونی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"جب پائلٹ نے طیارے کو اس جزیرے پر اتارا تو میں نے طیارے کا ڈھانچہ سمندر میں پھینکنے سے پہلے اس کے اندر سے کھانے پینے کا سارا سامان نکال لیا تھا۔ ڈھانچے کو سمندر میں پھینکنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ ممکن ہے کسی ملاح کی نظر اس پر پڑ جائے۔ کھانے پینے کا سامان میں نے اس جزیرے کے دوسری طرف چھپا دیا۔ اس وقت میرا ارادہ یہی تھا کہ امدادی پارٹی کے آنے تک میں کھانے کی اس قلیل مقدار کو زندہ بچنے والوں میں اس طرح روزانہ تقسیم کروں کہ وہ امداد آنے تک ہمیں زندہ رکھے مجھے اس امر کا بخوبی اندازہ تھا کہ اگر میں نے وہ سارا سامان ان لوگوں کے سامنے رکھ دیا تو وہ ایک وقت سے زیادہ نہیں چل سکے گا۔ اس جزیرے کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ اگر جلد ہی کوئی امدادی پارٹی ہمیں بچانے نہیں آئی تو ہم سب فاقوں سے مر جائیں گے کیونکہ اس جزیرے پر پینے کے پانی کے علاوہ کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا، اس جزیرے پر صرف اور صرف نیلے رنگ کی چھپکلیاں پائی جاتی تھیں جیسی کہ تم نے اس جزیرے پر دیکھی ہوں گی جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر ان لوگوں کو بند گوشت کے چند ڈبوں اور بسکٹوں کے چند پیکٹوں کے بارے میں معلوم ہوگیا تو ہر شخص وہ تمام خوراک حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور اس کوشش میں وہ ایک دوسرے کو جان سے مار ڈالیں گے۔ میرے پیش نظر یہ بات بھی تھی کہ ان لوگوں میں نظم و ضبط قائم رکھنے کی تمام ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے کیونکہ میں اس مہم کا کمانڈنگ آفیسر تھا اور ہر قسم کے حالات کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ڈال دی جائے گی اس لئے میرے لئے اپنی جسمانی قوت بحال رکھنا بے حد ضروری تھا تاکہ میں ان کے درمیان نظم و ضبط بحال رکھ سکوں اور ان پر قابو پائے رہوں۔

اس لئے سینور اس وقت میں نے جو کچھ بھی کیا اپنے خیال میں بہتر ہی کیا تھا لیکن شاید میں غلطی پر تھا یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جوں جوں دن گزرتے گئے اور یہ واضح ہوتا گیا کہ ہم لوگوں کی قسمت میں فاقوں سے مرنا لکھا ہے تو میرا خوف میرے ذہن پر چھا گیا۔ میری زندہ رہنے کی خواہش شدید سے شدید تر ہوتی چلی گئی۔"

کرنل خاموش ہوگیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر شراب کا گلاس اس طرح اٹھایا جیسے وہ گلاس منوں وزنی ہو۔ ٹونی جو سناٹے کے عالم میں کرنل کی کہانی سن رہا تھا چونک گیا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"شکریہ کرنل مجھے سچائی سے آگاہ کرنے کا بہت بہت شکریہ، اس وقت تم پر جو کیفیت طاری ہوگی میں اسے سہہ سکتا ہوں۔

"شکریہ سینور تم نے میرا بوجھ بہت ہلکا کر دیا۔" کرنل نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ "کم از کم اب مجھے یہ معلوم ہوگیا کہ اس دنیا میں ایک ایسا شخص ضرور موجود ہے جو جذبات سے عاری ہو کر اس وقت جو کیفیت مجھ پر طاری تھی اسے محسوس کر سکتا ہے۔ اب تم سمجھ گئے ہوگے سینور کہ جس وقت میرے آٹھ ساتھی بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے تھے۔ اس وقت آخر کیوں میرا وزن بڑھ رہا تھا...... تمہیں تمہارے سوال کا جواب مل گیا، تم نے مجھے مجبور کیا کہ میں ان اذیت ناک باتوں کو دہراؤں جنہیں میں پچھلے پینتیس سال سے بھولنے کی

کوشش کررہا ہوں...... مجھے...... مجھے امید ہے کہ اب تم اپنا وعدہ پورا کرتے ہوئے یہ سب کچھ بھلا دو گے...... یہ راز تمہارے ساتھ تمہاری قبر میں دفن ہوجائے گا؟"

"بے شک کرنل میں اپنے وعدے پر قائم رہوں گا۔ میں وعدہ خلاف نہیں ہوں۔" ٹونی نے جواب دیا......

ٹونی فوراً ہی کرنل کے مکان سے واپس اپنے ہوٹل آگیا۔ وہ اس معمے کے حل ہوجانے پر خوش تھا اور اسے ہمیشہ اپنے سینے میں دفن رکھنے پر افسردہ بھی تھا۔ وہ اس راز سے دنیا کو آگاہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اپنے پڑھنے والوں کو ایک بے حد سنسنی خیز کہانی سے محروم رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ غیر شعوری طور پر وہ بہت دیر تک اس کہانی کا عنوان سوچتا رہا۔ وہ اس کہانی کو شائع کرانے کے لئے غیر شعوری طور پر ماہناموں کا انتخاب کرتا رہا۔ پھر وہ اس امکان پر غور کرنے لگا کہ آیا اس کہانی کو پھیلا کر ایک پوری کتاب پر محیط کیا جاسکتا ہے۔ وہ تصوراتی نظروں سے اپنی اس کتاب کو بک اسٹالوں پر نمایاں جگہ پر لگے ہوئے دیکھنے لگا۔ اسے یقین ہوگیا کہ یہ کتاب اس کی پیشہ ورانہ زندگی میں ایک انقلاب برپا کردے گی۔ اس کی پوری زندگی تبدیل ہوجائے گی۔ وہ اس کتاب کے ساتھ اس کے مصنف کی حیثیت سے امر ہوجائے گا۔

اچانک اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ضرور اس کتاب کو لکھے گا اور اس طرح اس انداز میں کہ پڑھنے والے اسے پڑھنے کے بعد کرنل ملاگرا سے نفرت کے بجائے ہمدردی کرنے لگیں۔ وہ اس کتاب کے ایک ایک لفظ کو اپنے جذبات کی قوت سے متحرک کردے گا...... اس طرح کہ پڑھنے والوں کا دل اس کے قلم سے نکلے ہوئے ہر لفظ کے ساتھ دھڑکتا رہے۔ وہ ابھی اور اسی وقت کرنل کے پاس جائے گا اور بلا تمہید اس سے کہے گا۔

"کرنل ملاگرا میری بات غور سے سنو اور پوری بات سننے کے بعد ہی تم اس بات کا فیصلہ کرنا کہ میں تمہاری کہانی لکھوں یا نہیں۔

سنو 35 سال سے تم دنیا سے الگ تھلگ قید

تنہائی کی زندگی بسر کر رہے ہو۔ تم اپنے چہرے کو اس قدر بدنما تصور کرتے ہوئے کہ اسے دنیا بھر کی نظروں سے روپوش رکھنا چاہتے ہو۔ تمہیں اپنے نام سے بھی اتنی نفرت ہوگئی ہے کہ تم نے اسے بھی تبدیل کر دیا۔ کس لئے؟ صرف اپنے ایک احمقانہ اور بے بنیاد خوف کی وجہ سے تم سمجھتے تھے کہ اگر تم نے دنیا پر حقیقت کا اظہار کر دیا تو کوئی بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ کوئی بھی تم سے ہمدردی کا اظہار نہیں کرے گا...... کسی غلطی کی تصحیح کے لئے شاید 37 سال کا عرصہ بہت زیادہ ہوتا ہے کرنل لیکن اگر یہ تصحیح تمہاری جگہ کوئی دوسرا آدمی کرے گا؟

اگر کوئی دوسرا آدمی دنیا کو اس سچائی سے آگاہ کرے کہ اس وقت تم نے جو کچھ بھی کیا پوری دیانتداری اور پوری سچائی سے حالات کا جائزہ لے کر کیا تھا۔ غلط یا صحیح تمہارا ایکشن پر خلوص تھا۔ تمہیں یہ ڈر تھا کہ کھانے کے سامان کا علم ہونے پر وہ سب اسے حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے کا گلا کاٹ دیں گے۔ یہ عین ممکن ہے کرنل بلکہ مجھے پورا یقین ہے کہ ایک غیر متعلق غیر جانبدار آدمی کی زبانی پوری حقیقت جاننے کے بعد دنیا تمہیں صاف بری کر دے گی۔ لوگ تمہیں سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ تم سے ہمدردی کا اظہار کریں گے جو کچھ ہوا اس پر تاسف کا اظہار کیا جائے گا اور پھر...... پھر تم آزاد ہو جاؤ گے...... اپنے خوف سے اور اس قید تنہائی سے۔ تب تم ایک مرتبہ پھر اپنا پرانا نام استعمال کر سکو گے۔ کرنل ملاگرا پھر تمہیں لوگوں سے اپنا چہرہ نہیں چھپانا پڑے گا پھر تم اپنی مرضی کی زندگی گزار سکو گے......''

ہوٹل سے کرنل کے مکان کا درمیانی فاصلہ ٹونی نے اپنے ذہن میں ان دلائل کو دہرانے، یاد کرنے اور انہیں مرتب کرنے میں صرف کیا جو وہ کرنل کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا کرنل کے مکان کی ایک سو پندرہ سیڑھیاں طے کرتے وقت وہ با آواز بلند اپنی اس بے حد جذباتی تقریر کو دہرا رہا تھا۔ اس نے مکان کے دروازے پر دستک دی۔

دروازہ بے حد موٹی لکڑی کا بنا ہوا تھا اس لئے وہ دستک کی آواز ہضم کر گیا۔ ٹونی نے دروازے کو دھکیلا تو وہ بلا آواز کھلتا چلا گیا۔ وہ کرنل کو تلاش کرتا ہوا کھانے کے کمرے میں پہنچا۔ کرنل اس وقت کھانے کی میز پر بیٹھا ہوا۔ رات کا کھانا کھانے میں مشغول تھا۔ اس کا گونگا ملازم اس کے قریب کھڑا ہوا شراب کی بوتل سے میز پر رکھا ہوا مٹی کا ایک پیالہ شراب سے بھر رہا تھا۔

ٹونی نے انہیں متوجہ کرنے کے لئے کھنکار کر گلا صاف کیا، کھنکارنے کی آواز سنتے ہی کرنل کے جسم کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ وہ اس تیزی سے مڑا کہ اس کی کرسی الٹتے الٹتے بچی۔

ٹونی اس طرح بغیر کسی اطلاع کے گھر میں گھس آنے پر معذرت طلب کرنے لگا لیکن پھر اچانک اس کی نظر کرنل کے سامنے رکھی ہوئی پلیٹ پر پڑی جب اسے احساس ہوا کہ اس پلیٹ میں کیا رکھا ہوا ہے تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

یہ جاننے کے بعد کہ کرنل نے اسے جو کچھ بتلایا تھا وہ سب جھوٹ تھا الفاظ اس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ کرنل کی نظریں ٹونی کی نظروں کا تعاقب کرتی ہوئی اپنے سامنے رکھی ہوئی پلیٹ پر آ کر رک گئیں جس میں پانچ سات نیلی چھپکلیاں کٹی ہوئی رکھی تھیں۔

ٹونی کے کانوں میں کرنل کے الفاظ گونجنے لگے۔ ''اس جزیرے پر صرف اور صرف نیلے رنگ کی چھپکلیاں پائی جاتی تھیں جیسی کہ تم نے اس جزیرے پر دیکھی ہوں گی۔''

''تو کیا اس جزیرے پر کرنل دنیا کا غلیظ ترین اور کراہیت آمیز جانور چھپکلیاں کھاتا رہا اور چھپکلیاں کھانے کی عادت اسے اس جزیرے پر مقید کئے ہوئے ہے۔'' کرنل نے رحم طلب نظروں سے اسے دیکھا۔

''پلیز سینور، پلیز۔'' کرنل نے اسے گھگھیاتے ہوئے کہا۔ ''تم سمجھنے کی کوشش کرو سینور، ایک مرتبہ کوئی چیز منہ کو لگ جائے تو......''

☠

الگ مخلوق

آصفہ سراج۔لاہور

شیریں زبان حسن اخلاق اور مسکراتی آنکھوں کا متلاشی کون نہیں ہوتا اور یہی کچھ نادیدہ قوتیں بھی چاہتی ہیں وہ بھی انہی باتوں کی گرویدہ ہوتی ہیں کہانی پڑھ کر تو دیکھیں۔

کیا یہ حقیقت ہے کہ عشق و محبت، چاہت و خلوص اور دیدہ دلیری ہر مخلوق میں ہوتی ہے

میں اچانک ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ نیند کی وجہ سے آنکھوں میں سرخی نمایاں تھی، کسی نے اچانک سوتے میں میرے چہرے پر پانی پھینکا تھا۔ اچھی طرح ہوش میں آنے پر میں اردگرد نظر دوڑانے لگی۔ پھر میں سمجھی کہ یہ میرا وہم ہے لیکن اپنے دوپٹے کو گیلا دیکھ کر میں اپنے خیال کی نفی کرنے لگی۔

بہت دیر تک دیکھنے اور غور کرنے پر بھی میں کچھ نہ سمجھی...... میں بہت دیر تک بدحواس رہی۔ کمرے میں بھی اس وقت ایسی کوئی بات نظر نہ آئی، سب گھر والے اپنی اپنی چارپائیوں پر سکون سے سو رہے تھے، اس وقت تقریباً رات کے دو بج رہے تھے۔

میں نے منہ آسمان کی طرف کرکے اندازہ لگانے کی کوشش کی...... میں سوچنے لگی کہ "یہ کون تھا جو مجھ پر پانی پھینک گیا۔"

صبح تک میں اس بات کو بھول چکی تھی کیونکہ یہ کوئی اتنی خاص بات بھی نہیں تھی۔ صبح کو گھر میں معمول سے ہٹ کر چہل پہل اور رونق تھی...... آج میری کزن ندا کی مہندی تھی اور سب گھر والے وہاں جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ جانا تو میں بھی چاہتی تھی مگر دو دن پہلے ہی سیڑھیوں سے گر کر چوٹ لگا بیٹھی۔ خیر چوٹ زیادہ نہ تھی مگر معمولی بھی نہ تھی، پاؤں کی ہڈی میں تکلیف ہوگئی تھی، تکلیف بہت زیادہ اور سوجن بھی۔ تھوڑی دیر بھی چلتی تو تکلیف ہوتی تھی اور پاؤں سوجا جاتا تھا۔ اس لئے ندا سے فون پر ہی معذرت کر لی تھی۔

امی بھی بار بار مجھے سمجھا رہی تھیں۔ ''بیٹا دروازہ اچھی طرح بند کر لینا۔'' ویسے تو امی بھی شادی میں جانے سے منع کر رہی تھیں مگر میں نے انہیں یقین دلایا کہ ''میں اکیلی رہ لوں گی آپ پریشان نہ ہوں ویسے بھی آپ نے وہاں رکنا تھوڑی ہے چاہے دیر سے ہی مگر گھر آئیں گی ضرور۔'' اس لئے وہ مطمئن ہوگئی تھیں۔

اور کچھ دیر بعد ہی سب گھر والوں کے جانے کے بعد میں اکیلی رہ گئی گھر والوں کے جانے کے دو گھنٹے بعد ہی دروازے پر زوردار دستک ہوئی تو میں نے دروازہ کھولا تو ایک انتہائی خوبصورت بچی کھڑی تھی وہ بلا کی خوبصورت تھی، میں مبہوت ہو کر اسے تکے جا رہی تھی۔ اور وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ وہ پنک کلر کے فراک میں تھی پنک کلر اس کے سرخ و سفید رنگ پر بہت کھل رہا تھا بالوں کی دو چوٹیاں باندھے وہ انتہائی معصومیت سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی عمر آٹھ سال سے زیادہ نہ تھی۔ ''کیا بات ہے بیٹے؟'' میں نے پیار سے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

''باجی میرا نام انابیہ ہے۔'' وہ بولی۔ ''کہاں سے آئی ہو۔؟'' میں نے پوچھا۔

''اس طرف سے۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا تو میں سمجھی...... کہ وہ محلے میں نئی نئی آئی ہوگی۔ میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ''بیٹا...... کیا بات ہے۔؟'' میں اور میرا شوہر فیضان ملتان میں رہتے تھے۔

فیضان گھر میں اکیلے رہتے تھے...... ایسے میں جب میری طبیعت خراب ہوئی تو وہ پریشان ہوگئے اور مجھے میری امی کے گھر اسلام آباد چھوڑ گئے۔ خود ان کی پوسٹنگ بارڈر پر ہوگئی اور وہ چلے گئے میرے شوہر ایئر فورس میں تھے...... مجھے امی کے گھر رہتے ہوئے 2 ماہ ہوگئے تھے اور مجھے خوشخبری آنے تک اس جگہ رکنا تھا اس عرصے میں فیضان 3 مرتبہ مجھ سے ملنے آئے تھے۔ وہ روزانہ فون کرتے تھے......

''میں گھر میں آ جاؤں......'' میں یکدم ہی خیالات سے چونکی۔

''بیٹا تمہارے امی ابو پریشان ہوں گے۔''

''میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ میں باجی کے گھر کھیلنے جا رہی ہوں۔'' انابیہ بولی۔ میں اس کی طرف پیار سے دیکھنے لگی میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئی اس کے آنے سے گھر میں جیسے اجالا ہوگیا۔ وہ اتنی ہی اچھی تھی، ہمارے گھر میں چونکہ کوئی بچہ نہ تھا اس لئے میں اسکے ساتھ باتیں کرنے لگی۔ اس کے بعد میں اس خوب صورت مہمان کی خاطر تواضع کے لئے کچن میں چلی گئی وہ میرے ساتھ ہی کچن میں چلی آئی اور مجھے کام کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔

''بیٹا...... آپ کو پتہ ہے انابیہ کا مطلب کیا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''جی باجی...... انابیہ کا مطلب ہے۔ جنت کا دروازہ۔''

میں اس کے نام کے خوب صورت مطلب میں کھو سی گئی۔ ''جنت کا دروازہ'' میں نے زیر لب کہا۔ ''جتنا خوب صورت نام ہے اس سے کہیں زیادہ خوبصورت اس کا مطلب ہے۔'' میں نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔

''باجی آپ نے برا تو نہیں مانا۔'' وہ بولی۔

''کس بات کا؟'' میں نے کہا۔

''یہی کہ میں جو ادھر ادھر پھر رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اس کی معصومیت ایسی تھی کہ میں نے آگے بڑھ کر اسے پیار کرلیا۔ اس کی پرورش شاید بہت ہی اچھے ماحول میں ہوئی تھی اس لئے وہ بہت ضد کے بعد کچھ کھانے پر راضی ہوئی تھی پھر ہم دوبارہ باتوں میں مصروف ہوگئے۔ اس دوران میں نے اس سے اس کے گھر والوں کے بارے میں پوچھا۔'' اچھا انابیہ'' یہ بتاؤ تم کتنے بہن بھائی ہو۔؟

''صرف تین...... میں اور میرے دو بڑے بھائی۔'' وہ بولی۔

''تمہارے ابو کیا کرتے ہیں۔؟'' میں نے پوچھا۔

''پتہ نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اچھا میں تمہارے گھر والوں کو فون کردوں کہ تم یہاں ہو۔'' میں بولی۔

''ہرگز نہیں فون کرنے کی ضرورت نہیں میرے گھر میں سب کو پتہ ہے کہ میں یہاں پر ہوں۔''

اب مجھے اس کے گھر والوں کی طرف سے فکر ہونے لگی تھی کہ وہ انابیہ کو ڈھونڈرہے ہوں گے۔ کافی دیر تک باتیں کرنے کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔'' تمہارا گھر کہاں ہے تم کہاں رہتی ہو۔؟''

''پتہ نہیں۔''

''کیا؟ تمہیں اپنا گھر نہیں معلوم۔''

''نہیں یاد نہیں آرہا۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو۔'' میں گھبرا کر بولی۔'' دیکھو نا...... تم اس طرح یہاں رہوگی تو بہت پرابلم ہوجائے گی تمہارے گھر والے تمہیں ہر جگہ ڈھونڈیں گے۔''

''نہیں۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''ویسے اگر آپ کہتی ہیں تو میں واپس چلی جاتی ہوں مگر میں پھر دوبارہ آؤں گی۔'' وہ بولی۔

''ہاں...... ہاں۔ ضرور۔ ضرور آنا۔''

اسی وقت امی گھر میں داخل ہوئیں وہ بھی انابیہ جیسی خوب صورت بچی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ میں نے امی کو انابیہ کے گھر آنے کی کہانی سنائی تو امی کو بہت

الیکشن

الیکشن کا دور تھا، ایک امیدوار جس کے بارے میں بہت مشہور تھا کہ وہ بہت مغرور اور بد دماغ تھا اسٹیج پر تقریر کرنے آیا اور کہنے لگا دوستو! میرے بھائیو! میں آج سے پہلی بار آپ سے مخاطب ہوں، میرے بارے میں لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ میں بہت مغرور اور بد دماغ ہوں اگر میں ایسا ہوں تو کیا میں آپ جیسے ٹکے ٹکے لوگوں کے پاس ووٹ مانگنے آتا۔

(طاہر اسلم مٹھو بلوچ...... سرگودھا)

حیرت ہوئی۔'' ٹھیک ہے میں خود تمہیں تمہارے گھر چھوڑ کر آؤں گی۔'' امی بولیں۔

''نہیں میں اکیلی جاؤں گی۔'' وہ بولی۔

''چلو ہم چھوڑ آتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں ناں...... مجھے اکیلے ہی جانا ہے۔''

ہم چپ ہوگئے اور تھوڑی دیر بعد وہ اکیلی چلی گئی۔ پھر امی بولیں۔'' ماہم مجھے یہ بچی بہت پراسرار لگ رہی ہے۔''

''ارے امی اتنی پیاری بچی پراسرار سی کہاں سے ہوگئی۔ میں تو اس پر عاشق ہوگئی ہوں۔''

اس رات بھی سوتے ہوئے میرے چہرے پر کسی نے پانی پھینکا...... میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی...... مگر سب اپنی اپنی جگہ سو رہے تھے۔ مگر میرا چہرہ اور میرے کپڑے بدستور گیلے تھے۔

صبح ہوئی تو مجھے پھر یاد نہ رہا۔ پورا دن گزر گیا۔ میری دونوں چھوٹی بہنیں ندا کے گھر جاچکی تھیں اور اب امی بھی بارات میں جانے کے لئے ندا کے گھر جانے کے لئے بالکل تیار تھیں۔'' ماہم اگر وہ بچی آج بھی آجائے تو کسی بھی طرح ہو۔ اس کے گھر ضرور چلی جانا۔''

''ہاں یہ تو میں بھی سوچ رہی تھی۔'' میں بولی۔

امی کے جانے کے ٹھیک ایک گھنٹے بعد دروازہ بجا...... میں نے بھاگ کر دروازہ کھولا تو انابیہ اپنی خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ سامنے کھڑی تھی۔

''باجی میں آج پھر آ گئی۔'' وہ بولی۔

''آج تمہیں مجھے اپنا گھر دکھانا پڑے گا ورنہ میں تمہیں اندر نہیں آنے دوں گی اور تم سے دوستی بھی نہیں رکھوں گی۔'' میں نے کہا...... تو انابیہ کا چہرہ اچانک مرجھا گیا اور وہ یکدم بولی۔ ''نہیں باجی پلیز۔ بات یہ ہے کہ میرا گھر بہت دور ہے۔''

''کتنی دور مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔'' میں نے کہا تو انابیہ میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے آرام سے بولی۔ ''میں نے کہا نا کہ آپ میرے گھر نہیں جاسکتیں۔''

''اچھا پھر میں تم سے نہیں بولتی۔'' میں نے کہا۔ وہ گھبرا گئی اور کہنے لگی۔ ''اچھا اندر چلیں میں آپ کو بتاتی ہوں۔''

میں اسے اندر لے آئی۔ وہ بہت چپ چپ سی تھی۔ ''باجی میں آپ سے ایک بات کہوں لیکن ایک شرط ہے۔''

''چلو بتاؤ کیا شرط ہے۔؟'' میں بولی تو اس نے کہا۔ ''آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہوں گی۔''

''ارے تم سے کیسے ناراض ہو سکتی ہوں۔''

''اور وعدہ کرو کہ آپ کو ڈر بھی نہیں لگے گا۔'' وہ بولی۔

''ڈر؟ کس بات کا ڈر؟''

''باجی بات دراصل یہ ہے کہ میں انسان نہیں ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کیا؟ یہ کیا کہہ رہی ہو تم انابیہ۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہوں میں انسان نہیں بلکہ میرا تعلق قوم جنات سے ہے، میں جن کی بیٹی ہوں۔''

خدا کی پناہ میں کانپ کر رہ گئی، وہ اس وقت بالکل بڑوں کی طرح باتیں کر رہی تھی۔ میں نے اپنی امی اور باقی گھر والوں سے سنا تو تھا...... کہ آگے جا کر پہاڑیوں کے پیچھے جن رہتے ہیں اور اکا دکا لوگوں سے سنا بھی تھا جنہوں نے خود جنات کو دیکھا تھا۔ مگر میرے تصور میں بھی نہیں تھا کہ کسی دن میرا بھی سامنا کسی جنی سے ہو جائے گا۔

''انابیہ بیٹا اب تم مجھے ڈرا رہی ہو۔'' میں نے کانپتی آواز کے ساتھ کہا۔

''نہیں باجی میں تو آپ کی حفاظت کے لئے آپ کے پاس آئی ہوں۔''

''کیسی حفاظت۔؟'' میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا، اس وقت تک مجھے اس بات کا مکمل یقین نہیں تھا۔

''باجی ہر روز آپ کے اوپر کوئی پانی پھینکتا ہے ناں۔''

میں چیخ کر اٹھ بیٹھی اب یقین آ گیا تھا کہ وہ کون تھی۔ اس نے جو بتایا تھا وہ تو میرے سوا کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے فیضان تک سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا انابیہ میرا چہرہ دیکھ کر بولی۔ ''آپ تو میری باجی ہیں آپ تو ڈر رہی ہیں۔ باجی آپ کو کوئی نقصان نہیں ہوگا مجھ سے گلشام بہت شریر ہے وہ شرارت کے طور پر آپ کے اوپر پانی پھینکتا تھا لیکن میں اسے وہاں آ کر بھگا دیتی تھی۔''

''انابیہ۔'' میں نے آنکھیں بند کر کے اسے پکارا۔ ''تم جاؤ یہاں سے۔''

''کیوں باجی میں تو آپ کی دوست بن گئی ہوں ناں اس لئے تو کہہ رہی تھی کہ میرا گھر دیکھنے کی ضد نہ کریں۔ آپ کو میں نے باجی کہا ہے میں آپ کو نقصان کیسے پہنچا سکتی ہوں۔'' وہ مجھے بہت دیر تک یقین دلاتی رہی کہ میں اسے اپنی چھوٹی بہن سمجھوں۔

اس وقت تو میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی لیکن میرا دل ہی جانتا تھا کہ اس وقت میری کیا کیفیت تھی۔

''باجی آپ مجھ سے ڈر رہی ہیں ناں۔'' اس نے پوچھا۔

''ن.....نہیں۔'' میں مشکل سے اتنا ہی کہہ پائی اور اس کے بعد میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔

''مجھے ہوش نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں۔ اور میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔؟''

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے کمرے میں تھی فیضان اور امی وغیرہ سب لوگ میرے پاس موجود تھے۔

''میں یہاں کیسے آگئی۔'' میں نے کہا۔

تو فیضان بولے۔''میں تین دن کی چھٹیوں پر آیا ہوں آ کر دیکھا تو دروازہ کھلا ہوا تھا اور تم بے ہوش پڑی تھیں۔ پھر امی کو فون کیا تو یہ سب لوگ بھی گھبرا کر جلدی چلے آئے۔''

''امی......امی......وہ انابیہ؟''

''ہاں ہاں بیٹا بولو کیا ہوا انابیہ کو۔؟''

''امی......فیضان وہ انسان نہیں وہ جن ہے۔''

''کیا!'' یہ سن کر سب لوگ اچھل پڑے۔

''لیکن وہ ایک اچھی لڑکی ہے بہت پیار کرنے والی ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو ہے لیکن اگر یہ بات سچ ہے تو پھر ہمارے اور اس کے درمیان بہت فرق ہے ہم دونوں ایک الگ مخلوق ہیں۔'' فیضان بولے۔

پھر سب کے مشورے پر ابو نے ایک بہت بڑے عامل سے رجوع کیا، کئی گھنٹے کے بعد ابو کے ساتھ وہ عامل صاحب تشریف لائے انہوں نے مجھ سے ساری کہانی سنی پھر ایک گہری سانس لے کر بولے۔''بیٹا بات یہ ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی اس کائنات میں نہ جانے کتنی مخلوق ہیں اور کمال یہ ہے کہ سب ایک دوسرے سے الگ ہونے کے باوجود منسلک ہیں اور تم جس بچی کا ذکر کر رہی ہو وہ واقعی ایک جن ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا تم کو بلکہ وہ دوست ہے تمہاری۔''

''عامل صاحب کیا ایسے واقعات ہوتے ہیں۔ جن اور انسانوں میں دوستی ہوتی ہے؟''

عامل صاحب بولے۔''ایسے ہزاروں واقعات ہیں بلکہ ہمارے دور دراز کے مدرسوں میں جنوں کے بچوں کی خاصی بڑی تعداد درس لینے کے لئے آیا کرتی ہے۔ میری مانیں تو اگر یہ اس سے خوف زدہ نہیں ہیں تو چلنے دیں اسی طرح کیوں کہ وہ کوئی نقصان تو نہیں پہنچا رہی۔ بلکہ وہ ایک طرح سے ان کی حفاظت کر رہی ہے۔ اپنے شریر بھائیوں سے ان کو بچا رہی ہے۔''

پھر فیضان بولے۔''عامل صاحب یہ بتائیں کہ ہمیں اس سے کیا رویہ رکھنا ہوگا۔''

''بالکل نارمل یہ سمجھیں کہ وہ ایک انسان کا خوبصورت بچہ ہے۔ اگر آپ اس سے دوستی نہیں رکھنا چاہتی ہیں تو پھر ایسا عمل کیا جا سکتا ہے کہ وہ آپ کے پاس نہ آیا کرے۔''

''نہیں......نہیں...... میں یہ نہیں چاہتی۔'' میں جلدی سے بولی۔''اسے آنے دیں وہ بہت پیاری ہے۔'' میں روزانہ اس کا انتظار کرتی لیکن انابیہ نہ آئی شاید وہ ناراض ہوگئی تھی یا پھر کوئی اور بات تھی کہ اس نے میرے پاس آنا چھوڑ دیا تھا۔ دروازے پر ہونے والی دستک مجھے چونکا دیتی۔ لیکن وہ پھر کبھی نہیں آئی۔

پھر ایک حیرت انگیز بات ہوئی میرے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی اور وہ حیرت انگیز طور پر انابیہ کی طرح تھی، ویسی ہی آنکھیں سنہرے بال گورا رنگ جیسے انابیہ چھوٹی ہو کر آگئی ہو۔ امی نے بھی انابیہ کو دیکھ رکھا تھا اس لئے وہ بھی منی کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئیں پھر یہ بات سمجھ میں آگئی کہ میں اس دوران مسلسل انابیہ کے بارے میں سوچتی رہی تھی اس لئے میری منی بھی انابیہ جیسی تھی پھر میں نے ضد کر کے اپنی بیٹی کا نام بھی انابیہ رکھا۔

اس کے بعد میں فیضان کے ساتھ سیالکوٹ چلی آئی کیونکہ انہیں گورنمنٹ کی طرف سے گھر ملا تھا۔ اس واقعہ کو چھ سال گزر چکے ہیں، ہماری انابیہ اب چھ سال کی ہے اور یہ ہو بہو وہی انابیہ ہے کہ جس کو ایک بار دیکھتے ہی پیار ہو جائے۔

زندہ صدیاں

ایم اے راحت

قسط نمبر: 03

صفحوں پر محیط سوچ کے افق پر جھلمل کرتی، قوس قزح کے دھنک رنگ بکھیرتی، حقیقت سے روشناس کراتی، دل و دماغ میں ہلچل مچاتی ناقابل یقین ناقابل فراموش انمٹ اور شاہکار کہانی

سوچ کے نئے دریچے کھولتی اپنی نوعیت کی بے مثال، لاجواب اور دلفریب کہانی

ستارے بے نور ہوگئے، دور پہاڑوں کی اوٹ سے اجالا جھانکنے لگا، پھر کہیں سے ٹن ٹن کی آواز ابھری اور مجھے یوں لگا جیسے اچانک زمین آسمان الٹ گئے ہوں۔ تاحد نظر پھیلے ہوئے پہاڑ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہوں۔ میری آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھانے لگا۔ تبھی گھنٹے کی واز بند ہوگئی اور دور سے کوئی ہمیں اپنی طرف آتا نظر آیا۔

”بھگوان ناش کرے اس ستیاناسی کا۔“ کوروتی مدہم آواز میں بڑبڑائی۔ میں اس کی آواز سن کر چونکا۔ میں نے کہا۔

”کیا ہوا کوروتی۔“

”پاپی کیڑا وہ منحوس ادھر ہی آرہا ہے، کوروتی نے دانت کچکچا کر کہا۔ میں نے چونک کر ادھر دیکھا، گوتم بھنسالی ہی تھا۔ وہ اپنی لنگڑی چال کے ساتھ اسی طرف آرہا تھا۔ ”پھر صبح ہوگئی، ہمیں جانا پڑے گا۔“

”کہاں.....؟“ میں نے پوچھا۔

”شنیکل نواس، تمہیں شردھا کی کہانی سننی ہے تو کل رات کا انتظار کرنا پڑے گا۔ کوروتی نے سرد لہجے میں کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔“ گوتم اب ہمارے پاس آگیا تھا اچانک ہی مجھے اپنے پیروں کے پاس سرسراہٹ سنائی دی اور میں نے چونک کر نیچے دیکھا۔ ایک انتہائی خوف ناک کوڑیالا سانپ میرے پیروں کے قریب تھا۔ اس سے پہلے یہ میں اس سے بچوں کہ بھیانک ناگ نے میری پنڈلی پر منہ مار دیا۔ ایک ہلکی سی چبھن ہوئی اور بس، لیکن میرے منہ سے زوردار چیخ نکلی تھی جس پر چونک کر کوروتی نے نیچے دیکھا۔ اور پھر اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔

”منحوس کیڑے، مہابھارت کے دور کے راج لیکھک کی تاریخ میں کسی سانپ نے ان کے پاؤں میں نہیں کاٹا تھا، یہ تو گزری ہوئی تاریخ کا ایک سایہ ہیں۔ ان کا اصل شریر تو لاکھوں صدیوں کے بعد سنسار میں آنے والا ہے۔ یہ سانپ ان کا کیا بگاڑ سکے گا۔ آؤ عالی جی، یہ رقابت کا مارا۔ پیچھا کہاں چھوڑے گا آؤ۔“

”کوئی بات نہیں ہے کشکا، تیرا یہ راج لیکھک تیرے ساتھ نہیں رہ سکے گا۔ میں مہاراج سے کہہ کر تاریخ کے اس چور کر پکڑوا دوں گا تو دیکھنا، گوتم بھنسالی نے کہا اور واپس مڑ گیا۔ میرے پاؤں میں سانپ نے جس جگہ کاٹا تھا وہاں اب نہ کوئی نشان تھا نہ تکلیف۔ لیکن میں اس کے الفاظ پر غور کر رہا تھا کیا دلچسپ بات تھی کیا ہی دلچسپ، صدیوں پرانی ایک جیتی

جاگتی عورت۔ مافوق الفطرت قوتوں کی مالک جدید دور کے ایک تاریخ نگار کوبل گئی تھی۔ صدیوں کی تاریخ ایک ایسی کتاب میں درج کر دی گئی تھی جس کے اوراق میں صدیاں تحریر تھیں۔ میں تاریخ کے کسی بھی دور میں اس دور کے کسی کردار کا روپ دھار کر اس دور کی تاریخ کو جان سکتا تھا۔ پتھر کی یہ کتاب اپنے اندر..... صدیاں زندہ رکھے ہوئے نہیں تھی۔

اس دور کی کشکا اور اس سے پہلے دور کی کرروتی میرا ہاتھ پکڑ کر چل پڑی۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔

''کچھ پریشان ہو کوروتی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں......''

''کیوں...... مجھے بتاؤ۔''

''وہ کبڑا میرے لئے درد سر بن گیا ہے۔ ہتھیارے کو موت بھی قبول نہیں کرتی ورنہ میں اسے کبھی کا موت کی نیند سلا دیتی۔''

''کیا وہ ہمارا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔؟''

''تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیسے......؟''

''وہ مہاراج سے کہہ کر تمہیں گرفتار کرا سکتا ہے۔'' مہاراج تمہیں قیدی بنا کر قید خانے میں ڈال سکتے ہیں تمہیں تاریخ کا چور کہہ کر صدیوں کی سزا دی جاسکتی ہے۔''

یہ سن کر میرے اوسان خطا ہوگئے۔ میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ''گویا پھر میں اپنی دنیا میں واپس نہیں جاسکتا۔''

''کبھی نہیں۔'' اس نے کہا۔

''ارے باپ رے۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ کتنا بھیانک تصور تھا اپنی دنیا کو چھوڑ کر میں اس قدیم دور کا قیدی بن جاؤں گا۔ وہ بھی کسی اور شخصیت کی حیثیت سے کچھ وقت کے لئے یہ ماحول بہت اچھا لگا تھا۔ ابھی تک صحیح معنوں میں غور نہیں کیا تھا کہ خود میں کس حیثیت سے ہوں لیکن اب...... اب

احساس ہو رہا تھا کہ اپنی دنیا کس قدر خوب صورت ہے اور میں وہ سب کچھ چھوڑ کر یہاں قید خانے میں پڑا رہوں اور وہ بھی نجانے کب تک، کوروتی نے میرا چہرہ دیکھا اور مسکرا دی۔

''وہ گوتم بھنسالی ہے، مندروں میں گھنٹہ بجانے والا ایک غلام جس کا دعویٰ ہے کہ وہ میرے عشق میں گرفتار ہے۔ لیکن کیا وہ اس قابل ہے کہ اس کی محبت کو قبول کیا جاسکے مجھے دیکھو اور اس کی منحوس صورت کو دیکھو، میں اس سے زیادہ...... چالاک ہوں، بے شک اس نے امرت جل پی لیا ہے اور امر ہوگیا ہے لیکن میرا گیان اس سے کہیں زیادہ ہے میں نے جتنے علم سیکھے ہیں وہ لاجواب ہیں جبکہ اس کے پاس کوئی ایسا گیان نہیں ہے کہ وہ میری شکتی کو نیچا دکھا دے ممکن ہی نہیں ہے اس کے لئے تم بالکل چنتا مت کرو۔ ذیشان عالی میں تمہیں تمہارے سنسار میں پہنچا دوں گی۔ بس میرا یہ خیال تھا کہ تم مہا...... بھارت کے کچھ اور منظر اپنی آنکھوں سے دیکھو، یہ جانو کہ شردھا پر کیا بیتی مگر اب ذرا صورتحال مختلف ہوگئی ہے۔ شردھا کے بعد کی کہانی کبھی بعد میں تمہیں سنا دوں گی اس سے یہاں سے نکل جانا ضروری ہے کیونکہ گوتم بھنسالی رقابت کا شکار ہو کر تمہیں نقصان پہنچانے پر تل گیا ہے۔ بلکہ۔'' کوروتی کہتے کہتے خاموش ہوگئی۔

میں سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے پھر کہا۔

''بلکہ سے آگے تم کچھ اور کہنا چاہتی تھیں کوروتی۔''

''نہیں اس دور میں، میں کشکا تھی مجھے کشکا ہی کہہ کر پکارو، کوروتی کہو گے تو صورتحال بڑی گھمبیر ہو جائے گی۔''

''میں کہہ رہا تھا تم کچھ کہتے کہتے رک گئیں کشکا۔''

''ہاں! میں یہ کہہ رہی تھی مجھے شما کر دینا۔ یہ کہانی ہمیں یہاں ادھوری چھوڑنی پڑے گی۔ تمہارا واپس جانا

بڑا ضروری ہے۔"

"ہاں...... ہاں...... میں اپنی دنیا میں واپس جانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا اور کوروتی خاموش ہوگئی۔

ہم دونوں پیدل چل رہے تھے کہ کوروتی نے کئی بار پلٹ کر دیکھا تھا۔ گوتم بھنسالی اب آس پاس کہیں موجود نہیں تھا لیکن میں نے یہ بھی محسوس کرلیا تھا کہ ہم اس راستے پر نہیں جارہے جس راستے سے یہاں تک پہنچے تھے۔ کم ازکم اس کا اندازہ مجھے تھا چنانچہ یہ سفر جاری رہا اور سورج پوری طرح آسمان پر کھل اٹھا تھا اور دھوپ نے زمین کو سورج کی ہی طرح روشن کردیا تھا۔

تب ہمیں دور سے ایک ہندووانہ طرز کی بنی ہوئی عمارت نظر آئی جو کوئی پرانا کھنڈر تھی۔ اس کی دیواریں کائی سے سیاہ ہوگئی تھیں اور جگہ جگہ ٹوٹ پھوٹ کے آثار نظر آرہے تھے۔

"یہ قلعہ درباوتی ہے اپنے دور کا مشہور قلعہ۔ جہاں راجہ دھرم داس نے ڈیڑھ سو سال حکومت کی تھی۔ اتنی لمبی حکومت اس سے پہلے ہندوستان کے کسی راجہ نے نہیں کی تھی مگر اب یہ ویران پڑا ہوا ہے اور بہت عرصے سے میرا مسکن ہے۔"

"تمہارا۔؟" میں نے حیرت سے کہا تو کشکا مسکرادی پھر بولی۔

"تو تم کیا سمجھتے ہو کیا تم میرے بارے میں سب کچھ جان چکے ہو...... نہیں پترکار کچھ بھی نہیں معلوم تمہیں تمہارا جیون تو بہت چھوٹا سا ہے، بالکل اتنا سا۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بتایا۔

"اس چھوٹے سے جیون میں تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔"

یہ باتیں کرتے ہوئے ہم اس پرانے سے قلعے تک پہنچ گئے۔ میں نے بالکل ایک نئی طرز تعمیر کا جائزہ لیا۔ قدیم دور میں عمارتیں ایسے بھی بنائی جاتی تھیں۔ میں نے دل میں سوچا۔ ہم ایک ٹوٹے دروازے سے اندر داخل ہوگئے۔ ہر طرف ویرانی کا راج تھا۔ چھتوں کے نیچے تک سبزہ اگ آیا تھا۔ ہواؤں کی نمی نے پتھر کی زمین کو بھی نرم کردیا تھا۔ کشکا مجھے ساتھ لئے ہوئے چلتی رہی۔ کافی لمبی راہ داریوں کو عبور کرنے کے بعد آخرکار ہم ایک ایسے دروازے پر پہنچے جو کبھی لکڑی کا ہوگا لیکن اب دیمک نے اسے مٹی کا بنادیا تھا۔ کشکا نے اس دروازے پر ہاتھ رکھا اور دروازہ راکھ کی طرح ڈھے گیا۔ ہم اس راکھ پر سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ ایک بڑا سا ہال نما کمرہ تھا جس میں ایک اور چھوٹا سا دروازہ بنا ہوا تھا۔

"چلو اندر چلو......" کشکا بولی اور میں نے اس دروازے سے اندر قدم رکھ دیا۔ مجھے اس پر اعتماد تھا وہ میری محسن بھی تھی محافظ بھی اس نے مجھے جس ماحول اور جس دور سے روشناس کرایا تھا وہ بے شک ایک طلسمی عمل تھا۔ جدید دور کا کوئی بھی انسان سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ دنیا کی اس قدر قدیم تاریخ میں داخل ہوسکتا ہے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے زندگی میں کبھی کوئی ایسا نیک کام کیا ہو جس کے بدلے مجھے ایک ایسا کردار مل گیا وہ میری کاوشوں میں معاون ہوسکتا تھا۔ مجھے چونکہ خود بھی ہندو مائیتھالوجی سے بہت زیادہ دلچسپی تھی اور میں نے اس پر حتی المقدور دکتابیں لکھی تھیں لیکن جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اس دور کا ایک کردار بن کر اس کا ایک لفظ بھی میں نے اپنی کسی کتاب میں نہیں لکھا تھا وہ دنیا تو بالکل انوکھی تھی لیکن اب اگر میں ایسی کوئی کتاب لکھنا چاہتا تو دنیا تو میری بات پر کبھی یقین نہ کرتی کہ میں نے گزری صدیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں۔ وہ کردار اپنی نگاہوں سے دیکھے ہیں جو صرف تاریخ میں نظر آجاتے ہیں اور وہ بھی ہندو تاریخ میں۔ میں نے مہا بھارت دیکھی ہے وہ جنگ دیکھی جو کوروں اور پانڈوں کے درمیان ہوئی تھی کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس دور کا کوئی لکھاری ایسی کوئی کتاب لکھ سکتا ہے جس میں وہ آنکھوں دیکھی جنگوں کا حال لکھ سکتا ہے۔

میں نے تین سیڑھیاں عبور کرکے پیچھے دیکھا۔ کوروتی پہلی سیڑھی پر تھی اس نے کہا

''چڑھتے رہو چڑھتے رہو۔''

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا ،لیکن یہ سیڑھیاں تھیں کہ قیامت الامان الحفیظ چڑھتی ہی چلی جارہی تھیں۔ میں چڑھتا رہا دو تین بار میں نے کوروتی کو دیکھا وہ میرے پیچھے آرہی تھی۔ میں راستہ عبور کرتا رہا۔ مجھے یوں لگ رہا تھ جیسے یہ سیڑھیاں آسمان تک جارہی ہیں۔ خدا کی پناہ کوئی آدھے گھنٹے تک میں مسلسل سیڑھیاں عبور کرتا رہا اور میرے پاؤں جواب دینے لگے رانوں کی مچھلیاں سخت ہوگئیں اور اب ایک ایک سیڑھی چڑھنا مشکل لگنے لگا۔ میں نے تھکی تھکی آواز میں پوچھا۔

''مجھے کتنا اوپر جانا پڑے گا کوروتی۔؟''

لیکن کوروتی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں تو بری طرح تھک گیا ہوں کیا میں کچھ دیر بیٹھ سکتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے پلٹ کر دیکھا لیکن جہاں تک میری نگاہ گئی وہاں کوروتی کا کوئی نام ونشان نہیں تھا میرا دل دھک سے ہوگیا کیا وہ نیچے ہی رہ گئی کیا وہ واپس چلی گئی اپنی تاریخ میں تو اب میں کیا کروں اوپر کی سیڑھیاں عبور کروں یا نیچے جاکر کوروتی کو تلاش کروں۔ عجیب سی کشمکش کا شکار ہوا اور ایک سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے کچھ خیال آیا تو میں نے چیخ چیخ کر کوروتی کو آواز دینا شروع کردی۔

''مجھے بتاؤ! تم میری قابل اعتماد دوست ہو کوروتی مجھے اس طرح تنہا مت چھوڑو۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ اب میں کیا کروں۔ نیچے آتا ہوں تو یہ ہزاروں سیڑھیاں طے کرنا بھی میرے لئے ممکن نہیں ہوگا اوپر جاتا ہوں تو یہ پتا نہیں کہ کتنی طوالت اختیار کرنی پڑے گی۔ مجھے خیال آیا کہ کوروتی نے مجھے بتایا تھا کہ اگر مہاراجا کو میرے بارے میں علم ہوگیا کہ میں تاریخ کا چور ہوں اور جدید دور کے لئے تاریخ چرانے آیا ہوں تو وہ مجھے قید میں ڈال دے گا اور پھر وہی قید میری زندگی کا آخر ہوگی......ہوگی بھی یا نہیں کون جانے......

کوئی ایک گھنٹہ اپنے حساب سے وہیں بیٹھا رہا۔ کوروتی کا اب کوئی نام ونشان نہیں تھا وہ مجھے چھوڑ گئی تھی ایسا ہی تھا مجھے اوپر جانا چاہئے دیکھوں اوپر کیا ہوتا ہے اور ان سیڑھیوں کا اختتام کہاں ہوتا ہے، میں چڑھتا رہا اور آخر کار میں ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں مجھے ایک چھت سی نظر آرہی تھی مجھے حیرت ہوئی لیکن یہ چند سیڑھیاں اور عبور کرنی تھیں چنانچہ میں چڑھ کر اوپر پہنچ گیا اور پھر میں نے وہ حیران کن منظر دیکھا جو میرے لئے ناقابل یقین تھا۔

یہ وہی کمرہ تھا جہاں پتھر کی وہ کتاب رکھی ہوئی تھی۔ عظیم الشان کتاب اور میں اس کتاب کی آخری سطح پر تھا۔ اس پر لفظ ابھرے ہوئے تھے، جہاں میں کھڑا تھا وہاں ایک خانہ سا کھلا ہوا تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گھبرا کر پھرتی سے اس سوراخ سے باہر نکل آیا اور اس احساس کے ساتھ کہ کہیں دوبارہ میں اس سوراخ سے نیچے نہ گر پڑوں ایک چھوٹی سی چھلانگ لگا کر دوسری جگہ آکھڑا ہوا۔ وہ خانہ خود بخود بند ہوگیا تھا اور میں نے ان الفاظ کو دیکھا تھا جو اس پر لکھے ہوئے تھے حالانکہ شاید الفاظ سنسکرت میں لکھے ہوئے تھے لیکن میں جب مہا بھارت میں راج لیکھک کی حیثیت سے داخل ہوا تھا تو میں نے وہاں سنسکرت میں لکھی کتاب بھی پڑھی تھی جس کے بارے میں مجھے پتا چلا تھا کہ میں نے ہی لکھی ہے اور اس وقت سنسکرت کے وہ الفاظ میری نگاہوں کے سامنے تھے جنہیں میں پڑھ سکتا تھا۔ ان پر لکھا تھا ۔''مہابھارت''

میں خاموشی سے کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ دل میں یہی خیال تھا کہ شاید کوروتی بھی اس سوراخ سے باہر آجائے۔ ہوسکتا ہے اس آنے میں دیر ہوئی ہو، لیکن دیر ہوگئی وہ خانہ دوبارہ نہ کھلا۔ خود میرا اس پر پاؤں رکھتے ہوئے خوف سے برا حال تھا کہ کہیں دوبارہ نیچے نہ جاپڑوں۔ جب مجھے یہ اندازہ ہوگیا کہ کوروتی اس طرح سے باہر نہیں آئے گی تو میں نے بچ بچ کر قدم اٹھانے شروع کردیئے۔ میں نے ان دوسرے الفاظ پر غور بھی نہیں کیا تھا جو پتھر کے تراش سے بنے ہوئے تھے

اور ابھرے ہوئے تھے بالکل مہابھارت کی طرح، میں ان سب سے بچتا بچاتا سیڑھیاں اتر کر کتاب سے نیچے آ گیا۔ پھر احمقوں کی طرح میں نے تین چار بار زور سے آواز لگائی۔

''کوروتی...... کوروتی...... اگر تم اس عمارت میں موجود ہو تو میرے پاس آؤ، میں سخت پریشان ہوں، میں بے چین ہوں کوروتی میرے پاس آؤ۔''

لیکن کوئی جواب نہیں ملا، میں مایوسی سے آگے بڑھ آیا اور اس کے بعد اس عمارت کے صدر گیٹ سے بھی باہر آ گیا۔ عمارت میں میرے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ وہ سنسان پڑی ہوئی تھی اور بھائیں بھائیں کر رہی تھی کیسی عجیب جگہ ہے یہ۔

پھر اس کے بعد میں واپس اپنے گھر آ گیا۔ میرا گھر، میرا دیس، میرا سب کچھ، لیکن جہاں پہنچ گیا تھا وہ جگہ بہت عجیب تھی۔ کئی گھنٹے تک اپنی مسہری پر دراز آنکھیں بند کئے سوچتا رہا۔ دل چاہ رہا تھا کہ نیند آ جائے۔ دماغ تھوڑا سا پرسکون ہو جائے لیکن ان خیالات میں بھلا نیند کہاں سے آتی۔ سوچتا رہا...... بہت کچھ سوچتا رہا...... بہت سے کردار آئے، وہ محفل جس میں مجھے راج لیکھک کی حیثیت سے بلایا گیا تھا۔ آہ کتنا عجیب ہے اس دور کے لئے اگر یہ کہا جائے کہ تاریخی کہانیاں لکھنے والا ایک ادیب اس طرح سے تاریخ میں گر پڑا تھا۔ تو قہقہے لگانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کہیں گے یہی کہیں گے کہ زیادہ سوچتے ہوئے بے چارہ دماغی مریض بن گیا اب ایسی ہی فضول باتیں نہیں کرے گا تو اور کیا کر سکتا ہے۔

اس وقت شاید مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ میں نے فریج میں جا کر کھانے پینے کی چیزیں تلاش کیں اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ فریج میں جو چیزیں میں نے رکھی تھیں وہ جوں کی توں رکھی ہوئی تھیں۔ گویا کوئی وقت نہیں گزرا تھا۔ ہر چیز تر و تازہ تھی ایسا کچھ مل گیا جسے فوری طور پر پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے استعمال کیا جا سکے تو میں نے اسے زہر مار کیا۔ ہاں کچن میں جا کر میں نے اپنے لئے بہت عمدہ قسم کی کافی ضرور بنائی اور اس کی کئی پیالیاں چڑھا گیا۔ سوچنے کے لئے دل نہیں چاہ رہا تھا بس سو جانا چاہتا تھا۔ کبھی کبھی بے خوابی کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی اور اس کے لئے میرے پاس خواب آور گولیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے ان میں سے چند گولیاں نکال کر پانی کے ساتھ کھائیں اور بستر پر لیٹ گیا مجھے نیند آ گئی تھی۔

رات پرسکون گزری تو صبح کو طبیعت بہتر تھی۔ مگر بدن میں انگڑائیاں آ رہی تھیں۔ ٹوٹی ٹوٹی سی کیفیت تھی، میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی سنجی یاد آ گئی تھی جس نے راج لیکھک کی حیثیت سے مجھے غسل دے کر تیار کیا تھا۔ پھر وہ تمام شوخ لڑکیاں، جن کی آنکھوں میں جوانی ناچتی تھی وہ سب میرے اردگرد تھیں۔ جس طرف اشارہ کرتا وہ میری قربت میں آ جاتی لیکن خیر یہ بالکل الگ بات تھی۔ میں کوئی بے کردار آدمی نہیں تھا حسن و جمال کی دلکشی مجھے بھی عام انسانوں کی طرح متاثر کرتی تھی۔ لیکن یہ نہیں کہ اس کے لئے در بدر ہو جاؤں۔ کوروتی کو کشکا کی حیثیت سے دیکھا تھا وہ اس قدر حسین تھی کہ انسان بے خود ہو جائے۔ وہ میرے پاس جس حیثیت سے آئی تھی اس کی کہانی بھی طویل ہے جسے میں آہستہ آہستہ آپ کو بتاؤں گا۔ اب بھی وہ ایک پروقار لیکن کسی قدر عمر رسیدہ عورت کی حیثیت سے میرے سامنے تھی۔ لیکن اس قدر دلکش کہ اسے ایک مکمل عورت کہا جائے، نسوانیت کی دلکشی سے بھرپور۔ ہاں نوجوانی کی عمر ایک الگ حیثیت رکھتی ہے۔ وہ عمر جس میں، میں نے اسے کشکا کے روپ میں دیکھا تھا مگر وہ کہاں رہ گئی کیا گوتم بھنسالی نے اسے کسی عذاب میں گرفتار کر دیا۔ اس نے مجھے تو واپس میری دنیا میں بھیج دیا لیکن خود شاید تاریخ کی قیدی بن گئی۔ تھوڑا سا دکھ ہوا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب کیا کیا جائے زندگی میرے سامنے رواں دواں تھی اپنی دنیا اپنے ماحول میں میرے لئے بہت کچھ تھا۔ دلکشی، خوشیاں، دوستیاں، بہت سے دوست تھے میرے، میرے مداح

بھی تھے جن کی طرف سے مجھے موبائل فون پر پیغامات ملتے رہتے تھے۔ کسی محفل میں جاتا ایک ادیب کی حیثیت سے پہچان لیا جاتا تو میرے مداح میرے گرد جمع ہوجاتے۔ میرے آٹوگراف لئے جاتے، مجھ سے پوچھا جاتا کہ میں نے تاریخ کا مطالعہ کس طرح سے کیا ہے آج مجھے ہنسی آتی تھی۔ بس تاریخ کے کچھ واقعات میں اپنی کہانیاں سموکر میں اپنے کرداروں کو بھی تاریخ کا ایک حصہ بنا دیتا تھا۔ لیکن اب جب میں نے مہا بھارت میں دروپدی کو دیکھا تھا جس نے مشترکہ شادی کررکھی تھی اور بہتر بہترین ایک شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔ میں نے رانی گندھاری کو دیکھا تھا، میں نے دریودھن کو دیکھا تھا اور پھر مہا بھارت کا وہ دور دیکھا تھا جس میں کائنات کی سب سے بڑی لڑائی ہوئی جو لڑائی کتابوں میں محفوظ تھی۔ تب میرے دل میں ایک خیال آیا کیوں نہ میں ایک کتاب لکھوں ویسے تو میں نے ہندو مائیتھالوجی میں بہت سی کتابیں لکھی تھیں، دیویوں، دیوتاؤں اور جادو ٹونوں پر کالی دیوی پر، درگا دیوی پر گنیش جی پر اور نجانے کس کس پر، میں نے رام لیلا لکھی تھی، لکشمن سیتا اور رام پران کے بن باس پر۔ یہ سب کچھ لکھا تھا میں نے اور حقیقت یہ ہے کہ میں نے ان کو لکھنے کے لئے ان کتابوں سے مدد لی تھی۔ جو ہندو دھرم میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں لیکن اب اگر میں مہا بھارت لکھوں تو وہ اتنی اصلی ہوگی کہ شاید بہت سارے ہندو ادیبوں سے بھی نہ لکھی جائے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کائنات صرف ہندو مائیتھالوجی میں تو قید نہیں ہے۔ ان کے لاکھوں دیوی دیوتاؤں سے تو یہ دنیا آباد نہیں ہوئی ہے۔ دنیا بھر کی تاریخ پڑی ہے جس میں بڑے بڑے کردار ہیں۔ خود کوروتی نے مجھے بہت سے کرداروں سے روشناس کرایا تھا بلکہ میری زندگی کا سب سے انوکھا وقت تو وہ تھا، جب اس نے مجھے اپنی اس رہائش گاہ میں اس بڑے کمرے میں ان کرداروں سے روشناس کرائی تھی۔ یہ تاریخ میں محفوظ ہیں کیا ہی عجیب وغریب منظر تھا وہ میرے ذہن سے کبھی نہیں ہٹ سکتا تھا ایلا بار بردسا، زلوبیا، سیفو، سائیکی، ہین آف ٹرائے، کلو پیٹرا، ایکلس، ایوا براؤن اور نجانے کون کون۔ چونکہ تاریخ سے مجھے کافی شناسائی تھی ان کرداروں کے بھی میں نے نام سنے تھے۔ تھوڑی بہت معلومات بھی تھی ان کے بارے میں۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ اس قدر مکمل نہیں تھیں ہاں اگر اب میں کسی ہندو دیوی کے بارے میں لکھوں تو وہ زیادہ موثر تحریر ہوسکتی ہے میری۔

یہی تمام باتیں سوچتے سوچتے میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نا میں ایک ایسی کتاب لکھوں جو تاریخ کے زندہ جاوید کرداروں پر مشتمل ہو، وہ کردار زندہ جاوید ہیں جنہوں نے تاریخ میں کوئی بھی ایسا کام کیا ہو جس سے ان کی ایک شخصیت بن گئی ہو اور اسی وقت سوچتے سوچتے میرے ذہن میں اس کتاب کا نام بھی آیا۔ میں اس کا نام رکھوں گا ''زندہ صدیاں'' ہاں صدیاں اگر کاغذ پر زندہ ہوجائیں اور اس قدر مکمل ہوں تو کوئی تاریخ دان ان سے انحراف نہ کرسکے۔ تو یہ تو بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ جتنی جلدی ممکن ہو اس کتاب کا آغاز کردیا جائے اور اس کے لئے میں تانے بانے بننے لگا۔ میں نے سوچا کہ جس ماحول سے گزرا آیا ہوں اس میں واپسی تو ممکن نہیں ہے لیکن وہ ماحول اور اس سے منسلک واقعات میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ میں راجا چتر برج سے لے کر اور بھی سب کچھ لکھ سکتا ہوں۔

میں تیاری میں مصروف ہوگیا۔ کئی دن تک دل پر گزرا ماضی نقش رہا انسان کے اندر یہی خوبی ہوتی ہے کہ واقعات کتنے ہی عجیب ہوں آخرکار وہ ان کے جال سے نکل آتا ہے۔ پھر ایک دن بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ ذرا دیکھوں تو سہی کوروتی اپنی رہائش گاہ میں واپس آئی کہ نہیں۔ ممکن ہے وہ آگئی ہو۔ حالانکہ وہ جن پراسرار صلاحیتوں کی مالک تھی ان کے تحت اسے میرے پاس آجانے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ لیکن پھر بھی دل نے کہا کہ ایک نگاہ تو دیکھ لیا جائے۔ راستہ مجھے یاد تھا وہ رہائش گاہ شہر کے ایک علاقے میں ذرا الگ تھلگ واقع تھی اور مجھے وہ راستہ اچھی طرح یاد تھا۔ ہوش وحواس

کے عالم میں وہاں گیا تھا اور ہوش و حواس کے عالم میں ہی واپس آیا تھا۔

چنانچہ ایک دن تیاریاں کرکے چل پڑا۔ اور وہاں پہنچ گیا۔ علاقہ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ لیکن وہاں پہنچنے کے بعد میں حواس باختہ ہوگیا۔ میری نگاہیں ادھر ادھر بھٹکنے لگیں آس پاس کی ساری چیزیں جوں کی توں موجود تھیں لیکن وہ جگہ جہاں کوروتی مجھے لے گئی تھی ایک ویران اور پرانے طرز کی اینٹوں کے ایک کھنڈر کی شکل میں نظر آرہی تھی میں دیر تک ادھر ادھر نگاہیں دوڑتا رہا۔ راستہ تلاش کرتا رہا اس خیال کے تحت کہ ممکن ہے میں غلط جگہ آگیا ہوں وہ کوئی اور گھر ہو لیکن آس پاس کے جو مناظر تھے وہ بتا رہے تھے کہ یہ وہی جگہ ہے۔

پھر مجھے ایک دم خیال آیا کہ صدیوں پرانا ماضی جس طرح میری آنکھوں کے سامنے آیا اور مجھے وہاں جس طرح کے واقعات پیش آئے ان کے تحت یہ مشکل نہیں تھا کہ یہ پراسرار عمل ہوجائے۔ اب کیا کروں......

بہر حال میں بھی کہانی نویس تھا ہر طرح کی کہانیاں لکھ لیتا تھا۔ بہت سے ایسے مناظر میرے اپنے تخلیق کردہ تھے جو انسانی دل کو دہلا دیں اور ظاہر ہے میری سوچیں آسمان سے نہیں اترتی تھیں۔ ان مناظر کا تصور کیا جاسکتا تھا جو غیر حقیقی ہوں بلکہ غیر یقینی عمارت کا دروازہ موجود تھا۔ میں اس کھنڈر میں داخل ہوگیا ۔ ہر طرف ویرانی اور سناٹے کا راج تھا، ہر طرف جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں جیسے صدیوں سے ان پر کسی نے توجہ نہ دی ہو۔ میں آگے بڑھتا رہا ایک کمرہ، دوسرا کمرہ، تیسرا کمرہ...... لیکن مجھے وہاں کچھ نظر نہیں آیا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی عمارت تھی۔ وہ کمرہ بھی دیکھا جہاں میں نے ماضی کی داستانوں کو پردوں کی شکل میں اور انسانوں کی شکل میں دیکھا تھا۔ چپے چپے کی تلاش لے ڈالی لیکن وہ جگہ نہ ملی جہاں کتاب تھی۔ تقریباً ایک سے لے کر ڈیڑھ گھنٹے تک میں وہاں کسی آوارہ کی مانند چکرا تا رہا۔ لیکن کوئی نشان نہیں ملا۔

پتا نہیں کیوں ایک عجیب سی مایوسی کا احساس ہوا تھا۔ واپس چل پڑا اور اپنے گھر آگیا۔ طبیعت پر ایک اداسی طاری تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوروتی میری اپنی کوئی تخلیق ہو میرا اپنا کردار جسے میں نے عجیب و غریب شکل میں لکھا ہو۔ آپ یہ بات نہیں سمجھ پائیں گے کسی سچے ادیب سے پوچھئے کہ کبھی کبھی اسے اپنے کسی کردار سے کس طرح عشق ہوجاتا ہے کہ وہ دیوانگی کی حدود میں داخل ہونے لگتا ہے وہ کردار اس طرح اس کی زندگی میں رچ بس جاتا ہے کہ اس کے ہر لمحے میں وہی کردار اس سے منسلک ہوجاتا ہے۔

دل کو بہلانے کے لئے آج رات میں نے اپنی پسند کے کلب میں جانے کا فیصلہ کیا جو خوب صورت جگہ تھی حالانکہ میرا اسٹیٹس نہیں تھا کہ اس جیسے کلب کو افورڈ کرسکوں لیکن ایک آدھ بار کہیں بھی جایا جاسکتا ہے۔

چنانچہ میں چل پڑا اور تھوڑی دیر کے بعد پر رونق کلب میں جا بیٹھا بہت سے لوگ شناسا تھے۔ سلام دعا ہوئی، لیکن پڑھے لکھے لوگوں کی دنیا میں کچھ ایسے میٹرز ہوتے ہیں جن کا خیال رکھا جاتا ہے یعنی جب تک کوئی آپ سے خود قریب ہونے کی کوشش نہ کرے آپ اس پر مسلط نہیں ہوسکتے۔ میں بھی اپنی میز پر تنہا بیٹھ گیا اور میں نے اپنے لئے ایک مشروب طلب کرلیا۔ میری نگاہیں بھٹک رہی تھیں لیکن پھر بھی میں نے جو کچھ دیکھا اس نے مجھے ایک لمحے کے لئے مبہوت کرلیا۔ کوروتی ایک خوبصورت ساڑھی میں ملبوس ایک میز پر بیٹھی ہوئی تھی اس کا رخ دوسری جانب تھا لیکن میں اس کے نقوش ایک لمحے میں پہچان سکتا تھا۔ میرا دل دھاڑ دھاڑ کرنے لگا، غلط فہمی نہیں ہے یہ وہ کوروتی ہی ہے۔ پھر بھی میں نے اس کا انتظار کیا، تھوڑی دیر کے بعد اس نے رخ بدلا تو میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا کسی وہم کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے میں خود اس کے پاس جاؤں یا انتظار کروں کہ وہ مجھے دیکھ کر میرے پاس آئے اور میرا تھوڑا سا صبر کرنا بہتر ہی ہوا۔ اس نے مجھے دیکھا اور ایک دم اس کے چہرے پر ایک شناسا مسکراہٹ پھیل گئی اس نے

مجھے اپنی میز کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا اس میں انا کا کوئی سوال نہیں تھا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب جا بیٹھا وہ محبت پاش نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

''کیسے ہو عالی۔؟''

''ٹھیک ہوں...... کشکا کہوں یا کوروتی۔؟'' میں نے سوال کیا۔

''کوروتی......'' اس نے کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میں اس کی دلکش ہنسی میں کھو گیا۔

''کہو...... کیسے ہو؟''

''بالکل ٹھیک نہیں ہوں۔ یہ بات کہنا مجھے قطعی غیر حقیقی لگتا ہے کہ میں ٹھیک ہوں۔ اس دن کے بعد سے میں آج تک ٹھیک نہیں ہوں۔''

''مجھے اندازہ ہے، ظاہر ہے وہ سب کچھ تمہارے لئے اجنبی تھا۔''

''مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میں اپنے آپ سے بھی اجنبی ہو گیا ہوں۔'' میں نے کہا اور وہ ہلکے سے ہنس دی۔

''کیسا لگا وہ سب کچھ۔؟''

''انوکھا، عجیب اور اس سب سے زیادہ عجیب تم۔ وہ لمحے جب تم صدیوں پہلے رقص کر رہی تھیں اور دنیا کی نظریں تم پر نچھاور ہو رہی تھیں۔ تمہارا چہرہ نقاب میں تھا لیکن آنکھیں ستاروں کی طرح روشن تھیں۔ مجھے اپنے آپ پر قابو نہ رہا اور میں نے تمہارا پیچھا کیا۔''

''اور ہم نے صدیوں پرانا ماحول دیکھا۔''

''ہاں! بہت عجیب۔''

''وہ تو میں نے خیال رکھا ورنہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تم مہابھارت میں کسی بھی فوج کے کوئی لڑاکے ہوتے اور مہابھارت لڑتے۔''

''ارے باپ رے۔ پھر تو میں تمہارا احسان مند ہوں کیونکہ مجھے جنگ وجدل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' وہ بھی ہنسنے لگی پھر میں نے کہا۔

''ایک بات بتاؤ گی کوروتی؟''

''ہاں ہاں پوچھو۔''

''تم کہاں رہ گئی تھیں اس وقت جب تم نے مجھے بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔''

''بات اصل میں یہ ہے کہ تم لاکھوں سال بعد کے انسان ہو لیکن میرا وجود کشکا کی حیثیت سے وہاں تھا اور کشکا اگر اپنی جگہ پر نہ پہنچتی تو بڑا انرت ہو جاتا۔ مجھے یہ بھی خوف تھا کہ گوتم بھنسالی ہم دونوں کے خلاف کوئی بہت بڑی سازش کرے گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔ اس نے بتا دیا مہاراج کو کہ راج لیکھک نقلی ہے۔ وہ بعد کی دنیا سے آیا ہے اور تاریخ میں گھس گیا ہے۔ مہاراج نے اس کی گرفتاری کے احکامات جاری کئے اور سپاہی راج لیکھک کو پکڑ لے گئے۔''

''کیا......؟'' میں اچھل پڑا۔

''ہاں! راج لیکھک کو پکڑ کر لے گئے۔ وہ اصلی راج لیکھک تھا۔ ظاہر ہے وہ اپنے آپ کو تاریخ سے جدا نہیں کر سکتا تھا۔ جب اسے مہاراج کے سامنے پیش کیا گیا اور مہاراج نے اس کا امتحان لیا تو اس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اصلی راج لیکھک ہے، غلط خبر دینے والے گوتم بھنسالی کو سزا کے طور پر گرفتار کر لیا گیا۔ یہ سارا کام مجھے کرنا تھا۔ کیونکہ میں اس تاریخ کا ایک کردار تھی اور وہ کردار مہاراج کے سامنے آنا چاہئے تھا ورنہ بڑی خرابی پیدا ہو جاتی اور پتا نہیں تاریخ میں کیا تبدیلیاں رونما ہو جاتیں۔ بس گوتم بھنسالی قید ہو گیا اور اس کے بعد میں نے کچھ سے انتظار کیا پھر واپس آ گئی۔''

میں نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔

''لیکن ایک بات اور بتاؤ مجھے۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے تمہاری اس رہائش گاہ کا رخ کیا جہاں تم مجھے لے گئی تھیں۔ مگر وہاں ویران کھنڈر کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔''

''تو ٹھیک ہے ناں، مکان مکینوں سے بنتا ہے۔ جب اس گھر میں کوئی رہنے والا نہ تھا تو اسے کھنڈر کے سوا اور کیا ہونا چاہئے تھا۔''

''تو وہ تمہارا گھر نہیں تھا۔''

''میرا ہی گھر تھا اور ہے۔''

''اس کھنڈر کی شکل میں۔؟''

''ہاں وہ کھنڈر ہی تھا، جب میں وہاں تھی تو وہ آباد ہوگیا۔ میں نے اسے چھوڑا تو کھنڈر بن گیا۔''

''اور اب......؟'' میں نے سوال کیا، تو وہ ہنس پڑی پھر بولی۔

''اب میں وہیں ہوں۔''

''اور وہ کتاب......''

''میں نے کہا نا سب کچھ وہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا اور میں سوچ میں ڈوب گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے اس سے کہا۔

''کوروتی وہ سب کچھ میری زندگی کا سب سے عجیب حصہ تھا۔ تم نے مجھے جو کچھ دکھایا میں نے اسے تحریر کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں جو صدیوں پر مشتمل ہو اور میں نے اس کا نام ''زندہ صدیاں'' رکھا ہے کیونکہ تمہاری آنکھوں سے میں نے وہ صدیاں زندہ دیکھی ہیں۔''

اس نے مسکراتی ہوئی نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر بولی۔

''مجھے تمہاری کتاب کا نام بہت پسند آیا ہے۔ تم یہ کتاب لکھو اور جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے، تاریخ صرف ہندوستان یا مہا بھارت تک ہی محدود نہیں۔ تاریخ کا تعلق تو پوری کائنات پوری دنیا سے ہے اور جہاں کے بارے میں بھی تم لکھنا چاہو وہاں کی تاریخ تمہاری نگاہوں کے سامنے آسکتی ہے۔''

میں چونک پڑا۔ پھر میں نے کہا۔

''وہ کیسے۔؟''

''اب بھی یہ سوال کررہے ہو۔؟ میری مرتب کی ہوئی کتاب پر تم نے غور ہی نہیں کیا۔ میں نے نجانے کیسے کیسے یہ کتاب ترتیب دی۔ اس میں صدیاں سمٹی ہوئی ہیں۔''

''گویا اگر ہم کہیں اور جانا چاہیں۔؟''

''ہاں کیوں نہیں۔''

''تو پھر میں تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں کوروتی، میں تمہاری آنکھوں سے دنیا دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''مجھے کیا اعتراض ہوگا۔'' کوروتی نے کہا۔ پھر بولی۔

''چلو! اب میری طرف سے کچھ پیئو۔ تم میری میز پر آئے ہو۔ بتاؤ کیا منگواؤں تمہارے لئے۔''

''اپنی میز پر میں ایک مشروب لے رہا تھا۔ اب تم جو چاہو کھلا پلا دو۔''

''ٹھیک ہے میں منگواتی ہوں۔'' کوروتی نے کہا اور ایک ویٹر کو اشارہ کیا۔ ویٹر اس کے پاس پہنچا تو اس نے اسے کچھ چیزوں کا آرڈر دے دیا۔ ویٹر کے جانے کے بعد میں پھر اسی موضوع پر آ گیا۔

''بتاؤ میں کب آؤں تمہارے پاس۔؟''

''میرا گھر تو یاد ہے نا۔''

''بھلا بھول سکتا ہوں اسے۔'' میں نے کہا۔

''تو کل ہی آ جاؤ۔''

''کوروتی ایک سوال کروں تم سے۔؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں...... ہزاروں سوال کرو۔''

''تم صدیوں سے جیتی ہو، کیا کھاتی پیتی ہو۔''

وہ بے اختیار ہنس پڑی، پھر بولی۔

''بڑا معصومانہ سوال ہے، میں نے کب کہا ہے کہ میں مر چکی ہوں، میں زندہ ہوں اور زندہ لوگ جو کچھ کھاتے ہیں میں بھی وہی کھاتی ہوں۔''

اتنی دیر میں ویٹر نے ہمارے سامنے چیزیں لگانا شروع کردیں۔ لیکن اس کے ہاتھوں پر نظر پڑتے ہی کوروتی چونک پڑی۔ پھر اس کے منہ سے نکلا۔

''تم......؟'' اس کے تم کہنے پر میں نے بھی گردن اٹھا کر دیکھا۔ تو ویٹر کا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ وہ کینہ توز نگاہوں سے مجھے گھور رہا تھا اور یہ گوتم بھنسالی تھا۔ اس نے ویٹر کی وردی پہنی ہوئی تھی اور وہی یہ ساری چیزیں لے کر آیا تھا۔

''تو آزاد ہوگیا کبڑے۔ خیر یہ بات تو میں جانتی تھی کہ تو آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔''

گوتم بھنسالی نے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے تمام چیزیں رکھنے کے بعد واپس چلا گیا۔ تو کوروتی بولی۔

''ان چیزوں کو ایسے ہی رکھا رہنے دو، انہیں استعمال نہیں کرنا۔ وہ کبڑا شیطان نجانے ان میں کیا کچھ ملا کر لے آیا ہوگا۔ مجھے تو اگر وہ زہر کے ڈھیر بھی کھلا دے تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا لیکن وہ تمہیں میرا رقیب سمجھتا ہے۔ ابھی دس منٹ کے بعد ہم یہاں سے اٹھ جائیں گے۔''

میں سنسنی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ کافی دیر تک ہم وہاں بیٹھے رہے ہم نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ پھر اس کے بعد ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ بل وغیرہ وہیں رکھ دیا گیا۔ کوروتی کے ساتھ میں باہر نکل آیا تھا۔ باہر ایک انتہائی خوب صورت کار کھڑی ہوئی تھی۔ کوروتی اس طرف بڑھی اور بولی۔

''آؤ میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں۔''

''نہیں کوروتی میرے پاس میری اپنی گاڑی موجود ہے۔''

''تو پھر کل کسی وقت آ جاؤ۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔'' اس نے کہا اور کار کی جانب بڑھ گئی۔

میں اس کی کار کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ خود ڈرائیو کر رہی تھی اور میں حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ اس عورت کی عمر کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کتنے لاکھوں سال کی یہ ہے اس کے کیا معاملات ہیں، لیکن بہرطور اتنا مجھے اندازہ تھا کہ وہ طویل ترین عمر کی مالک ہے لیکن جس انداز میں میرے سامنے تھی وہ ششدر کر دینے والا تھا۔

کچھ دیر کے بعد میں اپنی کار اسٹارٹ کر کے واپس اپنے گھر کی جانب چل پڑا۔ لیکن یہ رات بھی میرے لئے خوابوں کی رات تھی۔ ساری رات میں کوروتی کو خواب میں دیکھتا رہا۔ مجھے خواب میں ہی وہ تمام مناظر نظر آئے۔

رانی شردھا کے پاس سے کہانی ختم ہو گئی تھی۔ ویسے بھی اب اس کہانی میں خاصی طوالت تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ مہابھارت آخر کس طرح شروع ہوئی۔

دوسرے دن آخر کار میں نے اس علاقے کا رخ کیا جہاں وہ گھر تھا جو خود بھی کسی طلسم کدے سے کم نہیں تھا۔ یعنی پہلے میں نے اسے بڑے خوب صورت انداز میں آباد دیکھا۔ پھر وہ مجھے ایک کھنڈر کی شکل میں نظر آیا اور اب دیکھیں وہاں کیا ہوتا ہے۔ لیکن جب میں اس علاقے میں پہنچا تو دور ہی سے میں نے اس گھر کو پھر پہلے جیسی شکل میں دیکھا اور آنکھیں بند کر کے گردن جھٹکی، درحقیقت تاریخ کا یہ طلسم میرے لئے بڑا حیران کن تھا۔

کوروتی میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے میرے لئے بڑی عمدہ عمدہ قسم کی چیزیں تیار کی تھیں جسے اس نے بڑے جدید انداز میں ایک میز پر لگایا اور بولی۔

''آؤ...... بہت عرصے کے بعد نجانے کتنے عرصے کے بعد میں نے کسی کے لئے اتنے تن من دھن سے کھانا پکایا ہے۔ تمہیں میرے ساتھ کھانا کھانے میں اعتراض تو نہیں ہے۔''

''نہیں......'' میں نے جواب دیا۔ میں کتاب کے ذریعے اور کچھ معلوم کرنے کا متمنی تھا۔ لیکن کوروتی نے کہا۔

''آج ہم کافی وقت ساتھ گزاریں گے تمہارے بارے میں میرا اندازہ ہے کہ تم ایک آزاد فطرت کے انسان ہو اور تم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔''

''ہاں کوروتی میں تمہیں بتا چکا ہوں ایک تنہا زندگی گزار رہا ہوں اور اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کسی طرح پابندی کی حامل ہو۔ لیکن ہماری کہانی ادھوری رہ گئی تھی۔ کوروں اور پانڈوؤں کے اس دور کے بعد کہانی میں ایک نمایاں تبدیلی ہو گئی تھی۔''

''ہاں میں جانتی ہوں، میں تمہیں اس بارے میں بتاؤں اگر تمہاری اجازت ہو تو۔''

''ہاں! زندہ صدیاں ایسے ہی تو نہیں تکمیل تک پہنچ جائے گی۔''

وہ سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر اس نے کہا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ پانڈو، کوروں کی چالاکی سے آخری بازی بھی ہار گئے تھے۔ لیکن پھر جلاوطنی کے یہ بارہ سال پورے کرنے کے بعد پانڈو دکن کے قریب ملک وائن میں آئے اور یہاں انتہائی گمنامی کی حالت میں زندگی بسر کرنے لگے۔ دریودھن نے ان کا کھوج لگانے کی بہت کوشش کی لیکن اسے کہیں ان کا سراغ نہ ملا۔ پھر جب جلاوطنی کی ساری شرائط پوری ہوگئیں تو پانڈوؤں نے سری کرشن کو اپنا ایلچی بنا کر دریودھن کے دربار میں بھیجا اور اپنے ملک کی واپسی کا مطالبہ کردیا۔ دریودھن نے اس مطالبے کو رد کردیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باہمی جنگ سے فیصلہ کرنے کی ٹھانی گئی۔ دونوں فریقوں نے اپنی اپنی فوجوں کو سامان جنگ سے پوری طرح آراستہ کیا اور تھانیسر کے قریب کورکھیت کے میدان میں صف آراء ہوگئے۔ یہ عظیم الشان معرکہ جنگ کل جگ کے شروع کے دور میں برپا ہوا۔ دونوں لشکر بری طرح ایک دوسرے پر حملہ آور ہوئے اور اٹھارہ روز تک یہ جنگ جاری رہی اس طرح سے دونوں طرف کے لشکریوں کو فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ کون سی فوجیں کس کی ہیں چونکہ مکاری اور غداری کا انجام ہمیشہ ذلت اور رسوائی ہوتا ہے اس لئے دریودھن اس جنگ میں مارا گیا اور اس کے لشکری بھی موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ ہندوؤں کے اعتقاد کے مطابق اس جنگ میں کوروں کی طرف سے شامل ہونے والا لشکر گیارہ کشوں اور پانڈوؤں کا لشکر سات کشون پر مشتمل تھا کشون کی تفصیل یوں ہے کہ ایک کشون اکیس ہزار چھ سو بہتر ہاتھی سواروں اتنے ہی اونٹ سواروں پینسٹھ ہزار چودہ سو گھوڑے سواروں اور ایک لاکھ نو ہزار چار سو پچاس پیدل سپاہیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ سپاہیوں کی اس قدر بھاری تعداد سے صرف بارہ آدمی زندہ بچے تھے۔ چار کوروں کے لشکر میں سے جن کے نام یہ ہیں ایک برہمن کرپا جو تحریر کا ماہر تھا، درون نامی ایک عالم کا بیٹا اشو تھا جو خود بھی بہت قابل انسان تھا۔ نمبر تین کرت برما جو یادو۔ خاندان سے تعلق رکھتا تھا، دریودھن کے باپ کا سنجی نامی رتھ بان۔ اس طرح باقی آٹھ آدمی...... دریودھن کا سوتیلا بھائی اور آٹھویں سری کرشن جو اپنی شہرت کی وجہ سے بڑے عالم تصور کئے جاتے تھے۔"

"ایک منٹ ایک منٹ کوروتی۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ وہ چونک کر میری صورت دیکھنے لگی، تو میں نے کہا۔

"سری کرشن کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔"

"ہاں...... سری کرشن شہر متھرا میں پیدا ہوئے۔ ان کے بارے میں مختلف خیالات آج تک پائے جاتے ہیں۔ بعض لوگ انہیں دنیا بھر کے تمام فریبیوں کا سردار مانتے ہیں بعض ان کے دیوتا ہونے کے قائل ہیں بے شمار لوگ انہیں بھگوان کا اوتار سمجھ کر ان کی پرستش کرتے ہیں۔ سری کرشن کی ولادت اور پرورش کا قصہ اس طرح ہے کہ متھرا کے راجا کنس کو نجومی نے یہ بتایا کہ اس کی موت کرشن کے ہاتھوں واقع ہوگی، راجا نے یہ سن کر حکم دے دیا کہ اس لڑکے کو پیدا ہوتے ہی قتل کردیا جائے۔ لیکن سری کرشن بچ گئے، پیدائش سے لے کر گیارہ سال کی عمر تک وہ نند نامی ایک شخص کے گھر میں پرورش پاتے رہے جو گوکل کا رہنے والا تھا۔ آخر کار انہوں نے یارو کے ذریعے راجا کنس کو قتل کیا اور اس کے باپ راجا اوگرسین کو تخت پر بٹھایا، لیکن اوگرسین کی حکومت برائے نام تھی حقیقی اقتدار سری کرشن کے ہاتھوں میں تھا۔ سری کرشن کے جادوئی عملیات اور طلسمی شعبدوں کی وجہ سے لوگ ان کے خدا ہونے پر ایمان لے آئے۔ بہت لوگ اس عقیدے کے مطابق ان کی پرستش کرنے لگے۔ سری کرشن نے اپنی زندگی کے ابتدائی بتیس سال بہت عیش وعشرت میں گزارے جن کے قصے بڑے مشہور ہیں۔ یعنی جمنا کنارے گوپیاں، مکھن وغیرہ۔ جب عیش وعشرت کے بتیس سال گزر گئے تو دوسرے راجاؤں نے

سری کرشن کو تباہ کرنے کی تجویز سوچی۔ بہار اور پٹنا کے راجا جراح سنگھ نے ایک طرف سے متھرا پر حملہ کیا اور دوسری طرف سے راجا کالیون نے حملہ کردیا۔ یہ راجا کالیون عرب کا رہنے والا تھا۔ بہرحال سری کرشن ان دونوں راجاؤں کے حملے کی تاب نہ لاسکے اور متھرا سے فرار ہوکر دوارکا چلے گئے۔ جو احمد آباد گجرات سے کافی فاصلے پر دریائے شور کے کنارے آباد ہے۔ دوارکا کے قلعے میں پناہ گزیں ہوئے۔ سری کرشن نے اٹھتر سال دوارکا کے آس پاس کے علاقوں میں گزارے۔ اس تمام عرصے میں وہ دشمنوں سے بچنے کی کوششیں کرتے رہے۔ لیکن وہ کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ آخر ایک سو پچیس سال کی عمر میں دریودھن کی ماں رانی کندھاری کی بددعا سے بہت بری طرح اس دنیا سے چل بسے۔ ہندوستان کے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سری کرشن کو موت نہیں آئی بلکہ انہوں نے بحالت زندگی روپوشی اختیار کی ہے اور ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔''

''رانی کندھاری کا ذکر آپ کرچکی ہیں کوروتی۔'' اس بددعا کا کیا قصہ ہے۔''

''بہت ہی عجیب وغریب کہا جاتا ہے کہ جب رانی کندھاری کی زچگی کا زمانہ قریب آیا تو ایک دن اس نے یہ سوچا کہ جب یہ لڑکا دریودھن پیدا ہوگا تو اس کا باپ اندھا ہونے کی وجہ سے اس کو دیکھ نہیں سکے گا۔ بہتر یہی ہے کہ میں اپنے شوہر کی رفاقت کا پورا پورا خیال رکھوں اور آشتر کی طرح لڑکے کو دیکھنے سے باز رہوں اس خیال کی بنا پر جب دریودھن پیدا ہوا تو رانی کندھاری نے آنکھیں بند کرلیں اور اپنے بیٹے کے جسم پر نگاہیں نہ ڈالیں۔ یہاں تک کہ وہ جوان ہوکر تخت سلطنت پر بیٹھا اور لڑائی کا بے شمار سامان لے کر دشمنوں کے مقابلے پر میدان جنگ میں آیا۔ لیکن رانی روز اول کی طرح بیٹے کے دیدار سے محروم تھی۔ جب لڑائی کا دن مقرر ہوا اور خطرے کی گھڑی قریب آئی تو اس سے ایک روز پہلے کندھاری نے اپنے بیٹے دریودھن کو بلا کر کہا۔

''میری زندگی کے ٹکڑے، میری جان انسان اپنی اولاد کو ہر طرح کی آفات سے اور بلاؤں سے محفوظ اور بے خوف رکھتا ہے۔ کل جب کہ جنگ شروع ہوگی تو مجھے یہ خطرہ ہے کہ کہیں تیرے نازک جسم کو جو خاص محفوظ نہیں ہے کوئی صدمہ نا پہنچے اس لئے تو بالکل بے لباس ہوکر میرے سامنے آنا کہ میں تیرے سارے جسم پر نگاہ ڈالوں۔''

دریودھن نے اپنی ماں سے اس طرح عریاں ہوکر آنے کا طریقہ پوچھا تو ماں نے جواب دیا۔

''اے میرے بیٹے اس زمانے میں عقل، سچائی اور بزرگی میں پانڈوں کے برابر کوئی نہیں ہے۔ تجھ کو چاہئے کہ تو پانڈوں کے دربار میں حاضر ہوکر اسکا طریقہ دریافت کرے۔''

دریودھن نے ماں کا کہنا مانا اور پانڈوں کے پاس پہنچا اور انہیں اپنے آنے کی وجہ بتائی۔ پانڈوں نے یہ جاننے کے باوجود کہ دریودھن ان کا جانی دشمن ہے، سچائی اور طبیعت کے استقلال کو مدنظر رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''فطرت کا یہ قانون ہے کہ اولاد ماں کے پیٹ سے بالکل برہنہ پیدا ہوتی ہے اور والدین کی نظر اسی طرح برہنہ حالت میں بچے پر پڑتی ہے چونکہ تیری ماں نے اب تک تجھے نہیں دیکھا اس لئے تجھے اس کے سامنے برہنہ جانا چاہئے کیونکہ اس کے لئے تیرا وجود اب بھی وہی حیثیت رکھتا ہے جو حیثیت کہ تیری ولادت کے روز تھی۔ لہٰذا یہ تیرا فرض ہے کہ تو اپنی ماں کا کہنا مانے اور اس کے سامنے بالکل برہنہ جائے تاکہ وہ تیرے جسم پر پاک نگاہیں ڈال کر تجھے تمام آفات سے محفوظ کردے۔''

دریودھن یہ نیک مشورہ حاصل کرکے اٹھا اور اپنے لشکر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں سری کرشن سے ملاقات ہوئی انہوں نے کہا۔

''اس طرح تنہا دشمن کے لشکر میں آنا خلاف مصلحت ہے۔ آخر تم کس لئے آئے تھے۔؟''

دریودھن نے اس کے جواب میں تمام واقعہ

بیان کر دیا یہ سب سن کر سری کرشن نے اپنے دل میں سوچا کہ یہ تو بڑا غضب ہو گیا اگر دریودھن پانڈوؤں کے مشوروں کے مطابق اپنی ماں کے سامنے بالکل برہنہ جائے گا تو ماں کی نگاہوں کی تاثیر سے اس کا جسم ہر طرح کی آفات سے محفوظ ہو جائے گا اور اس کے جسم پر کسی قسم کا کوئی وار کارگر نہ ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ میں فتح اس کو نصیب ہوگی اور یہ ہم لوگوں کو بالکل تباہ و برباد کر دے گا۔ یہ سوچ کر سری کرشن نے فریب سے ایک قہقہہ بلند کیا اور کہا۔

''اے نادان شخص جو انسان دشمنوں سے نیک مشورے کی توقع رکھتا ہے وہ یقیناً اپنے لئے گڑھا کھودتا ہے۔ پانڈوؤں نے تیرے ساتھ مذاق کیا ہے ذرا تو خود ہی اپنے دل میں غور کر کہ جب تو پیدا ہوا تھا تو اس وقت ایک چھوٹا سا بچہ تھا اور اب تو جوان ہو چکا ہے بھلا تیری غیرت تجھے کس طرح اجازت دے گی کہ تو بالکل ننگا ہو کر اپنی ماں کے سامنے جائے۔''

دریودھن سری کرشن کے فریب میں آ گیا اور انہی سے مشورہ حاصل کرنے لگا۔ اس پر سری کرشن نے کہا۔

''پانڈوؤں نے تجھے جو مشورہ دیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک حقیقت ہے۔ لیکن تو بس صرف اتنی احتیاط کر لینا کہ اپنے گلے میں پھولوں کا ایک لمبا سا ہار پہن لینا تاکہ تیری بدن پوشی ہو سکے۔ اس عالم برہنگی میں پھر تو اپنی ماں کے سامنے چلے جانا۔''

دریودھن کو سری کرشن کا مشورہ پسند آیا اور اس نے اسی پر عمل کیا اور اپنی ماں کے سامنے جا کر کہنے لگا۔

''میں حاضر ہو گیا ہوں میری ماں اپنی آنکھیں کھولو ماتا جی اور مجھے دیکھو۔''

ماں نے یہ سوچ کر کہ دریودھن پانڈوؤں سے نیک مشورہ لے کر آیا ہوگا آنکھیں کھول دیں۔ لیکن جونہی اس کی نگاہ دریودھن کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہار پر پڑی تو وہ چیخ کر بے ہوش ہو گئی۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ زار و قطار رونے لگی اور پوچھنے لگی کہ کیا یہ ہار پہن کر آنے کا مشورہ تجھے پانڈوؤں نے دیا تھا۔ دریودھن نے جواب دیا۔

''نہیں انہوں نے نہیں بلکہ سری کرشن راستے میں ملے تھے۔ میں نے ان کی رائے پر عمل کیا ہے۔''

یہ بات سن کر گندھاری نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اپنے جلے ہوئے دل سے سری کرشن کو بددعا دی اور لعنت بھیجی اور اپنے بیٹے سے کہا۔

''اے بیٹے تیرے جسم کی یہی جگہ جو میری نگاہوں سے اوجھل رہ گئی ہے دشمن کے وار سے زخمی ہوگی اور شاید یہی تیری ہلاکت کا سبب بن جائے گی۔''

چنانچہ بات بالکل درست نکلی۔ دریودھن کی موت اسی طرح واقع ہوئی اور سری کرشن بھی اسی بددعا کے اثر سے جیسا کہ پہلے بتایا بہت بری طرح دنیا سے رخصت ہوئے۔ یہ کہانی سری کرشن کی تھی جن کے متعلق ہندوستان والوں نے طرح طرح کے قصے بیان کیے ہیں۔ لیکن ایک اور شخص جس نے مہا بھارت کے بعد کوروں، پانڈوؤں کی کہانی ختم ہونے کے بعد سب سے پہلے اپنی حکومت قائم کی۔ اس کا نام کشن تھا، یہ شخص کافی ذہین تھا اس کا وزن سب سے زیادہ تھا اس قدر کہ گھوڑا اس کی سواری کی تاب نہیں لا سکتا تھا چنانچہ اس نے سب سے پہلے جنگلی ہاتھیوں کو پکڑوا کر حسن تدبیروں سے انہیں رام کیا اور ان پر سواری کی اس کے علاوہ ایک شخص اور تھا جس کا نام جے کشن تھا۔ وہ اس کے دور میں اس کا وزیر بنا اس نے چار سو سال تک زندگی پائی۔ اس کے بعد مہاراج کی حکومت آئی جو کشن کا بیٹا تھا اور اس نے اپنے باپ سے زیادہ حکومت چلانے پر محنت کی۔ چنانچہ بہت سے ایسے شہر جو ہندوستان سے بہت دور مقامات پر واقع تھے آباد ہو گئے۔ اس نے شہر بہار آباد کیا اور دور دور سے اہل علم کو بلا کر اس میں بسایا۔ یہاں عبادت گاہیں بنوائیں اور پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ مہاراج نے سات سو سال تک ہندوستان پر حکومت کی اور اس کے بعد ہندوستان کی حالت بدل گئی۔ غرض یہ کہ اس طرح سے بات کیشوراج کی

حکومت تک آئی۔ مہاراج کے چودہ بیٹے تھے۔ جن میں سب سے بڑا کیشوراج تھا جو اپنے باپ کا جانشین ہوا۔

خیر تو میں تمہیں بتا رہی تھی کہ اسی طرح وقت گزرتا رہا۔ ہندوستان میں بت پرستی کا رواج اس وقت سے شروع ہوا جب ایران سے ایک شخص ہندوستان آیا اور اس نے یہاں کے لوگوں کو آفتاب پرستی کی تعلیم دی۔ اس کی تعلیم کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ یہاں تک کہ ستارہ پرست لوگ بھی آگ کی پرستش کرنے لگے۔ لیکن اس کے بعد بت پرستی کا رواج شروع ہوگیا۔ بت پرستی کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس برہمن نے جس کا تذکرہ پہلے کیا جاچکا ہے راجا کو اس بات کا یقین دلا دیا تھا کہ جو شخص اپنے بزرگوں کی سونے چاندی یا پتھر کی شبیہ بنا کر اس کی پرستش کرتا ہے وہ سیدھے راستے پر ہوتا ہے۔ اس عقیدے کو لوگوں نے اس حد تک اپنایا کہ ہر چھوٹا بڑا اپنے بزرگوں کے بت بنا کر ان کی پوجا کرنے لگا۔ خود راجا سورج نے بھی دریائے گنگا کے کنارے شہر قنوج آباد کر کے وہاں بت پرستی شروع کردی۔ اس کی رعایا نے اپنے فرمانروا کی تقلید کی اور یوں بت پرستی عام ہوگئی لیکن ہندوستان میں بت پرستی کے نوے مختلف گروہ پیدا ہوگئے۔ قنوج کی آبادی میں بہت اضافہ ہوا۔ راجا سورج کی مدت حکومت دو سو پچاس برس ہے۔ اس کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ اس راجا کے پینتیس بیٹے تھے جن میں سب سے بڑا لہراج تھا جو اس کا جانشین ہوا۔ اسی شخص نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اپنے نام کی مناسبت سے ایک شہر لہراج آباد کیا۔"

میرا دماغ بری طرح چکرا گیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ہندوستان کا ایک ایک لمحہ میری نگاہوں کے سامنے بیدار ہوتا جارہا ہو۔ میں نے مسکراتے ہوئے ہاتھ اٹھایا اور اس سے کہا۔

"تم، حقیقت یہ ہے کہ نجانے کیا ہو کوروتی، میں تم سے بہت متاثر ہوا ہوں۔" کوروتی نے آنکھیں بند کرلیں۔ جیسے وہ کسی خیال میں ڈوب گئی ہو۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے کہا۔

"زندگی بڑی بے کار چیز ہے ذیشان عالی، انسان کبھی کبھی جو کچھ کر بیٹھتا ہے اس کا کوئی بدل اسے نہیں ملتا۔ یوں سمجھ لو کہ میں نے اپنی عمر کے لاکھوں کیا کروڑوں سال دیکھے ہیں۔ میں ہر دور میں اپنی دلچسپیوں کو قائم رکھے رہی ہوں چونکہ مجھے بھی تاریخ سے بہت زیادہ پیار رہا ہے اور بات صرف ہندوستان کی تاریخ ہی کی نہیں ہے۔ بابل، نینوا، مصر، ایران، یونان میں نے ہر جگہ کی تاریخ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور ہر دور میں اپنے آپ کو ایک کردار بنا کر تاریخ میں ضم رکھا ہے۔ اگر تم تاریخ کے باریک پہلوؤں کے بارے میں جاننا چاہو تو تمہیں کہیں سے اس کی تصدیق نہیں ملے گی سوائے میرے۔"

میرے ہوش وحواس رخصت ہوئے جارہے تھے۔ کیا عظیم شخصیت میرے سامنے تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"اور اس کے بعد کوروتی تم نے ان تاریخوں کو بھی دیکھا ہوگا جن میں مشہور جنگیں ہوئی ہیں۔ باہر کے مسلمان فرمانروا ہندوستان پر حملہ آور ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کی تاریخ کے بڑے بڑے انوکھے کردار کیا تم ان سب سے واقف رہی ہو۔"

"کافی حد تک۔ چونکہ میں بتا چکی ہوں کہ مجھے خود بھی تاریخ کا بے حد شوق رہا ہے اس لئے میں نے ہر دور میں اپنے آپ کو ضم کرنے کی کوشش کی ہے۔"

نجانے کتنی دیر تک میں اس کے ساتھ رہا مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے اپنے ذہن میں تاریخ ایک قیمتی خزانے کے طور پر محفوظ ہو۔ خاصی رات ہوگئی تھی میں نے اس سے اجازت مانگی تو وہ بولی۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ، لیکن خیال رکھنا کہ ہمارا ایک مشترکہ دشمن تمہاری تاک میں لگا رہے گا۔ تمہیں اس سے محفوظ رہنا ہے۔"

ایک لمحے کے لئے میرے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔ بزدل تو میں بالکل نہیں تھا لیکن مدمقابل

کوئی عام آدمی ہوتا تو مجھے پرواہ نہیں تھی۔ تاہم میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں اس سے محتاط رہوں گا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''ایک بات بتاؤ کوروتی اگروہ کبھی میرے مدمقابل آنے کی کوشش کرے تو کیا اس وقت کے ہتھیار اس کے خلاف استعمال ہوسکیں گے۔''

''یہی تو دکھ بھری بات ہے۔ نہیں ہوسکیں گے لیکن وہ تمہیں ہتھیاروں سے مارنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اس بات کا مجھے علم ہے۔''

''وجہ۔؟''

''وجہ نہ پوچھو تو زیادہ اچھا ہے۔''

میں نے اصرار نہیں کیا۔ یہ رات بھی میرے لئے عجیب وغریب حیرتوں کی رات تھی۔ اس نے ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا میں نجانے کب تک اس کے بارے میں سوچتے سوچتے سوگیا۔ سچی بات یہ ہے کہ کوروتی سے زیادہ میرے لئے اچھا کردار اور کوئی نہیں رہا تھا۔ جو مجھے ہندوستان کی تاریخ بتا رہی تھی۔ اس نے مجھے لہراج تک کے بارے میں بتایا تھا۔ لہراج کے باپ راجا سورج نے اپنے عہد حکومت میں بنارس شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ لیکن یہ شہر اس کی زندگی میں مکمل نہ ہوسکا۔ اس نے اس شہر کو بسانے میں پوری پوری محنت کی تھی اور اپنے بھائیوں کو ہمیشہ عزیز رکھا تھا۔ پتہ یہ چلا کہ اسی راجا نے اپنے باپ کی اولاد کو راجپوت کے نام سے اور دوسرے لوگوں کو مختلف فرقوں اور ناموں سے موسوم کیا۔ آخر کار وقت بگڑا اور ہر شخص حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں سنبھالنے کا خواب دیکھنے لگا۔ ایسے ہی لوگوں میں کیدار نامی ایک برہمن بھی تھا۔ اس نے سوامک کے کوہستان سے سرکشی کی اور لہراج پر حملہ کرکے اسے شکست دی۔ اس طرح ہندوستان کی حکومت کیدار کے ہاتھ آگئی۔ پھر اسی عہد میں شنکل نامی ایک باغی نے کوچ بہار کی طرف سے نکل کر سلطنت پر حملہ کیا اور بنگال و بہار کو فتح کرکے ایک بھاری فوج تیار کی۔

اس طرح شنکل ہندوستان کا راجا بن گیا۔

وہ مجھے ہندوستان کی پوری تاریخ سے روشناس کرانے لگی اور بات وہاں سے نکل کر اور آگے آگئی۔ راجا دکرماجیت، راجا بھوج دیو، واس دیو، راجا رامدیو راجپوت کی حکومت تک بات پہنچی۔ مجھے بہت کچھ معلوم ہورہا تھا۔ پھر ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بارے میں تفصیلات کا پتہ چلا۔

ہندوستان میں سب سے پہلے جس مسلمان نے قدم رکھا اور اہل ہندوستان سے معرکہ آرائیاں کیں وہ مہلب بن ابی صفرہ تھا۔ ہجرت نبویؐ کے اٹھائیسویں سال امیرالمومنین حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں بصرے کے حاکم عبداللہ بن عامر نے فارس پر حملہ کیا اور وہاں کے باشندوں کو جنھوں نے امیرالمومنین حضرت عمر فاروقؓ کی وفات کے بعد عہدی کی شکست دی اور واپس بصرے آگیا۔ ہجرت کے تیسویں سال حضرت امیرالمومنین حضرت عثمان غنیؓ نے ولید بن عتبہ کو جو کوفے کا حاکم تھا اس وجہ سے معزول کردیا کہ اسے شراب خوری کی عادت تھی اور اس کی جگہ سعید بن العاص کو مقرر کردیا۔ سعید اسی سال خارستان کی طرف متوجہ ہوا۔ حضرت امام حسن وامام حسینؓ بھی اس کے ساتھ اس معرکے میں شریک ہوئے۔ اسطرآباد کے دارالسلطنت جرجان کو حضرت حسینؓ کی قدموں کی برکت سے فتح کرلیا گیا اور وہاں کے باشندوں نے دولاکھ دینار سالانہ دینا منظور کئے۔ اہل جرجان اسلام لے آئے اور خوشحالی کے ساتھ زندگی بسر کرنے لگے۔

یہ تمام معلومات زندہ صدیاں کے لئے بہت بڑی حیثیت رکھتی تھیں میں انہیں رقم کرتا رہا۔ پھر اس کے بعد ایک دن میں کوروتی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا وہ کسی پریشانی کا شکار نظر آرہی تھی۔ اس نے کہا۔

''مجھے تم سے کچھ دن کے لئے رخصت ہونا پڑے گا۔''

''خیریت کوروتی...... کیوں۔؟''

"افسوس میں اس کیوں کا جواب نہیں دے سکتی۔"

"تو تمہارا مطلب ہے کہ یہ خوب صورت گھر ایک بار پھر کھنڈر کی شکل اختیار کر جائے گا۔" وہ مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔

"نہیں ہلکہ میں تمہیں دعوت دیتی ہوں کہ تم اگر چاہو تو اس کتاب کے ذریعے ماضی میں کہیں جاسکتے ہو۔ ہوسکتا ہے تم جہاں جاؤ میں وہاں کے ماضی میں، میں تمہیں نہ ملوں لیکن پھر بھی تمہاری اپنی معلومات میں اضافہ ہوگا۔"

"لیکن میرے لئے واپسی کا سفر کیسے ممکن ہوگا۔" میں نے کہا اور وہ سوچ میں ڈوب گئی، پھر بولی۔

"اس بارے میں، میں تمہیں ایک دو دن میں بتاؤں گی۔"

"گویا تمہارا مطلب ہے کہ ایک دو دن تک ابھی تم یہاں موجود ہو۔"

"ہاں......!"

"کوروتی میں تمہارا بری طرح عادی ہوگیا ہوں۔ نجانے کیوں مجھے یوں لگتا ہے کہ میں تمہارے بغیر اب وقت نہیں گزار سکتا۔"

اس نے دکھ بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر بولی۔

"ہم ابھی جدا نہیں ہورہے ذیشان عالی وقت ابھی کافی دن تک ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ رکھے گا۔ تم کل آنا میں تمہیں اور بھی کچھ تفصیلات بتاؤں گی۔" اس نے کہا۔

میرے لئے اب دن اور رات واقعی عجیب وغریب ہوگئے تھے۔ زیادہ تر کوروتی کا ساتھ رہتا تھا اور میں اس سے دنیا کی تاریخ کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہتا تھا۔ ہم دونوں کے پروگرام بھی ساتھ ہی بنا کرتے تھے۔ بظاہر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے ساتھ آج کل جن معزز خاتون کو دیکھا جاتا رہا ہے وہ دنیا کی تاریخ کا ایک عجیب وغریب کردار ہے۔ اتنا حیران کن کہ اگر دنیا کو اس کے بارے میں بتایا جائے

غیبت

ہمارے نبی ﷺ نے اپنے صحابہؓ سے دریافت کیا کہ غیبت کیا ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا۔ خدا اور اس کے رسول ﷺ ہی خوب جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ غیبت یہ ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کی پیٹھ پیچھے ایسی بات کہی جائے کہ اگر وہ بات اس کے سامنے کہی جائے تو وہ برا مانے، اگر وہ اس بات میں ہو۔ فرمایا جب ہی تو غیبت ہے اور اگر وہ اس بات میں نہ ہو اور پھر وہ کہی جائے تو یہ بہتان ہے۔

(قاری عابد-کراچی)

تو لوگ ہنسنے کے سوا اور کچھ نہیں کہیں گے۔ یہی کہیں گے کہ واہ! مصنف پراسرار کہانیاں لکھتے لکھتے پراسرار جھوٹ بولنے پر بھی اتر آئے۔ لیکن یہ ایک حقیقت تھی کہ کوروتی صدیوں قدیم پرانا کردار تھی اور دنیا اس کے ذہن میں گم تھی۔

دوسرے دن میں پھر مقررہ وقت پر اس خوبصورت عمارت میں داخل ہوگیا جو کوروتی کی غیر موجودگی میں ایک کھنڈر کی طرح سے رہ جاتی تھی۔ میں جس وقت وہاں جاتا تھا کوروتی میرا استقبال کرتی تھی خوب صورت لباس میں ملبوس چہرے پر ایک حسین مسکراہٹ سجائے لیکن آج وہ سامنے موجود نہیں تھی۔ حالانکہ وقت وہی تھا جب میں اس کے پاس جاتا تھا۔ نجانے کیوں ایک لمحہ کے لئے میری چھٹی حس نے ایک عجیب وغریب احساس دلایا وہ یہ کہ کوروتی اس وقت اس عمارت میں موجود نہیں ہے لیکن عمارت کھنڈر کی شکل میں نظر نہیں آرہی تھی۔ میں چند قدم آگے بڑھ کر اوپر پہنچا اور پھر انداز داخل ہوکر میں نے کوروتی کو آواز دی۔ کچن سے کھانوں کی خوشبو بھی نہیں آرہی تھی جو کوروتی بڑی دلچسپی سے میرے لئے تیار کرتی تھی اور حقیقت یہ تھی کہ

یہ نا قابل فہم کھائی دیتے تھے۔ صدیوں، قدیم روایات کے مطابق لیکن مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ نجانے کیوں میری چھٹی حس مجھے بتانے لگی کہ کوروتی نے کل جو کہا تھا کہ وہ کچھ وقت کے لئے مجھ سے جدا ہو جائے گی تو وہ مجھ سے جدا ہو چکی ہے۔ میں گھر کے چپے چپے میں اسے تلاش کرنے لگا اور آخر کار وہاں پہنچ گیا جہاں وہ کتاب موجود تھی۔ چند منٹ سوچنے کے بعد میں نے سیڑھیاں طے کیں اور ابھرے ہوئے الفاظ سے بچتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کوروتی کہیں کسی تاریخ کے دور میں تو نہیں چلی گئی ہے۔ لیکن جب کوئی عمل نہیں ہوتا تھا تو کتاب صاف شفاف نظر آتی تھی آج بھی اس کی یہی کیفیت تھی۔ میں ایک جگہ کھڑے ہو کر سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے کوئی اور ایسا ذریعہ نہیں تھا جس سے میں کوروتی کو آواز دیتا۔ ایک لمحہ کے لئے میں سوچ میں ڈوبا رہا اور پھر ایک گہری سانس لے کر واپس پلٹا لیکن پلٹتے ہوئے میں نے ذرا بے دھیانی سے کام لیا تھا۔ ایک دم سے میرا پاؤں لڑکھڑایا اور دوسرے لمحے میں کتاب کے ابھرے ہوئے ایک لفظ پر جا گرا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ہوش و حواس رخصت ہو رہے ہوں۔ کتاب کا وہ لفظ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا اور ایک گہرا غار نمودار ہو گیا تھا جس میں، میں برق رفتاری سے گرتا چلا جا رہا تھا۔

کچھ لمحوں کے لئے تو میرا ذہن بالکل چکرا کر رہ گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی اندھے کنویں میں گرتا جا رہا ہوں۔ مجھے وہ لمحے بھی یاد آئے جب پہلی بار میں کتاب کی گہرائیوں میں اترا تھا۔ اور نیچے گرا تھا۔ میرا خیال یہ تھا کہ میں بہت نیچے کسی اندھے کنویں میں گر رہا ہوں۔ مگر میرے جسم کو ایک ذرا بھی چوٹ نہیں آئی تھی اور اس وقت بھی یہی ہوا زیادہ سے زیادہ چند منٹ نیچے گرا ہوں گا اور وہ بھی ایسی جگہ جہاں مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم کے نیچے بہت چند فٹ نیچے گرا ہوں گا اور وہ بھی ایسی جگہ جہاں مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم کے نیچے بہت موٹی قسم کی مخمل بچھی ہو۔ یہ مخمل گہرے سبز رنگ کی گھاس تھی۔ اس وقت یہاں مدھم مدھم لیکن خوش گوار روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی کہ میں چاروں طرف اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر کا ماحول دیکھا اور خود بخود ایک فرحت سی ذہن پر محسوس ہوئی۔ بڑا حسین علاقہ تھا۔ ہر طرف سرسبز و شاداب جنگل نظر آ رہا تھا۔ دور دور تک گہری سبز گھاس بکھری ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اونچی اونچی جھاڑیاں جن پر پھول کھلے ہوئے تھے۔ وسیع و عریض میدان کے انتہائی سرے پر پہاڑی ٹیلے نظر آ رہے تھے اور ان کے عقب میں اونچی اونچی برف پوش چوٹیاں۔ کیا ہی حسین منظر تھا میں اپنی جگہ اٹھ کر بیٹھ گیا ابھی ایک لمحہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اچانک ہی مجھے ایک خوفناک غراہٹ سنائی دی اور میں چونک پڑا۔ میرا سر گھوم گیا۔ تب میں نے کسی چیز کو متحرک دیکھا اور چونکہ فاصلہ بہت زیادہ نہیں تھا اس لئے ایک لمحہ میں پہچان لیا۔ وہ ایک خونخوار ببر شیر تھا جو اونچی جھاڑیوں کے پیچھے سے نمودار ہوا تھا اور اس نے کسی شے پر غراتے ہوئے ایک لمبی چھلانگ لگائی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہو گیا۔ مجھے ایک انسانی چیخ سنائی دی تھی اور اس کے ساتھ ہی شیر کی غراہٹیں، ایک بار پھر میں نے اس شیر کو اسی طرح اچھلتے ہوئے دیکھا اور ایک لمحہ کے لئے میرے اوسان خطا ہو گئے۔

تبھی مجھے ایک دم اپنے جسم پر کسی تبدیلی کا احساس ہوا اور میں نے اپنے آپ کو دیکھا۔ میرے بدن پر جو لباس تھا وہ میرا اپنا نہیں تھا۔ بلکہ چمڑے کا ایک انتہائی مضبوط زرہ میرے جسم پر تھا۔ جو گھٹنوں تک تھا اور گھٹنوں سے نیچے پاؤں کسی لباس سے عاری تھے البتہ جو جوتے میں نے پہنے ہوئے تھے وہ مخصوص قسم کے تھے۔ جن کے چوڑے تسمے گھٹنوں تک آ کے کس گئے تھے۔ کمر سے ایک کلہاڑا لٹک رہا تھا۔ جس کا پھل بلاشبہ تین کلو سے زیادہ وزنی تھا۔ نجانے میرے ذہن میں کیا آئی کہ میں نے کلہاڑا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک بار پھر میرے حلق سے ایک تیز آواز نکلی اور وہ شیر جو کسی

نامعلوم انسان پر حملہ آور تھا میری طرف متوجہ ہوگیا۔اس نے رک کر میری طرف نگاہیں اٹھائیں اور پھر چند قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ کلہاڑا میرے ہاتھ سے نکلا اور پوری قوت سے اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان پیشانی پر پڑا۔ہڈی تڑخنے کی آواز سنائی دی۔ساتھ ہی شیر نے منہ کے بل قلابازی کھائی اور مجھ سے صرف چند منٹ کے فاصلے پر آگرا۔میں اچھل کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔کلہاڑے کا وار اتنا کاری تھا کہ شیر کا سر دو ٹکڑے ہوگیا تھا اور ایک لمحہ میں وہ ٹھنڈا ہوگیا تھا۔

میں نے متوحش نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا تبھی اس بڑی جھاڑی کے پیچھے سرسراہٹ ہوئی اور ایک شخص اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔دلچسپ بات یہ تھی کہ اس نے بھی بالکل میرے جیسا ہی لباس پہنا ہوا تھا۔لیکن اس کے بازوؤں سے چہرے سے اور ٹانگوں سے خون بہہ رہا تھا۔شیر نے اسے شدید زخمی کردیا تھا وہ چند قدم آگے بڑھا اور پھر گھاس پر گر پڑا۔میں نے ایک نگاہ شیر پر ڈالی اب اس کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔دوسرے لمحے میں اس شخص کی طرف بھاگا اور اس کے قریب پہنچ گیا۔

وہ ہوش وحواس میں تھا مجھ سے کہنے لگا۔

''میں زخمی ہوں میرے دوست میں بہت زخمی ہوں۔ذرا تم ادھر ادھر نگاہیں دوڑا کر میرا گھوڑا تلاش کرو۔وہ بے چارہ بھی زخمی ہوگیا ہے۔شیر نے اچانک مجھ پر حملہ کیا تھا۔''

حیرت کی بات یہ تھی کہ جو زبان وہ بول رہا تھا وہ بالکل اجنبی زبان تھی لیکن میری سمجھ میں اچھی طرح آرہی تھی۔میں نے اس کے کہنے کے مطابق ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں تو بہت دور مجھے ایک سفید دھبا سا نظر آیا۔یہ دھبا متحرک تھا۔غور سے دیکھا تو اندازہ ہوگیا کہ یہ وہی گھوڑا ہے۔جس کا اس نے مجھ سے تذکرہ کیا ہے لیکن اس کا فاصلہ کافی تھا میں نے اسے گھوڑے کے بارے میں بتایا تو اس نے گردن ہلائی اور بولا۔

''میں اسے بلاتا ہوں۔کاش میری آواز اس تک پہنچ جائے مجھے سہارا دو۔''میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا تو اس نے منہ کے آگے دونوں ہاتھوں کا بھونپوں بنایا اور ایک تیز آواز حلق سے نکالی۔دوسری یا تیسری آواز اس کے حلق سے نکلی تھی کہ میں نے اس سفید متحرک دھبے کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔گھوڑا پوری قوت سے دوڑا چلا آرہا تھا۔

میں دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔بڑا ہی خوب صورت اور قد آور گھوڑا تھا۔جو ہمارے نزدیک پہنچ گیا۔میں نے کبھی جانوروں کا بہت تجزیہ نہیں کیا تھا۔لیکن اس وقت مجھے صاف محسوس ہوا کہ اس گھوڑے کی آنکھوں میں بہت ہی پیار ہے۔وہ اپنا منہ اس شخص کے شانے سے رگڑنے لگا۔اس نے ہاتھ سے گھوڑے کی گردن تھپتھپائی اور مجھ سے بولا۔

''تمہیں خود بھی میرے ساتھ اس گھوڑے پر سوار ہونا ہوگا۔میں شاید تنہا اس پر بیٹھ کر سفر نہ کرسکوں۔''

میں نے اس کی بات پر غور کیا اور دل ہی دل میں ذرا سا خوف زدہ ہوا۔کیونکہ اس سے پہلے میں کبھی گھوڑے پر سوار نہیں ہوا تھا۔لیکن فوراً ہی مجھے ایک اور خیال بھی آیا وہ یہ کہ اس سے پہلے میں نے کبھی کسی کلہاڑے سے ایک خوف ناک شیر کا سر بھی نہیں توڑا تھا اور اس سے پہلے میرے جسم پر ایسا لباس بھی نہیں تھا۔ہاں ایک دلچسپ بات کا تذکرہ میں آپ سے خاص طور سے کروں گا وہ یہ کہ کوروتی کی کہانی کے ساتھ ساتھ میں نے اس سے پہلے مہابھارت کے دور کی دنیا دیکھی تھی اور انہی لوگوں کے درمیان خود کو محسوس کیا تھا لیکن مجھے اس وقت بھی اچھی طرح یہ بات یاد رہی تھی کہ میں راج لیکھک نہیں ہوں میرا نام کنس نہیں ہے بلکہ میں ذیشان عالی ہوں ایک تحریر نگار، ایک فکشن رائٹر اور اس وقت بھی مجھے اپنی تمام سوچوں کے ساتھ یہ ماحول اپنا اپنا ہی سا لگ رہا تھا یعنی میں دوہری شخصیت کا شکار تھا۔اور یہ ایک انتہائی انوکھا عمل تھا جسے فی الحال میں تو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔

گھوڑے کی پشت پر اس شخص کو سوار کرانے میں

مجھے کوئی وقت نہیں ہوئی۔ میں نے ہاتھوں کا پیالہ سا بنایا اور اس شخص سے کہا کہ میرے ہاتھوں پر پاؤں رکھ کر گھوڑے پر سوار ہو جائے۔ ساتھ ہی میں نے اسے سہارا بھی دیا تھا وہ شخص حالانکہ خاصا تن و مند تھا لیکن مجھے اس کا وزن ذرا بھی محسوس نہیں ہوا اور اسی وقت ہی میری نگاہیں اپنے بازوؤں پر پڑی تھیں۔ چوڑے چوڑے فولادی بازو جو صحیح معنوں میں مجھے اپنے نہیں لگ رہے تھے۔ میں تو ایک نرم و نازک شخصیت کا مالک ایک معصوم سا ادیب تھا۔ یہ میں کیا بن گیا ہوں اور لمحوں میں مجھے احساس ہوا کہ لازمی طور پر کتاب کے ان الفاظ کو میں نہیں دیکھ سکا تھا جس پر لڑکھڑا کر میں گرا تھا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح میں ان الفاظ کے ذریعے تاریخ کے کس دور میں پہنچ چکا تھا اور یہ ایک انتہائی دلچسپ لیکن بہت ہی سنسنی خیز تجربہ تھا میری زندگی کا۔

گھوڑے پر سوار ہونے میں مجھے کوئی وقت نہیں ہوئی۔ گھوڑے نے بہ آسانی ہم دونوں کا وزن سنبھال لیا تھا۔ میں نے گھوڑے کی لگامیں پکڑیں تو میرے پاس بیٹھے ہوئے شخص نے گھوڑے سے کچھ کہا اور گھوڑا مناسب رفتار سے چل پڑا۔ گویا وہ ہمیں کسی ایسی جگہ لے جا رہا تھا جہاں اس شخص کے لئے پناہ موجود تھی۔

میرے آگے بیٹھے ہوئے نوجوان آدمی کے جسم کے زخمی حصے لازمی طور پر درد کر رہے ہوں گے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اس نے کہا۔

”میرے مددگار، میرے ہمدرد، میرے دوست تمہارا نام کیا ہے۔“

”یولیس ......!“ میرے منہ سے آواز نکلی اور میں دنگ رہ گیا۔ میرے فرشتوں کو بھی اس نام کے معنی نہیں معلوم تھے۔ اور نا ہی یہ پتہ تھا مجھے کہ میں یولیس ہوں بھی یا نہیں لیکن جتنے اطمینان سے میرے منہ سے یہ لفظ نکلا تھا اس نے مجھے خود حیران کر دیا۔ زخمی نوجوان نے کہا۔ ”اور میرا نام نیولس ہے۔ تم بہت بہادر اور دلیر معلوم ہوتے ہو۔ بس میرے لئے بھی یہ شیر کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن درندے نے دھوکے سے حملہ کیا۔“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں تو ابھی حیرتوں کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ نجانے کون سی دنیا ہے نجانے کون سے لوگ ہیں یہ۔ نجانے یہ تاریخ کا کون سا حصہ ہے میں اس کتاب کے کسی دور میں آگرا ہوں۔ لیکن یہ دور کون سا ہے؟

بہرحال یہ سارے سوالات میرے ذہن میں تھے گھوڑا مناسب رفتار سے اپنا سفر طے کر رہا تھا۔ پھر ہم ایک ایسی بلندی پر پہنچے جہاں کی گہرائیوں میں ایک بہت ہی حسین شہر آباد تھا۔ بلندیوں سے ڈھلانوں کا سفر خطرناک نہیں تھا۔ بڑے معتدل ڈھلان تھے لیکن اختتام پر جو خوبصورت عمارتیں نظر آ رہی تھیں وہ قابل دید تھیں ہر طرف سبزہ اور پھول بکھرے ہوئے تھے۔

گھوڑا آہستہ آہستہ چلتا ہوا آخرکار ایک وسیع و عریض مکان کے سامنے پہنچا اور اس کے بڑے گیٹ سے اندر داخل ہو گیا۔ گھر ایک خاص طرز تعمیر کا نمونہ تھا۔ جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لیکن تعمیر کا یہ انداز بھی انتہائی حسین تھا وہاں ایک بوڑھی لیکن خوب صورت عورت جس کے نقوش بڑے کھڑے سے تھے اور ایک مرد نے ہمارا استقبال کیا۔ لیکن گھوڑے پر دو افراد اور نیولس کو زخمی دیکھ کر دونوں فکرمند ہو گئے اور تیزی سے آگے بڑھ کر گھوڑے کے نزدیک پہنچ گئے۔ معمر عورت نے کہا۔

”ارے یہ تمہارے جسم سے خون بہہ رہا ہے اوہ میرے خدا میرا بچہ زخمی ہے۔“ اس نے مرد سے کہا اور مرد آگے بڑھ کر نیولس کے پاس پہنچ گیا۔ نیولس نے کہا۔

”کوئی خاص بات نہیں ہے بس ایک شیر نے دھوکے سے حملہ کر دیا اور میں زخمی ہو گیا۔ لیکن میرے مہربان یولیس نے ایسے وقت میں میری مدد کی کہ میں آپ کو زندہ نظر آ رہا ہوں تو یہ بات اس کی مرہون منت ہے۔“

”آہ......آہ...... میں تمہیں سہارا دوں۔ نیچے

اترو۔"

"اب کیسے ہو۔" عمر رسیدہ شخص نے اسے سہارا دے کر نیچے اتارتے ہوئے کہا۔

"بہت بہتر ہوں۔ آپ پہلے میرے دوست سے ملیں اور اس کے لئے کسی مناسب قیام گاہ کا بندوبست کر دیں۔ اب میں اسے ابھی اپنے پاس سے جانے نہیں دوں گا۔"

"یقیناً، یقیناً...... اس نے ہم پر احسان کیا ہے اور میرے عزیز میں تم سے احسان مندی کے مخصوص الفاظ نہیں کہوں گا کیونکہ وہ کسی شخص کی محبت اور خلوص کو ہلکا کر دیتے ہیں۔ تم بھی میرے نیولس کی طرح سے ہو۔ آؤ یہ پورا گھر تمہارا ہے۔ جو جگہ تمہیں سکون کی نظر آئے اسے اپنے لئے منتخب کر لو۔" بوڑھے شخص کے لہجے میں بے پناہ اپنائیت اور خلوص تھا۔ میں اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور میں نے گردن ہلا دی۔ تب ہم اندر داخل ہو گئے۔ اسی وقت نوجوان نے آہستہ سے پوچھا۔

"تونیسا کہاں ہے۔؟"

"وہ اندر ہے۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"کیا حال ہے اس کا۔؟"

"حسب معمول۔ میں تو اس لڑکی سے خوف زدہ رہنے لگا ہوں۔"

"کیوں......؟"

"بس حسب معمول وہی احمقانہ باتیں، ہمیشہ شہنشاہ کی مخالفت کرتی ہے۔ مجھے تو خطرہ ہے وہ کسی دن مشکل میں نہ پھنس جائے اور ہم سب کو کسی مشکل میں نہ پھنسا دے۔"

"ہاں! یہ مناسب نہیں ہے بابا! وہ جانتی ہے کہ اس کا بھائی ملازم ہے اور بادشاہ کا معتمد خاص۔ مجھے آزمائش میں نہ ڈالا جائے تو بہتر ہے۔"

"بس کیا کہا جائے......"

"اسی وقت عقب سے ایک آواز ابھری اور میری نگاہیں اس طرف گھوم گئیں تب میں نے گھوم کر دیکھا ایک شعلہ سراپا دوشیزہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ حسین قد و قامت پر تمکنت چہرہ۔ چہرے کے نقوش نیولس سے ملتے جلتے تھے۔ لیکن لڑکی ہونے کے ناتے وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ البتہ اس کے چہرے کے تاثرات زیادہ خوش گوار نہیں تھے

"اوہو...... تونیسا دیکھو میں زخمی ہو گیا ہوں۔" نیولس نے کہا۔

"دیوتاؤں کا خدا تمہیں صحت دے لیکن میں سن چکی ہوں تم میری مخالفت میں بول رہے تھے اور ابھی تم نے اپنا ارادہ بھی بدل دیا ہے۔" لڑکی کے لہجے میں طنز تھا۔

"ہمارے مہمان یولیس سے ملو۔" نیولس نے پھر بات برابر کرنے کی کوشش کی اور لڑکی نے میری طرف دیکھ کر مخصوص انداز میں گردن جھکا دی۔

"آؤ تونیسا! مہمان کی خدمت کریں انہوں نے میری جان بچائی ہے۔"

"میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے بھائی کی مدد کی۔ لیکن نیولس تمہارے الفاظ نے مجھے بہت دل برداشتہ کیا ہے۔"

"تونیسا کیا مہمان کے سامنے ایسی گفتگو مناسب ہوتی ہے۔" نیولس کے لہجے میں آخر کار تلخی آ گئی۔

"میرا تذکرہ بھی شاید مہمان کے سامنے ہی ہوا تھا۔"

"گویا آج بھی تم اپنے ارادے پر اٹل ہو۔" نیولس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"فیصلے لمحوں میں نہیں کئے جاتے۔ نیولس، جو لوگ جذباتی فیصلے کرتے ہیں وہ مخلص نہیں ہوتے۔"

"تو پھر جاؤ پہاڑوں میں بھٹکتی پھرو۔ ان سرپھروں کو تلاش کرو جو نپوسکی کے باغی ہیں اور ان میں شامل ہو جاؤ۔"

"ہرگز نہیں میں پہاڑوں میں چھپ کر نہیں موقع ملنے پر سامنے سے وار کروں گی۔ ہاں اگر ان

باغیوں نے بھی میری مدد کی تو میں اپنی زندگی ان کے لئے وقف کردوں گی۔‘‘ لڑکی پر اعتماد لہجے میں بولی اور میں کان جھاڑنے لگا ایک لفظ جو سمجھ میں آرہا ہو۔

’’تم لوگوں میں تو ازلی بیر ہے تونیسا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارا بھائی زخمی ہے۔ بجائے اس کے کہ تم اس سے زخموں کی تفصیل پوچھو، لڑائی کرنے لگیں کیا یہ مناسب بات ہے۔‘‘ بوڑھی عورت نے کہا۔

’’مجھے افسوس ہے میں اپنے بھائی کو اپنی زندگی دے سکتی ہوں لیکن اپنے نظریات نہیں۔‘‘

’’تو اندر جاؤ...... چلو۔‘‘ بوڑھی نے کہا۔

’’میں اس بداخلاقی کے لئے معافی کی خواستگار ہوں۔‘‘ لڑکی نے میری طرف رخ کر کے کہا اور ایک بار پھر ہم سب اندر کی جانب چل پڑے۔

نیولس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اندر جا کر اس نے کسی قدر سرد لہجے میں کہا۔

’’ہمارے درمیان کون سا نظریاتی اختلاف ہے تونیسا۔‘‘

’’میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ تم نپوسکی کے باغیوں میں شامل ہوتے اور اس کی سرکوبی کے لئے کام کرتے اس کے برعکس تم اس کے وفاداروں میں سے ہو۔‘‘

’’آخر اس سے تمہیں کیا اختلاف ہے۔‘‘

’’وہی جو ہر محب وطن کو ہوسکتا ہے وہ جانور ہے جنگلوں میں سینہ کوبی کرنے والا ایک گوریلا اور تم اس جانور کے غلام ہو۔ کیا یہ انسانی پستی اس کی ذات کی توہین نہیں ہے کہ وہ ایک جانور کا تابع ہوگیا۔‘‘ لڑکی نے زہریلے لہجے میں کہا۔

’’لیکن وہ بہت بڑے خاندان کا شخص ہے۔ وہ اس تخت کا جائزہ حق دار ہے اور یونان کے قانون کے مطابق بارہا خود کو اس کا اہل ثابت کر چکا ہے۔‘‘

’’نہیں یہ ایک سازش ہے۔‘‘

’’کیوں آخر کیوں؟‘‘

’’اسے ایک شخص نے اپنے چھینے ہوئے وقار کی بحالی کے لئے کارگس دی ہے۔ وہ جنگ کرسکتا ہے سوچ نہیں سکتا، بول نہیں سکتا۔ اس کی آواز میں کوئی اور بولتا ہے۔‘‘

’’تم جانتی ہو تمہاری یہ معلومات ہمارے خاندان کی تباہی ہے۔‘‘

’’بس یہی بنیادی اختلاف ہے مجھے تم سے۔ میں چاہتی ہوں کہ انسان اگر برا بھی ہو تو اپنی برائیوں سے مخلص ہو۔ اچھا ہو تو ہر برائی کے خلاف آواز اٹھائے اس میں کوئی ایک صفت ہونی چاہئے۔ تمہاری طرح خاندان کی زندگی کے خوف سے حق گوئی سے انحراف نہیں۔‘‘ تونیسا نے کہا اور نیولس غصے سے تلملانے لگا۔

’’ٹھیک ہے وقت بتائے گا کہ تمہاری وجہ سے ہم لوگوں کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔‘‘

’’تم لوگوں نے بلاوجہ خود کو میرا محافظ سمجھ رکھا ہے۔ میں کسی کی پناہوں میں نہیں ہوں، خودمختار ہوں اور وقت کا انتظار کررہی ہوں۔‘‘

’’اگر یہ خیالات نپوسکی کو معلوم ہوجائیں۔؟‘‘

’’مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ میں منافقت کی زندگی نہیں بسر کرسکتی۔‘‘ لڑکی نے کہا اور اٹھ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ کمرے میں خاموشی ہوگئی سب کے چہرے دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ بوڑھی عورت اور مرد بھی کبھی خوف زدہ نگاہوں سے میری شکل دیکھ لیتے۔ تب میں نے کہا۔

’’آپ لوگ میری موجودگی کو محسوس نہ کریں۔ میں بس کیا ہوں اس کا آپ کو اندازہ نہیں ہوسکتا۔‘‘

’’نہیں نوجوان تم نے میرے بیٹے کی جان بچائی ہے۔ میں تمہارا احسان مند ہوں۔ میری بیٹی تونیسا کے دل میں نپوسکی کے لئے نفرت بیٹھ گئی ہے۔‘‘

’’اور یہ نفرت آخرکار ایک دن ہمارے خاندان کو تباہ کردے گی۔‘‘ نیولس نے کہا۔

’’میں کوشش کرتا ہوں کہ اسے باہر کے لوگوں میں نہ بیٹھنے دوں اور اس کے خیالات دوسروں تک نہ پہنچنے دوں۔ میں اس کے ذہن کو نہیں بدل سکتا۔‘‘

"ٹھیک ہے پھر تباہی کا انتظار کریں۔" نیولس نے کہا۔ پھر بولا۔

"کھانے کا وقت ہو گیا ہے، تم کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کر لو۔"

بہترین کھانا مجھے کھلایا گیا اور ایک جگہ میرے آرام کے لئے مخصوص کر دی گئی۔ ایک بار پھر میرے ذہن پر عجیب وغریب خیالات سوار ہونے لگے۔ اگر میں ان لوگوں کو بتاتا کہ بھائیو! میں پتہ نہیں ان سے کتنے بعد کی دنیا کا انسان ہوں اور میرا تمہاری اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تو یہ تک نہیں جانتا کہ تم لوگ کون ہو، اور تمہارا یہ کیا چکر چلا ہوا ہے۔ کورونی ویسے تو یہ سب کچھ میرے لئے انتہائی دلچسپ ہے ایک عجیب وغریب کہانی میری معلومات میں شامل ہو گئی ہے اور مجھے اچھی خاصی دلچسپی کا احساس ہو رہا ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں میرا ذہن کچھ الجھا الجھا سا ہے۔

بہر حال، بہت دیر تک میں سوچتا رہا اور اس کے بعد میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے نیند آ گئی تھی۔ نجانے کب تک میں سوتا رہا۔ اس کے بعد جاگا منہ ہاتھ دھویا، گزرے ہوئے ماحول میں مجھے وہ سب کچھ یاد آ گیا جو مجھے مہابھارت کے دور میں راج لیکھک کے نام سے پکارا گیا تھا اور اب...... اب میں یولیسیس تھا۔ نام سے تو یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ میں یونان میں ظہور لیکن جب ان لوگوں نے یونان کا نام لیا تب مجھے احساس ہوا کہ یہ یونان ہے۔ میرا دل چاہا کہ میں معلومات حاصل کروں کہ میں کون سی جگہ ہوں اور یونان کی تاریخ کے کس دور میں ہوں۔

بہر طور اچانک ہی لڑکی نے مجھ سے سوال کر لیا۔

"میری بات سنو! تمہارا نام یولیسیس ہے نا! تم نے کبھی نیوسکی کو دیکھا ہے۔"

"نہیں...... کبھی نہیں۔" میں نے پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔

"کبھی نہیں...... تعجب کی بات ہے۔ کیا تم نے تقدیروں کا کوئی ایسا مالک دیکھا ہے جس کے بدن پر لمبے لمبے بال ہوں اور وہ بول بھی نہ سکے۔"

"نہیں میں نے نہیں دیکھا۔"

"تو پھر کارگس میں تم ایک ایسے شخص کو ضرور دیکھو گے اور تم یہ دیکھ کر بہت خوش ہو گے کہ وہ تمہارا شہنشاہ ہے۔"

"اور یولیسیس تمہارا واسطہ کبھی پاگل عورت سے پڑا ہے۔" نیولس نے...... تلملائے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں خاموشی سے اس کی صورت دیکھنے لگا تو وہ خود ہی بولا۔

"خوش نصیب ہو میرے دوست! اگر تم عورتوں کے درمیان رہتے تو اس کی حماقتیں تم سے آدمی صلاحیتیں چھین لیتیں۔ یہ وہ مخلوق ہے جو سوچتی کم اور بولتی زیادہ ہے۔ اب میری بہن کو ہی لے لو جسے خوب صورت شکل تو مل گئی ہے لیکن عقل اسے چھو کر بھی نہیں گئی اور وہ صرف طنزیہ لہجے میں گفتگو کرنا جانتی ہے۔"

"اور کارگس کے مرد صرف غلامی کے قائل ہیں۔" وہ نفرت سے بولی۔

"میں تمہیں آخری بار اطلاع دے رہا ہوں تونیسا کہ خود کو سنبھال لو ورنہ میں ایک سرکاری فرض شناس کی حیثیت سے تمہیں گرفتار کر کے شہنشاہ کے سامنے پیش کر دوں گا اور اس کے بعد ذمہ دار نہ ہوں گا۔"

"دل کی گہرائیوں سے میں اس بات کی خواہش مند ہوں۔ اس طرح ممکن ہے یہاں کے بزدل بھائیوں کی غیرت جاگ اٹھے۔"

"کیا مطلب ہوا اس بات کا۔" نیولس نے پوچھا۔

"شہنشاہ نیوسکی کا معتمد خاص یہ بات نہیں جانتا کہ شہنشاہ کو عورتوں سے بڑی رغبت ہے اور میری صورت کافی دلکش ہے۔ شاہ مجھے سزا تو نہیں دے گا لیکن میرے سفید بدن کی سرخ لکیریں تیرے لئے کافی دلکش ہوں گی۔"

''بات حد سے بڑھ رہی ہے تو نیسا۔ تو اتنی بے باک ہوگئی ہے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرا خیال ہے اب تجھے ہمیشہ کے لئے اس سلسلے میں زبان بند کر لینی چاہئے۔ آئندہ میں اس بارے میں کچھ نہ سنوں۔'' اس بار بوڑھے شخص نے دخل دیا۔

''صرف ایک بات کہہ دو بابا میں خاموش ہو جاؤں گی۔''

''کیا......؟'' بوڑھا بولا۔

''میں جھوٹ بول رہی ہوں۔''

''جھوٹ ہو یا سچ، تجھے کون اس کے پاس لے جا رہا ہے۔''

''لیکن میں جانا چاہتی ہوں۔''

''آخر کیوں......؟''

''اس لئے کہ میری سرزمین کی بہت سی لڑکیوں کے ساتھ یہی وحشیانہ سلوک ہوا ہے۔ کیا صرف اس لئے کہ ان کا کوئی محافظ باپ یا بھائی نہیں ہے۔''

''ہوتا بھی تو کیا کر لیتا۔'' بوڑھے کے لہجے میں بے بسی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس لڑکی کے سوالوں نے ذہنی اذیت پہنچائی ہے۔

''اگر یہ بات ہے بابا تو اس سرزمین کی ہر لڑکی اپنا تحفظ کھو بیٹھی ہے۔ میرا خیال ہے کار گس میں رشتوں کا خاتمہ ہو جانا چاہئے۔ نا کوئی کسی کا باپ نا کوئی کسی کا بھائی۔ یہ رشتے تحفظ کی غیرت کے رشتے ہوتے ہیں اور اگر یہ بات نہ ہو تو پھر ہر لڑکی کو آزادی مل جانی چاہئے۔ چنانچہ میں جو کہتی ہوں وہ کرتی ہوں، مجھے کرنے دیا جائے سوچ لیا جائے کہ شہنشاہ نے مجھے دیکھ لیا ہے اور آپ لوگ بے بس ہیں۔''

''تو نیسا۔'' بوڑھا شخص چیخ پڑا۔

''مجھے غلط ثابت کر دیں بابا صاحب! آپ نہیں جانتے کہ اپلاسا کے پورے بدن پر خراشیں تھیں اور ان خراشوں میں خون جما ہوا تھا۔ اس کے بدن سے جگہ جگہ بھورے بال چپکے ہوئے تھے۔''

''تو اسے بھول نہیں سکتی۔''

''بھول جاتی لیکن یہ بات ذہن سے نہیں نکلتی کہ میرا بھائی اس کا شریک کار ہے۔''

''ان معاملوں میں تو میں اس کا شریک نہیں ہوں۔'' نیولس چیخ اٹھا۔

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی اس کی درندگی کے مختلف شعبے ہیں ان میں سے ایک شعبہ تمہارے پاس ہے۔''

''میں کیا کروں...... میں کیا کروں'' نیولس غرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''بتاؤ میں کیا کروں۔؟'' اس نے سرخ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھا اور لڑکی اپنی جگہ سے اٹھ کر سامنے جا بیٹھی اس نے اپنی گردن اونچی کر دی اور آنکھیں بند کر کے بولی۔

''تمہارے پاس جو خنجر ہے اس کی دھار بہت تیز ہے اسے نکال کر میری گردن پر پھیر دو جن لڑکیوں کے باپ اور بھائی زندہ ہیں انہیں اپنی بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ یہی سلوک کرنا چاہیئے۔ اسی میں ان کی نجات ہے ورنہ پھر بیٹیاں کیا کریں مجھے جواب دو میرے دلیر بھائی ان بہنوں اور بیٹیوں کو کیا کرنا چاہئے۔''

''تیرا بھائی کیا کر سکتا ہے بول تیرا بھائی کیا کر سکتا ہے، مجھے جواب دے۔'' نیولس جذباتی ہو گیا۔

''ہم لوگوں میں اتنے بزدل لوگ بھی ہیں جو اس سے اتنا ڈرتے ہیں۔''

''جتنا چاہو ذلیل کر لو لیکن مجھے بتاؤ میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''کیوں کر رہے ہو یہ سوال۔؟''

''میں تم سے تعاون کرنا چاہتا ہوں، میں زخمی ہو گیا ہوں۔ میں کہہ دوں گا کہ اب میں اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر ہوں۔''

''اوہ...... اوہ...... تو کیا تم...... تو کیا تم......''

اچانک ہی تو نیسا کی آنکھوں میں خوشی کی چمک لہرا گئی۔ وہ خوشی سے مسکرا پڑی۔

(جاری ہے)

نحوست

ساجدہ راجہ۔ ہنڈواں سرگودھا

بے ہوشی کے بعد جب خوبرو حسینہ کی آنکھ کھلی تو وہ لرزہ براندام ہوگئی اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور پورے وجود میں لہو منجمد ہونے لگا اور پھر اسے ایک ناقابل یقین حقیقت سے گزرنا پڑا جس کی مثال نہیں ملتی۔

خراماں خراماں چاہت وخلوص کی دل ودماغ کو مبہوت کرتی اپنی نوعیت کی دل فریفتہ حقیقت

وہ دونوں حیران وپریشان نظروں سے اس علاقے کو دیکھ رہے تھے جو نہایت عجیب تھا حالانکہ سارا کچھ بظاہر نارمل تھا لیکن بظاہر...... درحقیقت وہ واقعی عجیب تھا وہاں جانور بھی موجود تھے درخت پودے پہاڑ حتیٰ کہ انسان بھی لیکن کچھ تو الگ تھا جو اس علاقے کو الگ بنا رہا تھا۔

کچھ پردے میں تھا جو اس علاقے کو صحیح طور سے ظاہر نہیں ہونے دے رہا تھا عجیب طرح کی سنسناہٹ دوڑ جاتی تھی وہاں قدم رکھتے ہی...... ہوا بھی چل رہی تھی لیکن عجیب روبوٹ کے سے انداز میں...... جانور ایسے جیسے چابی بھرے ہوئے ہوں...... درخت یوں ہوا میں جھوم رہے تھے جیسے کوئی تنا پکڑ کر ہلا رہا ہو۔

غرض ہر چیز الگ سی نہ ہونے کے باوجود الگ سی دکھتی تھی۔ جولی پھٹی پھٹی آنکھوں سے آس پاس دیکھ رہی تھی جبکہ جیکی اتنا حیران نہیں تھا یا شاید اس نے غور نہیں کیا تھا یا پھر جولی جیسا نہیں تھا۔

”جیکی ہم واپس لوٹ چلتے ہیں۔“

”پاگل ہوگئی ہو کیا اتنا دور آئے ہیں تو اب یوں تو واپس نہیں جائیں گے۔“

جولی کے چہرے پر اداسی پھیل گئی کیونکہ جیکی کی

ہاں ناں میں نہیں بدلتی تھی۔

''چلو اب آگے۔'' وہ دونوں آگے بڑھے۔ ہوا بے چین ہو کر درختوں سے سر پٹخنے لگی جیسے انہیں روک دینا چاہتی ہو۔

جانور عجیب سی آوازیں نکالنے لگے جیسے انہیں آنے والے خطرے سے آگاہ کررہے ہوں۔

اور درخت یوں تیزی سے جھومنے لگے جیسے کسی مصیبت کو آتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ جولی ہراساں ہوگئی کھسک کر مزید جیکی کے قریب ہوئی۔ ایک لمحے کو جیکی بھی پریشان ہوا پھر جولی کی خوف زدہ حالت دیکھ کر دل کو مضبوط کرلیا۔

''کم آن جولی...... بچوں کی طرح بی ہیومت کرو۔ ایسے علاقوں میں آنے کے لئے اس وقت تم ہی پرجوش تھی اب ڈرو نہیں۔ میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔'' اور جولی کے چہرے پر محبت کی لامتناہی چمک پھیل گئی۔ یہ محبت بھی عجیب شے ہے موت کے منہ میں کھڑے شخص کو بھی مسکرانے پر مجبور کردیتی ہے ناامید شخص کو امید کے نئے سرے تھمادیتی ہے۔

☆......☆......☆

''مکونا ...... کچھ بات بتانی ہے آپ کو۔'' مودب کھڑے خدمت گار نے ایسے آدمی کو مخاطب کیا جو چہرے مہرے سے سردار ٹائپ لگ رہا تھا۔

''بول......'' بارعب لیکن مشینی آواز گونجی۔

''دو انسان ایک مرد اور ایک عورت علاقے میں داخل ہوتے دیکھے گئے ہیں۔'' یہ سنتے ہی مکونا اچھل پڑا۔ جوش اور خوشی سے اس کا پتھریلا چہرہ تمتمانے لگا۔

''عورت بھی ہے۔؟ کیا دھوکہ تو نہیں ہوا تم لوگوں کو؟......''

''نہیں مکونا...... دھوکے کا سوال ہی نہیں۔''

مکونا مزید خوش ہوگیا۔ ''انہیں کوئی مشکل نہیں ہونی چاہئے راستے کی ہر مشکل رکاوٹ دور کردو اور خاص کر لڑکی کو بالکل خوف محسوس نہیں ہونا چاہئے۔''

''جو حکم مکونا۔ حکم کی تعمیل ہوگی۔'' یہ کہہ کر خادم ادب سے مڑ گیا۔

مکونا جوش وجذبات سے بھرپور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اسے لڑکی کی بہت فکر تھی کہ وہ کب اس کے پاس پہنچے گی لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس لڑکی کو ان تک پہنچنے کے لئے مزید کچھ دن درکار ہوں گے وہ انسان نہیں تھے لیکن قریب قریب انسان جیسے ہی تھے ان کا مشینی انداز انہیں انسانوں سے الگ بناتا تھا۔

ان کے بچے جب پیدا ہوتے تو دیکھتے ہی رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوتے، بندر نما شکل دیکھنے والے کراہیت محسوس کرتے لیکن وہ سب اس کے عادی ہوچکے تھے لیکن اس سے نجات چاہتے تھے اور اس کا ایک حل تھا۔ کوئی آدم زادی جو خود ان کے علاقے میں داخل ہوتی۔

جولی کا خوف خاصی حد تک کم ہوگیا تھا یا پھر اس نے مجبوراً دل کو مضبوط کرلیا۔ لیکن جب دو دن گزرنے کے بعد بھی انہیں کسی آبادی کے آثار دکھائی نہ دیئے تو وہ تھوڑے سے بد دل ہونے لگے۔

اب تو جیکی بھی بے زار دکھائی دینے لگا تھا لیکن اب واپسی ممکن نہیں تھی کیونکہ ایسا کرنا جیکی کو اپنی مردانگی کے خلاف لگ رہا تھا وہ کسی جنگل میں موجود نہیں تھے کہ انہیں راستہ بھولنے کا خدشہ ہوتا۔ ہاں درخت کہیں کہیں بہت گھنے تھے جھاڑیاں بھی پاؤں میں الجھتی۔ کانٹے عجیب سے انداز میں چبھتے لیکن انہیں آگے تو بڑھنا ہی تھا۔

پھر اچانک جیسے سب کچھ آسان ہوتا چلا گیا انہیں راستے کی ہر رکاوٹ دور ہوتی محسوس ہونے لگی خاص کر جولی بہت تازہ دم محسوس کرنے لگی خود کو......

اس نے پیار سے اپنے شوہر کو دیکھا جو قریب آتی آبادی کو دیکھ کر پرجوش ہو رہا تھا لیکن جولی کو نہ جانے کیوں اس کے جوش کے پیچھے ایک انجانا خوف چھپا دکھائی دیا۔

جولی کا دل عجیب سے انداز میں دھڑک اٹھا۔ وہ جو پہلے خوش ہونے لگی تھی ایک دم ٹھنڈی ہوگئی وہ چہرہ پڑھنے میں ماہر تھی۔ جیکی نہ جانے کیوں پرجوش ہونے کے باوجود بے چین سا لگ رہا تھا۔

''کوئی پریشانی جیکی......؟''

''نہیں جولی۔ میں تو خوش ہو رہا ہوں کہ چلو کوئی آبادی تو نظر آئی ورنہ تو چل چل کر پاؤں بھی شل ہو گئے ہیں۔''

اس نے جولی سے آنکھیں چرائیں کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جولی اس کے اندر تک جھانکنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور یہ کہ وہ اس کے ہر جھوٹ کو اچھی طرح پہچان لیتی ہے۔

جولی خاموش ہو گئی۔ وہ آگے بڑھنے لگے اور پھر ٹھٹک کر رک گئے۔ وجہ وہاں موجود انسان تھے یا شاید انسان ٹائپ کوئی اور مخلوق، جب وہ آبادی کے قریب پہنچے تو وہاں موجود لوگوں نے عجیب مشینی انداز میں گردن گھما کر انہیں دیکھا ان کے ہونٹوں پر، پراسراری مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

جولی نے جھرجھری لی۔ جیکی کا دل ایک لمحے کو کانپا۔ پھر وہ لوگ اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔

''یہ کس طرح کے لوگ ہیں۔؟''

''ہاں جیکی۔ میں تو ایک لمحے کو ڈر سی گئی انہیں دیکھ کر۔''

''واقعی کچھ عجیب سے ہیں خیر چلو آگے۔'' جولی نے بھی قدم آگے بڑھا دیئے ان کے قریب پہنچ کر انہوں نے ان کو مخاطب کیا۔ لیکن وہ اپنے کام میں مگن رہے ہاں ایک نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں آگے کی راہ دکھائی۔

جیکی کندھے اچکا کر رہ گیا اور جولی کے ساتھ آبادی کے اندر داخل ہو گیا۔ ''کیا وقت ہوا ہوگا جیکی......؟'' جولی نے پوچھا۔

جیکی نے کلائی پر بندھی رسٹ واچ دیکھی پھر اس کی آنکھوں میں حیرت پھیل گئی۔ وہ الجھن زدہ دکھائی دینے لگا۔

''کیا ہوا جیکی۔؟'' جولی نے پھر پوچھا۔

''یار میری واچ بند ہو چکی ہے حالانکہ ایسا ناممکن ہے تم جانتی ہو کہ یہ ایسے بند نہیں ہو سکتی اتنی قیمتی ہے یہ۔؟'' جیکی کے انداز میں ایک نیا دکھ گھل گیا اسے یہ گھڑی بہت پیاری تھی اور ایک دوست کا دیا ہوا نہایت قیمتی تحفہ۔ جولی بھی حیران ہو گئی۔

''جیکی ہو سکتا ہے یہ کچھ وقت کے لئے چلنا رک گئی ہو پھر ٹھیک ہو جائے گی تم پریشان مت ہو۔'' جیکی نے اثبات میں سر ہلایا اور آگے چل پڑا پھر انہیں احساس ہی نہ ہوا کہ وہ ایک عجیب و غریب گھر میں داخل ہو چکے ہیں۔ جولی نے آس پاس نگاہ دوڑائی اور حیران رہ گئی۔

''یہ ہم کہاں آ چکے ہیں۔؟''

جیکی چونک پڑا واقعی انہیں اس گھر میں داخل ہونے کا قطعی احساس نہ ہوا تھا وہ بہت بڑا صحن تھا دھول مٹی سے مبرا ہموار پتھروں سے بنا ہوا...... بستر ے کی رمق بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ عمارت عجب وحشت میں ڈوبی دکھائی دے رہی تھی۔

ان کے دل یکدم وحشت میں گھر گئے۔

''جیکی میرا دل گھبرا رہا ہے۔'' جولی بولی۔

''حوصلہ کرو یار کیا ہو گیا ہے۔ ٹھہرو میں کسی کو آواز دیتا ہوں۔'' اور پھر جولی کے بولنے کا انتظار کیے بغیر اونچی آواز میں کسی کو پکارنے لگا۔ اس کی آواز گھر کے در و دیوار سے ٹکرا کر بھیانک معلوم ہو رہی تھی۔

''بس کرو جیکی ...... تم تو اور زیادہ خوف زدہ کر رہے ہو۔'' جیکی چپ ہوا تو بھاری چرچراہٹ سے کسی دروازے کے کھلنے کی آواز آئی۔ وہ چونک کر متوجہ ہوئے دل تھا کہ سینہ پھاڑ کے باہر آنے کو تھا سہ پہر ڈھلنے کو تھی فضا میں سوگواریت سی رچی تھی اور اس سے بھی زیادہ بے چینی بھر دینے والا خوف۔

جولی کو اس سب کا تجربہ پہلی بار ہو رہا تھا اور نہایت خوف زدہ کر دینے والا بھی۔

''ایک بار واپس گھر چلی جاؤں تو پھر ایسی جگہوں پر آنے کا خواب میں بھی نہیں سوچوں گی۔'' جولی نے دل میں دور سے کہا۔

وہ جو بھی تھا دروازہ کھول کر نہایت جوش سے ان تک آیا۔ اس کا انداز اس قدر ڈرا دینے والا تھا کہ جولی کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ جیکی بھی لرز گیا جولی جیکی کے بازو سے چپک گئی۔ آنے والا پرجوش ہونے کے ...

میں بہت بدہیت دکھائی دے رہا تھا۔ وہ خوش تھا اس کا اندازہ ان دونوں کو ہوگیا لیکن وہ کیوں اتنا خوش تھا اس کا اندازہ آنے والے وقت میں جولی کو ہوگیا۔

☆......☆......☆

وہ آدمی جس کا نام مکونا تھا اس کے ساتھ دونوں اندر آ گئے کمرہ سادہ لیکن اچھی طرز کا تھا اس وقت مکان میں کوئی ذی نفس موجود نہیں تھا۔ مکونا نے انہیں اپنا نام بتا دیا تھا اور انہیں اسی نام سے پکارنے کی تلقین کی تھی انہیں بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔

مکونا کے پرجوش انداز نے ان کا خوف خاصی حد تک کم کر دیا تھا لیکن وہ مکونا کی خوشی سمجھنے سے قاصر تھے۔

انہیں کھانا پیش کیا گیا۔ وہی غذا جو وہ عام زندگی میں کھاتے تھے اس لئے انہوں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا۔ اتنے دن پیدل چلنے کی وجہ سے تھکن شدت اختیار کر چکی تھی سو وہ کھانا کھاتے ہی لیٹ گئے اور جلد ہی نیند کی وادیوں میں اتر گئے۔

ٹوٹ کر نیند آنے کی وجہ سے جب وہ بیدار ہوئے تو خود کو کافی تروتازہ محسوس کر رہے تھے سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا تبھی انہیں معلوم ہوگیا کہ وہ پوری رات اور آدھا دن سوئے رہے تھے۔ تبھی ہلکے پھلکے تھے۔

ناشتہ آ چکا تھا خوب ڈٹ کر کیا۔ پھر باہر نکلے باہر وہی فضا مکدر تھی نہ جانے کیوں انہیں عجیب محسوس ہو رہا تھا ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ وہاں سے بھاگ جائیں لیکن اب بھاگنے کا فائدہ بھی کیا تھا جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو کر ہی رہنا تھا۔

”میرے خیال میں ہمیں باہر نکل کر اس علاقے کو اچھی طرح دیکھنا چاہئے۔“ جیکی بولا۔

جولی نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ دونوں اس گھر سے باہر نکل آئے۔ مکونا کا کچھ پتہ نہیں تھا اور کوئی بھی انسان انہیں وہاں نظر نہیں آ رہا تھا حالانکہ انہیں پتہ نہیں تھا کہ وہ غیر انسانی مخلوق کے درمیان ہیں اگر انہیں پتہ چل جاتا تو شاید خوف سے ان کی روح فنا ہو جاتی۔ لاعلمی بھی کبھی کبھار کتنی بڑی نعمت بن جاتی ہے نا.....؟

سارے گھر عجیب وغریب ساخت کے تھے اور اس طرح تعمیر کئے گئے تھے کہ انہیں دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی تھی کہ یہ انسان کے ہاتھوں کی تعمیر کس طرح ہوسکتی ہے۔ حالانکہ ان میں وہ لوگ رہائش پذیر تھے اور ان میں بسی ویرانی دل ہولاتی تھی لیکن اس کے باوجود ان کی طرز تعمیر حیرانگی میں مبتلا کر دیتی تھی۔

وہ رہائشی علاقے سے باہر نکلے باہر سرسبز علاقہ پھیلا ہوا تھا اتنا سبزہ کہ وہ دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

”یہ اتنی خوشحالی کے باوجود ویرانی کیوں محسوس ہو رہی ہے۔“

جولی کے سوال پر جیکی محض کندھے اچکا کر رہ گیا کیونکہ اس سب کا بہرحال اسے بھی نہیں پتہ تھا۔

”دیکھو جیکی یہ کس طرح کی فصلیں ہیں۔ بالکل گندم کی طرح لیکن یہ اس سے کتنی الگ سی دکھتی ہیں۔“

جیکی بھی غور سے انہی فصلوں کو دیکھ رہا تھا۔ اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”آؤ جیکی چھاؤں میں بیٹھتے ہیں مجھے گرمی محسوس ہو رہی ہے۔“ وہ دونوں ایک ہرے بھرے گھنے درخت کے نیچے آ بیٹھے۔

فرحت بخش ٹھنڈی ہوا ان کو پرسکون کرنے لگی لیکن اس کے ساتھ کچھ اور احساس بھی تھا جس کی انہیں سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ رہی ہیں انہوں نے کچھ توجہ نہ دی پھر انہیں یوں محسوس ہوا جیسے خون کی روانی میں تیزی آ گئی ہو۔ ان کے جسم میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ سی شروع ہوگئی۔ انہوں نے وحشت زدہ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر آس پاس نگاہ دوڑائی کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا لیکن ان کے جسم......؟

”جیکی یہ کیا ہے......؟“

جیکی خود حیران تھا۔

کپکپاہٹ اب تکلیف میں بدل رہی تھی ایسا

لگ رہا تھا جیسے کوئی ان کے جسم کو کھینچ رہا ہو۔ جیسے ان کی کھال جسم سے الگ ہونے کو ہو۔

''جولی اٹھو...... بھاگو...... اس درخت میں کچھ ہے۔'' جولی کو اٹھنے میں شدید مشکل ہورہی تھی جیکی خود بھی اذیت میں تھا گرتا پڑتا جولی تک آیا اس کے بازو کو پکڑا اور اٹھنے میں مدد دینے لگا۔

''نہیں جیکی میں اٹھ نہیں پاؤں گی۔ میں گھسٹتے ہوئے جانے کی کوشش کرتی ہوں تم چلو۔''

لڑکھڑاتا...... گرتا پڑتا جیکی اس درخت کی چھاؤں سے نکلا اور گھسٹتی ہوئی جولی بمشکل اس تک پہنچ پائی اور پھر ایک حیرانگی بھری بات ہوئی جیسے ہی وہ اس درخت کی چھاؤں سے نکلے ان کی تکلیف یوں ختم ہوئی جیسے انہیں کچھ تھا ہی نہیں۔

''یہ...... یہ سب کیا تھا جیکی......؟'' جولی نے پوچھا۔

جیکی نے ایک نظر خوف زدہ جولی کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا ایک لمحہ پہلے ہونے والا واقعہ انہیں خواب سا لگا لیکن وہ خواب نہیں حقیقت تھا۔

''جولی تم اتنی پیلی کیوں ہورہی ہو......؟''

جولی نے چہرے پر ہاتھ پھیرا گویا اس طرح اسے رنگت دکھائی دے جائے گی اور پھر اس کی نظر جیکی کے چہرے کی طرف اٹھی۔

''جیکی تم بھی۔'' اور جیکی نے بھی جلدی سے چہرے پر ہاتھ پھیرا وہی جولی کی طرح حرکت...... ان کی نظر ایک دوسرے سے ٹکرائی اور وہ زور سے ہنس پڑے۔ اس علاقے میں داخل ہونے کے بعد یہ پہلی ہنسی تھی جس نے ان کے لبوں کو چھوا تھا۔ وہ دونوں کمزوری محسوس کررہے تھے۔ ''چلو واپس چلتے ہیں۔'' وہ دونوں مکونا کے گھر کی طرف چل پڑے اگر وہ پیچھے مڑ کر دیکھ لیتے تو پتھر کے ہوجاتے۔

درخت کی نچلی شاخوں سے خون کے چھوٹے چھوٹے قطرے نیچے گررہے تھے اور تیزی سے زمین میں جذب ہورہے تھے۔

☆......☆......☆

مکونا ان کے ہی انتظار میں تھا ان کے پیلے چہروں کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا۔

''تم لوگ کہاں گئے تھے۔؟''

جواباً جیکی نے اسے ساری بات بتادی مکونا کے چہرے پر شدید پریشانی دکھائی دینے لگی پھر اس نے ایک بوتل اٹھائی اور ان کی طرف بڑھائی اور ان کو آدھی آدھی پینے کو کہا۔

وہ کوئی کڑوا سا سیال تھا لیکن اس کو پیتے ہی وہ خود کو مکمل تندرست و توانا محسوس کرنے لگے، تھوڑی دیر پہلے پیدا ہونے والی کمزوری رفع ہوگئی اور بار بار اصرار کے باوجود بھی مکونا نے انہیں اس درخت کے متعلق کچھ نہ بتایا۔

☆......☆......☆

رات کے کسی پہر جولی کی آنکھ کھلی۔ جیکی اس کے قریب نہیں تھا وہ گھبرا کے جیکی کو آوازیں دینے لگی لیکن جیکی کی بجائے جب مکونا اس کے پاس آیا تو اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا۔

''جیکی کہاں ہے۔؟'' اس نے اصرار کیا اور گھبرا کر پوچھا۔

''وہ بالکل ٹھیک ہے۔'' مکونا کے جواب سے جولی کو تسلی نہ ہوئی

''مجھے جیکی کے پاس جانا ہے۔'' وہ رونے لگی۔

مکونا اسے ساتھ لے کر چل پڑا۔ ایک تنگ کمرے میں جیکی بے ہوش پڑا تھا۔

جولی دوڑ کر اس کے پاس جانے لگی تو مکونا نے اس کا راستہ روک لیا۔ ''وہ بے ہوش ہے لیکن بالکل ٹھیک ہے۔''

''جیکی کو ہوش میں لاؤ خداوند کے لئے۔'' جولی ہچکیوں سے رورہی تھی۔

''دیکھو فکر مت کرو اسے کچھ نہیں ہوگا اس کے لئے ایک شرط ہے۔'' جولی نے دھڑکتے دل سے مکونا کی طرف دیکھا۔

''کیا شرط ہے۔؟''

''میری بات غور سے سنو۔ ہم انسان نہیں ہیں

لیکن ہم میں بہت سی صفات انسانوں والی ہیں۔'' یہ سن کر جولی کی آنکھیں فرط خوف سے پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔

''دیکھو خوف زدہ بالکل بھی مت ہو، ہم انسانوں کو نقصان بالکل بھی نہیں پہنچاتے، تم نے دیکھا ہم بالکل انسانوں جیسے دکھتے ہیں لیکن ہمارا ایک مسئلہ ہے ہمارے بچے جب پیدا ہوتے ہیں تو وہ کسی نہ کسی جانور کی شکل میں ہوتے ہیں آہستہ آہستہ بڑا ہونے کے بعد وہ اس صورت میں آتے ہیں جیسا اب میں ہوں ایسا نہ جانے کیوں اور کب سے ہے لیکن اس کا ایک حل ہے اور وہ یہ کہ۔

کوئی آدم زادی اپنی خوشی سے ہمارے اس علاقے کے سردار کا بچہ جنے۔ اس کے بعد اس نحوست کا سایہ خود بخود ہم پر سے ختم ہو جائے گا اور ہمارے بچے بالکل نارمل پیدا ہوں گے اب چونکہ اس علاقے کا سردار میں ہوں اور تم لوگ خود اس علاقے میں آئے ہو تو اب مجھے لگتا ہے کہ اس شرط کے پورا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔

تم کو سب سمجھ آ گئی ہے تو اب تم کیا کہتی ہو۔؟'' مکونا کی سوالیہ نظریں جولی کے ساکت چہرے کی طرف اٹھیں۔

''نہیں..... بالکل نہیں..... میں ہرگز تمہارا بچہ پیدا نہیں کروں گی بے شک مجھے قتل کر دو، میں اپنے شوہر سے بے حد محبت کرتی ہوں میں ایسا نہیں کروں گی۔''

اس کی ہذیانی آواز نے مکونا پر کچھ اثر نہیں کیا۔

''اگر شوہر سے محبت ہے تو اس کی زندگی بچانے کے لئے تمہیں راضی خوشی یہ کام کرنا ہوگا ورنہ اس کی بھیانک موت تمہارے لئے یقیناً ناقابل برداشت ہوگی۔''

جولی پاگلوں کی مانند دکھنے لگی اپنے محبوب شوہر جس سے شادی کو محض تین ماہ ہی ہوئے تھے اس کی موت جولی کی اپنی موت تھی۔

مکونا بولا۔ ''اگر شوہر کو پتہ لگنے کی بات ہے تو..... دیکھو تمہارے شوہر کو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ وہ بے ہوش ہے اور اس کی بے ہوشی ٹھیک اسی وقت ٹوٹے گی جب تم اس بچے کو پیدا کرو گی اور پھر اپنے شوہر کے ساتھ واپس چلی جانا، اسے معلوم بھی نہیں ہوگا کہ وہ نو ماہ بے ہوش رہا ہے۔ باقی تمہارا کام کہ اسے کیا بتانا ہے اور کیا نہیں۔ اگر تمہیں یہ سب قبول ہے تو ٹھیک ہے ورنہ تمہارا پیارا شوہر اسی بے ہوشی میں مر جائے گا۔''

مکونا کی بھیانک آواز جولی کو پاگل کر دینے کو کافی تھی لیکن وہ بے بس تھی اگر اپنی مرضی سے یہ کام نہ کرتی تو اس کا شوہر موت کے گھاٹ اتر جاتا جو اسے اپنی زندگی سے بھی پیارا تھا۔

وہ رات اس کی زندگی کی تلخ ترین رات تھی جب ایک غیر انسانی مخلوق مکونا اس کے قریب آیا۔

نو ماہ گزر گئے۔ جولی نے مکونا کے بچے کو جنم دیا پورا قبیلہ خوش تھا اس علاقے میں جشن کا سا سماں تھا کیونکہ انسانی بطن سے پیدا ہونے والے بچے کی وجہ سے ان پر سے نحوست کا سایہ ختم ہو گیا تھا۔ مکونا کا بچہ پیدا ہونے کے بعد ہی ایک اور بچہ پیدا ہوا جو بالکل نارمل حالت میں تھا۔ وہ لوگ یا غیر انسانی مخلوق خوشی سے پاگل تھی اور بچے کو ہاتھوں پر اٹھائے پھرتی تھی۔

جولی نے ایک نظر بھی اس بچے کو نہیں دیکھا اسے ڈر تھا کہ بچے کو دیکھ کر اس کی ممتا بیدار نہ ہو جائے۔

جیکی ہوش میں آ گیا۔ جولی نڈھال سی اس کے پاس موجود تھی جیکی سے اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیا۔

اسی دن انہوں نے واپسی کی تیاری شروع کر دی۔ مکونا نے جولی کا شکریہ ادا کیا اور ایک تھیلی اس کے حوالے کی جو جواہرات سے بھری ہوئی تھی جولی کا چہرہ سپاٹ ہی رہا۔

مکونا نہ جانے کیوں اس کے جانے کا سن کر اداس سا ہو گیا اور پھر ان کو رخصت کر کے اپنے قبیلے میں واپس پلٹ گیا۔

جیکی نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھا جو ٹائم کے ساتھ نو ماہ آگے کا وقت بتا رہی تھی۔ اس نے حیرت سے جولی کو دیکھا جو سپاٹ چہرے کے ساتھ نفی میں سر ہلا گئی اور آگے قدم بڑھا دیئے۔

خونی مسیحا

سید محمود حسن۔حیدرآباد

اندھیرا پھیلتے ہی لاؤڈ اسپیکر پر قرآنی آیات کی آوازیں سنائی دینے لگیں کہ اتنے میں کلینک میں موجود سارے لوگ ڈاکٹر سمیت بے چین و بے قرار ہوگئے اور پھر دلخراش منظر رونما ہوا۔

خوفناک، حیرتناک، دہشت ناک، حیرت انگیز، تحیر انگیز اور دلوں پر خوف کا سکہ بیٹھاتی کہانی

احسن آباد ایک چھوٹا سا شہر تھا، لیکن چند مہینوں سے اس شہر کے رہنے والوں کو ایک پراسرار بیماری اور نحوست کا سامنا تھا۔ اس شہر میں نجانے کہاں سے ڈریکولا آتے جا رہے تھے اور ڈریکولا بھی جیسا کہ شروع میں لوگ سمجھ رہے تھے کہ کوئی باہر سے آئی ہوئی مخلوق ہے لیکن بعد میں انکشاف ہوا کہ یہ اسی شہر کے رہائشی اور عام لوگ تھے۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ دن میں یہ لوگ عام انسانوں کی طرح ہوتے تھے اور جہاں رات کا اندھیرا پھیلا تو یہ لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوتے تھے اور ان کے دو نوکیلے دانت نمودار ہوجاتے تھے اور وہ صرف ایک ہی آواز لگاتے ”روشنیاں بند کرو، لائٹیں بند کرو۔“ اور ان کے جسموں میں بھی غیر معمولی طاقت آجاتی تھی اور پھر وہ شہر کی اندھیری گلیوں میں گم

ہوجاتے تھے اور صبح ہوتے ہی ایک نارمل انسان کی طرح اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوجاتے تھے۔

احسن آباد میں پچھلے چند مہینوں سے ایک نیا کلینک قائم ہوا تھا جو کہ دانتوں کے علاج کے لئے تھا اور سب سے اچھی بات یہ تھی کہ یہاں پر دانتوں کا فری علاج ہوتا تھا۔ چاہے نئے دانت لگوانے ہوں یا دانت نکلوانے ہوں یا دانتوں کی اور کوئی پیچیدہ بیماری ہو۔

شام ہوتے ہی اس کلینک پر لوگوں کا رش لگ جاتا تھا، اس کلینک کے مالک ڈاکٹر نکوسیا تھے جو کہ نجانے کہاں سے آئے تھے ان کا ایک اسسٹنٹ ڈاکٹر بھی تھا جس کا نام ڈاکٹر فوسیا تھا۔ شام ہوتے ہی وہ دونوں اپنی بلیک کلر کی کار میں آتے اور رات 12 بجے اپنا کلینک بند کرکے غائب ہوجاتے تھے۔

جن مریضوں کو نئے دانت یا بتیسی لگانی ہوتی تھی وہ انہیں ایک دن بعد کا ٹائم دیتے تھے اور ان کے کلینک میں ایک ایسا کمرہ تھا جس میں مکمل اندھیرا رہتا تھا۔ لوگوں کو نئے دانت لگائے جاتے تھے۔ ڈاکٹر نکوسیا اور ڈاکٹر فوسیا ہمیشہ ایک سفید رنگ کا لبادہ اوڑھے رہتے تھے سر پر کیپ اور چہرے سے عجیب سی سفاکی اور خونخوار پن جھلکتا تھا لیکن ان کی شخصیت کتنی ہی خونخوار سہی ،لوگ ان سے بے حد متاثر تھے کیونکہ وہ لوگوں کا فری علاج کرتے تھے ہفتے میں دو دن وہ چھٹی کرتے تھے بقول ان کے وہ احسن آباد سے 300 کلو میٹر دور ایک شہر کے رہنے والے تھے اور دو دن اپنے گھر والوں کے ساتھ گزارتے تھے۔

شہر کے مشہور تاجر رئیس الدین بھی اسی پراسرار بیماری کا شکار ہوگئے تھے۔ کچھ دن پہلے تو وہ اچھے بھلے تھے اور انہوں نے اپنے دانتوں کا علاج ڈاکٹر نکوسیا سے کرایا تھا اور پھر دوسرے ہی دن اس بیماری میں مبتلا ہوگئے تھے۔ جیسے ہی رات ہوئی رئیس الدین کے تیور بدلنے لگے ان کے چہرے پر دو دانت نمودار ہوگئے اور وہ چیخ رہے تھے۔ ''لائٹیں بند کرو، اندھیرا کردو۔ مجھے جانا ہے اپنے آقا کے پاس، میں میں اندرونی طور پر جل رہا ہوں۔'' اور پھر وہ لوگوں کو دھکا دیتے ہوئے اپنے گھر سے باہر بھاگ کھڑے ہوئے۔

گھر والوں نے انہیں روکنے اور پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے جسم میں بلا کی طاقت آگئی تھی اور انہیں پکڑنے والے دور جا گرے اور وہ گھر سے باہر نکل گئے۔ اندھیری گلی میں ایک کتا ان کے سامنے آگیا۔ انہوں نے کتے کو دبوچ لیا اور اپنے دونو ں نوکیلے دانت اس کی گردن پر گاڑ دیئے اور تھوڑی ہی دیر میں کتا بے جان سا ہوکر زمین پر گر گیا اور اب ان کا رخ شہر کے باہر قبرستان کی طرف تھا۔ نہ صرف رئیس الدین بلکہ شہر کی مختلف گلیوں سے ڈریکولا جو کہ تھوڑی دیر پہلے تک نارمل انسان تھے اب قبرستان کی جانب رواں دواں تھے جیسے ان سب میں کوئی شیطانی طاقت حلول کرگئی ہو۔ اور پھر وہ سب قبرستان میں پہنچ گئے۔

قبرستان کے وسط میں ایک گھنے درخت کے سائے تلے ایک تخت بچھا ہوا تھا اس پر سفید چادر اور اس پر ایک کرسی جس پر ایک سفید لبادے والا شخص بیٹھا تھا اور دوسرا شخص اس کے قدموں کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور اس نے بھی سفید لبادہ پہنا ہوا تھا۔

سارے ڈریکولا اب اس تخت کے سامنے جمع تھے۔ پھر اس شخص کی مکروہ اور کرخت آواز گونجی۔ ''بیٹھ جاؤ میرے بچو! بیٹھ جاؤ، آج تمہاری تعداد 100 ہوچکی ہے۔ اگر ایسے ہی اپنا کام چلتا رہا تو یہ تعداد 1000 ہوجائے گی اور پھر یہ شہر ڈریکولا شہر بن جائے گا اور میں سپر ڈریکولا بن جاؤں گا اور اس شہر میں ہمارا ہی راج ہوگا اور اگر کوئی دوسرا آیا بھی تو ہم اسے ڈریکولا بنادیں گے۔ ابھی تمہاری طاقتیں کم ہیں لیکن جب تمہاری تعداد 200 ہوجائے گی اور ایک مہینہ اور گزرے گا تو تم جس کو بھی کاٹو گے وہ بھی ڈریکولا بن جائے گا ابھی تم صرف جانوروں کو کاٹ سکتے ہو، جلد ہی انسانوں کا نمبر آجائے گا۔'' ڈریکولا خوفناک انداز میں بولا۔

اور پھر سارے ڈریکولا دیوانہ وار رقص کرنے

لگے۔ پھر فجر کی اذان کی آواز سنائی دی اوراس کے ساتھ ہی تمام لوگ نارمل ہونے لگے اور تخت پر بیٹھا ہوا شخص بھی بھاگتا ہوا نظر آیا اوراس کا ساتھی بھی اس کے ساتھ ہی بھاگ کھڑا ہوا۔

☆......☆......☆

ارشد بھی ایک ایسا نوجوان تھا جس کے دانت خراب ہوچکے تھے اور وجہ وہی تھی یعنی چھالیہ اور پان کا بہت زیادہ استعمال اور اب اس کے تقریباً سارے ہی دانت کمزور ہوچکے تھے اور اب وہ نئے دانت لگوانے کا سوچ رہا تھا کہ اس نے ڈاکٹر نکوسیا کو اپنا چیک اپ کرانے کا فیصلہ کرلیا اور آج وہ ڈاکٹر نکوسیا کے کلینک میں بیٹھا تھا ۔ڈاکٹر نکوسیا نے اس کے دانتوں کا معائنہ کیا۔''تمہیں نئی بتیسی لگے گی کل آجانا آج نمبر لے لو۔کل میں صرف آپریشن کروں گا یعنی نئے دانت لگاؤں گا۔'' ڈاکٹر نکوسیا نے ہفتے کے دو دن آپریشن کے لئے وقف کئے ہوئے تھے اور جس میں فری دانت لگائے جاتے تھے۔غریب لوگوں کے لئے ڈاکٹر نکوسیا کسی مہربان مسیحا سے کم نہ تھا۔

دوسرے دن ارشد مصنوعی دانت لگوانے پہنچ گیا۔ ڈاکٹر فوسیا اسے آپریشن روم میں لے گیا جہاں مشین لگی ہوئی تھیں اسے ایک گولی دی جو کہ اس نے پانی سے کھالی اور پھر اسے نیند آنے لگی اور وہ تھوڑی ہی دیر میں بے ہوش ہوگیا۔ اتنی دیر میں ڈاکٹر نکوسیا اندر داخل ہوا۔ ڈاکٹر فوسیا ادب سے جھک کر بولا۔'' سر آپ کا شکار تیار ہے۔'' اور پھر ڈاکٹر نکوسیا قہقہہ مار کر ہنسا اور اب اس کے دو نوکیلے دانت نمودار ہوگئے تھے اس نے اپنے دونوں دانت ارشد کی گردن میں گاڑ دئے اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنا منہ ہٹالیا۔

''آؤ فوسیا میری پیاس تو بجھ گئی ہے اگلا شکار تمہارا ہوگا۔اب کتنے مریض اور ہیں۔''

''سر صرف دو ہیں۔''

''ٹھیک ہے ایک کا خون تم پینا اور دوسرے کو ایسے ہی چھوڑ دینا تاکہ کسی کو ہم پر شک نہ ہو۔اب کل رات تک یہ بھی ڈریکولا بن جائے گا۔'' اور پھر ڈاکٹر فوسیا

باپ کی نصیحت

بیٹی بد دل ہوکر میکے آگئی۔ باپ نے کہا۔ ''تمہارے ہاتھ کا کھانا کھائے بہت دن ہوگئے ہیں۔آج میرے لئے ایک انڈا اور ایک آلو ابال دو، ساتھ میں گرما گرم کافی۔ لیکن 20 منٹ تک چولہے پر رکھنا۔'' جب سب کچھ تیار ہوگیا تو کہا۔ ''آلو چیک کرلو۔'' ٹھیک سے گل کر نرم ہوگیا ہے۔''اب انڈا چھو کر دیکھو ہارڈ بوائل ہوگیا ہے اور کافی بھی چیک کرو۔ رنگ اور خوش بو آگئی ہے۔'' بیٹی نے چیک کرکے بتایا۔''سب پرفیکٹ ہے۔'' باپ نے کہا۔''دیکھو...... تینوں چیزوں نے گرم پانی میں یکساں وقت گزارا اور برابر کی تکلیف برداشت کی۔''آلو سخت ہوتا ہے۔'' اس آزمائش سے گزر کر وہ نرم ہوگیا۔''انڈا نرم ہوتا ہے۔'' گرے تو ٹوٹ جاتا ہے۔'' لیکن اب سخت ہوگیا ہے اور اس کے اندر کا لیکویڈ بھی سخت ہوچکا ہے۔ کافی نے پانی کو خوش رنگ، خوش ذائقہ اور خوش بودار بنادیا ہے۔''تم کیا بننا چاہو گی۔'' ''آلو...... انڈا...... یا کافی'' یہ تمہیں سوچنا ہے یا خود تبدیل ہوجاؤ یا پھر کسی کو تبدیل کردو۔ ڈھل جاؤ یا ڈھال دو۔ یہی زندگی گزارنے کا فن ہے۔''سیکھنا......اپنانا'' تبدیل ہونا، تبدیل کرنا''ڈھلنا......ڈھل جانا'' یہ اسی وقت ممکن ہے، جب اپنے اندر تباہ کرنے کا عزم ہو لیکن کم ہمت منزل تک نہیں پہنچتے۔'' رستے ہی میں ہلاک ہوجاتے ہیں۔''

(شرف الدین جیلانی۔ٹنڈو الہ یار)

نے بھی ایک اور مریض کے ساتھ یہی عمل کیا۔
دوسری رات میں ارشد کے بھی دو نوکیلے دانت نمودار ہوگئے اور وہ رات ہوتے ہی گھر سے بھاگ کھڑا ہوا اور دوسرے مریض کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ لیکن کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ شہر میں بڑھتے ہوئے ڈریکولاؤں کے پیچھے ڈاکٹر نکوسیا کارفرما ہے۔

☆......☆......☆

مولانا ہاشم کی عمر تقریباً ستر سال کے لگ بھگ تھی، وہ حافظ قرآن اور بہت پہنچے ہوئے تھے، ان کے پاس لوگ اکثر آسیب کا اتار کروانے، جن بھگانے کے علاج کے لئے بھی آتے تھے وہ احسن آباد سے 200 کلومیٹر دور شہر رحیم آباد میں رہتے تھے۔ آج انہیں دعوت نامہ ملا کہ ان کے بچپن کے دوست کلیم الدین کے سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی ہے تو وہ احسن آباد کے لئے روانہ ہوگئے اور شام تک وہ احسن آباد پہنچ گئے ان کے دوست کلیم الدین انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے۔ ''اچھا ہوا تم آگئے۔''
''لیکن شادی میں گانا بجانا نہیں کرنا اگر ریکارڈنگ لگاؤ بھی تو قرآن کی تلاوت لگا دینا نہیں تو میں واپس چلا جاؤں گا۔''
''ارے نہیں بھئی تم میرے بچپن کے دوست ہو جیسا تم کہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔ میرے بچے میری بہت عزت کرتے ہیں اور وہ میرے حکم کے خلاف ذرا بھی نہیں چلیں گے۔''
جس روڈ پر کلیم الدین کا گھر تھا اسی کے بالکل سامنے ڈاکٹر نکوسیا کا کلینک بھی تھا اور جب کلیم الدین ہاشم شاہ کو لے کر گھر سے باہر نکلے تو ڈاکٹر نکوسیا کے کلینک کے سامنے رش لگا ہوا تھا۔ ''یہ کیا کوئی ڈاکٹر ہے۔؟'' مولانا ہاشم نے کلیم الدین سے سوال کیا۔
''ارے ہاں بھائی یہ احسن آباد کی خدا ترس اور مقبول شخصیت ہیں۔ ڈاکٹر نکوسیا، یہ دانتوں کا فری علاج کرتے ہیں اور بتیسی بھی لگاتے ہیں تم بھی مصنوعی دانت لگوالینا۔ کل تم میرے ساتھ چلنا، کل ڈاکٹر نکوسیا سے نمبر لے لیں گے تو پرسوں تمہیں مصنوعی دانت لگ جائیں گے۔''
''چلو چلے چلیں گے ذرا ہم بھی تو اس نیک انسان سے ملیں۔'' مولانا ہاشم نے مسکراتے ہوئے کہا۔
پھر کلیم الدین نے مولانا ہاشم کو احسن آباد میں ہونے والی اس پراسرار بیماری کے بارے میں بتایا کہ کیسے لوگوں کے دو نوکیلے دانت نکل آتے ہیں اور وہ رات کو اپنے گھروں سے بھاگ جاتے ہیں اور صبح ہوتے ہی واپس آجاتے ہیں۔ سارے شہر میں نحوست چھائی ہوئی ہے۔
دوسرے دن کلیم الدین کے بیٹے کی شادی تھی لیکن حسب وعدہ ریکارڈنگ پر گانے نہیں لگائے گئے اور مولانا ہاشم کی خواہش پر قرآن کی تلاوت بلند آواز میں چلائی گئی۔ ابھی تلاوت چلتے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ ڈاکٹر نکوسیا کے کلینک میں شور مچ گیا اور ڈاکٹر نکوسیا اور ڈاکٹر فوسیا اپنے کلینک سے چیختے ہوئے باہر آگئے۔
''اسے بند کرو......شور بند کرو۔ میرے مریض ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔'' وہ اب کلیم الدین کے سامنے کھڑے تھے۔
''لیکن یہ تو تلاوت قرآن ہے اس سے آپ کیوں ڈسٹرب ہو رہے ہیں؟''
''تمہیں کسی پڑوسی کا خیال ہی نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نکوسیا اور ڈاکٹر فوسیا بری طرح سہمے ہوئے لرز رہے تھے۔ اور پھر کلیم الدین نے ریکارڈنگ بند کروادی اور کہنے لگے۔
''بھائی ہم تو خود کسی کو تکلیف دینا نہیں چاہتے۔'' پھر ڈاکٹر نکوسیا اور ڈاکٹر فوسیا جلد ہی اپنا کلینک بند کر کے چلے گئے۔
دوسرے دن کلیم الدین، مولانا ہاشم کو لے کر ڈاکٹر نکوسیا کے کلینک پر پہنچ گئے اور کہنے لگے۔ ''کل میری وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی اس کے لئے ایک مرتبہ پھر میں معذرت چاہتا ہوں۔''
ڈاکٹر نکوسیا نے کہا۔ ''آئندہ خیال رکھیے گا مجھے شور پسند نہیں ہے اور پھر میرا کلینک بھی ڈسٹرب ہوتا ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب یہ میرے بچپن کے دوست ہیں مولانا ہاشم یہ اپنے مصنوعی دانت لگوانا چاہتے ہیں۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' ڈاکٹر نکوسیا نے مولانا ہاشم سے ہاتھ ملایا اور کہا ''آپ کل آجائیں تو آپ کو مصنوعی دانت لگادیں گے۔''

مولانا ہاشم کو ڈاکٹر نکوسیا کا ہاتھ انتہائی سرد لگا اور چہرہ بھی کچھ عجیب سا، غیر انسانی سا، لیکن انہوں نے اس کا ذکر اس وقت تو نہیں کیا جب وہ گھر پر آئے تو انہوں نے کہا! ''کلیم الدین، ڈاکٹر نکوسیا مجھے انسان نہیں لگتا۔ وہ کوئی خبیث روح، آسیب یا جن ہے جو کہ انسانی روپ میں اپنا کلینک چلا رہا ہے۔''

''لیکن تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو، وہ تو ایک نہایت خدا ترس اور نیک آدمی ہے اور سب کا فری علاج کرتا ہے۔''

''میری ساری زندگی جن بھوتوں کو اتارتے ہوئے ہی گزری ہے کلیم الدین.....'' مولانا ہاشم نے سنجیدگی سے کہا۔ ''کل دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا تم ایک کام کرو بڑے لاؤڈ اسپیکر لگاؤ اور قرآن کی تلاوت کا انتظام کرو اور لاؤڈ اسپیکر کا رخ ڈاکٹر نکوسیا کے کلینک کی طرف کردینا پھر میں تمہیں تماشہ دکھاؤں گا۔ یقین کرو ساری نحوست اور شہر میں ڈریکولا بننے والی بیماری کا سبب یہی شخص ہے۔''

اور پھر دوسری رات کو جیسے ہی ڈاکٹر نکوسیا اپنی کار سے اترا اور کلینک میں جاکر بیٹھا تو مولانا ہاشم نے ریکارڈنگ چلانے کا اشارہ کیا اور پھر بلند آواز میں قرآن کی تلاوت شروع ہوگئی۔

ادھر ڈاکٹر نکوسیا کے کلینک میں جیسے زلزلہ آگیا وہ ڈاکٹر فوسیا اور ڈاکٹر نکوسیا دونوں اب کلینک سے باہر آچکے تھے اور بری طرح چیخ رہے تھے۔ ''ارے بند کرو، پھر تم لوگوں نے شور مچا رکھا ہے۔'' مولانا ہاشم آگے بڑھے اور اب وہ خود بھی قرآنی آیات کا ورد کررہے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر نکوسیا کا ہاتھ پکڑلیا اور پھر سارے شہر میں ہلچل مچ گئی۔ شہر کے تمام کونوں سے اور گلیوں سے ڈریکولا نکل رہے تھے یہ وہی لوگ تھے جن کے دانتوں کا علاج ڈاکٹر نکوسیا نے کیا تھا اور وہ ڈریکولا بن گئے تھے، وہ سب کے سب زمین پر لوٹ لگا رہے تھے۔

ادھر قرآن کی تلاوت تیز آواز میں جاری تھی پھر مولانا ہاشم کی آواز ابھری۔ ''کون ہے تو خبیث بتا جلدی۔''

اور پھر ڈاکٹر نکوسیا کا قد چھوٹا ہونا شروع ہوگیا، ڈاکٹر فوسیا بھی زمین پر لوٹ لگا رہا تھا۔ ڈاکٹر نکوسیا کی خوف ناک آواز نکلی۔ ''میں دراصل ایک ڈریکولا ہوں اور اس شہر کو ڈریکولا بنانے کا مشن لے کر آیا تھا۔ میں اور میرا اسسٹنٹ ڈاکٹر فوسیا دونوں ہی ڈریکولا ہیں۔ میں اور فوسیا جس کی گردن میں دانت گاڑ دیتے تھے اور اس کا تھوڑا سا خون پیتے تھے تو وہ ڈریکولا بن جاتا تھا۔''

''لیکن اب تمہارا کھیل ختم ہوگیا۔'' اور اس کے ساتھ ہی مولانا ہاشم نے ایک پانی کی بوتل نکالی جس میں قرآنی آیات کا دم کیا ہوا پانی تھا انہوں نے وہ پانی ڈاکٹر فوسیا اور ڈاکٹر نکوسیا پر چھڑک دیا۔ اس کے ساتھ ہی دونوں کے وجود میں سے دھواں اٹھنے لگا اور اب اس دھوئیں میں سے بری طرح چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں اور تھوڑی ہی دیر میں وہ دھواں بھی وہاں سے غائب ہوگیا۔

دھوئیں کے غائب ہوتے ہی تمام لوگ جو کہ ڈریکولا بنے ہوئے تھے نارمل ہوگئے اور سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ ''ہمیں کیا ہوا تھا۔''

پھر مولانا ہاشم نے انہیں بتایا کہ ''وہ ایک خبیث ڈریکولا کا شکار ہوگئے تھے جو کہ اپنی طاقت کو بڑھاتا جارہا تھا اور اگر وہ 1000 ڈریکولا بنالیتا تو سارے شہر پر اسی کا راج ہوتا۔

لیکن اللہ کی مہربانی سے میں نے اس کا خاتمہ کردیا ہے اور اب سب لوگوں کو اس سے نجات مل گئی ہے۔'' پھر تمام لوگوں نے مولانا ہاشم کا شکریہ ادا کیا اور احسن آباد ایک مرتبہ پھر پرامن اور پرسکون شہر بن گیا اور مولانا ہاشم دعاؤں کے ساتھ وہاں سے اپنے شہر کے لئے روانہ ہوگئے۔

دختر آتش

طاہرہ آصف۔ساہیوال

عامل کے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتے ہی کمرے کے کونے میں گاڑھا دھواں اٹھا اور جب دھواں چھٹا تو اس جگہ ایک سراپا حسن مجسم وجود نظر آیا اس کے یاقوتی ہونٹوں پر دلکش تبسم رقصاں تھا اور پھر......

یہ دنیا رہے نہ رہے میرے ہمدم، کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔دل پر سحر طاری کرتی کہانی

رات آہستہ آہستہ اپنا سفر ختم کر کے اب تھک گئی تھی۔ صبح کا آغاز ہونے والا تھا ستاروں بھرا آسمان بہت ہی خوش نما منظر پیش کر رہا تھا، سب سے پہلے نور بی بی بیدار ہوئیں تا کہ نماز ادا کریں۔ غلام محمد پہلے بیدار تھے صرف والدہ کے اٹھنے کے منتظر تھے والدہ کو دیکھ کر وہ بھی جلدی سے اٹھے اور والدہ کے پیچھے سیڑھیاں اتر آئے، پانی وہ رات کو ہی کنوئیں سے بھر کر لا رکھتے تھے تا کہ وہ اور دیگر گھر کے افراد صبح کی ضروریات سے فارغ ہوسکیں ۔وضو کیا اور مسجد کی طرف چل دیئے اگرچہ مسجد میں بھی کنواں تھا لیکن وہ اطمینان کی خاطر گھر سے وضو کر کے جایا کرتے تھے گھر کے پچھواڑے وسیع قبرستان تھا جسے عبور کر کے مسجد آتی تھی اکثر انہیں گھر سے نکلتے ہوئے یا راستے میں اپنے والد اور خاندان کے دیگر بزرگ اور گاؤں کے نمازی حضرات مل جاتے اور سب ہجوم کی صورت یا انفرادی طور پر مسجد پہنچ جاتے۔

غلام محمد کو گرمیوں کی صبح بہت پسند تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انہیں گرمی کا پورا موسم پسند تھا، سردی انہیں بری لگتی تھی۔

نماز پڑھ کر گھر واپس آنے کے بجائے اپنے تایا کے گھر چلے گئے دروازہ تائی نے کھولا، انہیں سلام کیا تو انہوں نے شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا اور اندر لے آئیں، وسیع صحن میں سات آٹھ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں ان کی تایا زاد سکینہ چارپائیاں اور بستر سمیٹنے پر لگی ہوئی تھی ایک پلنگ پر ان کے تایا نیم دراز تھے غلام محمد پر نگاہ پڑی تو سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور محبت سے ان کے سر پر ہاتھ رکھا پھر احوال پوچھنے لگے تو غلام محمد نے انہیں اپنی تقرری کے بارے میں بتایا کہ وہ اب پٹواری کے عہدہ پر فائز ہو چکے ہیں، آج وہ ضلع کے بڑے افسر کے پاس حاضر ہوں گے۔

تائی جو قریب ہی بیٹھی تھیں دلچسپی سے سب سن رہی تھیں پھر فوراً بھینس کا تازہ دودھ گلاس میں ڈال کر لے آئیں اور بعد اصرار پلایا کچھ دیر بعد وہ سب کو سلام کر کے گھر آئے اور والد کے پاس آ کر بیٹھ گئے، اپنی روانگی کے بارے میں بات کرنے لگے۔

نور بی بی نے دونوں کے سامنے ناشتہ لا کر رکھا ناشتے سے فارغ ہوئے تو ماں نے دھلا ہوا جوڑا کھدر اور پگڑی جو کہ ململ کی کلف لگی تھی لائیں اور تیار ہونے کا کہا وہ فوراً کنوئیں سے نہا کر آئے لباس بدلا چمڑے کا نیا کھسہ پہنا سر پر پگڑی جمائی کاغذات کا پلندہ تھیلے میں ڈالا اور والد، والدہ سے دعائیں لے کر گھر سے نکل گئے۔

یہ 1921ء کا سال چل رہا تھا اس زمانے میں بسیں نہ ہونے کے برابر تھیں اور مخصوص اوقات میں ہی چلا کرتی تھیں، وہ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے بڑی سڑک کی طرف ہولئے تاکہ وقت پر بس میں سوار ہوسکیں۔

ڈیڑھ میل چلنے کے بعد بڑی سڑک دکھائی دی اور ساتھ ہی بس بھی رکتی نظر آئی وہ بھاگ کر بس کی طرف لپکے اور جلدی سے بس میں سوار ہوگئے اگرچہ سوار ہونے والے افراد محدود تھے بہرحال وہ شکر بجالائے اور زیر لب درود پاک کا ورد کرنے لگے، یہ غلام محمد کا معمول تھا کہ وہ اٹھتے بیٹھتے زندگی کے معمولات انجام دیتے وقت درود شریف کا ورد کرتے رہتے تھے۔

غلام محمد بہت وجیہہ و شکیل نوجوان تھے عمر لگ بھگ تیئس برس اور گھر میں وہ دوسرے نمبر پر تھے، بڑی بہن شادی شدہ اپنے گھر والی تھیں ان کے بعد مزید دو بھائی چھوٹے تھے انہیں پڑھنے کا شوق تھا سو میٹرک کیا جو اس دور میں اعلیٰ تعلیم تصور ہوتی تھی اس کے بعد پٹواری کا امتحان پاس کیا اور اپنے خاندان میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کرلی۔

آج وہ اپنی تقرری کا پروانہ حاصل کرنے نکلے تھے بس نے انہیں شہر کے چوک پر اتارا تو آگے وہ پیدل ہولئے کچہری پہنچ کر متعلقہ انگریز افسر کے دفتر میں حاضر ہوئے، افسر نے ان سے چند سوالات کئے اس کے بعد انہیں انہی کے گاؤں سے تین گاؤں آگے کا علاقہ دیا اور رسمی کارروائی کے بعد فارغ کردیا۔ وہ کچہری سے نکلے تو سوچا شہر میں مقیم ان کے جو رشتہ دار رہ رہے تھے ان سے مل لیا جائے کیونکہ خاصہ دن باقی تھا، وہ چلتے ہوئے شہر کی آبادی والے حصے میں آئے اور تمام رشتہ داروں سے فرداً فرداً ملے، دوپہر کا کھانا اور نماز سے فارغ ہوکر آدھ پون گھنٹہ قیلولہ کیا پھر اپنے گھر کے لئے روانہ ہوئے، چوک پر آکر بس پکڑی بس کچھ تاخیر سے ملی اور کچھ سفر بھی سست روی سے طے کیا، مزید یہ ہوا کہ ان کی منزل سے ایک میل پہلے ہی اتار دیا گیا کہ بس نے دوسری طرف مڑنا تھا وہ ٹھنڈی سانس لے کر اترے اور پیدل چلنا شروع کردیا۔ عصر کا وقت تنگ ہورہا تھا انہیں فکر ہوئی کہ نماز ادا کرلیں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے چلتے رہے کہ پانی نظر آئے تو وضو کرلیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب آبادی کا پھیلاؤ بے تحاشہ نہ تھا خصوصاً دیہاتوں میں آبادی صرف محدود جگہ پر ہوتی اس کے بعد طویل جگہ غیر آباد اور ویران ہوتی، غریب لوگ عموماً پیدل سفر کرتے، خوشحال لوگ گھوڑے اور بگھیاں استعمال

کرتے، خیر ایک جگہ انہیں چند ایک کچے مکانات نظر آئے باہر کچھ مویشی بندھے ہوئے تھے وہ تیزی سے بڑھے اور ایک جگہ بیٹھے ہوئے بڑے میاں سے پانی مانگا تو انہوں نے فوراً ڈول میں پانی فراہم کردیا انہوں نے وہیں وضو کرکے نماز ادا کی بڑے میاں کا شکریہ ادا کرکے چلنے لگے تو بڑے میاں نے ان سے ان کی منزل کے بارے میں پوچھا اور پھر مغرب سے پہلے پہلے پہنچنے کی تاکید کی۔

غلام محمد تیز تیز قدموں سے چلنے لگے پھر بھی چلتے چلتے راستے میں مغرب کا وقت ہوگیا انہیں کچھ فکر سی ہونے لگی کیونکہ ان کے بزرگوں نے ہمیشہ مغرب کے وقت گھر سے باہر رہنے سے منع کیا تھا اور اس وقت وہ گھر سے بہت دور تنہا اس ویرانے میں تھے، خیر وہ تیز تیز چلتے رہے کہ کچھ ہی فاصلہ باقی تھا، کچھ دیر بعد انہوں نے ایک صاف جگہ دیکھ کر اپنا صافہ زمین پر بچھایا اور مغرب کی نماز ادا کرنے لگے۔

نماز کے دوران بارہا انہیں کچھ عجیب سی سرسراہٹیں محسوس ہوئیں جنہیں انہوں نے تنہا ہونے کا وہم سمجھ کر نظر انداز کیا، جلد نماز ختم کی صافہ جھاڑ کر کندھے پر رکھا اور آگے کو قدم بڑھا دیئے، دو تین قدم ہی چلے تھے کہ بہت دلفریب خوشبو کا جھونکا آیا اور پھر انہوں نے نسوانی ہنسی کی آواز سنی تو وہ رکے اور ادھر ادھر دیکھا، کچھ بھی دکھائی اور سنائی نہ دیا، انہوں نے آیات زیرلب پڑھتے ہوئے چلنا جاری رکھا کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے گاؤں کی حدود میں داخل ہوگئے پھر گھر پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔

والدہ گویا دروازے سے لگی بیٹھی تھیں، انہوں نے دیکھتے ہی شکر بجالائیں دیر ہوجانے کی وجہ پوچھی اور اپنی فکرمندی کا اظہار کیا۔

غلام محمد تھکے ہوئے تھے منہ ہاتھ دھویا کپڑے بدلے اور صحن میں بچھی چارپائی پر والد کے پاس بیٹھ گئے، ان کے دونوں چھوٹے بھائی بھی آ کر پاس بیٹھ گئے۔ انہوں نے گھر والوں کو پورے دن کی روداد سنائی اور مغرب کی نماز کے بعد ہونے والی بات گول کر گئے یہ ان کی دانست میں کچھ قابل ذکر بات نہ تھی۔

رات کا کھانا سب نے ساتھ کھایا پھر عشاء کی نماز کے لئے مسجد روانہ ہوگئے۔ نماز سے واپسی پر سونے کے لئے چھت پر آگئے چونکہ غلام محمد بہت زیادہ تھکے ہوئے تھے فوراً ہی سوگئے۔ نیند کا یہ سلسلہ تین چار گھنٹے ہی چلا ہوگا کہ غلام محمد گہری نیند سے اچانک ہی بیدار ہوگئے چند لمحوں تک انہیں اپنی بیداری کی وجہ سمجھ نہیں آئی پھر وہ کروٹ لے کر دوبارہ سونے لگے تو انہیں وہی مانوس خوشبو اپنے آس پاس محسوس ہوئی پھر انہیں لگا کہ کسی نے دھیرے سے ان کے پاؤں کو چھوا ہو، انہوں نے چونک کر اپنی پائنتی کی طرف دیکھا تو کچھ بھی نظر نہ آیا نیند کا غلبہ کچھ ایسا تھا کہ وہ غور کئے بغیر سوگئے لیکن نیند میں جاتے ہوئے بھی انہوں نے اپنے پاؤں پر دوبارہ وہی لمس محسوس کیا۔

صبح معمول کے مطابق اٹھے، وضو کے بعد مسجد کو چل دیئے واپسی پر کنوئیں سے نہائے، گھر آ کر ناشتہ کیا اور معمولات کا آغاز ہوگیا۔ رات والا واقعہ انہوں نے اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کردیا۔ آج ان کی ملازمت کا پہلا دن تھا، وہ اپنی تقرری والے چک میں گئے اور ایک مصروف دن گزارا واپسی پر تانگہ پکڑا اور گھر آگئے۔

گھر کے تمام افراد ان کی سرکاری ملازمت سے بہت خوش تھے ایک ایسے گاؤں میں جہاں اکثریت آبادی غربت اور پسماندگی کی زندگی بسر کررہے ہوں وہاں پر سرکاری ملازمت پیشہ افراد رشک کی نظر سے ہی دیکھے جاسکتے تھے۔

☆......☆......☆

پیر نیاز حسین کے آباؤ اجداد غالباً پچاس برس قبل اس گاؤں میں وارد ہوئے تھے ان کے علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے باعث وہ خاندان اب تک ان کے نام سے عزت سیٹتا چلا آرہا تھا، پیر نیاز حسین اس پورے علاقے کے واحد پیر تھے اس دور کے دستور کے مطابق ہر شخص کسی نا کسی روحانی ہستی سے وابستگی کے بغیر نامکمل سمجھا جاتا تھا ان خاندانوں پر اللہ کا خصوصی کرم تھا ان کے دادا واقعی ایک خدا رسیدہ تھے ان کی اولادیں اگرچہ ان جیسا

روحانی مرتبہ نہ پاسکیں لیکن بہرحال عزت کی کمی نہ تھی۔

غلام محمد کے والد احمد دین کی پیر نیاز حسین سے بہت بنتی تھی ان میں دوستی کی حد تک بے تکلفی پائی جاتی تھی پیر صاحب اگرچہ خود بہت زیادہ روحانی مراتب نہیں رکھتے تھے باپ دادا کی ساکھ سے بات چل رہی تھی لیکن ان کی اہلیہ بہت متقی خاتون تھیں، زندگی کا زیادہ حصہ عبادات میں گزرتا تھا۔

غلام محمد بچپن میں پیر صاحب کے صاحب زادے عابد حسین کے ساتھ کھیلے تھے عابد حسین کو والدہ نے اپنے طریق پر رکھا ان کی روحانی تربیت میں کوئی کمی نہ رہنے دی۔

حاجرہ خاتون بہت ہی صاحب نظر تھیں غلام محمد کی نیک نفسی کی ابتدا ہی سے بھانپ کر اپنے بیٹے کا ساتھی بنایا، وہ واحد مرد تھے جو گھر تک آنے کی اجازت رکھتے تھے ورنہ ان کے گھر میں مزید خواتین کے علاوہ گاؤں کے کسی مرد نے جھانکا تک نہیں تھا۔

غلام محمد کی والدہ نے گھر پر سوجی کے لڈو میوے ڈال کر تیار کیے اور انہیں ایک بڑے طشت میں رکھ کر غلام محمد اور ان کے والد کو کہا کہ "وہ پیر صاحب کا منہ میٹھا کروا آئیں۔"

باپ بیٹا پہلے سے دل میں یہی بات لئے بیٹھے تھے، عصر کی نماز ادا کر کے فوراً ہی چل دیئے، پہلے ڈیرہ پر گئے۔ غلام محمد کی ملازمت کا بتایا تو پیر صاحب بہت خوش ہوئے، شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا منہ میٹھا کیا پھر دعائے خیر کی، تمام حاضرین نے ان کی تقلید میں دعا کی۔ دعا کے بعد نیاز حسین مسکرائے اور کہا کہ "یہ لڈوؤں کا طشت گھر لے جاؤ اور اپنے دوست اور اماں کو بھی خبر دو۔"

غلام محمد عابد حسین کی طرح حاجرہ خاتون کو اماں کہتے تھے وہ فوراً اٹھے اور ڈیرہ سے ملحق ان کے گھر کا رخ کیا۔ پہلے عابد حسین سے ملاقات ہوئی بغلگیر ہوئے اور خوش خبری سنائی پھر چند لمحوں کے بعد حاجرہ خاتون چلی آئیں، غلام محمد انہیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔

حاجرہ خاتون نے آگے بڑھ کر ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعا دی مگر پھر چونک سی گئیں اور غلام محمد کی جانب بہت غور سے دیکھنے لگیں چند لمحے یونہی دیکھتے رہنے کے بعد ایک لمبی سانس خارج کی اور سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ غلام محمد اور عابد حسین دونوں نے ان کی سنجیدگی کو محسوس کیا مگر ادباً کوئی سوال نہیں کیا۔ غلام محمد نے لڈو پیش کیے اور پوری بات بتائی تو انہوں نے مبارک باد دی دعا بھی دی ادھر ادھر کی چند باتوں کے بعد انہوں نے اپنے بیٹے کی جانب دیکھا وہ ماں کا اشارہ سمجھ کر کوئی بہانہ بنا کر وہاں سے اٹھ گئے۔ بیٹے کے جانے کے بعد حاجرہ خاتون نے غلام محمد سے پوچھا۔ "پتر مجھے کچھ خلاف معمول محسوس ہوا ہے ایسا لگتا ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے اگرچہ اس لمحے وہ نہیں ہے وگرنہ میں سارا معاملہ سمجھ لیتی تم ہی کچھ بتاؤ کہ تمہیں کچھ محسوس ہوتا ہے۔"

جواباً غلام محمد نے انہیں اپنے سفر اور پھر گزرنے والی رات کا احوال بتا دیا، وہ غور سے ان کی بات سنتی رہیں، خاموشی سے غور کرتی رہیں پھر اٹھ کر گھر کے اندرونی حصے میں چلی گئیں پھر کچھ دیر بعد لوٹیں تو ان کے ہاتھ میں سیاہ دھاگے میں پرویا ہوا ایک چرمی تعویز تھا۔

"غلام محمد تم اس بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہو گے بالکل خاموش رہو گے اگر تم میری طرف نہیں آتے تو شاید یہ معاملہ تا دیر چلتا اور تمہیں معلوم بھی نہ ہوتا مگر اب بات جلد کھلے گی سب کچھ سامنے آئے گا مگر اس کا اظہار کسی کے سامنے نہ ہونے پائے اگر پھر بھی کچھ نہ سمجھو تو میرے پاس چلے آنا عابد حسین کو بھی شریک معاملہ نہیں کرنا۔" غلام محمد خاموشی سے سب سنتے رہے، انہیں بہت حیا محسوس ہوئی وہ دور ہی ایسا تھا جب حیا صرف عورتوں میں نہیں بلکہ مردوں میں بھی ہوتی تھی سادگی اور شرم ہر معاملہ زندگی پر محیط ہوتی تھی، خیر وہ اجازت لے کر اٹھنے لگے تو انہوں نے کہا۔ "غلام محمد فرصت ہو تو نور بی بی کو میری طرف بھیجنا۔" یہ کہہ کر انہیں رخصت کر دیا مگر ان کے بازو پر تعویز باندھنا نہ بھولیں اور تاکید کی کہ "یہ تعویز میری اجازت کے بغیر نہیں اتارنا۔"

غلام محمد گھر جانے والے راستے پر ہو لئے وہ گہری

سوچ میں گھرے ہوئے تھے مغرب کی اذان سنائی دی تو رخ مسجد کی جانب کردیا نماز سے فارغ ہوکر گھر آئے تو بڑی بہن اور بہنوئی آئے ہوئے تھے وہ ان سے ملے اور باتیں کرتے رہے کھانا تیار ہوتے ہی سب نے مل کر کھایا۔ اسی اثناء میں عشاء کا وقت ہوگیا سب نماز کے لئے اٹھ گئے۔

رات میں چھت پر آکر سونے کی بجائے باتیں کرنے بیٹھ گئے اردگرد کی چھتوں پر موجود لوگ بھی محفل میں شامل ہونے آگئے ایسے میں ایک خاتون رشتہ دار نے پھل جڑی چھوڑی۔ ''نور بی بی اب بیٹے کی شادی بھی کرڈالو۔''

اس پر غلام محمد کی بہن نے بھی کہا۔ ''اما میں بھی یہی بات کہنے والی تھی آپ تایا یا ماموں دونوں میں سے کسی ایک کے ہاں بات ڈال دیں کیونکہ غلام محمد کے لئے دلچسپی دونوں طرف سے ہے۔''

کچھ دیر تک اس موضوع پر بات ہوتی رہی غلام محمد پہلے ہی اپنی چارپائی پر جاکر دراز ہوچکے تھے۔ اس بات پر انہوں نے بیٹھے رہنا مناسب نہیں سمجھا۔ تایا اور ماموں دونوں طرف ان کا آنا جانا رہتا تھا مگر انہوں نے کبھی اپنی کزنز کو تفصیل سے نہیں دیکھا تھا کیونکہ ان کے جانے پر وہ ادھر ادھر ہوجاتیں کیونکہ ان دنوں ایسا ہی دستور تھا۔ سرسری دیکھنا ہی ہوتا تھا لہٰذا وہ اپنی رائے دینے سے قاصر تھے، نا ہی کبھی انہوں نے اس موضوع پر سوچا تھا، دن بھر کے واقعات کو سوچتے سوچتے سوگئے۔

آنے والی صبح کو اٹھ کر معمولات سے فارغ ہوکر نوکری پر جانے کو تیار ہوئے تو پتہ چلا کہ بہن اور بہنوئی بھی روانہ ہونے کو ہیں ناشتے کے بعد سب ساتھ ساتھ ہولئے کیونکہ بہن کا سسرال ان کے راستے میں پڑتا تھا۔ ملازمت پر آکر لگے بندھے معمول میں لگ گئے شام گئے وہ فارغ ہوئے تو واپسی کا سفر انہوں نے پیدل ہی کرنے کا سوچا اپنے کاغذات کا پلندہ تھیلے میں ڈالا تھیلا پکڑا اور نکل آئے موسم خاصہ گرم تھا۔ وہ آیات کا ذکر کرتے ہوئے جارہے تھے، آدھے راستے میں ایک نہر نما پانی کا نالہ پڑتا تھا جس کا پانی کھیتوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ یہاں آکر انہوں نے سوچا کہ تازہ دم ہولیا جائے نالے پر آکر منہ ہاتھ دھویا پاؤں ٹھنڈے کئے چند لمحے ستائے اور پھر چل پڑے۔ بے دھیانی میں اپنا تھیلا کنارے پر چھوڑ دیا۔

ابھی چند فرلانگ آگئے ہوں گے کہ دفعتاً یاد آیا کہ تھیلا ہاتھ میں نہیں ذہن پر زور دیا تو نالہ کے کنارے رکھا یاد آگیا پھر واپس چل دیئے، یہ علاقہ بہت بہت ویران تھا دور دور تک کسی شے پر نگاہ نہ پڑتی تھی گرمی کی وجہ سے کھیت بھی خالی تھے جب وہ نالہ کے قریب آنے لگے تو دور سے کسی کی پشت دکھائی دی جیسے کوئی نالہ میں اسی جگہ پاؤں لٹکائے بیٹھا ہو جہاں ان کا تھیلا رکھا ہوا تھا۔ قریب آکر احساس ہوا کہ کوئی عورت ہے اور تھیلا اس کے قریب رکھا ہوا تھا مجبوراً تھیلا اٹھانے کے لئے مخاطب کرنا ضروری تھا وہ پہلے کھنکھارے اور پھر بولے۔ ''بی بی یہ تھیلا میرا آپ کے قریب رکھا ہے، اگر اجازت ہوتو اٹھالوں۔''

ان کی آواز پر عورت نے سر گھما کر پیچھے دیکھا، غلام محمد کی آنکھوں کے سامنے برق کوندگئی اس قدر حسین عورت انہوں نے اپنی زندگی میں دیکھی تھی نہ سنی تھی دو چار لمحوں کے لئے وہ حواس باختہ سے ہوگئے عورت جسے لڑکی کہنا زیادہ ٹھیک ہوگا ان کا تھیلا پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی ہاتھ آگے بڑھا کر تھیلا ان کی جانب کردیا۔ تھیلا لیتے ہوئے ہاتھوں پر نگاہ گئی تو بس دیکھ کر ہی رہ گئے ہاتھ کا حسن الفاظ میں ڈھالنا ممکن نہیں تھا۔

وہ تھیلا لے کر پلٹنے والے تھے کہ لڑکی نے کہا۔ ''میں یہاں تنہا ہوں کیا آگے کا سفر آپ کے ساتھ کرسکتی ہوں؟ شام ہونے والی ہے، راستے میں کوئی تانگہ ملا تو بیٹھ جاؤں گی۔''

غلام محمد نے جواب دیا۔ ''جیسے آپ کی مرضی۔'' انہوں نے کوئی سوال فوراً کرنا مناسب نہیں سمجھا وہ لڑکی ان سے دو قدم پیچھے چل پڑی۔

اب غلام محمد کا ذہن رعب حسن سے نکل کر کچھ

سوچنے کے قابل ہوا تو سوچنے لگے کہ اس ویرانے میں ایسی لڑکی تنہا کہاں جارہی ہے جبکہ اس کا لباس خصوصاً بات چیت کا انداز نہ تو مقامی عورتوں جیسا تھا اور نہ ہی طور اطوار وہ بہت سلجھے الفاظ اور لہجے میں مخاطب ہوئی تھی اور جو لباس اس نے پہن رکھا تھا ویسا تو جاگیرداروں کی مستورات کا بھی نہیں ہوتا تھا۔ چلتے چلتے وہ غیر محسوس انداز میں ان کے برابر آ گئی اور انہیں وہی مانوس سی خوشبو محسوس ہوئی وہ پردہ سے عاری تھی اس کا لباس بھی ایسا نہ تھا جو کہ اس علاقے کی خواتین کا تھا۔

چلتے چلتے انہوں نے سوال کیا" بی بی آپ کہاں کی رہنے والی ہیں اور اس وقت تنہا کہاں جارہی ہیں۔؟"

اس نے جواب دیا۔" میں فتح پور کے قریب جو علاقہ خالی ہے وہاں رہتی ہوں آج دل کے مجبور کرنے پر آپ کے سامنے ہوں۔"

غلام محمد کچھ حیران سے ہوئے اور بولے۔" بی بی فتح پور میرے گاؤں سے کچھ ہی دور ہے درمیان میں جس خالی علاقہ کا ذکر کررہی ہیں وہاں سے میرا دو تین بار گزر ہوا ہے وہ تمام نیم جنگل جیسا ہے وہاں تو آبادی ہے ہی نہیں، نہ کوئی مکان نہ گھر آپ وہاں کیسے رہتی ہیں؟ دوسری بات کہ میں آپ کو زندگی میں پہلی بار اب دیکھ رہا ہوں، میں آپ کو نہیں جانتا تو آپ کیوں میرے لئے یہاں اکیلی آئیں۔"

یہ سن کر وہ چلتے چلتے رک گئی غلام محمد کو بھی رکنا پڑا وہ ان کی جانب رخ کر کے براہ راست دیکھتے ہوئے بہت آہستگی سے بولی۔" غلام محمد آپ نے مجھے نہیں دیکھا لیکن میں نے آپ کو دیکھا ہے تب سے اب تک میں ہر وقت صرف آپ کو ہی دیکھنا چاہتی ہوں لیکن لیکن......" وہ بولتے بولتے خاموش ہوگئی۔

پھر وہ چلنے لگ گئے غلام محمد خاموش ہو گئے ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا بولیں ان کی تربیت اور عادت کچھ ایسی تھی کہ انہیں بڑھ بڑھ کر بولنا نہیں آتا تھا نہ ہی اپنی مختصر سی زندگی میں اپنی بہن اور والدہ کے علاوہ کسی عورت سے بے تکلف ہوئے تھے ان کے لئے یہ معاملہ ایک افتاد کی طرح تھا۔

"غلام محمد میں اپنے بارے میں سب کچھ بتاؤں گی پہلے اپنے دل سے پوچھو۔ اپنی زندگی کے فیصلے خود کرو دوسروں کے ہاتھ میں مت دو۔" اتنے میں نجانے کہاں سے ایک بگھی آ کر وہاں رک گئی جو کہ ساری خالی تھی کوچوان ہی دکھائی دیا، وہ لڑکی اس میں سوار ہوئی، انہیں بھی بیٹھنے کو کہا تو وہ خاموشی سے بیٹھ گئے اور بگھی چل پڑی۔

ان کے گاؤں کے بالکل قریب آ کر رک گئی وہ اترے، ابھی شکریہ ادا کرنا ہی چاہتے تھے کہ بگھی ہوا ہوگئی تو وہ ایک سانس بھر کر گھر کی جانب ہو لئے۔

رات وہ سونے کے لئے لیٹے تو اس شام پیش آنے والے واقعات کے بارے میں سوچنے لگے، انہوں نے اس پر کسی سے فی الحال بات کرنا بہتر نہیں سمجھا۔ اس لڑکی کا سراپا ان کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر نظر آ جائے پھر ان سے باتیں کرے، دفعتاً دل میں خیال آیا کہ حاجرہ خاتون نے تاکید کی تھی کہ کوئی بھی بات ہو صرف ان کو آ کر بتائیں لہٰذا وہ اگلے دن حاجرہ خاتون سے ملنے کا فیصلہ کر کے سو گئے۔

نصف رات کے قریب ان کی آنکھ کھل گئی انہیں سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیوں جاگ گئے پھر ان کی طبیعت پر بوجھ پڑنے لگا جو چند ہی منٹوں میں بڑھتا گیا وہ بے چین ہو کر بیٹھ گئے پھر خود ہی دل چاہنے لگا کہ وہ نیچے جائیں وہ آہستگی سے اٹھے اور نیچے کا رخ کیا نیچے اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئے کمرے میں گہرا اندھیرا تھا پھر بھی نجانے کیوں ان کے بوجھ میں کمی ہونے لگی یہاں تک کہ وہ پرسکون ہو گئے گرمی کے باوجود انہیں گرمی نہیں لگ رہی تھی وہ سونے کی کوشش کرنے لگے۔

اندھیرے میں اچانک ایک سایہ سا لہرایا پھر وہی خوشبو پھیل گئی، اس بار وہ جاگ رہے تھے اس لئے کچھ چونک سے گئے دھیرے سے کوئی لمس ان کو اپنی کمر پر محسوس ہوا وہ ڈرے نہیں بس متجسس ہو گئے ان کے کان میں بالکل مدھم سی سرگوشی ہوئی۔" آپ مجھے یاد

کر رہے تھے ناں۔" اس کے بعد خاموشی۔

انہوں نے خود ہی مخاطب کیا۔ "مجھے لگتا ہے کہ تم یہاں ہو اگر ہو تو پھر سامنے کیوں نہیں آتی۔؟" لیکن اس کے بعد وہ انتظار ہی کرتے رہ گئے۔

☆......☆......☆

حاجرہ خاتون امور خانہ داری سے فارغ ہونے کے بعد اطمینان سے بیٹھ رہیں صاحبزادے اور شوہر تو عشاء کی ادائیگی کے بعد مسجد چلے گئے مگر وہ عشاء کی نماز پڑھنے کی بجائے گہری سوچ میں بیٹھی رہیں وہ اس گتھی کو سلجھانے کے لئے سرا تلاش کرتی رہیں جب تک سرا ہاتھ لگا دونوں کی واپسی ہوگئی تو کرانی کو دودھ تیار کر کے دینے کا کہہ کر انھیں شوہر سے کہا کہ۔ "آج انہیں کچھ خصوصی وظائف کرنے ہیں لہٰذا وہ ان کا انتظار کرنے کے بجائے سو جائیں انہیں کچھ وقت لگے گا۔" اس کے بعد وضو کر کے اپنی عبادت کی کوٹھری میں آ گئیں عشاء ادا کی اس کے بعد کافی دیر تک اپنے وظائف میں مشغول رہیں۔

دفعتاً ان سے کچھ فاصلے پر ایک ادھیڑ عمر عورت نمودار ہوئی اس نے آہستگی سے انہیں سلام کیا اور قریب آ کر زمین پر بیٹھ گئی۔ "بی بی ہم ناچیز کو کیسے یاد کیا۔؟"

"بلقیس ہم نے تم سے کچھ باتیں جاننا تھیں اس لئے زحمت دی۔"

"زحمت کیسی بی بی، ہم غلام ہیں، پوچھیئے۔"

پھر کافی دیر تک حاجرہ خاتون ان سے دھیمی آواز میں گفتگو کرتی رہیں مطمئن ہونے کے بعد اس خاتون کو جانے کی اجازت دے دی بلقیس الوداعی سلام کرنے کے بعد ویسے ہی غائب ہوگئی۔

حاجرہ خاتون پھر دوبارہ پڑھائی میں مشغول عبادت ہوگئیں نصف گھنٹہ کے بعد کچھ پڑھ کر انہوں نے مغرب کی جانب پھونک ماری اس کے چند لمحوں کے بعد ایک لڑکی ان کے سامنے آ موجود ہوئی اس نے سر پر سیاہ دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا نگاہیں جھکی ہوئی تھی اس ان سے دو قدم قریب آ کر سلام کیا۔

"پتر میرے قریب آ کر بیٹھ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

لڑکی خاموشی سے ان کی جائے نماز کے پاس بیٹھ گئی۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم بھی ہماری طرح مسلمان ہو، کلثوم نام ہے ناں تمہارا، والد فوت ہو چکے ہیں، حافظ قرآن بھی ہو، اس لئے میرے دل میں تمہارا احترام ہے۔ تم بتاؤ کہ غلام محمد سے تمہیں کیا دلچسپی ہے۔؟"

"جب آپ میرے متعلق سب کچھ جانتی ہیں تو یہ بھی معلوم ہوگا۔"

"نہیں یہ نہیں معلوم اس لئے خود ہی کچھ بتاؤ۔"

"غلام محمد سے ملنا بس ایک اتفاق تھا میں نے انہیں دیکھا مگر انہوں نے نہیں، ایک بار دیکھ لینے کے بعد پھر کچھ بھی اور دیکھنے کی خواہش نہیں رہ گئی مجھے ان کے ظاہر سے ان کا باطن نظر آیا میں نے انہیں ظاہری دیکھنے کے بعد پسند ضرور کیا تھا لیکن کئی روز ان کے ساتھ ساتھ رہنے پر میرا ارادہ مصمم ہے۔

میں اپنی محبت اور چاہت کا احوال الفاظ سے بیان نہیں کر سکتی، بس التجا کر سکتی ہوں۔" یہ کہنے کے بعد اس نے اپنے ہاتھ ان کے پاؤں پر رکھ دیئے اس کی سسکیاں خاموش فضا میں گھلنے لگیں اس کے انداز نے حاجرہ خاتون کو سن کر دیا وہ سوچ بیٹھی تھیں کہ ان کے سامنے روایتی ہستی آئے گی اور وہ ہمیشہ کی طرح اپنے دبدبے سے اپنی بات منوا لے گی مگر یہ سب ان کے اندازوں سے بالکل الٹ تھا۔"

انہوں نے اس کے سر پر دست شفقت بھرا رکھا اور نرمی سے پچکارا۔

کلثوم نے اپنی روشن آنکھیں ان پر مرکوز کر دیں۔ "بی بی مجھے معلوم ہے کہ آپ مجھے غلام محمد سے دور کر سکتی ہیں آپ کے اختیارات ہمارے اختیارات سے زیادہ ہیں مگر یاد رکھیئے گا میرا خون آپ کی گردن پر ہوگا، براہ کرم مجھے سمجھائے گا بھی نہیں کیونکہ میری محبت آپ انسانوں کی طرح عارضی نہیں۔ میں اس تعلق

کو نبھانے کے لئے ہر طرح کی قربانی دوں گی۔"
حاجرہ خاتون نے کہا "میں نے ابتداء میں ہی اس معاملے کو بھانپ کر اس کی والدہ کو بلوا کر اس کی شادی کی بات کان میں ڈال دی تھی، اب تک تو یقیناً معاملہ آگے بڑھ چکا ہوگا کیا یہ مناسب ہوگا کہ وہ لوگ اپنوں کے سامنے شرمسار ہوں۔"
"آپ اتنی چھوٹی بات کو میرے معاملے پر ترجیح نہ دیں آپ کے مرتبے کے سامنے میری زبان کچھ کہنے سے عاجز ہے آپ معاملہ فہم ہیں، مجھے مجبور مت کریں میں آپ کو اپنے اور غلام محمد کے تعلق کی بنیاد بنا رہی ہوں آپ اسے لاتعلقی میں مت بدلئے گا۔" اس کے بعد اس نے اجازت مانگی اور اس کا وجود تاریکی میں کھو گیا۔
حاجرہ خاتون نڈھال سی ہو گئیں مزید بیٹھنا ممکن نہ رہا وہ اٹھ کر اپنی خوابگاہ میں آ کر پلنگ پر دراز ہو گئیں وہ خاصی پریشان تھیں پھر بھی سوچتے سوچتے آخر سو گئیں۔

☆......☆......☆

تمام رات انتظار میں گزر گئی غلام محمد نہیں جانتے تھے کہ ان سے ملنے آنے والی اچانک چلی کیوں گئی، بہر حال وہ رات تو جاگ کر بسر ہوئی فجر کی اذان سے قبل وہ آ کر ادا پر لیٹ گئے اور پھر وہی معمولات جو روز ہوتے تھے۔ آنے والا دن ان کی دفتری تعطیل کا لہٰذا دفتر جانے کی فکر نہیں تھی، ناشتے پر والدہ نے احمد دین یعنی ان کے والد کو یاد دلایا کہ وہ آج تیار رہیں غلام محمد کے رشتے کے سلسلے میں ان کے بھائی کے ہاں جانا ہے جبکہ احمد دین اپنے بھائی کا ذکر لے بیٹھے مگر نور بی بی کے دلائل کے سامنے قائل ہونا ہی پڑا ان کے چھوٹے بھائی بھی اپنی اپنی رائے دیتے رہے صرف وہی خاموش رہے معلوم نہیں کیوں انہیں اس ذکر سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔
ناشتے کے بعد وہ والد کو پیر صاحب کے گھر کا کہہ کر نکل آئے، ان کا ارادہ حاجرہ خاتون سے ملنے کا تھا وہ اس مبہم اور غیر واضح صورت حال سے الجھ گئے تھے اسے اماں ہی سلجھا سکتی تھیں وہاں آئے تو عابد حسین گھر پر نہیں تھے اپنی بہن کو بغرض علاج شہر لے کر گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اماں سے پوچھا۔ "اماں چھوٹی بی بی کب بیمار ہوئیں اور بیمار بھی ایسی کہ علاج کے لئے شہر جانا پڑا۔ مجھے بتایا ہوتا تو میں عابد حسین کے ساتھ جاتا۔" اس موقع پر وہ اپنی پریشانی بھول گئے جواباً حاجرہ خاتون نے تسلی دی اور کہا کہ "پریشان نہ ہو بچی کے پیٹ میں کافی دن سے تکلیف تھی مقامی علاج سے فائدہ نہیں ہوا تو شہر لے جا کر علاج کروانا پڑا۔
خیر کی پائی کا پوچھا پھر انہیں کہا کہ "ایک اہم معاملہ پر بات کرنی ہے۔"
غلام محمد کہنے لگے۔ "اماں میں بات کرنے کے لئے ہی آیا تھا مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہے۔"
اس کے بعد انہوں نے گزشتہ دن اور رات کا واقعہ بیان کر دیا۔ ان کے خاموش ہونے پر حاجرہ خاتون نے کہنا شروع کیا۔
"پتر جو بات میں کہنے والی ہوں وہ عام بات نہیں کچھ معاملات بہت نازک ہوتے ہیں انہیں بہت سوچ سمجھ کر حل کرنا ہوتا ہے تمہارا سابقہ قوم جنات کی ایک لڑکی سے پڑا ہے، عمر کے حساب سے وہ ہم انسانوں میں لڑکی ہی شمار ہوگی تم اس کی زندگی اور نظر میں آنے والے پہلے مرد ہو، جس کے ساتھ وہ پوری طرح سنجیدہ ہے میں نے پہلے اس کے بارے میں تمام معلومات حاصل کیں اور پھر اسے بذات خود حاضر کیا اس معاملے میں زور زبردستی نہیں کر سکتی کیونکہ وہ مسلمان اور حافظہ بھی ہے، تمہارے اوپر وہ کسی بھی سمجھوتے کے لئے تیار نہیں مگر ہم دنیا دار انسان ہیں ہمیں اسی معاشرے میں رہنا ہے، ہمارے ہاں ایسے رشتے نہ بنائے جاتے ہیں اور نہ نبھائے جاتے ہیں۔
اس معاملے میں اپنی رائے دو کہ تمہارا کیا فیصلہ ہے اس مسئلہ کا واحد حل تمہارا انکار ہے اگر تم خود اسے اپنانے سے انکار کر دو تو وہ خود مایوس ہو کر پیچھے ہٹ جائے گی اس صورت میں ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوگا لیکن اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔"
غلام محمد یہ سب جان کر بہت متفکر ہو گئے انہیں کچھ کچھ شک تھا کہ نا معلوم وہ کون ہو سکتی ہے مگر سب واضح

سن لینے کے بعد وہ دم رو کے بیٹھے تھے بہر حال غلام محمد ایک نو عمر نوجوان تھے نا کہ ایک پختہ کار بزرگ جو کہ لمحوں میں فیصلہ کر لیتے۔

"اماں میں کیا کہہ سکتا ہوں مگر ابھی کہنا بھی نہیں چاہتا۔" غلام محمد گویا ہوئے۔ "آپ اس مسئلہ کو یہیں چھوڑ دیں، بی بی صحت یاب ہو جائیں تو کچھ سوچیں گے۔" اس کے بعد انہوں نے اجازت لی اور گھر کی جانب ہوئے۔

گھر آئے والدہ نے کھانے کو پوچھا تو انہوں نے بتا دیا کہ کھانا وہ دوست کے گھر سے کھا کر آئے ہیں پھر چارپائی پر ان کے بالکل قریب جا بیٹھے ماں کا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگے۔ "اماں میں چاہتا ہوں کہ ابھی آپ اور ابا میرے رشتہ کے لئے کہیں بھی نہ جائیں کچھ عرصہ رک جائیں۔"

نور بی بی نے سوال کیا۔ "پر کیوں پتر اگر ذہن کسی طرف ہے تو بتا۔"

"نہیں اماں میرا ذہن کسی بھی طرف نہیں ہے اسی لئے تو منع کر رہا ہوں بس آپ لوگ ابھی کہیں نہ جاؤ میرا دل نہیں مانتا ابا کو بھی تم ہی بتا دینا، میرا نام نہ لینا، زیادہ دیر نہیں بس کچھ وقت دو پھر اپنی مرضی سے جو چاہے کرنا۔"

جواباً نور بی بی نے انہیں تسلی دی کہ فی الحال وہ اس سرگرمی کو موقوف کر دیتی ہیں بعد میں اس بارے میں کچھ کر لیں گے۔ پھر آرام کرنے کی نیت سے اپنے کمرے میں آ گئے گرمی اپنے عروج پر تھی اس وقت وہ قیلولہ کرنے لیٹ گئے ان کے دونوں بھائی اس وقت نجانے کہاں تھے وہ تنہا ہوئے تو آج صبح ہونے والی باتوں پر غور و فکر کرنے لگ گئے وہ اپنے طور پر فیصلہ کرنا چاہتے تھے دل مسلسل کلثوم کی طرف کھنچ رہا تھا جبکہ دماغ اس غیر فطری رشتے پر سماج اور گھر والوں کے رد عمل سے ڈرا رہا تھا نجانے کتنی دیر وہ سوچتے رہے پھر گہری نیند سو گئے۔ وہ غالباً خواب دیکھ رہے تھے لیکن نہیں یہ خواب نہیں تھا وہ ایک نامعلوم سی جگہ پر تھے ایک بڑا سا کمرہ سجا سجایا اور خوب صورت ایک طرف مسہری پڑی ہوئی تھی شاہانہ طرز کی جیسے کسی مغل شہنشاہ کی ہو اس کے قریب وہ خود ایک زرنگار کرسی پر بیٹھے تھے پورا کمرہ ان کے علاوہ کسی بھی ذی روح سے خالی تھا انہیں لگا کہ وہ کسی کا انتظار کر رہے ہوں پھر مانوس سی خوشبو کے ساتھ وہ کمرے میں آئی دھیرے دھیرے چلتے ہوئے ان کے بالکل سامنے مسہری پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے فیروزی رنگ کا خوب صورت لباس پہن رکھا تھا اس کی خوب صورتی پر اس کے حور ہونے کا گمان ہوتا تھا۔

اس نے انہیں سلام کیا۔ "میرا نام کلثوم ہے آگے یقیناً آپ جان گئے ہوں گے۔" اس نے جھکی جھکی نگاہوں کے ساتھ کہا۔

"ہاں مجھے اماں نے بتایا ہے۔" وہ بولے۔

"تو پھر آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟" کلثوم نے سوال کیا۔

غلام محمد نے کہا۔ "میں آپ کو جان ہی کہاں پایا ہوں کہ فیصلہ کر سکوں۔"

"آپ کی اماں کی مداخلت کے باعث مجھے ابتداء میں ہی اپنا آپ ظاہر کرنا پڑا، ورنہ میں نے پہلے آپ کے دل میں جگہ حاصل کرنے کے بعد ہی یہ سوال اٹھانا تھا یا شاید یہ سوال کرنے کی نوبت ہی نہ آتی مگر اب آپ کو فیصلہ سنانا ہی ہوگا لیکن یاد رکھئے گا کہ آپ آدم زاد تو چند دہائیوں کی زندگی پاتے ہیں مگر ہم ہزار ہا سال جیتے ہیں، آپ تو انکار کرنے کے بعد نئی زندگی شروع کر لیں گے جو ہمارے نزدیک بہت مختصر سی ہوتی ہے لیکن میں صدیوں کے لئے زندہ مصلوب ہو جاؤں گی کیونکہ آپ کے بعد زندگی صرف قید تنہائی ہوگی۔"

"مگر کلثوم میں دل و جان سے آپ کو قبول کر بھی لوں تو باقی سب کو کیسے مطمئن کروں گا۔"

غلام محمد کی بات پر کلثوم مسکرائی اور نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا۔ "آپ نے مجھے قبول کر کے میری تمام پریشانی ختم کر دی ہے اور آپ کی پریشانی ختم کرنا میرے ذمہ ہے آپ کو کچھ نہیں کرنا صرف اپنا فیصلہ حاجرہ خاتون تک پہنچا دیجیے کیونکہ ایسا نہ ہو کر وہ آپ کو مجبور کر دیں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور غلام محمد کے پاؤں میں بیٹھ کر ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "غلام محمد آپ زبان دیجیے اور وعدہ

کیجیے کہ آپ کسی کو خاطر میں نہیں لائیں گے اور مجھ سے ضرور شادی کریں گے۔"

غلام محمد گویا ہوئے۔"اگر میں آپ سے نہ ملا ہوتا تو معمول کے مطابق ہی زندگی گزارتا وہی کرتا اور ہوتا جو سب کرتے ہیں جو ہوتا چلا آرہا ہے مگر اب آپ کے علاوہ میں کسی کو شاید زندگی میں جگہ تو دے سکوں مگر دل میں نہیں۔"

اس بات پر کلثوم اٹھی اور ان کا شکریہ ادا کیا اور پھر ایک چھوٹی سی سونے کی ڈبیہ غلام محمد کو دی اور کہا" پہلی فرصت میں حاجرہ خاتون کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیجیے وہ اگرچہ مخالفت کریں گی مگر آپ اپنے ارادے پر مضبوطی سے قائم رہئے گا جب وہ آپ کے فیصلے سے متفق ہو جائیں تو یہ ڈبیہ ان کو دیجیے گا، آگے کے معاملات ان کے ساتھ ہمارے قبیلے کے بڑے باہمی رضا مندی سے طے کریں گے۔"

پھر یہ منظر تحلیل ہو گا گیا۔ عصر کی اذان بلند ہوئی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھے وہ پسینے سے شرابور تھے انہیں لگا کہ وہ خواب دیکھ رہے تھے لیکن اٹھتے ہوئے لگا کہ ہاتھ میں کچھ ہے دیکھا تو وہی طلائی ڈبیہ ان کے ہاتھ میں تھی، نجانے کیوں ان کا دل خوشی سے بھر گیا۔"تو یہ سب سچ تھا۔" وہ خود سے مخاطب ہوئے۔"اب میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا۔" ڈبیہ کو احتیاط سے جیب میں محفوظ کیا اور درود شریف پڑھتے ہوئے وضو کرنے چل دیئے۔

نماز کے بعد خیال آیا کہ" حاجرہ خاتون سے فوراً ملنا مناسب نہیں ابھی کچھ روز ٹھہر جاتا ہوں پھر اس بابت اپنے فیصلہ سے انہیں آگاہ کروں گا ورنہ وہ اسے میرا جذباتی قدم سمجھیں گی۔" دل میں یہ طے کر کے مطمئن ہو گئے۔

دو دن معمول کے مطابق گزر گئے تیسرے روز وہ اپنا کام نمٹا کر گھر آرہے تھے گرمی کے باعث سنسانی چھائی ہوئی تھی اور کوئی یکہ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا وہ آیات کا ورد کرتے ہوئے آرہے تھے دفعتاً چار حضرات بہت معزز، دکھائی دینے والے لمبے چوڑے مضبوط جسم اور ادھیڑ عمر، ان کے قریب آکر سلام کیا باری باری مصافحہ کیا پھر بولے۔" بیٹا تم سے کچھ بات کرنی ہے ہمارے ساتھ چلو۔"

غلام محمد کو ایک لمحے کے لئے کچھ اشتباہ ہوا لیکن پھر کچھ سوچ کر ان کے ہمراہ چلنے کو تیار ہو گئے وہ انہیں لے کر شمال کی جانب چل پڑے بامشکل پچیس قدم چلے ہوں گے کہ سامنے ایک گھر دکھائی دیا وہ انہیں لے کر اندر آئے ایک بڑے سے کمرے میں آکر بیٹھایا اور خود چاروں ان کے دائیں بائیں بیٹھ گئے ان میں سے جو سب سے بزرگ تھے انہوں نے بات کا آغاز کیا۔"بیٹا ہمارے قبیلے کے ایک معزز فرد کی بیٹی نے ہم سے تمہارے لئے درخواست کی ہے۔ چونکہ اب وہ معزز ہستی مرحوم ہو چکے ہیں اور ان کی جان بھی قبیلے کی دفاع میں ہونے والی جنگ میں گئی تھی اگر یہی بات ہمارے قبیلے کی کوئی اور خاتون کرتی تو وہ ہمارے لئے نا صرف نا قابل قبول ہوتی بلکہ نا قابل معافی بھی، لیکن چونکہ درخواست گزار نا صرف قابل احترام ہستی ہے بلکہ ہماری بچیوں کی معلمہ بھی الہٰذا ہم کوئی سخت قدم نہیں اٹھا سکتے۔ دوسرا آپ کے سر پر حاجرہ خاتون کا ہاتھ بھی ہے۔

ہم شریر جنات سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ امن پسند اور حدود کے پابند مسلمان جنات ہیں اور یہ طے ہے کہ شادی کے بعد وہ بالکل انسانوں جیسی رہے گی، جناتی فطرت سے بہت دور ہو جائے گی یعنی کسی وقت بھی اس کے جنی ہونے کا شبہ تک نہیں ہو سکے گا۔ آپ بتایئے آپ نے کیا طے کیا ہے۔؟"

جواباً غلام محمد چند لمحے خاموش رہے پھر گویا ہوئے۔"محترم آپ کی نرم خوئی کا شکریہ آپ ہی بتایئے کلثوم خاتون عورت ہو کر میرے لئے اپنے خاندان معاشرہ اور پیاروں کی قربانی دے کر میرا ساتھ چاہتی ہیں، ہماری زندگی آپ کے مقابلے میں بے حد مختصر ہوتی ہے میرے بعد انہوں نے تنہائی کا صحرا عبور کرنا ہے۔ انہوں نے چل کر میرے ساتھ آنا ہے ایک دوسرے معاشرے کو اختیار کرنا ہے جو ان کی فطرت پر نہیں ناکہ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ جانے کا مطالبہ کیا ہے۔ پھر میں مرد ہو کر کیوں پیچھے ہٹوں اور انہیں مایوس کروں۔ ان کے جذبہ صادق نے مجھے بہت مضبوط کر دیا ہے میں بھی ان کی محبت میں مبتلا ہوں آگے آپ اپنا فیصلہ صادر کر دیجیے تاکہ ہم

دونوں کی قسمت کا فیصلہ ہو جائے۔"

یہ سن کر ان کے بائیں جانب بیٹھے ہوئے باریش بزرگ نے "سبحان اللہ" کہا پھر کہنے لگے۔ "ہماری بچی کا انتخاب غلط نہیں، آپ نے ہمارے تمام شکوک رفع کردیئے ہیں آپ جا کر شادی کے انتظامات کیجیے باقی ہم سنبھال لیں گے ہم سب بصورت انسان آ کر آپ دونوں کی شادی انجام دیں گے آپ کو کوئی وضاحت نہیں دینی پڑے گی۔ ہم اجازت ملتے ہی حاجرہ خاتون سے ملاقات کرتے ہیں۔" وہ تمام اٹھ کھڑے ہوئے اس بار انہوں نے پیشانی پر بوسہ دیا اور دروازے پر آ کر رخصت کیا، غلام محمد اپنی خوشی کو سنبھالتے ہوئے گھر آ گئے۔

اسی شام انہوں نے جا کر اماں کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا ساتھ ہی کلثوم کی دی ہوئی طلائی ڈبیہ ان کے ہاتھ میں دھر دی جو کہ انہوں نے خاموشی سے لے لی اور انہیں بے فکر رہنے کو کہا غلام محمد کے لئے ان کا رویہ بہت حیران کن تھا انہیں ان کی طرف سے بھرپور مزاحمت کی توقع تھی کہ وہ انہیں اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کریں گی، مگر انہوں نے کوئی باز پرس کرنے کی بجائے خاموشی سے اس معاملے کو نمٹانے کی حامی بھر لی پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گئے کہ انہوں نے خود جہاں حیرت چنا ہے اب قدم قدم پر حیرتیں ہی دیکھنے کو ملیں گی۔ اس کے بعد کچھ خیال آیا تو اماں سے پوچھنے لگے۔ "اماں میرے اماں ابا کو کون آمادہ کردے گا جبکہ ظاہری طور پر ابھی کچھ ان کو بتانے اور دکھانے کو نہیں ہے۔" اس پر اماں نے اس طرف سے بالکل بے فکر ہونے کو کہا اور بولیں "انتظار کرو اور دیکھو یہاں تمہارے کرنے کے لئے کوئی کام نہیں۔" وہ اجازت لے کر پلٹ آئے۔

ان کی اس ملاقات کے چار روز کے بعد شام میں وہ گھر پر موجود تھے تو پیر نیاز حسین کے گھر سے نوکرانی آئی اور سیدھے نور بی بی کو مطلع کیا کہ۔ "ذرا دیر میں حاجرہ خاتون ان کے گھر تشریف لا رہی ہیں۔"

یہ سنتے ہی سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہ حاجرہ خاتون آ رہی ہیں ایسا کبھی بھی نہیں ہوا کہ وہ کسی کے گھر بذات خود چل کر آئی ہوں سوائے کسی کی اہم شادی کی تقریب ہو تو دو چار لمحوں کے لئے اہل خانہ کے اصرار پر دلہا دلہن کو دعا دینے کو آ جاتی تھیں۔

ضروری سے ضروری معاملات کے لئے بھی اہل گاؤں کی خواتین خود جا کر ملاقات کرتی تھیں ان کے لئے تو بہر حال یہ اعزاز تھا کہ وہ ان کے ہاں آ رہی ہیں تمام افراد بھاگ دوڑ کر ان کے لئے انتظامات میں لگ گئے اس بھاگ دوڑ میں خوشی بھی تھی اور تشویش بھی۔ برآمدے میں ان کی نشست کا انتظام ہوا کہ وہ پردہ دار ہیں صحن میں بیٹھنا مناسب نہ ہوگا۔

چند ثانیوں بعد وہ آئیں تو آگے بڑھ کر نور بی بی نے ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئیں، احمد دین فوراً منظر سے ہٹ گئے کہ بی بی غیر مردوں سے پردہ کرتی ہیں انہیں بیٹھایا گیا تواضع کے انتظامات غلام محمد کے چھوٹے بھائیوں نے سنبھال لئے غلام محمد لپک کر ان کے پاس بیٹھ گئے رسمی باتوں کے بعد وہ نور بی بی سے کہنے لگیں۔ "نور تجھے میرے یہاں آنے پر ضرور حیرت ہو رہی ہو گی مگر کام کچھ ایسا تھا کہ خود آنا مناسب تھا۔" پھر غلام محمد کو کہا۔ "بیٹا آپ یہاں سے جاؤ اور اپنے والد کو بھیجو مجھے دونوں سے تنہائی میں ایک بات کرنی ہے۔" وہ اٹھے کمرے میں بیٹھے والد کو بھیج دیا اس کے بعد ان کے درمیان بات چیت کا آغاز ہوا یہ نشست ایک گھنٹے چلی اس کے بعد وہ رخصت ہونے لگیں۔

تمام اہل خانہ کے اصرار پر وہ کھانے پر رک گئیں پھر مغرب کی نماز ادا کر کے رخصت ہوئیں۔

غلام محمد اپنے والدین کی زبانی اس بات چیت کا احوال جاننے کے لئے بے چین ہو رہے تھے مگر خود سوال کرتے ہوئے حجاب آڑے آتا تھا خیر جیسے تیسے تمام امور نمٹائے گئے عشاء پڑھ کر سب چھت پر سونے کے لئے آئے ان کے بھائی بھی والدین کو گھیر کر بیٹھ گئے کہ اس تازہ ترین واقعہ کے بارے میں پوچھیں غلام محمد بھی اسی حلقے میں آ کر شامل ہو گئے تا کہ وہ بھی جان سکیں احمد دین ان کے والد نے کہا۔ "آج بی بی غلام محمد کے رشتے کے بارے میں بات کرنے آئیں تھیں وہ چاہتی ہیں کہ غلام

محمد کی شادی ان کی پسند کی ہوئی لڑکی سے کی جائے جو کہ ان کے جان پہچان کے لوگ ہیں۔"

واضح رہے یہ وہ دور تھا جب خاندان برادری کی اکائی بہت محدود اور مضبوط ہوا کرتی تھی خاندان سے باہر شادی کا تصور تک نہیں تھا شادی بیاہ کے معاملات صرف والدین اور بھائی بہن نہیں بلکہ برادری کے بڑوں کی شمولیت سے طے پاتے تھے۔

ان لوگوں کے لئے یہ معاملہ گھمبیر تھا لیکن حاجرہ خاتون نے انہیں درپردہ حکماً یہ نسبت طے کرنے کو کہا تھا اور ان کا حکم نہ ماننا ان کے لئے ناممکن تھا لہٰذا کل وہ تمام اہم رشتہ داروں کے ہمراہ مزید تفصیلی بات چیت کے لئے پیر نیاز حسین کے گھر جانے والے ہیں غلام محمد کو قطعاً حیرت نہ ہوئی جبکہ ان کے بھائی سخت حیران ہوئے۔

حاجرہ خاتون نے اپنے شوہر پیر نیاز حسین کو تنہائی میں بلا کر تمام واقعہ گوش گزار کیا اور یہ بتایا کہ "چار روز قبل کلثوم کے قبیلہ کے اہم افراد ان کے سامنے حاضر ہو کر اس غیر رسمی شادی کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں وہ باقاعدہ حاجرہ خاتون کے میکہ والوں کے جان پہچان والے عزیز بن کر رشتے اور شادی کے معاملات انجام دیں گے تاکہ کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو وہ شاید اس معاملے کو نرمی سے نہ برتتے۔ مگر حالات کے پیش نظر دونوں فریقین کو افہام و تفہیم سے چلنا ہوگا۔"

پیر صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ انہیں بصورت انسان بلالیں وہ دونوں طرف کے لوگوں کی ملاقات کروا کر بدست خود یہ شادی طے کروائیں گے اگرچہ کہ برادری سے باہر شادی ان کے یہاں تقریباً ناممکن ہے مگر ان کے خود اور حاجرہ خاتون کی شمولیت کے باعث تمام اعتراضات دم توڑ دیں گے۔

اگلے دن احمد دین اور نور بی بی اپنے قریبی اعزاہ کو لے کر پیر صاحب کے گھر گئے یہ پہلا موقع تھا کہ گاؤں کے کسی فرد کی شادی کا معاملہ پیر نیاز حسین کے گھر پر ان کی اہلیہ کی پسند پر طے ہو رہا تھا یہ بات ایک ہی دن میں تقریباً تمام گاؤں میں پھیل گئی خیر وہ ان کے ہاں پہنچے تو وہاں پیر نیاز حسین، عابد حسین اور چند خاص اشخاص کے علاوہ سات آٹھ مرد اور دو خواتین بھی تھیں آنے والے تمام لوگ ان ہستیوں کو دیکھ کر کچھ مرعوب ہو گئے کیونکہ یہ تمام کے تمام بہت بارعب اور معزز دکھائی پڑتے تھے ساتھ ہی حسن و جمال کا نمونہ بھی۔ پہلے رسمی سلام دعا اور گفتگو ہوئی اور دودھ بادام کے مشروب سے تواضع کی گئی ان تکلفات کے بعد پیر صاحب غلام محمد کے والدین اور ان کے اعزاہ سے بات چیت کا آغاز کیا اگرچہ گاؤں کے معاملات اہل گاؤں خود ہی طے کرتے ہیں مگر غلام محمد کا معاملہ الگ ہے حاجرہ خاتون اپنی پسند سے ان کی نسبت طے کرنا چاہتی ہیں اگر کسی کو اعتراض ہے تو وہ کہہ سکتے ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے ان ہستیوں کا تعارف اپنی اہلیہ کے دور کے عزیزوں کے طور پر کروانے کے بعد رشتے پر بات شروع کر دی اور بذات خود اس نسبت کو طے کرنے کی درخواست کی اس پر احمد دین نے فوراً اٹھ کر ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور کہا۔" آپ اور بی بی دونوں بہت عقیدت و احترام والی ہستیاں ہیں آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" پھر انہوں نے دونوں بھائیوں سے رائے مانگی جو سب نے پیر صاحب پر اعتماد کا اظہار کیا پھر نیاز حسین نے عورتوں کو کہا کہ" وہ گھر کے اندر چلی جائیں اور بچی دیکھ لیں کیونکہ ان لوگوں کی رہائش بہت دور پار کے علاقے میں ہے اس لئے احمد دین کے اہل خانہ کی سہولت کے لئے انہیں یہاں بلایا گیا ہے۔"

تمام خواتین گھر کے اندرونی حصے میں آ گئی حاجرہ خاتون کی دست بوسی کی محبت سے ملیں پھر انہوں نے کلثوم اور ان کی والدہ کو بلوایا ان دونوں کے آنے سے کمرہ روشن سا ہو گیا والدہ تو حسن و وقار کا مجموعہ تھیں جبکہ خود کلثوم کو دیکھتے ہی نور بی بی مبہوت ہو کر رہ گئیں انہیں اندازہ نہیں تھا کہ حاجرہ خاتون کی پسند ایسی بے مثال ہوگی انہوں نے بڑھ کر سر پر ہاتھ پھیرا تو پورے بدن میں لہری اتر گئی۔ انہوں نے اس لڑکی کی والدہ سے بات چیت کی تو معلوم ہوا کہ بچی حافظ قرآن اور معلمہ ہے تو بہت خوشی اور فخر ہوا ان کے دل میں اب تک اپنی بھتیجی کے نہ لاسکنے کا

جوملال تھا دھل گیا۔

البتہ انہیں کلثوم کی والدہ بلقیس کچھ خاموش خاموش اورافسردہ سی لگیں۔ بہر حال انہوں نے اپنی رضا مندی ظاہر کردی تو فوراً باہر مردوں کو اطلاع کردی گئی۔ پیر صاحب نے اطلاع پاتے ہی رشتہ طے کر کے دعا خیر کردی۔

اس کے بعد صرف پندرہ دن کی مختصر مدت کے بعد تاریخ طے کردی بارات، انہی کے گھر پر لانے کو کہا گیا کیونکہ وجہ وہی بیان ہوئی کہ ان کا رہائشی علاقہ بہت ہی دور تھا جہاں سفر کر کے جانا محال تھا۔ کلثوم کے بڑوں نے درخواست کی کہ شادی میں شور ہنگامہ نہ کیا جائے کیونکہ وہ سب بہت مذہبی خیالات رکھنے والے لوگ ہیں وہ سادگی اور خاموشی سے یہ رسم کرنا چاہتے ہیں جو کہ پیر صاحب کے اتفاق رائے سے مان لیا گیا۔

آگے کا قصہ مختصر پندرہ روز کے بعد غلام محمد کا نکاح دختر آتش سے ہوگیا۔

حاجرہ خاتون نے کلثوم کو بہت ساری تاکید اور ہدایات کے ساتھ رخصت کیا کہ وہ انسانی دنیا میں آگئیں ہیں کچھ بھی ایسا نہ ہو یعنی بھول کر بھی جناتی فطرت سامنے نہ آئے جس کی وجہ سے غلام محمد کے اہل خانہ یا گاؤں کے لوگوں میں شبہات پیدا ہوں۔" غلام محمد کو بھی کہا "وہ جلد تبادلہ کروالیں تاکہ وہ اس بہانے سے والدین سے الگ رہیں اور بہو کا کوئی گن ان کی نظر میں نہ آسکے۔"

کلثوم غلام محمد کے گھر رخصت ہو کر آئیں تو سیروں سونا اور سیروں چاندی زیورات جہیز میں لائیں جو آتے ہی انہوں نے ساس کے حوالے کردیا کہ وہ حفاظت سے رکھ لیں وہ اپنی مرضی سے کام میں لائیں۔

کلثوم نے اپنے تمام سسرالیوں کی ایسی عزت اور خدمت کی کہ سگی اولاد سے ایسی پذیرائی ملنا محال ہوتی اس کے آنے سے غیر محسوس طریقے سے رفتہ رفتہ وہ سب خوشحال بھی ہوتے گئے۔ پھر غلام محمد نے انتھک کوشش کر کے دور تبادلہ کروالیا اور بیوی کے ساتھ چلے آئے۔ یوں ان دونوں کی زندگی اس قدر محبت کے ساتھ بسر ہوتی رہی کہ وہ مثالی بن گئے۔

ان کے یہاں اولادیں بھی ہوئیں مگر کلثوم ولادت کے موقع پر ہمیشہ اپنے قبیلے میں چلی جاتیں اور بچے کو اپنی والدہ کو دے کر خالی ہاتھ آجاتیں کیونکہ ان کے بچے اس معاشرے میں نہیں رکھے جاسکتے تھے ان دونوں نے یہی ظاہر کیا کہ ان کے بچے ولادت کے وقت ہی مر گئے۔

گزرتے ہوئے ماہ سال میں غلام محمد کے بھائیوں کی شادیاں بھی ہوگئیں وہ اولاد والے بھی ہوگئے غلام محمد نے اپنی نوکری سے صرف تنخواہ کے علاوہ عزت کمائی، ان کی عزت تمام عزیز رشتہ دار اور جان پہچان والے بھی کرتے۔

قیام پاکستان کے بعد ان کے سکھ اور ہندو دوست ہجرت کر گئے کچھ مزید سال گزرے تو غلام محمد کے والدین بھی وقفے وقفے سے انتقال کر گئے۔

حاجرہ خاتون جب تک زندہ رہیں انہوں نے کلثوم کو ماں جیسی محبت دی۔ ان کا انتقال ہوا تو گویا نیاز حسین تنہا ہی ہوگئے۔ انہوں نے اپنی جگہ بیٹے کو دے کر خود گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ غلام محمد کی دوستی اور محبت عابد حسین سے بدستور قائم رہی وہ اپنے بھائیوں بڑی بہن اور ان کی اولادوں سے بہت محبت کرتے تھے اپنے بھانجے بھتیجوں کو جائیدادیں بنادیں تعلیم دلوائی سب کو بس ان سے یہی گلہ تھا کہ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی ان کے ساتھ آکر نہیں رہے ہمیشہ الگ گھر میں رہے مگر اس بات کے پس پردہ حکمت صرف وہی دونوں جانتے تھے۔ ان دونوں کو آپس میں اس قدر محبت تھی کہ کبھی غلام محمد اپنی بیوی سے ایک دن بھی الگ نہ رہے۔

بالآخر پچھتر برس کی عمر میں آکر بیمار رہنے لگے کلثوم نے ان کی خدمت میں اضافہ کردیا، ہر طرح سے علاج معالجہ کروایا مگر بڑھتی عمر کے باعث کمزور ہوتے چلے گئے، یوں طویل بیماری کے بعد ایک شب جمعہ وہ تہجد کے وقت انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے سسرالی رشتہ دار بھی آئے نماز جنازہ کے موقع پر اس قدر ہجوم تھا کہ گاؤں کے لوگ حیران رہ گئے نامعلوم لوگ

صفیہ لباس میں ان کے جنازے میں شامل ہوئے

عدت کے موقع پر کلثوم تنہا گھر میں تھیں تو غلام محمد کی بہن صفیہ ان کے پاس رہنے آ گئیں کہ بھاوج تنہائی سے گھبرا نہ جائیں کلثوم کی حالت دیکھ کر دیکھنے والوں کی آنکھیں چھلک جاتیں انہوں نے شوہر کے مرنے پر آہ و بکا تو نہ کی بلکہ خاموشی سے یہ صدمہ سہا مگر ان کا حال دیکھ کر لگتا تھا کہ ان کا جسم روح سے خالی ہے، وہ بس پردہ نشین ہو کر عبادت کرتی رہیں۔

چار ماہ دس دن انہوں نے کڑی عبادت کر کے گزارے، عدت کے آخری روز انہوں نے نند کو بلا کر کہا۔ ''کل ان کے میکے والے آئیں گے اور ان کو لے جائیں گے۔''

صفیہ نے بہت منت سماجت کی کہ وہ نہ جائیں مگر انہوں نے وہاں رہنا قبول نہ کیا، پھر کلثوم نے صفیہ سے وعدہ لیا کہ وہ انہیں بہت اہم بات بتانے والی ہیں مگر وہ پابند ہوں گی کہ یہ سب حقیقت انہی کی ذات تک محدود رہے اور کسی کے علم میں نہ آئے۔ کلثوم نے اپنی نند کو شروع سے آخر تک تمام حقیقت بیان کر دی۔ جیسے ہی صفیہ کو معلوم ہوا کہ اس کی بھاوج جن زادی ہیں تو انہیں یقین ہی نہ ہوا مگر کلثوم نے جب ثبوت دیا تو وہ قائل ہو گئیں مگر صفیہ کو بالکل خوف محسوس نہ ہوا۔ آخر میں کلثوم نے کہا کہ۔ ''غلام محمد کے بعد زندہ رہنا بالکل بے معنی ہے، معلوم نہیں کتنا عرصہ جی پاؤں مگر آخری ساعتیں وہ غلام محمد سے ہونے والی اپنی اولاد کے ساتھ گزارنا چاہتی ہیں لہٰذا وہ تمام گھر والوں کو اپنے طور پر سمجھا دیں اب ان کا ساتھ اپنے سسرالیوں سے ختم ہو چکا۔''

یہ جان کر کہ ان کے بھائی کی اولاد بھی ہے صفیہ بے تاب ہو گئیں اور منت گزار ہوئیں کہ۔ ''صرف اور صرف انہیں اپنے بھائی کے بچوں سے ایک بار ملوا دیں پھر وہ کوئی بات نہیں کریں گی۔''

اس پر کلثوم نے معذرت کر لی۔ ''سر دست ابھی ممکن نہیں مگر وہ ان کے بھتیجوں سے انہیں ضرور ملوا دیں گی۔''

اگلے ہی روز تین بزرگ آئے گھر کے اندر آنے کی اجازت چاہی تو بخوشی انہیں ... وہ ان کو ساتھ لے گئے۔

غلام محمد کی بہنوں نے تمام گھر والوں کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد کلثوم کی یہاں سے اجازت ہو گئی ہے اس لئے وہ انہیں چلی گئیں کبھی واپس نہ آنے کے لئے۔

صفیہ نے بہت طویل عمر پائی تقریباً سو برس کی عمر میں وفات پائی، وہ میری نانی تھیں اور انہیں تمام بچوں میں سب سے زیادہ محبت مجھ سے تھی وہ باتوں میں اکثر اپنے بھائی غلام محمد کو یاد کرتی تھیں اور آبدیدہ ہو جاتیں۔

میں پندرہ کی تھی جب انہوں نے مجھے یہ قصہ سنایا تھا مگر میں نے کبھی باقی بہن بھائیوں یا کسی کو بھی یہ باتیں نہیں بتائیں مگر ایک سوال تھا جو ذہن میں رہ گیا میں نے آخر نانی سے پوچھ ہی لیا۔ ''نانی کیا کبھی آپ اپنے بھائی کے بچوں سے ملیں؟''

اس پر انہوں نے کہا۔ ''ہاں ایک بار...... بھائی کی وفات کے نو برس بعد ایک دن میں گھر میں تنہا تھی دوپہر کا وقت تھا میں سوئی ہوئی تھی کہ آہٹ سی ہوئی آنکھ کھلی تو دیکھا دو بہت حسین نوعمر لڑکے میرے پلنگ کے پاس کھڑے تھے میرے جاگنے پر انہوں نے کہا۔ ''پھوپھی جان السلام علیکم۔''

میں ایک دم کھڑی ہو گئی تو وہ بولے۔ ''پھوپھی آج ہماری والدہ کلثوم وفات پا گئی ہیں، انہوں نے کہا تھا کہ جب وہ وفات پا جائیں تو ہم آپ سے ملاقات کر آئیں اور ان کی وفات کا بھی بتا دیں۔'' یہ کہہ کر دونوں میرے گلے لگ گئے۔

مجھے ایسا لگا کہ جیسے آج بھائی کی موت کا زخم تازہ ہو گیا ہو، میں نے جی بھر کر انہیں پیار کیا پھر وہ چلے گئے۔

میں نے جان لیا کہ میری بھابھی کلثوم میرے بھائی کی جدائی برداشت نہ کر سکی اور اپنی طبعی عمر سے بہت پہلے ہی چلی گئی وہاں جہاں میرا بھائی ہو گا۔''

شیبا

فرحان احمد نصیب۔کراچی

اچانک دریا کنارے ایک پرہیبت اور ہولناک بلا نظر آئی جس نے گائوں والوں کے سکون کو تہہ و بالا کرکے رکھ دیا ہر کوئی سہما ہوا تھاکہ پھر وہ بلا اچانک نمدار ہوئی اور گائوں والوں کو اچنبھے میں ڈال دیا۔

حقیقت کے افق پر جھلمل کرتی اور دل ودماغ کو سوتی سوچ کے پالنا میں جھولتی روداد

ہم سب بہن بھائیوں کو ہمارے نانا جان سے قلبی لگاؤ تھا۔اسکول سے موسم گرما کی یا سردیوں کی چھٹیاں ملتے ہی ہم ان کے گھر ڈیرا ڈال لیتے۔ خاص وجہ یہ تھی کہ وہ بہت عمدہ اور دلچسپ کہانیاں سنایا کرتے تھے۔

اس بار بھی ہم سردیوں کی تعطیلات میں ان کے ہاں پہنچ گئے۔رات ہوتے ہی ہم نانا جان کے سر پر سوار ہوگئے۔وہ کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول تھے۔ہمیں دیکھ کرانہوں نے کتاب سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔وہ جانتے تھے کہ جب تک وہ کہانی سنانا شروع نہیں کریں گے ہم کہانیوں کے دلدادہ انہیں کچھ بھی نہیں کرنے دیں گے۔

''بچو...... میں سوچ رہا ہوں کہ آج تم سب کو ایک سچی کہانی سناؤں جو کسی اور کی نہیں بلکہ میرے اپنے والد صاحب یعنی تمہارے پرنانا کی آپ بیتی ہے۔ کیا کہتے ہو...... سننا چاہو گے؟'' نانا جان نے پلنگ پر بیٹھ کر کمبل اوڑھا اور ہم سے استفسار کیا۔ہم سب بہن بھائی ان کے اطراف میں پلنگ پر بیٹھ کران کے ہی لحاف میں گھس گئے اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

نانا جان مسکرائے اور پھر کچھ توقف کے بعد بولے۔

''چونکہ یہ میرے والد صاحب دلاور احمد کی کہانی ہے،اس لئے میں ان ہی کی زبانی تم سب کو سناتا ہوں۔آسانی رہے گی۔''

یہ تقسیم ہند سے پہلے کی بات ہے۔میری عمراس وقت محض بارہ برس تھی مگر جسمانی ساخت،قدوقامت اور قابل رشک صحت کی وجہ سے میں اٹھارہ،انیس برس کا نوجوان دکھائی دیتا تھا۔

ہندوستان کی سرزمین پر ہمارا چھوٹا سا گاؤں ایک دورافتادہ جگہ پر آباد تھا۔جس میں گنتی کے چند ہی مکانات تھے اور مسلم گھرانے صرف دو تھے ایک ہمارا اوردوسرا اشتیاق چاچا کا،جوکہ ہمارے گاؤں کی اکلوتی مسجد کے موذن تھے اور میرے بابا امام صاحب۔ ہرنماز میں ان دوگھروں کے رہائشی ہی عبادت کے لئے آتے تھے جن کی تعداد اتنی کم تھی کہ پہلی صف بھی مکمل نہیں ہوپائی تھی۔یہ دیکھ کرمیرے بابا کا کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ انہوں نے ایمان افروز بیانات سے وہاں کے سکھ اور ہندو باشندگان کو بہرہ ور اور فیض یاب کرنے کی ہرممکن کوشش کی مگران میں سے کوئی بھی ایمان کی دولت سے مالا مال نہیں ہوپایا۔

گاؤں میں بسنے والے سب ہی لوگ میرے بابا

کی بے حد عزت کرتے تھے۔ گاؤں کے سرپنچ سہا بیر سنگھ سے بھی زیادہ انہیں سر بلند اور عالی مرتبہ مانتے تھے مگر پھر بھی ان کے نقش قدم پر چل کر ایمان لانے سے کتراتے تھے۔

گاؤں کا ماحول بہت ہی پر امن اور خوشگوار تھا۔ وسیع جنگل اور گاؤں کے درمیان میں ایک چٹیل میدان تھا۔ جس کے بیچوں بیچ مسجد تعمیر کی گئی تھی۔ مسجد میرے مرحوم دادا نے خود بنوائی تھی اور گاؤں کے مندر اور گردوارے سے دوری قائم رکھنے کے لئے اس میدان کے وسط میں لگے ہوئے ایک بہت بڑے سے سایہ دار درخت کے ساتھ تعمیر کروائی تھی۔ حیرت انگیز بات یہ تھی اس شفاف اور ریتیلے میدان کے بیچ میں وہ صرف ایک ہی درخت تھا۔ جس کی وسیع چھاؤں تلے گاؤں والوں نے چارپائیاں ڈال رکھی تھیں۔ مسجد کے داخلی دروازے کا رخ اسی درخت کی طرف تھا۔

جب نماز کا وقت ہوتا تو گاؤں کے ہندو اور سکھ افراد ان چارپائیوں پر بیٹھ کر امام صاحب کا انتظار کرتے اور جب وہ نماز پڑھا کر لوٹتے تو وہ سب ان کے ساتھ دیر تک دل کی باتیں کیا کرتے۔ سرپنچ جی بھی وہاں باقاعدگی سے آتے تھے اور جب کبھی پنچائیت لگتی تو وہ میرے بابا سے ضرور مشورہ لیتے۔ روزانہ رات کو ان چارپائیوں پر دیر تک بیٹھ کر گپ شپ کرنا بھی گاؤں والوں کا معمول بن گیا تھا۔

☆......☆......☆

سنگ مرمر جیسی سفید رنگت کی مالک، انتہائی خوب صورت ریکھا کمر پر مٹکا ٹکائے ندی کی طرف رواں دواں تھی۔ وہاں پہنچ کر مٹکا زمین پر رکھ کر ایک سرسری نگاہ سے ندی کے اس پار دیکھا تو ساکت رہ گئی۔ پھر جیسے ایک دم سے ہوش میں آ کر مٹکا وہیں چھوڑا اور چیختی چلاتی گاؤں کی طرف دوڑ پڑی۔ اس کی چیخ وپکار سن کر گاؤں کے تقریباً سب ہی لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ ریکھا کی ماں نندنی موسی نے لپک کر اسے سنبھالا اور ایک طرف بٹھا دیا۔

''کیا ہوا بیٹا......؟'' سب ہی لوگ ریکھا کے قریب آ گئے۔

''وو...... وہ......'' پھولی ہوئی سانس کے باعث ریکھا بول نہیں پا رہی تھی۔

''ارے کوئی پانی لاؤ۔'' نندنی موسی متذبذب ہو کر چلائی تو قریب کھڑا جسپال سنگھ جو ریکھا کو متوحش دیکھ کر تڑپ اٹھا تھا، فوراً پانی لینے چلا گیا۔

ریکھا کو پانی دیا گیا تو اس کے حواس کچھ بحال ہوئے۔

''آئی...... آئی وہاں......ندی کے اس پار جنگل میں، میں نے بہت بڑا درندہ دیکھا ہے وہ...... وہ گیتا کاکی کی گائے جتنا بڑا تھا۔ آئی مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' ریکھا پھر سے خوف زدہ ہونے لگی۔

''ارے پر کیسا درندہ بیٹا؟ ٹھیک سے بتا۔ گھبرا مت، ہم سب ہیں نہ ادھر۔'' الوک کاکا نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دلاسہ دیا۔

''کاکا......وہ شاید کوئی بھیڑیا تھا، مگر بہت بڑا۔ سچی کہتی ہوں کاکا۔ گیتا کاکی کی گائے جتنا۔'' بے حد بزدل ریکھا ہنوز سہمی ہوئی تھی۔

''بیٹا تو ایک بھیڑیئے سے ڈر گئی۔ بھلا جنگل میں جانور نہ ہوں گے تو اور کہاں ہوں گے۔؟ وہ ندی کے اس پار تھا، پھر وہ تجھے کیسے نقصان پہنچاتا۔؟'' روپ چند نے بھی آگے بڑھ کر اس کا حوصلہ بڑھانے کی خاطر کہا۔

''ہاں ری۔ تو نے تو ہم سب کو ہی ڈرا دیا۔ میں بھی گھبرا گئی تھی کہ جانے کیا قہر ٹوٹ پڑا ہے میری بچی پر۔'' نندنی موسی نے چین کا سانس لیا۔

''لیکن آئی......'' ریکھا خوف کے دائرے سے نہیں نکل پا رہی تھی۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ چل اب گھر چل۔ سب کو بلاوجہ پریشان کر دیا۔'' نندنی موسی نے نرمی سے ہاتھ تھام کر اسے اٹھایا اور پھر سب ہی اسے تسلیاں دیتے گھر لوٹ گئے۔

رات ہوئی تو کھانا کھا کر معمول کے مطابق

بوڑھے اور جوان مسجد کے پاس دھری چارپائیوں پر آبیٹھے اور درخت پر لٹکتے چراغ کی روشنی تلے بیٹھے باتوں میں مصروف ہوگئے۔

آج وہ سب اس دیوقامت بھڑیئے کے متعلق گفتگو کررہے تھے۔ جس کا ذکر ریکھا نے کیا تھا۔

''سرپنچ جی...... بٹیا کہہ رہی تھی کہ بھیڑیا گائے جتنا بڑا تھا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟'' روپ چند نے اپنی سفید بھنوئیں اچکا کر پوچھا۔

''میرے خیال میں تو ایسا ممکن نہیں ہے۔ مانا کہ قدآور بھیڑیئے بھی ہوتے ہیں مگر اتنا کہ گائے جتنا بڑا ہو۔ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ ریکھا بٹیا تو ذرا ذرا سی بات پر خوف اور وحشت سے کپکپانے لگتی ہے۔ اس بار بھی وہ ضرور خوف کا شکار ہوئی ہے۔'' سرپنچ جی نے اپنی رائے پیش کرکے میرے بابا کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا تو وہ کہنے لگے۔

''ہاں یہ سب تو ٹھیک ہے، مگر جہاں تک میں ریکھا کو جانتا ہوں، وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتی اور رہی بات واہمہ کی تو ریکھا کوئی نادان بچی نہیں ہے۔ یقیناً اس نے کسی غیر معمولی جانور کو دیکھا ہوگا اور یہ تشویش ناک خبر ہے۔ اس سے قبل کہ وہ درندہ ہمارے گاؤں میں داخل ہوکر خون ریزی کرے، ہمیں اپنے تحفظ کے لئے عملی اقدامات اٹھالینے چاہئیں۔'' امام صاحب کی بات سن کر سب کا رنگ فق ہوگیا۔ کیونکہ ان کی رائے کو پتھر پر لکیر کی سی اہمیت دی جاتی تھی۔ ان کی کہی ہوئی کسی بھی بات کو محض خام خیالی قرار دینے والا وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

''بابو...... اگر ایسا ہے تو میں نے کچھ سوچا ہے۔'' سرپنچ جی کے بہادر سپوت مہندر سنگھ نے آگے بڑھ کر سرعت سے کہا۔

''کیا سوچا ہے بیٹے؟'' جواباً امام صاحب نے استفسار کیا۔

''امام صاحب! ہم تمام نوجوان لڑکوں کو آج رات سے ہی گاؤں کے اطراف میں پہرہ دینا شروع کردینا چاہئے۔'' اس نے بابا کے قریب آکر کہا۔

''نہیں پتر...... رات کے اندھیرے میں ایسا کرنا خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ اس بلا نے تم سب پر حملہ کردیا تو پھر بھلا ہم کیا کرلیں گے؟'' دیودھر نے اٹھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر خبردار کیا۔

''لیکن دیودھر کاکا......'' مہندر نے کچھ کہنا چاہا مگر سرپنچ جی نے قطع کلامی کی۔

''دیودھر ٹھیک کہتا ہے پتر۔ پہلے ہمیں آنے والی مصیبت کے لئے خود کو مکمل طور پر تیار کرلینا چاہئے۔''

''کیسی تیاری بابو جی؟ ہمارا مقابلہ کسی انسان سے نہیں ہے۔ ہم تو ہتھیار لے کر جائیں گے۔ وہ سامنے آیا تو پرخچے اڑادیں گے اس کے۔'' مہندر نے ہتھیلی کا مکا سا بنا کر آہنی بازو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پرجوش لہجے میں کہا۔

''لیکن میرے جسپال کے پاس تو ہتھیار نہیں ہے۔ اس کچھ ہوگیا تو۔؟'' تیج پال سنگھ نے اپنے بیٹے کو اس معاملے سے دور رکھنے کے لئے ہمیشہ کی طرح خود غرضی کا مظاہرہ کیا۔

''ارے کاکا...... ہتھیار سب کو میں مہیا کروں گا تم فکر چھوڑو۔ جسپال بہت بہادر اور نڈر منڈا ہے۔'' مہندر نے تسلی دی تو تیج پال اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

''بہتر یہی ہے بیٹا، کہ تم لوگ کل دن کی روشنی میں جنگل کا رخ کرنا، اس وقت جانے کا ارادہ ترک کردو۔'' امام صاحب نے مناسب مشورہ دیا تو ظاہر ہے کہ سب متفق ہوگئے۔

مسلمان، سکھ اور ہندوؤں پر مشتمل ہمارے چھوٹے سے گاؤں کی اگرچہ آبادی مختصر تھی اور بجلی نہ ہونے کی وجہ سے زندگی بے حد پرمشقت تھی۔ سب کے اپنے اپنے چھوٹے موٹے کاروبار تھے۔

ہمارے اور سرپنچ مہابیر سنگھ کے چند کھیت تھے، جس میں گاؤں کے قریب کسان دیودھر کاکا کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔ اشتیاق چاچا گاؤں کے واحد حکیم تھے، جنہیں ویدجی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ مرہم

معجون اور صحت بخش سفوف بنانے میں طاق تھے۔

لکھویندر کی بیوہ ماں گیتا کا کی گوالن تھی۔ اس نے اپنے مکان کے ساتھ ہی ایک چھوٹا باڑہ بنا کر چند بھینسیں پال رکھی تھیں اور دودھ، دہی مکھن وغیرہ فروخت کر کے اپنا گھر چلا رہی تھی، ایک گائے بھی تھی جس کی وہ تعظیم کرتی تھی اور اس کا دودھ فروخت نہ کرتی۔

بوڑھے الوک کاکا درزی تھے اور انہوں نے اپنی بیٹی رکمنی کو بھی اس کام میں ماہر کر دیا تھا۔ جبکہ ان کے چھوٹے بھائی روپ چند کا کا واحد موچی۔

نندنی موسی مٹی کے برتن بناتی تھی۔ پنڈ کے تمام گھروں میں جتنے بھی مٹی کے برتن مستعمل تھے، وہ اسی کے ہاتھوں بنے تھے۔ وہ واحد عورت تھی جو اس گاؤں کی نہ تھی چند برسوں پہلے وہ کمسن ریکھا کو لے کر کہیں سے آن ٹپکی تھی۔ اس نے بتایا کہ ریکھا اس کی بیٹی ہے اور ریکھا کا باپ فرنگیوں کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔

سانولی سلونی نندنی کی پھول جیسی اور دودھیا رنگت والی بیٹی کو دیکھ کر یقین نہ ہوتا تھا کہ وہ نندنی کی سگی بیٹی ہے۔ البتہ نین نقش ملتے جلتے تھے اس لئے سب ہی نے مان لیا مگر......

تیج پال سنگھ کی بیوی منجیت نے اعتبار نہ کیا تھا۔ وہ اس بات کی کھوج میں لگ گئی تھی اس لئے اس نے نندنی سے مراسم بڑھا لئے تھے۔ آخر کار وہ نندنی کا اعتماد جیتنے میں ایک دن کامیاب ہو گئی اور نندنی نے جو راز اسے بتایا، اس کو جان کر منجیت ہکا بکا رہ گئی۔ منجیت کی سوچ نہایت فرسودہ تھی، اس لئے اسے ریکھا سے گھن آنے لگی۔ ظاہری طور پر وہ نندنی کے ساتھ ایک حد تک مخلص تھی۔ شاید اسی لئے اس کے راز کو ہمیشہ پردے میں رکھا مگر ریکھا سے نفرت کرتی تھی۔

☆......☆......☆

فجر کی نماز کے بعد امام صاحب دوستوں کے پاس چارپائی پر آ بیٹھے۔ تبھی کچھ دیر میں مہندر بندوق سنبھالے آ گیا۔ اس کے ساتھ جسپال، لکھویندر اور اشتیاق چاچا کا بیٹا صابر بھی تھا۔ وہ سب ہتھیاروں سے لیس تھے۔

''کہاں کی تیاری ہے۔؟'' اشتیاق چاچا نے ان سب کو، خصوصاً صابر کو دیکھ کر متعجب ہو کر پوچھا۔

''وہی......بھیڑیا۔'' مہندر مسکرایا۔

''ارے پر ایسی بھی کیا جلدی ہے کہ منہ اندھیرے آن دھمکے ہو۔ ابھی تو پو بھی نہیں پھٹی۔'' اشتیاق چاچا بگڑنے لگے۔

''وید کا کا آپ تو جانتے ہو کہ مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔ میں اپنے پنڈ میں کسی درندے کا تصور بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ بس وہ میرے سامنے آ جائے، چیر کے رکھ دوں گا۔'' بھیڑیئے کے تصور نے ہی اسے مشتعل کر دیا اور وہ تھا بھی ایسا ہی۔ ہر ناخوشگوار بات اسے جذباتی کر دیتی تھی وہ اپنے عزم کا پکا تھا۔

''چلو اب آ ہی گئے ہو تو کچھ دیر ٹھہر جاؤ۔ روشنی ہو لینے دو۔'' امام صاحب نے تنبیہ کی تو وہ چاروں ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔

''تو نہیں چلے گا دلاور۔؟'' صابر نے مجھ سے پوچھا تو میں سٹپٹا گیا۔ میں نے جب سے بھیڑیئے کا ذکر سنا تھا، تب سے خوف زدہ تھا۔ محض نام کا دلاور تھا مگر دیکھا جائے تو ابھی میری عمر ہی کیا تھی۔ وہ چاروں مجھ سے آٹھ، دس سال بڑے تھے۔ میری صحت اور قد کاٹھ کی وجہ سے وہ میری عمر سے لاعلم تھے اور میرے دوست بھی تھے۔

''دلاور ابھی ہتھیار اٹھانے کے قابل نہیں ہوا ہے۔ فی الحال اسے لے جانا مناسب نہیں ہوگا۔'' میرے کچھ کہنے سے قبل ہی بابا نے جواب دے کر مجھے بچا لیا۔

پھر روشنی پھیلتے ہی میں نظر بچا کر گھر لوٹ گیا۔ ورنہ مہندر کا کیا بھروسہ، وہ اگر اڑ جاتا تو بابا کے جاتے ہی مجھے جبراً ساتھ کھینچ لیتا۔

☆......☆......☆

تیج پال سنگھ خود غرض اور لاپرواہ ہونے کے ساتھ ساتھ بے حیا، دل پھینک اور ہوس کا غلام بھی تھا۔ گاؤں

میں کہیں پر کسی کنواری یا بیوہ عورت کو تنہا پاتا تو اس کے ارادے ناپاک ہونے لگتے۔ وہ ازخود رفتہ ہو جاتا۔ اس کے اعصاب چیخنے لگتے۔ مگر وہ بڑی مکاری سے اپنے جذبات چھپا لیتا۔ وہ انتہائی شاطر دماغ رکھتا تھا۔ وہ کسی قسم کی زبردستی نہ کرتا۔ وہ دانہ پھینک کر شکار کو رضامند کرتا۔ وہ خودسپردگی پسند کرتا تھا۔ اس کی حقیقت سرپنچ سے پوشیدہ تھی۔ یہ اسی کی محنت تھی ورنہ پنڈ سے نکالا جاتا۔

اس نے شادی شدہ عورتوں کی طرف کبھی بھی پیش قدمی نہیں کی۔ اگر وہ بھڑ جاتیں تو اس کا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کنواریوں اور بیواؤں کو جال میں پھانستا تھا۔ غلہ اور اناج کا لالچ دیتا تو وہ غریب عورتیں اپنی مرضی اور خوشی سے اس کے دام میں پھنسنے کو آمادہ ہو جاتیں۔

جانکی اور دیوکی دو ہندو کنواری بہنوں کو اس نے کئی سالوں سے اپنی نفسانی لذتوں کا سامان بنا رکھا تھا۔ وہ دونوں خوش بھی تھیں کہ خاوند تو ملا نہیں پر خاوند کا "سکھ" مل رہا تھا۔ لیکن ایک دن سرپنچ جی نے اپنے کسانوں اور کھیتوں کے نگران دیودھر کا بیاہ جانکی کے ساتھ کر دیا۔ دیودھر کی پہلی بیوی مرچکی تھی۔ اس لئے سرپنچ جی نے جبراً اس کا گھر بسایا تھا۔ جانکی تو پھولے نہ سمائی مگر تیج پال کا رنگ فق ہو گیا۔

اب دیوکی رہ گئی تھی مگر انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کی رسائی اور اصابت سے دور ہوتی ہے وہی اسے درکار ہوتی ہے۔

جانکی عزت دار زندگی جینے لگی۔ تیج پال کو منہ نہ لگاتی۔ وہ اس کو دھمکی بھی دینے لگا تھا کہ اس کے خاوند کو سچائی سے آگاہ کر دے گا۔ مگر وہ بھی اپنے قول و فعل کی پکی ہو چکی تھی۔ وہ جواباً اس کی حقیقت سرپنچ جی کو بتانے کی دھونس جھاڑتی۔

بالآخر تھک ہار کر تیج پال نے جانکی کا خیال دل سے نکال دیا۔ مگر دوسری طرف دیوکی نے جب بہن کا گھر بستے دیکھا تو اس کی امید بھی جاگ اٹھی۔ اس نے سرپنچ جی کو عرضی بھجوادی کہ اس پر نظر کرم کی جائے۔ جیسا بھی رشتہ ہوگا وہ قبول کر لے گی۔

انہی دنوں گاؤں میں کچھ نئے لوگ آئے اور ہمارے پنڈ میں آباد ہو گئے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں مگر شادی شدہ۔ ان کے خاوند ساتھ تھے۔ تیج پال کے دام میں پھنسنے کے لئے اب گاؤں میں ایک بھی عورت نہ بچی تھی۔ دیوکی نے بھی اس سے قطع تعلق کر رکھا تھا۔ اس کی گیدڑ بھبکیوں سے وہ بھی نہ ڈرتی تھی جانکی نے اسے ذہنی طور پر مضبوط بنا دیا تھا۔ شاید اسی صبر کا قدرت نے دیوکی کو انعام دیا تھا۔ نئے آنے والوں میں سے ایک کے ساتھ سرپنچ جی نے دیوکی کو بھی بیاہ دیا۔

اب تو تیج پال بولایا بولایا پھرتا۔ ہوس کا نشہ اس کے اعصاب کو جھنجھوڑتا تو وہ پاگل ہونے لگتا۔ اس کے شاطر دماغ کی تار بکھر جاتی۔ وہ اپنی بیوی منجیت سے بہت محبت سے پیش آنے لگا۔ وہ اس اچانک امڈ آنے والی محبت کو محسوس کر کے شک میں مبتلا ہونے لگی اور اپنی جاسوسی طبیعت سے جلد ہی تیج پال کی اوباشانہ فطرت کی حقیقت جان لی وہ سخت برہم ہوئی اور تیج پال کو اس دن سے خلوت کا رفیق بنانے سے انکار کر دیا۔

اس کے آگے اب آخری دروازہ بھی بند ہو گیا تھا وہ اک عجیب سے اضطراب میں مبتلا رہنے لگا۔ منجیت کو منانے کے لئے اچھا بننے کا ڈھونگ رچانا شروع کر دیا۔ باقاعدگی سے گردوارے جاتا اور دیر تک بیٹھا رہتا۔ اپنے بچوں، جسپال اور رتن کو وقت دیتا۔ خود کو ہر وقت پرسکون ظاہر کرتا۔

شاید وہ ہمیشہ کے لئے سدھر بھی جاتا، اگر انہی دنوں گاؤں میں ایک بیوہ نندنی گود میں بچی اٹھائے رہنے نہ آ جاتی، جسے دیکھ کر تیج پال کی رال ٹپک گئی تھی۔

☆......☆......☆

وہ چاروں جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ پیدل تھے۔ مہندر کے پاس گھوڑے تو تھے مگر وہ انہیں ساتھ نہیں لایا تھا۔ وہ گھوڑے کی ٹاپوں سے بھیڑیئے کو چوکنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ماہر شکاری بھی تھا اور شکار کھیلنے کی ہر روش سے بخوبی واقف تھا۔ اسے کامل

یقین تھا کہ وہ اس درندے کو ضرور مار گرائے گا۔ چلتے چلتے وہ چاروں کافی آگے نکل گئے۔ راستے میں خوب صورت ہرن، خرگوش، جنگلی بکریاں اور کئی شکار نظر آئے، جنہیں دیکھ کر وہ بھیڑیئے کو بھول بیٹھا۔ شاید وہ گولی بھی چلا دیتا مگر جسپال نے سرعت سے اپنی ذکاوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے روک دیا۔

''کیا کر رہا ہے مہندر......؟ اس طرح تو بھیڑیا ہوشیار ہو جائے گا، بھول گیا کہ ہم یہاں کس مقصد سے آئے ہیں۔؟'' جسپال نے خشونت بھرے لہجے میں کہا۔

''اوئے یار...... بڑھیا شکار دیکھ کر منہ میں پانی آنے لگا تھا۔'' مہندر خجل سا ہو گیا۔

''بہرحال ہمیں اپنا مقصد قطعاً فراموش نہیں کرنا چاہئے۔ چلو آگے بڑھتے ہیں۔'' صابر نے تنبیہ کی اور وہ پھر سے آگے بڑھنے لگے۔

اسی اثناء میں چند بھورے خرگوش تیزی سے دوڑتے ہوئے ان کے آگے سے گزر کر خودرو جھاڑیوں میں غائب ہو گئے۔ شور کا اک طوفان سا اٹھا تھا جو لمحوں میں تھم گیا مگر اڑتی ہوئی خاک کی مختصر آندھی دھیمی رفتار سے چھٹ رہی تھی۔ جب منظر واضح ہوا تو صابر کی آنکھیں وحشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جسپال نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو اسے خوف زدہ ریکھا یاد آ گئی۔

''کوئی آواز نہ کرے نہ ہی اپنی جگہ سے ہلے۔'' مہندر نے نہایت آہستہ آواز میں سرگوشی کی۔ وہ چاروں محتاط ہو کر اس دیو قامت بھیڑیئے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے ایک خرگوش کو گھیر رکھا تھا مگر تعجب کی بات تھی کہ وہ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا تھا۔ خرگوش اس قوی ہیکل بھیڑیئے کی حراست میں نہایت وحشت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔

یکا یک بھیڑیئے کی نگاہ ان چاروں پر پڑ گئی۔ اس نے خرگوش کو چھوڑ کر ان کی طرف نہایت دھیمی رفتار سے بڑھنا شروع کر دیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو مگر وہ چاروں اس کو اپنی طرف آتا دیکھ کر خوف اور وحشت سے کپکپا اٹھے۔ مہندر نے تیزی سے بندوق کا رخ اس کی طرف کیا مگر وہ بندوق کو دیکھتے ہی اچانک بدکا اور سبک رفتاری سے گھنے جنگل کی پر پیچ جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ مہندر نے گولی صحیح وقت پر چلائی تھی۔ اس نے غفلت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا مگر پھر بھی جانے کیسے بھیڑیا خود کو بچا گیا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ گولی چلنے سے پہلے بھاگا تھا جیسے بندوق کو پہچانتا ہو۔ بھلا ایک درندے کو کیا پتا کہ بندوق کیا چیز ہے۔

ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ خوف اور حیرانگی کے مارے وہ زمین پر بیٹھ گئے۔ مہندر کی آنکھوں سے مایوسی جھلک رہی تھی۔ آج زندگی میں پہلی بار اس کا نشانہ خطا ہو گیا تھا۔ لکھویندر ناگواری سے مہندر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ صابر ابھی تک اپنی بے ترتیب سانسوں کو بحال کر رہا تھا۔

مگر جسپال کے دماغ میں تو کچھ اور ہی چل رہا تھا۔ جو خوف اسے بھیڑیئے کو پہلی نظر میں دیکھ کر محسوس ہوا تھا، وہ اب مکمل طور پر زائل ہو چکا تھا وہ ان چاروں میں واحد بندہ تھا، جسے مہندر کا گولی چلانا اچھا نہیں لگا تھا۔ لیکن کیوں؟ یہ وہ خود بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ وہ بس اتنا محسوس کر سکتا تھا کہ وہ بھیڑیا اسے درندہ نہیں لگا تھا۔ وہ اپنے دل کی بات سن رہا تھا پر سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

''چلو اٹھو اب کیا کسی درندے کا خود شکار بننا چاہتے ہو۔؟'' لکھویندر برا سا منہ بنا کر سب سے پہلے کھڑا ہو کر بولا۔

''سارا پلان چوپٹ ہو گیا یارو۔'' مہندر ہنوز دل گرفتہ تھا۔

''چلو چھوڑو کوئی بات نہیں۔ ہمت ہارنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہم پھر بھی اسے دبوچ لیں گے۔'' اگرچہ جسپال ایسا نہیں چاہتا تھا پھر بھی ان سب کی دل جمعی کی خاطر بولا۔

پھر وہ چاروں واپس لوٹنے لگے۔ راستے میں جسپال کی خواہش پر مہندر نے ایک ہرن شکار کیا۔

جب وہ مسجد کے سامنے بیٹھک کے پاس پہنچے تو

ان سب لوگوں کو اپنا منتظر پایا، جو صبح کے وقت سے وہاں بیٹھے تھے۔

مہندر نے بے دلی سے سارا ماجرا سنایا تو جواباً اسے سرپنچ جی کے عتاب کا سامنا کرنا پڑا۔

"سرپنچ صاحب...... جانے بھی دیں۔ بچے زندہ سلامت لوٹ آئے، یہی کیا کم ہے؟ وہ درندہ چاہتا تو کچھ بھی کرسکتا تھا۔" اشتیاق چاچا نے سمجھایا۔

"ویدجی اس نے میرا نام ڈبو کر رکھ دیا ہے۔ کبھی بھی ناکام نہیں لوٹا ہے اور آج...... دوپہر کردی جنگل میں۔ بھیڑیئے کو تو بھگا دیا اور لایا بھی کیا...... یہ ہرن کا بچہ......" سرپنچ جی نے قہرآلود لہجے میں کہہ کر ہرن کی طرف اشارہ کیا تو مہندر دزدیدہ نگاہوں سے جسپال کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ تو میں نے شکار کرنے کو کہا تھا سرپنچ جی۔" جسپال فوراً بولا، وہ اپنے باپ کی طرح لاپرواہ اور خودغرض ہرگز نہ تھا۔ "مہندر نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ وہ جانور بہت ہی ہوشیار تھا۔"

"پر پتر مصیبت تو اب بھی ٹلی نہیں ناں۔ وہ اب بھی زندہ ہے۔" سرپنچ جی کچھ نرم پڑ گئے۔

"خیر ہم کل پھر سے کوشش کریں گے۔ وہ زیادہ دن تک دندناتا نہیں پھر سکے گا۔" اب کی بار صابر نے دلاسہ دیا۔ مہندر اب بھی خاموش کھڑا تھا۔ وہ بے نیل مرام لوٹنے پر اب تک سکتے کی سی کیفیت میں تھا۔

"اچھا سرپنچ صاحب...... میں ذرا ظہر کی اذان دے لوں۔ پھر اس بارے میں مل کر کوئی فیصلہ کریں گے۔" اشتیاق چاچا اٹھ گئے تو لڑکے بھی گھر لوٹ گئے۔

شام کے وقت میں گھر سے نکلا تو مجھے نندنی موسی نظر آئی۔ وہ برتن اٹھائے اپنے گھر کی طرف لوٹ رہی تھیں۔ میں دوڑتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔

"ندی کی طرف سے آرہی ہو موسی۔؟" میں نے ان کا راستہ روکا۔

"ہاں بیٹا...... ریکھا تو وہاں جانے سے ڈرتی ہے۔ مجھے ہی جانا پڑا۔ پانی بھی تو چاہئے تھا نا۔" انہوں نے خوش دلی سے جواب دیا۔

"پر موسی تمہیں بھی نہیں جانا چاہئے تھا۔ سنا نہیں وہ درندہ اب بھی مرا نہیں ہے۔ بچ کر نکل بھاگا ہے۔ تم کسی لڑکے سے کہہ دیتیں۔" میں سراسیمہ تھا۔

"ارے بیٹا۔ ڈر کر ہم جینا تو نہیں چھوڑ سکتے اور جنگل بھی تو ندی کے اس پار ہے۔ اگر بھیڑیا آ بھی جاتا تو ندی پار نہیں کرسکتا تھا۔ ریکھا تو ویسے ہی بہت ڈرتی ہے۔" انہوں نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنے گھر میں داخل ہوگئیں۔

میں وہیں کھڑا کھڑا سوچتا رہا کہ واقعی ندی کے پاس تو جنگل کی طرف جانے والی کوئی پگڈنڈی نہیں ہے۔ میرے قدم خود بخود ندی کی طرف بڑھنے لگے۔ کسی انجانے خیال کے تحت میں آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ اب ندی میرے سامنے تھی۔ میری آنکھیں جنگل کی طرف مرکوز تھیں۔ کوئی جانور پیش نظر نہیں تھا۔

ندی گاؤں سے زیادہ دور نہ تھی البتہ جنگل سے نہایت قریب تھی۔ میں ندی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا یہاں تک کہ ایک کچے راستے تک پہنچ گیا جس کا رخ جنگل کی طرف تھا۔ چند رنگ برنگے پرندوں نے میری توجہ کھینچ لی۔ میں سرشار سا ہو کر ان کی طرف بڑھ گیا۔ وہ سہم کر اڑتے چلے گئے۔ ایک بھورا جنگلی خرگوش میرے سامنے سے گزرا۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آیا تو میں سرپٹ دوڑنے لگا۔ وہ میرے پیچھے تھا۔ خوف اور وحشت کے مارے افتاں وخیزاں بھاگتے ہوئے میں کافی آگے نکل گیا۔ میں جنگل کے وسطی حصے میں پہنچ گیا تھا۔ مجھے راستے کا کوئی علم نہیں تھا۔ میں اتفاق سے لگڑ بھگے سے بچ نکلنے میں کامیاب تو ہوگیا مگر راستہ بھٹک چکا تھا۔

سورج غروب ہوگیا تھا پر ابھی بھی ہلکی ہلکی روشنی باقی تھی۔ دیوہیکل درخت بھیانک عفریت کی مانند دکھائی دیتے تھے۔ میں بدحواس سا ایک طرف رک گیا تھا۔ دماغ نے جیسے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اندھیرا بڑھنے

لگا اوراس سے کہیں زیادہ رفتار سے میرا خوف بڑھ رہا تھا۔ دل الگ بے قابو تھا میں سست روی سے ایک طرف چلنے لگا۔ تھوڑا ہی آگے بڑھا تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ میرے سامنے جو منظر تھا۔ وہ اوسان خطا کر گیا۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

وہ کوئی انتہائی ہیبت ناک چیز تھی۔ درختوں سے بھی اونچا قد، پورے جسم پر لمبے لمبے بال، چمکتی ہوئی سرخ انگارہ آنکھیں، جنہیں دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا جیسے آنکھوں کی جگہ دو لال برقی قمقمے نصب ہوں۔ اس بھیانک اور دیوہیکل مخلوق کو دیکھ کر میں دہشت زدہ ہو کر زمین پر گرتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

نندنی گاؤں میں نئی نئی آئی تھی۔ سب سے پہلے اسے تیج پال نے دیکھا تھا۔ اس کی سانولی سلونی رنگت اور نمکین چہرہ دیکھ کر تیج پال کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ اس نے تیج پال کو بتایا کہ وہ اس گاؤں میں پناہ چاہتی ہے۔ اسے رہنے کے لئے مکان چاہئے۔ وہ اسے سرپنچ جی کے پاس لے گیا۔ وہاں اس نے بتایا کہ وہ ایک بیوہ عورت ہے اور ریکھا اس کی بیٹی ہے۔ اس کے خاوند کو گوروں نے ہلاک کر دیا ہے۔ وہ دلبرداشتہ ہو کر اپنا علاقہ چھوڑ آئی ہے۔ اب یہاں رہنا چاہتی ہے۔

رحمدل سرپنچ نے پنڈ کی ایک بوڑھی تنہا عورت سے اجازت لے کر نندنی کو اس کے گھر ٹھہرا لیا۔ وہ ضعیف عورت مٹی کے برتن بناتی تھی نندنی اس کی خوب خدمت کرتی اور اس سے برتن بنانا بھی سیکھتی۔

اس کے بعد دل کے ہاتھوں مجبور تیج پال کسی نہ کسی بہانے اس کے گھر چکر لگاتا۔ کبھی شہد لے جاتا تو کبھی اصلی گھی۔ نوجوان نندنی قیافہ شناس نہیں تھی اس لئے دل سے اس کی مشکور رہتی۔ وہ عمر میں نندنی سے دوگنا تھا۔ نندنی اسے باپ کی طرح سمجھتی تھی۔ اس کے مکروفریب اور ناپاک ارادوں سے بے خبر تھی۔ وہ بھی جلد بازی میں کام بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کا اعتماد جیتنے کی خواہش میں نہایت احتیاط سے جال بچھا رہا تھا۔

منجیت کو اس کی سرگرمیوں کی بھنک پڑ چکی تھی۔ اسے تیج پال کا متواتر نندنی کے گھر جانا کھٹکنے لگا۔ پہلے تو وہ اس بات کا یقین کر چکی تھی کہ تیج پال بدل چکا ہے۔ مگر جب سے نندنی گاؤں میں آئی تھی۔ تیج پال کی تمام تر توجہ اس کی طرف مرکوز ہو چکی تھی۔ بے شک وہ ہر بار منجیت کو مطلع کرنے کے بعد ہی نندنی کے گھر مدد کی نیت سے جاتا تھا مگر کچی گولیاں منجیت نے بھی نہیں کھیلی تھیں۔ وہ جلد ہی تیج پال کے ارادے بھانپ گئی۔ اس نے بھی نندنی کے گھر جانا شروع کر دیا۔

پہلی بار اس نے ریکھا کو بغور دیکھا۔ وہ سرخ وسپید بچی کہیں سے بھی نندنی کی بیٹی نہ لگتی تھی۔ منجیت ایک عجیب سے شک میں مبتلا ہو گئی۔ وہ اس بات کی کھوج میں لگ گئی تھی۔

"سچ سچ بتا نندنی...... کیا ریکھا واقعی تیری بیٹی ہے؟" وہ نندنی سے عجیب عجیب سوال پوچھتی۔ جواباً نندنی کا فق ہوتا رنگ دیکھ کر اس کے شک کو تقویت ملتی۔ نندنی بمشکل بات کو ٹالتی مگر منجیت کی قیافہ شناس فطرت کا وہ کب تک مقابلہ کرتی۔ اسے منجیت پر بھروسہ ہونے لگا۔ بالآخر ایک دن اس نے منجیت کو ریکھا کی حقیقت بتا دی۔

"منجیت دیدی...... پہلے تم وعدہ کرو کہ اس بات کو راز رکھو گی۔؟"

"وعدہ ہے جی وعدہ...... بول بول، کیا بتانے والی ہے تو؟" منجیت بے قراری سے عجلت میں بولی۔

"چند سال پہلے میں اپنے باپ کے ساتھ یہاں سے بہت دور رہا کرتی تھی۔ یہاں کی طرح ہمارے پنڈ میں بھی محبت تھی، اتفاق تھا۔

ایک رات میں شانتی بوا کے گھر سے اپنے گھر لوٹ رہی تھی۔ راستے میں اندھیرا تھا، سناٹا تھا میں تیز رفتاری سے چل رہی تھی کہ اچانک جانے کہاں سے ایک انگریز سپاہی میرے سامنے آ گیا۔ مجھے تنہا دیکھ کر اس کی نیت میں فتور آ گیا۔ اس نے انسانیت کی حدود پار کرتے ہوئے مجھے دبوچ لیا۔ میں مدد کے لئے چلانا چاہتی تھی مگر اس نے میرے منہ پر سختی سے اپنا ہاتھ

رکھ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے وہاں سے تھوڑی دور ایک خیمے میں لے گیا اور چارپائی پر پٹخ دیا۔ میں وحشت سے چلانے لگی مگر میری مدد کو کوئی نہ آیا۔ اس نے میرا دوپٹہ میرے منہ پر باندھ دیا پھر تمام رات مجھے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا رہا۔ چاقو کی نوک سے مجھے زخمی کرتا رہا۔ شراب کی بوتلیں خالی کرتا رہا۔ میں خوف اور اذیت سے تڑپتی رہی مگر اس وحشی درندے کو مجھ پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔ میرا دامن تار تار ہو چکا تھا۔ میں برباد ہو چکی تھی۔

صبح ہونے سے پہلے وہ شراب کے نشے میں مدہوش ہو چکا تھا۔ اسے بے سدھ پڑا دیکھ کر میں چپکے سے اٹھی مگر زخموں سے اٹھنے والی ٹیسیں میری جان لینے کی درپے تھیں۔ میں ساری قوت یکجا کر کے اٹھ جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ میرے من میں انتقام کی آگ بھڑکنے لگی۔ نقاہت کے باوجود میں نے اسی کے چاقو سے اس پر پے در پے وار کئے۔ وہ تڑپتا رہا۔ میں تب تک چاقو چلاتی رہی جب تک اس کے جسم میں زندگی کی رمق موجود تھی۔

وہ مر گیا، میں نے اپنے دریدہ لباس کو چھپانے کے لئے اسی کی چارپائی سے چادر اٹھا کر اوڑھ لی اور تڑپتی، سسکتی گھر آ گئی۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ میرے باپ نے جاگ کر جب میری حالت دیکھی تو گھبرا کر ویدرانی کو لے آیا۔ اس نے میرے زخموں کی مرہم پٹی کے ساتھ ساتھ میرے بے آبرو ہو جانے کا انکشاف بھی کر دیا۔ میرا باپ اس غم کو زیادہ دن جھیل نہیں پایا۔ اس نے خودکشی کر لی۔ ویدرانی اچھی عورت تھی۔ اس نے میرا راز گاؤں والوں سے چھپا کر رکھا اور میرے باپ کی خودکشی کے بعد مجھے اپنے گھر لے گئی۔

میرے زخمی ہونے کا بہانہ یہ بنایا گیا کہ کسی جنگلی جانور نے حملہ کر دیا ہے مگر میرے باپ کی خودکشی سب کی سمجھ سے باہر تھی۔ میں نے بھی لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ بات وہیں دب گئی۔ پر مصیبت نہیں ٹلی تھی۔ کچھ ہی عرصے بعد ویدرانی کو پتہ چلا کہ میں ماں بننے والی ہوں۔ وہ بہت گھبرائی، مجھے کئی دوائیں کھلائیں مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ پورے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی۔ میں نے مجبوراً سارا ماجرا سنا دیا۔ کئی عورتوں کو مجھ پر رحم آیا اور کئی عورتیں میرے اس گاؤں میں رہنے پر اعتراض کرنے لگیں۔ بالآخر میں خود ہی وہاں سے چلی گئی۔ وہاں سے دور ایک اور گاؤں میں ریکھا کو جنم دیا۔ میں بن بیاہی ماں بن گئی۔ اس کے بعد میں دو برس تک وہاں رہی۔ وہاں ایک پنڈت کی بیوی نے مجھے پناہ دی تھی اور وہ بھی میری سچائی جانتی تھی۔ ریکھا دو برس کی ہوئی تو پنڈت جو میرے باپ کی عمر کا تھا۔ اس کی بیوی مر گئی اور وہ سادھو سے شیطان بن گیا۔ وہ دھمکیاں دینے لگا کہ اگر میں نے اس کی داشتہ بننے سے انکار کیا تو وہ گاؤں والوں کو میری حقیقت سے آگاہ کر دے گا۔ میں نے اس کی بات نہیں مانی تو وہ بھڑک اٹھا۔ دھمکیاں دیتا ہوا گھر سے نکل گیا اور اسی پل میں نے پھرتی سے اپنا سامان باندھا اور یہاں آ گئی۔'' منجیت نے شدید حیرت کے عالم میں نندنی کا قصہ سنا جواب زار و قطار رو رہی تھی۔

''کیا تیرا کوئی خاوند نہیں ہے؟ تو نے جھوٹ کہا تھا؟'' منجیت کا شک ایک حد تک سچ ثابت ہوا تھا۔

''ہاں دیدی، میں اس بار بھی سچ بول کر اس پنڈ سے نکالی نہیں جانا چاہتی تھی۔ مگر تم نے ضد کی تو مجھے سب بتانا پڑا۔'' نندنی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''چل ٹھیک ہے۔ تو فکر نہ کر۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی اور سن...... تو بھی کسی کو نہ بتانا۔'' منجیت کو اس پر ترس آ گیا تھا مگر سامنے کھڑی اس کی ناجائز بیٹی ریکھا پر نظر پڑی تو اس نے نفرت اور حقارت سے منہ پھیر لیا۔

☆......☆......☆

وہ بھیانک اور ہیبت ناک مخلوق میرے سامنے تھی۔ میں خوف اور وحشت کے زیر اثر بری طرح ہانپ رہا تھا۔ پیروں میں جیسے جان نہ رہی اور میں لرزتا ہوا زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

اس سے قبل کہ وہ خوف ناک عفریت آگے بڑھ کر مجھ پر حملہ کر دیتی، میرے عقب سے کسی کتے کے

بھونکنے کی زوردار آوازیں آنے لگیں۔ وہ آواز قریب آتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ دیو قامت بھیڑیا میرے بالکل پاس آکر کھڑا ہوگیا وہ واقعی بہت بڑا تھا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ یہ وہی بھیڑیا ہے جس کو تلاش کیا جارہا تھا۔ میں ڈر اور خوف سے پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ ایک بات پر مجھے شدید حیرت بھی ہوئی کہ وہ بھیڑیا کسی کتے کی طرح بھونک رہا تھا اور وہ بھی مجھ پرنہیں، بلکہ سامنے موجود عفریت پر اس کا رخ اسی بلا کی جانب تھا جو اب آہستہ آہستہ دور ہوتی جارہی تھی۔

اچانک بھیڑیا پلٹا اور میرے بالکل قریب آگیا۔ میں نے کلمہ شریف پڑھ لیا اس نے اپنے دانتوں سے میرا گریبان پکڑا اور گھسیٹتا ہوا ایک طرف دوڑنے لگا۔ زمین کی رگڑ سے اور خودرو جھاڑیوں سے مجھے کئی خراشیں آئیں۔ میں درد سے چیخنے لگا مگر وہ دوڑتا رہا۔

اب مجھے دور سے گاؤں کی مسجد اور بیٹھک نظر آنے لگی۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا، کیونکہ بھیڑیا مجھے گھسیٹتا ہوا اسی طرف لے جارہا تھا۔ مسجد قریب آنے لگی تو اس نے اپنی رفتار کم کردی۔ اب وہ کھینچتا ہوا چل رہا تھا میدان میں داخل ہوکر اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ پھر وہ زور زور سے بھونکنے لگا۔ چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے سبھی لوگوں نے ہمیں دیکھ لیا۔ مہندر نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ فوراً بندوق کا رخ بھیڑیئے کی طرف کیا تو میں پوری قوت سے چلایا۔

”نہیں ...... گولی مت چلانا۔“ سب ہی لوگ اٹھ کر میری طرف دوڑ پڑے۔ بھیڑیا جنگل کی طرف بھاگ چکا تھا۔ وہ لوگ مجھے اٹھا کر چارپائی تک لے آئے۔ ہر کوئی حیرت کی تصویر بنا ہوا تھا۔ مجھے زخموں سے چور دیکھ کر اشتیاق چاچا نے فوراً صابر کو گھر سے مرہم وغیرہ لانے کے لئے دوڑایا۔

ذرا سی دیر میں افراتفری مچ گئی۔ ہر کوئی سراسیمہ تھا۔ بابا میرے قریب بیٹھے تھے اور میرے زندہ بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کررہے تھے۔ سرپنچ جی دکھ بھرے لہجے میں بول رہے تھے۔

”اوئے بیڑہ غرق ہو اس منحوس بھیڑیے دا۔ خبیث نے خون ریزی کی شروعات کر ڈالی۔ امام صاحب کی نیکیاں آڑے آگئی ہوں گی جو پتر بچ گیا۔ نالائق مہندر نے صبح اس کا خاتمہ کردیا ہوتا تو داور پتر ابھی تکلیف میں نہ ہوتا۔“

میں حیرت سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ باری باری سب ہی بھیڑیئے کو کوس رہے تھے۔ مہندر شرم اور خجالت کے مارے سر جھکائے مجرموں کی طرح کھڑا تھا۔ جسپال عجیب سی کیفیت میں گھرا خاموش کھڑا تھا۔ اسے بھیڑیئے سے یہ امید ہرگز نہ تھی۔

”سرپنچ چاچا......“ میں نے انہیں پکارا۔

”ہاں پتر بول کیا ہوا؟“ وہ سرعت سے میری طرف آگئے۔

”آپ سب کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ میرے جملے نے سب کو چونکا دیا۔

”کیسی غلط فہمی پتر؟“ وہ کچھ نہیں سمجھے۔

”آپ سب بھیڑیئے کو کیوں کوس رہے ہیں؟ وہ درندہ نہیں ہے۔ اس نے اپنی جان پر کھیل کر میری جان بچائی ہے۔“ میں نے مضطرب ہوکر کہا تو ہر کوئی حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا۔ جسپال بھی ایکدم سے جیسے ہوش میں آگیا۔

”جان بچائی ہے...... اے کی کہہ رہا ہے پتر؟“ سرپنچ جی پرسوچ لہجے میں بولے تو میں نے سارا واقعہ کہہ سنایا۔ جسے سن کر ہر کوئی تحیر اور استعجاب میں مبتلا ہوگیا۔ جسپال کا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔

”بھیڑیا اگر وقت پر نہ پہنچتا تو وہ چھلاوا دلاور کی جان لے لیتا۔“ جسپال کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

”کمال ہے جی...... او بھیڑیا پتر کو مسجد تک چھوڑ گیا۔ میں تو سمجھا تھا یہیں سے جکڑا ہے اس نے۔“ سرپنچ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تیرنے لگی۔

”مجھے تو پہلے ہی اندازہ تھا کہ وہ بھیڑیا درندہ نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ جنگلی بھی نہیں ہے۔ وہ اچانک سے ہی کہیں سے آگیا ہے۔ شاید کسی کا

پالتو ہو۔'' جسپال نے اپنی رائے دی۔
''اب یہ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں بیٹا۔ بہر حال ہمیں اب بھی اس کی طرف سے بے فکر نہیں ہونا چاہئے ۔ہے تو وہ آخر جانور ہی ناں۔'' اشتیاق چاچا میرے پاؤں پر مرہم لگاتے ہوئے بولے۔
''ٹھیک کہتے ہو وید جی...... ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔مگر اب اسے پکڑنے کے لئے جنگل کوئی نہیں جائے گا۔'' سرپنچ جی نے آخری جملہ لڑکوں کی طرف دیکھ کر کہا تو مہندر نہایت خوش ہوا۔ اس کے باپ کی ناراضگی ختم ہو چکی تھی اس لئے اس کے دل میں چھپا مجرمانہ احساس بھی جاتا رہا۔

☆......☆......☆

''دیکھو جی...... میں صاف صاف کہتی ہوں کہ اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ۔ میں خوب سمجھتی ہوں تمہارے ہتھکنڈوں کو۔ وہ مصیبت کی ماری بھلی لڑکی ہے۔ بہت دکھ جھیلے ہیں بے چاری نے۔'' منجیت ابھی ابھی نندنی کے گھر سے آئی تھی۔ گھر پر تیج پال کو بجتے سنورتے دیکھا تو چراغ پا ہو گئی۔
''ہاں تو میں نے کیا کیا ہے؟ دکھی ہے، غریب ہے تبھی تو تھوڑی مدد کر دیتا ہوں۔ یہ کچھ بادام اور کا جو لایا تھا، یہی دینے جا رہا ہوں۔'' تیج پال کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔
''دو ہٹی لگتی ہے تمہاری ، جو اتنا چمک دمک کر جا رہے ہو۔مدد کرنے سے میں نے کب انکار کیا ہے؟ پر یہ نیا جوڑا ، نئی جوتیاں پہن کر کون مدد کرتا ہے۔اتنا سج کر تو کوئی رشتہ مانگنے بھی نہیں جاتا۔'' اس نے زہریلے لہجے میں طنز کیا۔
''تجھے تو بس شک کرنے کی بیماری لگ گئی ہے۔ اب کیا نیا جوڑا پہننے کے لئے میں تہوار کا انتظار کروں؟ میرا جی چاہا تو پہن لیا، اتنی سی بات ہے۔'' تیج پال نے اسے مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کی۔
''تمہاری اتنی سی باتوں کو خوب جانتی ہوں میں۔شک کرنے والی بیمار لگتی ہوں ناں ۔ کیا میرا وہ شک بھی غلط تھا جب تمہیں گرمیت کے ساتھ پکڑا تھا؟ کیا میں نہیں جانتی کہ مدد کرنے کے بدلے میں تم نے جانکی اور دیوکی سے ان کی عزت کا سودا کیا تھا۔ میں کہتی ہوں میرا زیادہ منہ نہ کھلواؤ۔ اگر سرپنچ جی کے آگے میرا منہ کھل گیا تو سر عام دھوتی کھل جائے گی تمہاری۔ پنڈ میں کسی کو منہ دکھانے کے بھی لائق نہیں رہو گے۔'' طیش کے عالم میں منجیت کی قینچی جیسی زبان خرافات بکنے لگی تو تیج پال بھی آگ بگولا ہو گیا۔
''بند کر اپنی بکواس...... میرے معاملے میں ٹانگ نہ اڑایا کر...... میرا جو جی چاہے گا وہ میں کروں گا۔ تیرے حکم کا غلام نہیں ہوں۔ کیا کرے گی؟ سرپنچ کو بتائے گی؟ جا...... بتا دے ۔زیادہ سے زیادہ وہ کیا سزا دے گا؟ پنڈ سے نکال دے گا تجھ سے الگ کر دے گا۔ تیرے ساتھ رہنا ہی کون چاہتا ہے۔تو کون سا میرا حق ادا کرتی ہے مہینوں گزر گئے مگر ایک بار بھی اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیا مجھے تو تیرے کردار پر بھی شک ہو رہا ہے۔ دن بھر گھر سے باہر رہتی ہے۔ جانے کدھر منہ کالا کروا رہی ہے جبھی میری ضرورت نہیں پڑتی تجھے۔''
''تیج پال......'' وہ پوری قوت سے چلائی۔
''چلا مت...... چلانا مجھے بھی آتا ہے۔ مگر میں چار دیواری میں تجھے نیچی آواز میں سمجھائے دیتا ہوں۔ جو جیسا چل رہا ہے، چپ چاپ چلنے دے۔ اگر اپنی زبان کھولی تو میں تجھے طلاق دے کر نندنی کے ساتھ بیاہ کر لوں گا۔'' وہ غضب آلود لہجے میں دھمکی دیتا ہوا گھر سے نکل گیا۔
منجیت سکتے کی سی حالت میں اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔ آج زندگی میں پہلی بار تیج پال نے دل کی بھڑاس نکالی تھی۔ وہ جو منجیت کے آگے بھیگی بلی بنا رہتا تھا، آج غضب ناک شیر بن گیا تھا۔
''پانی سر سے اوپر آ چکا ہے۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔'' منجیت ٹھنڈے دماغ سے سوچنے لگی تو ایک راستہ اسے سجھائی دے گیا۔ جس میں اس کی بھی بھلائی تھی اور نندنی کی بھی۔ یہ ترکیب مضحکہ خیز بھی

تھی، تو کسی حد تک نیک بھی۔

جبکہ دوسری جانب تیج پال کے ارادے انتہائی خطرناک تھے۔ اس نے ایک جارحانہ قدم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کا ضبط جواب دے چکا تھا۔ وہ فکر فردا سے بے نیاز ہوچکا تھا اور جلد از جلد اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا کر اپنی راہ میں حائل دیوار گرا دینا چاہتا تھا۔

نندنی کے گھر جاکر اس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اسے خشک میوہ پیش کیا۔ وہ جو پہلے ہی اس قدر عنایات پر خجل رہا کرتی تھی، مزید پشیمان ہوگئی۔ تیج پال کے روپ میں اسے اپنا باپ دکھائی دیتا تھا۔ وہ صدق دل سے اس کا شکریہ ادا کرنے لگی اور تیج پال یہ سوچ کر کہ وہ اب اس کے دام میں مقید ہونے کے لئے مکمل طور پر تیار ہے، لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔

شام ہوتے ہی منجیت نندنی کے گھر پھر سے گئی۔ اس نے اپنے خاوند کے ناپاک ارادوں کو نندنی کے آگے ظاہر نہیں کیا، البتہ نہایت ہوشیاری سے تیج پال کے بارے میں اس کی رائے جاننے کے لئے استفسار کرنے لگی۔

''بات سن...... ان کا بار بار یہاں آنا تجھے برا تو نہیں لگتا۔؟''

''ارے نہیں، کیسی باتیں کرتی ہو دیدی۔ وہ تو میرے لئے پتا کی طرح ہیں۔ ایک باپ اپنی بیٹی کے گھر آئے تو بھلا بیٹی کیوں ناراض ہوگی۔؟'' نندی خوش دلی سے بولی تو منجیت کو اطمینان ہوگیا کہ تیج پال نے اب تک اپنے غلیظ ارادے کو نندنی سے پوشیدہ رکھا تھا۔ پھر وہ ماحول کو مزید خوشگوار بنانے کی نیت سے بولی۔

''ہائے اب میرا خاوند اتنا بھی بڈھا نہیں ہے کہ تو اسے باپ ہی سمجھنے لگے۔ ابھی تو وہ چالیس، بیالیس کا گبرو جوان ہے۔'' وہ بھونڈے انداز میں ہنسی تو نندنی بھی کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ منجیت نے جو ترکیب سوچی تھی، اس حوالے سے بات کرنے کا سرا اسے از خود مل گیا۔

''سن نندنی...... دو دن بعد رکھشا بندھن کا تہوار ہے۔ اس دن پنڈ کی ساری عورتیں سرپنچ کے گھر جمع ہوتی ہیں اور اپنے بھائیوں کے ساتھ ساتھ سرپنچ کو بھی راکھی باندھتی ہیں۔ میں سوچ رہی ہوں تیرا تو کوئی بھائی ہے نہیں۔ تو تیج پال کو راکھی باندھ کر اسے باپ کے بجائے بھائی کیوں نہیں بنالیتی۔'' اس نے راز داری سے اپنا منصوبہ ظاہر کیا۔

''ہاں دیدی یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ اس طرح تو وہ میرے قانونا بھائی بن جائیں گے۔ ایسے نیک اور مخلص انسان کو کون بھائی نہیں بنانا چاہے گا؟ میں ان کو راکھی ضرور باندھوں گی اور پھر تمہیں بھابھی کہوں گی بھابھی۔'' نندنی نے خوشی سے سرشار ہوکر منجیت کے گال پکڑ لئے۔

''اچھا، اچھا ٹھیک ہے۔ مگر فی الحال یہ بات کسی کو نہ بتانا۔ ان کو تو ہرگز پتا نہ چلے۔ انہیں تو سرپنچ کے سامنے باندھنا۔ ٹھیک ہے میں چلتی ہوں۔'' منجیت عجلت میں بول کر اٹھی۔

''ارے دیدی ٹھہرو...... چائے لاتی ہوں۔'' نندنی نے روکنا چاہا۔

''بعد میں پلا دینا۔ ابھی مجھے کئی کام ہیں۔'' اتنا کہہ کر منجیت گھر لوٹ آئی جہاں تیج پال اس کا منتظر تھا۔

''کہاں گئی تھی منجیتے۔؟'' اس نے نرم لہجے میں پوچھا تو وہ چونک گئی۔ پھر بگڑ کر بولی۔

''کہیں منہ کالا کرنے نہیں گئی تھی۔ اپنی طرح سمجھ رکھا ہے۔؟''

''تو اب تک خفا ہے مجھ سے؟'' وہ ہنوز پرسکون لہجے میں بات کررہا تھا۔ منجیت کی حیرانی بڑھنے لگی۔ اسے متعجب دیکھ کر اس نے مزید کہا۔

''مجھے معاف کردے منجیت۔ مجھے عقل آگئی ہے۔ یقین کر میرا۔ انسان کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ میں سچ میں بدل چکا ہوں۔ میں نے بہت سوچا کہ اپنی گندی عادتوں کو چھوڑ کر بھی مجھے کیا ملے گا؟ پھر خیال آیا کہ اپنے تو اپنے ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے

سدھرنے میں تو میری مدد ضرور کرے گی۔ میرا حوصلہ ضرور بڑھائے گی...... بول...... میرا فیصلہ ٹھیک ہے ناں......؟" اس نے پیار سے منجیت کے ہاتھ تھام لئے، جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"بول ناں منجیتے، کچھ تو بول۔" وہ مضطرب ہونے لگا۔

"یہ اچانک کیا ہوگیا جی تمہیں؟ سویرے تو مجھے طلاق دینے کی درپے تھے۔ پھر ابھی کیا ہوگیا؟ ایک ہی دن میں اتنا بدلاؤ۔" اسے اعتبار کرنے میں دشواری محسوس ہورہی تھی کیونکہ وہ ایک بار پہلے بھی دھوکہ کھا چکی تھی۔

"میں نے سوچا تجھے طلاق دے دوں گا تو بھی نندنی کون سا میری ہوجائے گی۔ وہ ہندو ہے، ہم سکھ ہیں۔ سرپنچ یہ شادی نہیں ہونے دے گا۔" وہ دلفریب لہجے میں بولا تو بالآخر منجیت نے اسے معاف کردیا۔ اس نے منجیت سے کہا کہ اس نے نیت کی تھی کہ اگر منجیت اسے معاف کردیتی ہے تو وہ اسے گردوارے میں لے جاکر گرو کے سامنے نئی شریفانہ زندگی کی ابتداء کے لئے قسم کھائے گا۔

منجیت مان گئی اور وہ دونوں اگلی صبح جسپال اور رتن کو گیتا گوالن کے گھر چھوڑ کر روانہ ہوگئے۔

گاؤں سے دور نکل جانے کے باوجود وہ کسی اور آبادی تک نہیں پہنچے تھے۔ منجیت کہنے لگی۔

"سنو جی، ہم کہیں راستہ تو نہیں بھٹک گئے۔؟"

"ہم بالکل صحیح راستے پر ہیں۔ تو فکر نہ کر۔ منزل قریب ہے۔" اس کے لہجے میں اک عجیب سی پراسراریت تھی۔ منجیت کو شک سا ہونے لگا مگر وہ خاموش رہی۔ تیج پال نے تانگے کا رخ جنگل کی طرف کردیا۔

"یہ ہم کہاں جارہے ہیں جی۔؟" منجیت عجلت میں بولی۔

"میں نے کہا ناں چپ چاپ بیٹھی رہ۔" تیج پال کا قرق ٹوٹا تو درشتی سے بولا مگر منجیت کو خطرے کا احساس ہوچکا تھا۔ اس نے تانگے سے چھلانگ لگادی اور ایک طرف دوڑ پڑی۔ تیج پال نے بھی سرعت سے تانگے میں رکھا ہوا بڑا سا ڈنڈا اٹھایا اور اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑی اور تیج پال اس کے سر پر پہنچ گیا۔

"سالی کمینی...... مجھ سے بھاگتی ہے۔ تیج پال سنگھ سے۔ بہت چالاک سمجھتی ہے خود کو۔ سمجھایا تھا...... کئی دفعہ سمجھایا تھا کہ میری واہ میں رکاوٹ مت بن۔ اپنے کام سے کام رکھ...... جینے دے مجھے میری پسند کی زندگی مگر تو نہیں سمجھی۔ تو نے ہی سرپنچ سے کہہ کر دیودھر کا بیاہ جانکی سے کروایا ناں؟ جسے دیکھ کر دیوکی نے بھی مجھ سے منہ موڑلیا۔ تو کیا سمجھتی ہے مجھے کچھ نہیں پتا۔؟" وہ کسی بپھرے ہوئے شیر کی طرح غضب ناک ہوکر پھاڑ کھانے والے لہجے میں چیخ رہا تھا۔ منجیت دہشت زدہ سی اس کے آگے بے بس پڑی تھی۔

"مجھے گرمیت کے گھر سے نکلتا دیکھ کر تو نے اسے بھی دھمکیاں دے کر مجھ سے دور کردیا اور اب نندنی کے معاملے میں ٹانگ اڑانے چلی تھی، وہ بھی تب جب وہ میری محبت کے جال میں پھنس چکی ہے۔ جب کہوں تب مجھ سے شادی پر آمادہ ہوجائے۔" وہ خوش فہمی کے عالم میں زوردار قہقہہ لگانے لگا۔ منجیت کھڑی ہوگئی۔

"وہ تم سے محبت نہیں کرتی۔ یہ تمہاری بھول ہے، وہ تو......"

"بکواس بند کر۔" تیج پال نے زوردار طمانچہ رسید کرکے اسے مزید کچھ کہنے سے باز رکھا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اور پھر سے زمین بوس ہوگئی۔ اب تیج پال مزید کچھ کہنے کے موڈ میں نہ تھا۔ منصوبے کے مطابق اس نے منجیت کو بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور غلیظ گالیاں دیتے ہوئے ڈنڈے کا ایک بھرپور وار اس کے سر پر کیا۔ وہ تڑپ کر دوہری ہوگئی۔ سر سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ تیج پال نے اس کے غش کھائے وجود کو اٹھا کر درخت کے ساتھ باندھ دیا پھر اپنی کمر کی طرف چھپا چاقو نکال کر اس کے پیٹ میں گھونپ ڈالا۔

"میرے راستے کا کانٹا ہٹ چکا۔ اب اسے

اس جنگل کے درندے کھا جائیں گے اور ہر ثبوت مٹ جائے گا۔'' اس نے منجیت کا خون آلود دوپٹہ کھینچا اور من ہی من میں خوش ہوتا گاؤں لوٹ گیا۔

☆......☆......☆

بھیڑیئے کو پکڑنے کا ارادہ برخاست کیا جا چکا تھا۔ گاؤں میں ہر زبان پر اسی کا ذکر تھا۔ کئی لوگ تو اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔ خصوصاً عورتیں زیادہ خواہش مند تھیں۔ وہ بس اس کا دیو ہیکل جسم دیکھنا چاہتی تھیں وہ بھی دور سے۔

رات ہوئی تو میں گھر کی کھڑکی کے پاس کھڑا مسجد کے پاس بنی بیٹھک کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں گاؤں کے لوگ معمول کے مطابق کچھ بحث میں مصروف تھے۔ دور سے مجھے وہ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہے تھے کیونکہ رات بھی تھی۔ میں نے ایک نظر مسجد کی طرف دیکھا اور کھڑکی سے ہٹ گیا۔ پھر کسی خیال کے تحت دوبارہ اس طرف دیکھنے لگا جہاں دیئے رکھے جاتے تھے۔ مسجد کے بائیں طرف بنی چھوٹی سی دیوار پر رکھے چمکتے دیئوں کی روشنی میں مجھے کچھ نظر آیا۔ اس دیوار کے پیچھے کوئی جانور بیٹھا تھا۔ کیا تھا وہ؟ گائے، بھینس یا گدھا...... نہیں وہ بھیڑیا تو نہیں۔؟

یہ خیال آتے ہی میں تیزی سے دروازے کی جانب لپکا۔ میرے زخم تازہ تھے، مگر میں چلنے پھرنے کے قابل تھا۔ گھر سے نکل کر میں سیدھا اس جانور کی طرف بڑھنے لگا۔ چارپائیوں پر بیٹھے لوگ مجھے آتا دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ سراسیمہ تھے کہ مجروح حالت میں مجھے گھر سے نکلنے کی کیا ضرورت تھی۔ مگر میرا رخ ان کی طرف نہیں تھا۔ میں اس دیوار کی جانب بڑھ رہا تھا اور جیسے ہی وہاں پہنچا تو بھیڑیئے کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ خوف کی وجہ سے میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اگر وہ اچانک مجھ پر حملہ کر دیتا تو میں کیا کر سکتا تھا۔ وہ سر اٹھائے میری طرف ہی دیکھ رہا تھا مگر اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ میں فوراً وہاں سے ہٹ کر چارپائیوں کی سمت چلا گیا ان لوگوں کا دھیان میری طرف ہی تھا۔

''بیٹا اس حالت میں تم گھر سے باہر کیوں نکلے اور وہاں کیا کر رہے تھے۔؟'' بابا نے میرے قریب پہنچتے ہی استفسار کیا۔

''بابا...... اس دیوار کے پیچھے وہی بھیڑیا بیٹھا ہے۔'' میرے جملے نے سب کے ہوش اڑا دیئے۔

''کیا۔؟'' کئی لوگوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

''لگتا ہے تم ہوش میں نہیں ہو۔ بھیڑیئے کا خوف اب تک تمہارے ذہن سے نہیں نکلا۔'' بابا کو یقین نہیں آیا۔

''میں سچ بول رہا ہوں بابا۔'' میں نے فوراً کہا۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' جسپال اس طرف بڑھنے لگا۔

''نہیں جسپال...... وہ حملہ کر دے گا۔'' میں نے جسپال کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میں نہیں مانتا کہ وہ حملہ کرے گا۔'' جسپال نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر اس جانب قدم بڑھا دیئے۔ مہندر اس کے پیچھے ہو لیا۔ وہ دونوں وہیں جم کر رہ گئے۔ ہم سب اضطرابی کیفیت میں ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لمحوں میں وہ واپس لوٹ آئے۔

''دلاور ٹھیک کہتا ہے۔ بھیڑیاں وہاں موجود ہے مگر وہ نڈھال ہے۔ کوئی حرکت نہیں کر رہا۔'' جسپال نے آتے ہی کہا مگر اس نے محسوس کیا کہ کسی نے اس کی بات نہیں سنی۔ ہر کوئی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کے عقب میں دیکھ رہا تھا۔ دراصل اس کے وہاں سے آتے ہی بھیڑیا بھی اس کے پیچھے پیچھے یہاں تک آ گیا۔ سب بے حس و حرکت بت بنے کھڑے تھے۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ بھیڑیا سب سے بے نیاز میری طرف آ گیا اور اپنی اگلی ٹانگ اونچی کر دی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی ٹانگ میں ایک بڑا کانٹا دھنسا ہوا تھا اور وہاں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ اذیت میں تھا۔

''یہ دیکھ جسپال...... اس کے پاؤں میں کانٹا ہے۔'' میرا خوف پل بھر میں غائب ہو گیا۔ جسپال نے اب بھیڑیئے کو دیکھا اور فوراً قریب آ گیا۔ اس نے بے

خوفی سے اس کی ٹانگ تھام لی اور کانٹا نکالنے لگا۔

''رکو بیٹا، تم مت نکالو، کہیں یہ درد سے بدک نہ جائے۔'' اشتیاق چاچا نے فوراً اسے ٹوکا اور قریب آ گئے۔ اب سب کا خوف کم ہو رہا تھا۔ سب آہستہ آہستہ قریب آ رہے تھے۔ اشتیاق چاچا نے مہارت سے کانٹا نکال لیا۔ پھر شانے پر رکھی ہوئی چادر کا ٹکڑا پھاڑ کر عارضی پٹی باندھ دی۔ وہ پرسکون ہو کر وہیں بیٹھ گیا اور جسپال اسے چمکارنے لگا۔

سب اس کے قریب آ گئے۔ جس جس نے اسے پہلی بار دیکھا وہ سب متعجب تھے۔ اس کے پورے جسم پر بڑے بڑے سفید اور سرمئی بال تھے۔ وہ بلاشبہ خوبصورت تھا۔ ہاتھ پھیرتے پھیرتے جسپال نے دیکھا کہ اس کے گلے میں چمڑے کا بنا ہوا ایک سیاہ طوق تھا، جس پر انگریزی سنہری حروف میں ''شیبا'' لکھا ہوا تھا۔ وہ چونک گیا۔ اس نے فوراً سب کو متوجہ کیا۔

''یہ دیکھو...... میں کہتا تھا ناں کہ یہ جنگلی جانور نہیں ہے۔ اس کے گلے میں پٹا ہے۔ یہ کسی کا پالتو ہے۔'' اس کی آواز میں بشاشت تھی۔ سب طوق کی طرف دیکھنے لگے۔

''کیا لکھا ہے اس پر پتر۔؟'' سرپنچ جی بولے

''شیبا۔'' جسپال نے جیسے ہی شیبا کہا۔ بھیڑیئے نے سرعت سے گردن اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا......؟ شیبا۔؟'' سرپنچ جی نے وہ لفظ دہرایا تو بھیڑیئے نے گردن ان کی طرف گھمالی۔

''ارے دیکھو یہ کیسے چونک رہا ہے۔ لگتا ہے اس کا نام شیبا ہے۔'' اشتیاق چاچا نے فوراً محسوس کر لیا۔ ان کی بات سن کر مہندر، جو بھیڑیئے کے عقب میں کھڑا تھا، پکارنے لگا۔

''شیبا...... شیبا۔'' بھیڑیا کھڑا ہو گیا اور مڑ کر مہندر کے قریب ہو گیا۔ مہندر ٹپٹا گیا مگر جسپال نہایت خوش ہو گیا۔

''شیبا...... میرے پاس آ جا۔'' جسپال نے پکارا تو بھیڑیا اس کے قریب آ گیا۔ جسپال کو اس پر خوب پیار آیا۔ وہاں موجود ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ شیبا کوئی وحشی درندہ نہیں بلکہ ایک معصوم پالتو جانور ہے۔

''او جی اب سمجھ آیا کہ اس نے اپنے دلاور کی مدد کیوں کی۔ یہ انسانوں سے محبت کرتا ہے۔ ضرور انسانوں کے بیچ پلا بڑھا ہے۔'' سرپنچ جی مسکرا کر بولے۔

''ہاں بالکل...... یہ اپنے مالکان سے بچھڑ گیا ہے۔ وہ لوگ ضرور اس کے لئے پریشان ہوں گے۔'' بابا نے تائید کی۔

''ٹھیک کہتے ہیں امام صاحب...... جانے کتنے دنوں سے جنگل میں بھٹک رہا ہے۔ کچھ کھایا پیا بھی ہوگا کہ نہیں۔'' اشتیاق چاچا نے تاسف بھرے لہجے میں کہہ کر جسپال سے کہا۔

''بیٹا تم گیتا بہن کے گھر سے دودھ لے آؤ اور میرے گھر سے مرہم پٹی بھی لے آنا۔'' لکھویندر وہاں موجود نہیں تھا ورنہ دودھ کے لئے اسے بھیجا جاتا۔ جسپال چلا گیا اور جب لوٹا تو اس کے پیچھے گاؤں کی کئی عورتیں بھی تھیں جو شیبا کو دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ دور ہی رک گئیں اور تعجب سے شیبا کے طویل القامت وجود کو دیکھنے لگیں۔ گیتا کاکی نے جانوروں کے بیچ میں ایک عمر گزاری تھی۔ وہ بے خوف ہو کر شیبا کے قریب آ گئیں۔ شیبا بالٹی میں منہ ڈالے شوق و شغف سے دودھ ہی پی رہا تھا۔ گیتا کاکی کی تجربہ کار اور رمز شناس آنکھوں نے کچھ محسوس کیا۔ وہ کہنے لگیں۔

''یہ بھیڑیا کہاں ہے؟ یہ کتا ہے۔''

''کتا ہے۔؟'' سرپنچ جی بولے۔

''ہاں یہ کتا ہے۔ اچھی نسل کا یہ نسل ہندوستان میں کہیں بھی نہیں ہے۔ یہ بدیسی نسل ہے۔ آپ سب اسے بھیڑیا سمجھ رہے تھے مگر یہ بھیڑیا نہیں ہے۔'' گیتا کاکی کی بات سن کر سب بغور شیبا کو دیکھنے لگے۔

☆......☆......☆

اپنے منصوبے کو کامیاب بنا کر تیج پال خوشی خوشی گاؤں لوٹ آیا۔ اب نندنی اور اس کے درمیان کوئی

دیوار حائل نہیں تھی۔ وہ سیدھا گیتا گوالن کے گھر آنسو بہاتا ہوا پہنچ گیا۔ اسے منجیت کا خون آلود دوپٹہ دکھا کر روتے ہوئے بولا۔

''پرجائی جی...... دیکھو یہ کیا ہوگیا...... میری منجیت۔'' وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس کو دیکھ کر ننھا جسپال سہم کر گیتا سے چپک گیا۔

''کیا...... کیا ہوا منجیت کو۔؟'' گیتا گھبرا کر دوپٹہ دیکھنے لگی۔

''کیا بتاؤں پرجائی جی...... ہمارے تانگے پر ایک باگھ نے حملہ کردیا۔ وہ خونی درندہ...... وہ ظالم میری منجیت کو میری آنکھوں کے سامنے نوچ نوچ کر کھا گیا۔ میں بیچ میں کود پڑا مگر...... مگر نہیں بچاسکا اپنی منجیت کو۔'' وہ کمال اداکاری کا مظاہرہ کررہا تھا۔ گیتا دوپٹہ سینے سے لگا کر زاروقطار رونے لگی بچے سہمے سہمے سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ بات کو سمجھ پائے یا نا سمجھے البتہ باپ کو روتا ہوا دیکھ کر بھی رونے لگے تھے۔

پھر بات پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ ہر کوئی تیج پال کے گھر اسے دلاسہ دینے آرہا تھا نندنی کا تو رو رو کر برا حال تھا۔ وہ اس قدر مضطرب تھی کہ جیسے منجیت اس کی سگی بہن ہو۔ اس دوران تیج پال دزدیدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا اور من ہی من میں نہایت خوش ہوتا کہ تیر نشانے پر لگا ہے۔ وہ اس کو قع سے فیض یاب ہونے کے لئے روتے ہوئے بار بار بول رہا تھا۔

''ہائے میرے معصوم چھوٹے چھوٹے مسکین بچے ماں کے بغیر کیسے رہیں گے؟ کون دے گا ان کو ماں کا پیار؟ ارے کوئی ہے......؟ کوئی ہے تو سامنے آئے۔'' وہ یہ پورا جملہ صرف نندنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا۔ وہ تو کھڑی نہ ہوتی البتہ گاؤں کے کئی مرد حضرات اسے سنبھالنے آجاتے اور وہ منہ لٹکا کر رہ جاتا۔

اگلے روز رکھشا بندھن تھا۔ تمام عورتیں اپنے بھائیوں کے ساتھ سرپنچ جی کے گھر چلی آئیں۔ اس بار منجیت کے غم کی وجہ سے ماحول سوگوار تھا۔ اس کے سوگ میں کوئی شاندار اہتمام اور سجاوٹ نہیں کی گئی تھی۔ لیکن

نیند اور شخصیت

کیا آپ پیٹ کے بل سوتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو یہ عادت فوراً ترک کردیں، کیونکہ ماہرین نفسیات نے طویل تجربات کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جو لوگ پیٹ کے بل سوتے ہیں وہ طرح طرح کی نفسیاتی پریشانیوں میں مبتلا رہتے ہیں جو لوگ بلی کے جسم کی طرح دائرہ سا بنا کر سوتے ہیں وہ اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتے ہیں اور تحفظ چاہتے ہیں۔ جو لوگ پیٹھ کے بل سوتے ہیں۔ ان میں بے پناہ خوداعتمادی ہوتی ہے۔ وہ اپنی مستحکم شخصیت کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ہر قسم کا مقابلہ کرنے اور اپنے مفادات کا دفاع کرنے کے قائل ہوتے ہیں۔ جو لوگ تکیے کے ساتھ لپٹ کر سونے کے عادی ہوتے ہیں وہ محبت کے بھوکے ہوتے ہیں۔ چادر یا رضائی میں منہ چھپا کر سونے والے حضرات قنوطی ہوتے ہیں۔ دائیں کروٹ سونے والے تخلیقی صلاحیت رکھتے ہیں جبکہ بائیں کروٹ سونے والے اپنی ذات سے مطمئن اور تحفظ کے احساس سے سرشار ہوتے ہیں۔

(سبحان۔کراچی)

دیگیں چڑھائی گئی تھیں تیج پال اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لے کر وہاں پہنچ گیا۔ آج موقع اچھا تھا۔ وہ اپنے بچوں کا حوالہ دے کر سرپنچ جی سے نندنی مانگنا چاہتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ مذہب کے فرق کی وجہ سے سرپنچ انکار کرے گا۔ مگر اس کے پاس بہانہ موجود تھا۔ وہ گیتا گوالن کا حوالہ دینے والا تھا کہ وہ ہندو ہونے کے باوجود کرتار سنگھ کی بیوی تھی، تو وہ کیوں نندنی سے بیاہ نہیں

کرسکتا؟

وہ خوشی سے سرشار ہوتا، خیالی پلاؤ پکاتا سرپنچ جی کے پاس پہنچ گیا۔

”مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے سرپنچ جی۔“

”ہاں ہاں بولو تیج پال کیا بات ہے؟“ انہوں نے فوری توجہ دی۔

”جی بات یہ ہے کہ......“ وہ اتنا ہی بول پایا تھا کہ اچانک عقب سے گیتا گوالن نمودار ہو کر کہنے لگی۔

”تیج پال بھیا...... ایک ضروری بات کرنی ہے تم سے۔“

”لو جی...... آج تو سارے ہی ضروری باتیں کرنے آئے ہیں۔ چلو پرجائی جی پہلے آج ہی بول دو۔“ سرپنچ جی کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بولے جبکہ تیج پال ناگواری کے تاثرات چھپانے لگا۔

”وہ جی دراصل منجیت چاہتی تھی کہ میرا لکھویندر اس کا جمائی بنے۔ میں نے اور کرتار جی نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم تمہاری رتن کی سگائی آج ہی ہمارے لکھویندر کے ساتھ کردیتے ہیں۔ کیا آپ کو رشتہ منظور ہے۔؟“ گیتا نے صاف الفاظ میں باقاعدہ رشتہ ہی طے کرلیا۔

”کیسی باتیں کرتی ہو پرجائی جی۔ ابھی تو منجیت پرجائی کو گزرے ایک ہی دن ہوا ہے۔ ان کے سوگ میں ہم آج تہوار بھی سادگی سے منارہے ہیں۔ پھر بھلا آج سگائی کیسے ہوسکتی ہے۔“ تیج پال کی بجائے سرپنچ جی نے جواب دیا جبکہ خودغرض تیج پال سوچنے لگا کہ اب وہ اپنی شادی کی بات کیسے کرے۔

”معاف کرنا سرپنچ جی...... مجھے منجیت کی خواہش یاد رہی اور سوگ کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔“ وہ خجل سی ہوگئی۔

”بہرحال رشتہ مانگ ہی لیا ہے تو تیج پال تم اپنی مرضی بھی بتادو۔“ سرپنچ جی نے تیج پال سے پوچھا۔

”مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ منجیت ایسا چاہتی تھی تو میں انکار نہیں کروں گا۔ میں تو کہتا ہوں سگائی بھی آج ہی کردو۔ اب مرنے والوں کے ساتھ کوئی مر تو نہیں جاتا۔ زندگی تو چلتی رہتی ہے ناں جی۔“ وہ بس اپنا کام بنانا چاہتا تھا اس لئے اپنی تین برس کی بیٹی کی سگائی طے کردی۔

”نہیں جی نہیں...... بس زبانی کلامی رشتہ پکا ہوگیا یہی کافی ہے۔ اب جب یہ بچے جوان ہوجائیں تو سیدھا بیاہ کردینا۔“ سرپنچ جی اپنے اصول نہیں توڑنا چاہتے تھے۔ تیج پال الجھنے لگا جبکہ گیتا خوشی سے کھل اٹھی۔

”میں یہ خوشخبری کرتار جی کو سنا کر آتی ہوں۔“ وہ فرط مسرت سے سرشار ہوتی ہوئی چلی گئی اور تیج پال اپنی بات کہنے کے لئے الفاظ ترتیب دینے لگا۔

”چلو مبارک ہو بھئی۔ بچپن میں ہی کڑی کو اچھا رشتہ تو مل گیا۔“ سرپنچ جی اپنے بازو پھیلا کر بولے تو وہ جبراً بغل گیر ہوگیا۔ اسی اثناء میں نندنی وہاں آگئی۔ اسے دیکھ کر تیج پال ٹپٹا گیا۔ اس کی موجودگی میں وہ بات نہیں کرسکتا تھا۔ نندنی نے انہیں گلے ملتے دیکھ لیا تھا اس لئے وجہ پوچھنے لگی۔ جواباً سرپنچ جی نے رشتے کی خوش خبری سنادی۔

”ارے واہ...... اتنی بڑی بات خاموشی کے ساتھ طے ہوگئی اور ہمیں پتا تک نہ چلا چلو خیر ہے...... اس خوشی کے موقع پر میں بھی آپ کے ساتھ ایک نئے رشتے کی شروعات کرنا چاہتی ہوں۔“ نندنی کی بات سن کر تیج پال کو اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا۔ اس کے دل کی بات نندنی کی زبان پر تھی۔

”مم...... میں تیار ہوں۔“ تیج پال نے جھٹ سے کہا۔

”اچھا...... تو پھر اپنا ہاتھ آگے بڑھایئے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ تیج پال نے نشے کی سی حالت میں ہاتھ آگے بڑھایا اور نندنی نے نہایت محبت کے ساتھ اس کے ہاتھ پر راکھی باندھ دی۔

”نیا رشتہ مبارک ہو تیج پال بھیا...... یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے آپ جیسا بھائی مل گیا۔“ وہ

مبارک باد دیتی شاداں وفرحاں وہاں سے چل دی۔ اور تیج پال ایک دم سے جیسے ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے ہاتھ پر بندھی راکھی کو تکنے لگا۔ اسے اب خیال آیا کہ نندنی کے نشے میں وہ بھول بیٹھا تھا کہ آج رکھشا بندھن ہے۔

☆......☆......☆

لکھویندر کی بھینسوں کے باڑے میں ایک طرف چاردیواری ڈال کر کمرہ بنایا گیا تھا۔ جہاں لکھویندر کی کتیا گنگا رہتی تھی۔

جسپال نے سرپنچ جی سے درخواست کی تھی کہ وہ شیبا کو گاؤں میں رکھنے پر رضامند ہوجائیں۔ انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور یہ طے پایا کہ شیبا کو گیتا کاکی کے باڑے میں گنگا کتیا کے کمرے میں رکھا جائے گا۔

لکھویندر اس وقت تو خاموش رہا مگر جب تمام لڑکے شیبا کو باڑے کی طرف لے جانے لگے تو راستے میں لکھویندر جسپال پر بگڑنے لگا۔

''کیا ضرورت تھی اس کو میری گنگا کے کمرے میں رکھنے کی بات کرنے کی؟ وہ ڈر جائے گی، سہم جائے گی۔''

''صاف صاف بول کہ تجھے ڈر ہے۔ تیری پوتر گنگا کہیں میلی نہ ہوجائے۔'' جواباً مہندر نے معنی خیزی سے کہا تو سب قہقہہ لگانے لگے۔

''اچھا چل میں تجھ سے اپنے شیبا کے لئے گنگا کا ہاتھ مانگتا ہوں۔'' جسپال نے بھی استہزائیہ لہجہ میں لکھویندر کو مزید چھیڑا۔

''بھلا ہاتھی اور چیونٹی کا کیا جوڑ؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا تو مہندر بولا۔

''اب اتنی بھی چھوٹی نہیں ہے گنگا۔ تو پھر رشتہ پکا سمجھوں۔؟''

''بکواس نہ کر یار۔'' لکھویندر نے برا سا منہ بنا کر کہا تو فضا میں ایک بار پھر سب کے قہقہے گونجنے لگے۔

راستے میں الوک کا کا کی درزن بیٹی رکمنی نظر آئی۔ جو شیبا کو دیکھ کر ساکت کھڑی رہ گئی۔ مہندر نے ہم سب کو باڑے کی سمت جانے کا کہا اور رکمنی کی طرف چلا گیا۔

''گھبرا مت رکمنی...... شیبا خطرناک نہیں ہے۔ دیکھ وہ لوگ شیبا کو لے کر چلے گئے۔'' اس نے پیار سے ہمت بڑھائی مگر رکمنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔

''تم نے سرپنچ جی سے بات کی۔؟''

''ارے تو کیوں چنتا کرتی ہے۔؟ بار بار یہی بات کرتی ہے۔ میں کرلوں گا بابو جی سے بات۔ وہ بھلا کیوں انکار کریں گے۔؟'' مہندر ناراض سا ہوگیا۔

''تو پھر کب کرو گے بات؟ کتنے مہینے ہوگئے اور تم بس مجھے تسلیاں دیتے آرہے ہو۔'' وہ رودینے کو تھی۔

''اچھا...... اب رونے مت بیٹھ جانا۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ اگر بابو جی نے یہ کہہ کر رشتہ کرنے سے انکار کردیا کہ تو ہندو ہے تو پھر جو بھی کرنا ہوگا، تجھے کرنا ہوگا اور تو بھی ناکام رہی تو میں اپنی جان دے دوں گا۔'' مہندر دوٹوک لہجے میں بول کر وہاں سے چلا گیا اور رکمنی تڑپ کر رہ گئی وہ نادم تھی کیونکہ آج ایک بار پھر جلد بازی کا مظاہرہ کر کے اس نے مہندر کو خفا کردیا تھا۔

ہم چاروں لڑکے باڑے سے ہنستے کھیلتے لوٹ رہے تھے۔ وہاں گنگا کے خوف زدہ ہو کر دیوار سے چپک جانا اور لکھویندر کا تڑپ کر اس کو سنبھالنے کا منظر ہی بڑا دلچسپ تھا۔ ہم مہندر کو بھی یہ بات بتانا چاہتے تھے۔ وہ ہمیں راستے میں نہیں ملا تو ہم اس کے گھر چلے گئے۔

وہ بے حد اداس تھا اور تکیے میں سر دیئے لیٹا ہوا شاید رو رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر سرعت سے چہرہ صاف کیا تو جسپال نے اس کی پرملال حالت دیکھ کر فوراً استفسار کیا۔ اس نے بھی بنا کوئی بہانہ بنائے سارا قصہ کہہ سنایا۔

''بس...... اتنی سی بات۔ ارے مجھے بھی تو یہی چنتا ہے کہ ریکھا ہندو ہے مگر میں اس مسئلے کا حل کھوج رہا

ہوں۔ تا کہ جان دینے کا سوچنے لگوں۔" جسپال نے اس کی ہمت بڑھانے کی خاطر کہا۔

"لیکن بابو جی ہرگز اپنے رواجوں کو نہیں توڑیں گے۔" مہندر نے مایوسی بھرے لہجے میں خدشے کا اظہار کیا۔

"وہ انصاف پسند ہیں۔ اپنی اولاد کی خوشی کو وہ اولین ترجیح دیں گے۔ تم بس اب چنتا کرنا چھوڑ دو۔" صابر نے دلاسا دیا تو وہ جبراً خاموش ہو رہا مگر ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ سرپنچ جی نے دروازے کی آڑ سے ہماری گفتگو سن لی تھی۔

ادھر تیج پال نے گھر جاتے ہی توڑ پھوڑ مچا دی اور غیض وغضب کے عالم میں راکھی بھی اتار پھینکی۔ اگر سرپنچ جی نہ ہوتے تو وہ محفل میں نندنی کو ضرور ایک آدھ طمانچہ رسید کر دیتا۔

مگر اب وہ اپنا قہر برتنوں پر نکالنے کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس کی زندگی میں اولاد کے علاوہ اور کچھ نہیں بچا تھا۔ پنڈ میں ایک بھی کنواری یا بیوہ نہیں تھی، جس سے وہ شادی کر سکتا۔

کچھ عرصہ بعد گیتا کا خاوند کرتار سنگھ ایک جان لیوہ عارضے میں مبتلا ہو کر چل بسا۔ بے غیرت تیج پال اس موقع کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتا، اگر گیتا اس کی بیٹی کی ہونے والی ساس نہ ہوتی۔

تیج پال نفس پر قابو رکھنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ ایک شرمناک اور ناقابل ذکر جنسی بیماری میں مبتلا ہو کر بستر سے لگ گیا۔ ایسے میں گیتا اور نندنی نے خوش اسلوبی کے ساتھ اس کے گھر کا چولہا چوکا اور بچوں کو سنبھالا۔ یہ وید جی کی باثر دواؤں کا کمال تھا جو وہ کم ازکم چلنے کے قابل ہو گیا۔ مگر ٹھیک ہوتے ہی اسے پھر اپنی شادی کی فکر ستانے لگی تھی۔

وہ شاید دوسری شادی کی غرض سے عورت تلاش کرنے کسی اور گاؤں جانے کا سوچ رہا تھا۔ تب وید جی نے ایک ایسا انکشاف کیا جس نے اس کے جذباتی سوچ پر پانی پھیر دیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس کی بیماری تو ختم ہو چکی ہے مگر اس سے ہونے والی الرجی نے تیج پال کو مکمل طور پر نامرد کر دیا ہے۔ وہ بہت گھبرایا اور گڑگڑا کر علاج کے لئے وید جی کے پیروں پر گر کر جستجو کرنے لگا۔ پر وہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ اس زمانے میں وید جی کے پاس الرجی کا کوئی علاج نہ تھا۔

یوں اپنی بے حیائی پر ناز کرنے والے تیج پال کو قدرت نے سزا دے دی تھی۔ اب وہ اعضا شکنی کا شکار رہنے لگا۔ اس کا آس تو ٹوٹ گیا مگر فطرت میں کوئی فرق نہ آیا۔ شاید ایسے لوگوں کو ہدایت نہیں ہوتی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی زندگی میں ایک اور طوفان آنا باقی ہے جو اس کے کالے کرتوتوں کو منظر عام پر لے آئے گا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے سولہ برس گزر گئے۔ بچے جوان ہو گئے مگر دونوں بچوں کے پاس نندنی کی تربیت تھی۔ وہ ہر لحاظ سے اپنے باپ سے مختلف تھے۔ جسپال اور رتن، ریکھا کے ساتھ کھیل کود کر پروان چڑھے تھے۔ جسپال ریکھا میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ مگر یہ بات اپنے دوستوں کے علاوہ کسی کو بھی نہیں بتائی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مذہب کے فرق کی وجہ سے وہ ریکھا کو کھو دے۔ وہ کسی حل کی تلاش میں تھا۔

انہی دنوں شیبا کی آمد اس کی دل گرفتگی میں بہت کمی لائی تھی۔ وہ زیادہ تر شیبا میں ہی مگن رہتا۔ اسے پورے پنڈ میں گھماتا۔ وہ بھرپور جوان تھا مگر شیبا کے آگے بچہ بن جاتا تھا۔

ایک دن وہ اسی طرح شیبا کو ساتھ لئے پنڈ میں گھوم پھر رہا تھا کہ دفعتاً اسے نندنی موسی اپنے گھر کے باہر ہراساں کھڑی نظر آئیں۔ وہ فوراً ان کی جانب لپکا۔ "کیا بات ہے موسی؟" اس نے متفکر لہجے میں پوچھا۔

"بیٹا...... بیٹا ریکھا کو جانے کیا ہو گیا ہے۔ وہ عجیب عجیب آوازیں نکال رہی ہے۔ اس نے توڑ پھوڑ مچا رکھی ہے۔ میں نے کسی طرح اسے کمرے میں بند کر دیا ہے۔ میں گھر سے باہر کسی کی مدد لینے کے لئے

آئی ہوں۔ اچھا ہوا تو آ گیا۔ جا...... جلدی سے سرپنچ جی اور امام صاحب کو بلا لا۔'' انہوں نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ عجلت میں کہا تو جسپال پریشان سا ہو کر گھر میں جانے لگا۔

''ارے...... تو اندر مت جا بیٹا۔ میں ہوں یہاں ۔تو بس ان لوگوں کو جلدی سے بلا کر لے آ۔'' انہوں نے سرعت سے جسپال کو روکا تو اس نے شیبا سمیت سرپنچ کے گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔

کچھ دیر بعد بابا سمیت گاؤں کے کئی افراد رسیوں میں جکڑی ریکھا کے سامنے موجود تھے۔ اس وقت ریکھا خوبرو حسینہ نہیں، بلکہ بھیانک چڑیل لگ رہی تھی۔ سرخ آنکھیں، بکھرے ہوئے بال اور غضب ناک آواز۔ وہ دریدہ دہن ہو کر خرافات بک رہی تھی اور بھیانک قہقہے بھی لگا رہی تھی۔ وہ کسی غیر مرئی مخلوق کے زیر اثر تھی۔ نندنی موسیٰ کا رو رو کر برا حال تھا۔ عورتیں انہیں بمشکل سنبھال رہی تھیں۔

بابا نے ریکھا پر کچھ پڑھ کر پھونکا تو وہ بپھر گئی۔

''زندگی عزیز ہے تو دفع ہو جا یہاں سے۔ تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میری راہ میں رکاوٹ بنے گا تو اپنی جان سے جائے گا۔ تیری نسل ختم کر دوں گا میں۔'' پھاڑ کھانے والے لہجے میں دھمکیاں دیتی کرخت مردانہ آواز یقیناً ریکھا کی نہیں تھی۔ وہاں موجود کمزور دل خواتین اور مرد کانپ کر رہ گئے۔

وہ بابا کے قابو سے باہر تھی۔ انہوں نے وہاں سے ہٹنا مناسب سمجھا اور نندنی موسیٰ کو تسلی دے کر وہ سرپنچ جی سے اس آفت سے چھٹکارے کے متعلق صلح مشورہ کرنے لگے۔

جسپال نے شیبا کو نندنی موسیٰ کے گھر کے باہر باندھ دیا تھا۔ جانے کسی نے اس کی زنجیر کھول دی اور شیبا آزاد ہوتے ہی گھر میں گھس آیا۔ وہ ریکھا کے سامنے جا کر زوردار آواز میں بھونکنے لگا۔ ریکھا ہذیانی لہجے میں چیخنے لگی۔ وہ بے حد گھبرائی ہوئی رسیاں توڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دراصل اس میں موجود آسیب شیبا کی وجہ سے دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ اس کی دل دوز چیخوں کی وجہ سے کئی لوگ خوف زدہ ہو کر دور ہٹ گئے تھے۔ جسپال نے شیبا کو وہاں سے لے جانے کی کوشش کی مگر اسے ہلا تک نہ پایا۔ یہاں تک کہ ریکھا بے ہوش ہو گئی اور شیبا از خود پرسکون ہو کر کمرے سے باہر آ گیا۔

جب تک ریکھا بے ہوش رہی، ہر کوئی وہاں موجود رہا۔ زیادہ تر لوگ شیبا کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ اس کی وحشیانہ حرکت انہیں گراں گزری تھی۔ لیکن جب ریکھا ہوش میں آئی تو اس میں کوئی آسیب نہیں تھا۔ وہ بالکل ٹھیک تھی۔ وہ مخلوق جو میرے بابا کو دھمکیاں دے کر سرکشی کا اظہار کر رہی تھی۔ اسے شیبا نے ڈرا کر بھگا دیا تھا۔

جسپال نے شیبا کو چمکارتے ہوئے ان لوگوں کی طرف گھور کر دیکھا جو کچھ دیر پہلے شیبا کو لعنت ملامت کر رہے تھے۔ اب وہ لوگ نادم ہو کر سر جھکائے کھڑے تھے۔ نندنی موسیٰ نے ریکھا کی رسیاں سرعت سے کھول کر اسے سینے سے لگا لیا اور شیبا کی بہادری کا قصہ بھی سنا دیا۔ ریکھا ڈری سہمی سی فاصلے پر کھڑے شیبا کو گھورتی رہی۔

شام کو تمام حضرات مسجد کے باہر چارپائیوں پر بیٹھے شیبا کی تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے۔ سرپنچ جی بول رہے تھے۔

''شیبا ہماری زندگی کا خاص حصہ بن چکا ہے۔ پنڈ کے لئے اچھا بن کر آیا ہے جی۔ بڑے خطرناک کام بھی آسانی سے کر گزرتا ہے۔ اس کی مہربانیوں کا تو ہم بدلہ بھی نہیں چکا سکتے۔ خوشیاں ہی خوشیاں لایا ہے جی۔'' وہ نہایت پرمسرت لہجے میں بول رہے تھے۔ سب ہی نے اتفاق رائے کی۔ سرپنچ نے مزید کہا۔

گیتا بہن نے پیغام بھیجا تھا کہ وہ اگلے مہینے اپنے لکھویندر کا بیاہ تیج پال جی کی بیٹی رتن بٹیا کے ساتھ کرنا چاہتی ہیں۔ آپ کیا کہتے ہو؟'' ان کا رخ تیج پال کی طرف تھا۔

''جیسا آج ٹھیک سمجھو۔'' تیج پال نے لاپرواہی

سے کہا۔

''چلو جی ...... یہ تو طے ہو گیا۔ اب ایک اور خوشخبری بھی سنادوں۔'' سرپنچ جی نے معنی خیزی سے مسکرا کر مہندر کی طرف دیکھا۔ وہ متوجہ تھا اور الوک کا کا بھی ہونٹوں پر مسکان سجائے اسی کو دیکھ رہے تھے۔

''میں نے سوچا ہے کہ اگلے مہینے ایک نہیں بلکہ تین بیاہ ہونے چاہئیں مطلب یہ کہ لکھویندر کے ساتھ ہی میں اپنے مہندر اور جسپال کے فرائض سے بھی سبق دوش ہو جاؤں۔'' ان کی بات سن کر جسپال اور مہندر چونک گئے۔ مہندر کے دماغ میں اس وقت ایک ہی بات تھی اور وہ تھی خودکشی۔

''ان کی نسبت کہیں طے کی بھی ہے یا آئندہ۔؟'' بابا بولے۔

''کرلی ہے جی کرلی ہے۔ مہندر کے لئے میں نے الوک جی کی رکمنی مانگ لی ہے۔ یہ راضی ہیں۔'' انہوں نے کہا تو مہندر کھل اٹھا۔

''پر جسپال کا ابھی فیصلہ ہوگا۔ تیج پال جی ...... آپ کو جسپال کے لئے نندنی بہن کی ریکھا منظور ہے۔؟''

''کیا ......؟ ریکھا۔؟'' تیج پال کے چونکنے پر خوشی سے سرشار جسپال کا دل ڈوبنے لگا۔

''ہاں جی ریکھا۔ کیا آپ کی مرضی کچھ اور ہے۔؟'' سرپنچ جی پریشان ہونے لگے۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ جسپال سے پوچھ لو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' تیج پال نے فوراً خود پر قابو پایا تو جسپال ڈانواں ڈول ہونے لگا۔

''بول پتر ...... کیا کہتا ہے۔'' سرپنچ جی نے جسپال سے پوچھا۔

''جی ...... جی ...... مجھے ...... منظور ہے۔'' اس نے بڑی مشکل سے یہ جملہ ادا کیا تو وہاں پر مبارک سلامت کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ پرمسرت ماحول میں دیر تک خوش گوار گفت وشنید چلتی رہی۔ تبھی لکھویندر گھبرایا ہوا سا دوڑتا ہوا وہاں آیا اور رک کر پہلے بے ترتیب سانسوں کو بحال کرنے لگا۔

''سرپنچ جی ...... وہ ...... وہ ۔'' اس نے بمشکل کہا۔

''وہ ...... آپ کے گھر ...... ایک عورت آئی ہے۔ وہ ...... وہ کہتی ہے کہ اس کا نام منجیت ہے اور ...... اور وہ جسپال کی ماں ہے۔'' اس کے شکستہ جملے نے گویا وہاں دھماکہ کر دیا۔

''منجیت پرجائی۔'' سرپنچ جی بے یقینی کے عالم میں بولے۔

''ہاں سرپنچ جی ...... مجھے نندنی موسی نے بھیجا ہے۔ وہ آپ کے گھر میں اس عورت کے ساتھ ہی بیٹھی ہیں۔ اس نے اس عورت کو پہچان لیا ہے۔ آپ جلدی چلو۔'' اب کی بار لکھویندر کی بات سن کر کوئی رکا نہیں، سب ہی بے دریغ سرپنچ جی کے ساتھ سبک رفتاری سے چل دیئے۔ سوائے تیج پال کے۔

اس کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ اس کی ذلت اور سفاکی کا بھید کھولنے کے لئے سولہ برس بعد طوفان آ گیا تھا۔ اس کی جھوٹی شرافت کا لبادہ گرانے کے لئے اور ذلت سے ہمکنار کرنے کے لئے قدرت نے منجیت کو بھیج دیا تھا۔

وہ وہیں بیٹھا خوف اور وحشت میں مبتلا، اپنے بچاؤ کی تدابیر سوچتا رہا۔

☆......☆......☆

''کیا سوچا تھا اس نے ...... کہ مجھے خون میں لت پت درخت سے بندھا چھوڑ جائے گا تو میں مرجاؤں گی؟ نہیں ...... زندگی اور موت کا فیصلہ انسان نہیں کرسکتا انسان قتل کرسکتا ہے پر موت نہیں دے سکتا۔'' منجیت نے گاؤں والوں کو سارا واقعہ سنا دیا۔ ہر کوئی انگشت بدنداں ہو کر بے یقینی سے منجیت کو دیکھ رہا تھا۔

''سمجھ نہیں آتی پرجائی جی کہ تیج پال بھلا ایسا کیسے کرسکتا ہے۔ اس کے اس روپ کے بارے میں تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔'' سرپنچ جی کی پیشانی

پر شکنیں نمودار ہونے لگیں۔

''منجیت ضرور سچ بول رہی ہے سرپنچ جی۔ تیج پال درندہ صفت انسان رہا ہے۔ عورت کو تو وہ کھلونا سمجھتا تھا۔ ہم سب کو اس کی حقیقت معلوم تھی پر ہم خاموش رہیں۔'' جانکی آگے بڑھی۔

''مجھے پہلے پتا چلتا تو میں اسی وقت اس کا حساب بے باق کردیتا۔ خیر اب بھی انصاف ضرور ہوگا۔'' انہوں نے پرسوچ لہجے میں کہہ کر دیودھر کو پکارا۔

''دیودھر..... لڑکوں کو بھیج کر تیج پال کو پکڑواؤ۔ مجھے سمجھ آگئی ہے کہ وہ یہاں کیوں نہیں آیا۔''

''جی سرپنچ جی۔'' دیودھر نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لڑکوں کو روانہ کیا لیکن جسپال متحیر سا وہیں کھڑا اپنی ماں کو دیکھتا رہا۔

''یہ آپ کا جسپال ہے پرجائی جی۔'' روپ چند نے ماحول کو خوش گوار بنانے کی خاطر جسپال کی طرف اشارہ کیا تو منجیت جذبات میں مغلوب ہوکر اٹھی اور اسے سینے سے لگالیا۔ وہ جسپال کو دیکھ کر جس قدر خوش ہوئی تھی، اتنا ہی پریشان بھی تھی کیونکہ اسے اپنی اولاد کے سامنے ایک اور کٹھن سچ لانا تھا۔

''یہ تو بتاؤ پرجائی جی کہ آپ کی جان بچی کیسے؟'' سرپنچ جی نے استفسار کیا۔

''میں وہیں درخت کے ساتھ بے ہوش بندھی ہوئی تھی کہ اچانک ایک بوڑھا شکاری اپنے بیٹے کے ساتھ وہاں سے گزرا اور مجھے دیکھتے ہی فوراً مجھے کھول کر اپنے پنڈ لے گیا۔ میں دو دن بے ہوش رہی۔ بڑی مشکل سے میری جان بچی اور جب میں ہوش میں آئی تو مجھے کچھ بھی یاد نہیں رہا۔ میری یادداشت سر پر چوٹ لگنے سے جاچکی تھی۔

ان لوگوں نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میری زبان پر نندنی کا نام تھا۔ وہ لوگ سمجھے کہ میں ہندو ہوں اور میرا نام نندنی ہے۔ وقت گزرتا رہا مگر مجھے کچھ یاد نہ آیا۔ پھر.....'' اتنا کہہ کر منجیت جھجک کر خاموش ہوگئی۔

''پھر کیا ہوا پرجائی جی۔؟'' سرپنچ جی نے بے چینی سے پوچھا تو منجیت عجیب سی کیفیت میں اپنے قریب بیٹھے شخص کو اور پھر جسپال کو دیکھنے لگی۔

''پھر جب انہوں نے دیکھا کہ مجھے کچھ یاد نہیں رہا تو ان لوگوں نے مجھے اپنے پنڈ میں ہی ہمیشہ کے لئے رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ میرے رشتے داروں کی تلاش روک دی۔ وہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ میرا بیاہ نہیں ہوا ہے۔ بوڑھے شکاری نے اپنے پتر شنکر کے ساتھ میرا..... میرا بیاہ کردیا۔'' منجیت سر جھکا گئی۔

''میں ہی شنکر ہوں۔'' پاس بیٹھا شخص فوراً بولا۔

''اور یہ میرا اور نندنی کا..... مطلب منجیت کا بیٹا ہے۔'' اس نے گود میں بیٹھے چھوٹے سے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ جسپال سمیت سب ہی پھٹی پھٹی آنکھوں سے بچے کو دیکھنے لگے منجیت سچ بتا چکی تھی۔ پھر وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

اب شنکر ہی میرا خاوند ہے اور اس درندے تیج پال سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ آج سولہ سال بعد مجھے سب کچھ یاد آگیا تو میں اپنے بچوں سے ملنے اور تیج پال کو اس کے انجام تک پہنچانے کے لئے آگئی ہوں۔'' وہ دزدیدہ نظروں سے جسپال کو دیکھنے لگی جو الجھا الجھا دکھائی دے رہا تھا۔

''سرپنچ جی..... تیج پال کا کا پورے پنڈ میں نہیں ہیں۔ وہ شاید فرار ہوچکے ہیں۔'' لڑکے لوٹ آئے اور فوراً خبر دی۔

''کیا.....؟ او جی بچ کر جائے گا کدھر۔ بوڑھا آدمی ہے پکڑا جائے گا۔'' سرپنچ جی کو غصہ تو بہت آیا مگر انہوں نے قابو پا کر منجیت کو تسلی دی۔ اسی پل رتن اور ریکھا بھی وہاں آپہنچیں۔ منجیت کو بتایا گیا کہ یہ رتن ہے تو وہ بے اختیار اپنی بیٹی سے بھی لپٹ گئی۔

''اور یہ آپ کی ہونے والی بہو ہے...... ریکھا۔'' سرپنچ جی مسکرا کر بولے تو منجیت کو اچانک بہت کچھ یاد آگیا۔

''کونسی ریکھا؟ نندنی کی بیٹی؟ اور میری ہونے والی بہو۔؟'' منجیت نے دیدے پھاڑ کر شرماتی ہوئی ریکھا

سامنے ریکھا کو کھڑا۔

''ہاں...... یہ میری ریکھا ہے دیدی۔'' نندنی خوش دلی سے بولی۔

''مجھے آپ سے اکیلے میں کچھ بات کرنی ہے سرپنچ جی۔'' منجیت الجھنے لگی تھی۔

''اکیلے میں......ایسی کیا بات ہے جو آپ سب کے سامنے نہیں بتا سکتیں۔؟'' سرپنچ جی بولے۔''سب ہی کچھ تو بتا دیا ہے آپ نے۔''

''مگر یہ بات میں سب کے سامنے نہیں بول سکتی۔ میں نے نندی سے وعدہ کیا تھا۔'' منجیت ہنوز مضطرب تھی۔

''میں سمجھ گئی دیدی...... کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو......'' نندنی وعدے کی بات سن کر منجیت کے دل کی بات جان گئی تھی۔ ''اب تم نے ارادہ کرلیا ہے تو سب کے سامنے بول دو۔'' اتنا کہہ کر نندنی نے رتن کو اشارہ کیا ،کہ وہ ریکھا کو وہاں سے لے جائے۔ ان دونوں کے جانے کے بعد بھی منجیت خاموش رہی۔

''بولو نہ دیدی...... بول دو کہ تم ریکھا کو اپنی بہو نہیں بنانا چاہتیں کیونکہ......کیونکہ وہ......'' نندنی اس سے آگے نہیں بول پائی۔ جبکہ جسپال کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔

''ضد نہ کر نندنی...... مجھ سے نہیں بولا جائے گا۔'' منجیت نے بھی عذر پیش کیا۔

''تو ٹھیک ہے...... میں خود ہی بتا دیتی ہوں سب کے سامنے۔ میں جسپال کو اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ اسے ویسے بھی میں بیاہ سے پہلے آگاہ کرنے ہی والی تھی کہ......ریکھا میری ناجائز بیٹی ہے۔'' سچ بتا کر نندنی کا چہرہ بجھ سا گیا وہاں موجود سب ہی لوگ حیرت کے سمندر میں ڈوب گئے۔

''یہ کیا بول رہی ہو؟'' سرپنچ جی کو جیسے یقین ہی نہ آیا۔

''یہ سچ ہے سرپنچ جی۔'' نندنی نے اتنا کہہ کر اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کا قصہ سب کے سامنے سنا دیا۔

☆......☆......☆

ریکھا کو اس بات سے بے خبر رکھا گیا کہ وہ ناجائز ہے۔ پر اسے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ اس کی شادی جسپال کے ساتھ نہیں ہوسکتی۔ اس رشتے سے انکار نہ تو منجیت نے کیا تھا اور نہ ہی جسپال نے۔ انکار کرنے والی خود نندنی تھی۔ اس کو منجیت کا الجھ کر حامی بھر لینا مناسب نہیں لگا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ منجیت دل سے ریکھا کو اپنی بہو تسلیم کرے۔ منجیت کے چہرے پر طمانیت کے تاثرات نہ دیکھ کر نندنی نے دل گرفتہ ہوکر کہہ دیا تھا کہ وہ یہ رشتہ نہیں ہونے دے گی۔ جسپال نے بے چینی سے وجہ پوچھی تھی تو نندنی نے دوٹوک لہجے میں کہا تھا۔

''دیدی لاکھ کہے کہ اسے رشتہ منظور ہے مگر میں جانتی ہوں کہ وہ ایک فرنگی کی بیٹی کو دل سے نہیں اپنا سکتی۔ جس دن وہ مطمئن ہوجائے گی ، میں ریکھا اسے دے دوں گی۔''

''مجھے منظور ہے نندنی......تو کیوں ضد کر رہی ہے۔؟'' منجیت منمنائی۔

''مگر دل سے منظور نہیں ہے۔ جس دن مجھے یقین ہوگا،اس دن میں بھی مان جاؤں گی۔'' نندنی اٹھ کر چلی گئی۔ اس کی بات درست تھی۔ منجیت نے صرف جسپال کی خوشی کی خاطر رضا مندی کا اظہار کیا تھا درحقیقت وہ مکمل طور پر مطمئن نہیں تھی۔

جسپال نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ آخر وہ کیا کرے اور یہی حال ریکھا کا بھی تھا۔ اس نے نندنی سے گڑگڑا کر مان جانے کے لئے کئی بار کہا تھا۔

''نہیں ریکھا......جسپال کا خیال دل سے نکال دے۔ اگر منجیت راضی ہوتی تو وہ میرا راز کھولنے کا ذکر کیوں کرتی؟ کیا ضرورت تھی اسے؟ میں نے خفا ہوکر اپنا راز خود ہی فاش کردیا۔ اسے بتانے کے لئے کہ میں کسی سے ڈرتی نہیں ہوں۔'' نندنی کا دل ٹوٹ چکا تھا۔

''تم کس راز کی بات کر رہی ہو آئی۔؟'' ریکھا چونک اٹھی تھی۔

''بس کچھ نہیں...... ہماری آپس کی بات ہے۔ کچھ خاص نہیں ہے۔ تو چھوڑ اسے اور جسپال کو بھول جا۔'' وہ بات چھپا کر کمرے میں چلی گئی۔

دو دن گزر گئے۔ ریکھا اور جسپال دونوں ہی مغموم تھے۔ انہیں ملنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ جسپال کی مجنوں کی سی حالت تھی۔ وہ بے چین اور بے قرار سا ہو کر نندنی کے گھر کے چکر کاٹا رہتا۔ کبھی کبھار دستک بھی دے دیتا پر اس کا نام سن کر نندنی دروازہ نہ کھولتی۔

ایک رات نندنی سو رہی تھی تب ریکھا چپکے سے اٹھی۔ وہ جسپال سے ملنا چاہتی تھی۔ ڈرتے ڈرتے گھر سے نکلی اندھیرے سے اس کی جان جاتی تھی وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔

اس کا رخ جسپال کے گھر کی جانب تھا۔ دور سے ہی اسے جسپال کے گھر کے باہر دو سائے نظر آئے۔ وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ ایک سایہ دوسرے سائے کو گھسیٹتا ہوا کہیں لے جا رہا تھا۔

اسے کسی انجانے خطرے کا احساس ہوا۔ وہ بلا ارادہ ہی ان کی طرف چپکے چپکے بڑھنے لگی۔ مکانات کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد آخر میں گیتا کاکی کا باڑہ تھا جس کے عقب میں پہلا کھیت تھا۔ وہ متحرک سایہ دوسرے سائے کو کھینچتا ہوا کھیت کی طرف لے گیا۔ رات کو کسی کی اس طرف آمد متوقع نہیں تھی۔

ریکھا اس طرف چلی جاتی تو ان کے آگے ظاہر ہو جاتی۔ اس لئے خوف مدہ ہونے کے باوجود اس نے ذہانت کا مظاہرہ کیا اور باڑے میں داخل ہو کر پانچ فٹ کی دیوار کی آڑ سے کھیت کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ چونک گئی۔ چاند کی روشنی میں اس نے ان دونوں کو پہچان لیا۔ وہ تیج پال تھا، جو ہاتھ میں بندوق پکڑے پیروں میں بے بس پڑی منجیت کو غلیظ گالیاں دے رہا تھا۔ منجیت کے منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔ وہ وحشت زدہ سی تیج پال کے سامنے بے حس و حرکت پڑی تھی۔

ریکھا سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ وہ خود تو تیج پال کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اور اگر مدد کے لئے گاؤں والوں کو بلانے جاتی تو تب تک تیج پال منجیت کو گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ وقت بہت کم تھا۔ کشمکش و پیچ میں مبتلا ریکھا کے ذہن میں اک خیال کوندا۔ وہ جس جگہ کھڑی تھی وہیں شیبا کا کمرہ تھا اس نے سوچا کہ شیبا کی مدد سے منجیت موسی کو بچایا جا سکتا ہے۔ پر وہ شیبا سے ڈرتی تھی۔

وہ تمام تر ہمتیں یکجا کر کے شیبا کے کمرے میں داخل ہو گئی کہ فی الحال اس کے پاس ڈرنے کی بھی مہلت نہ تھی۔ اسے دیکھتے ہی شیبا کھڑا ہو گیا۔ وہ گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اسے یاد آیا کہ جسپال کو شیبا پر کامل اعتماد ہے۔ وہ جسپال کے بھروسے پر بھروسہ کرتی جھجکتے ہوئے آگے بڑھی۔ شیبا نے کوئی حرکت نہ کی۔ اس کا حوصلہ بڑھا اور کپکپاتے ہاتھوں سے اس کی زنجیر کھولنے لگی۔

لرزتے ہاتھوں سے اس کی زنجیر پکڑ کر کھینچتے ہوئے وہ شیبا کو کمرے سے باہر لے آئی اور کہنے لگی۔

''شیبا...... تیرے جسپال کی ماں کی جان خطرے میں ہے...... ان کو بچا لے شیبا...... آ جا میرے ساتھ چل۔'' وہ شیبا کو باڑے سے باہر لے آئی۔ شیبا اس کی زبان نہیں سمجھتا تھا مگر بلا کا ذہین اور رمز شناس تھا۔ اسے بھی خطرے کا شاید احساس ہو گیا تھا۔ وہ ریکھا کے ساتھ کھیت تک آ گیا۔

سامنے کا منظر دیکھ کر شیبا کو اپنی مالکن ازابیلا فیرس یاد آ گئی۔ ماضی کا ناخوشگوار واقعہ اس کی آنکھوں میں لہرا گیا۔ تیج پال اور منجیت نے ریکھا اور شیبا کو دیکھ لیا اس سے قبل کہ تیج پال بندوق کا رخ شیبا کی طرف کرتا وہ ایک لمبی جست لگا کر تیج پال پر سوار ہو گیا بدحواسی کے عالم میں تیج پال کے ہاتھ سے بندوق گر گئی شیبا اس کی چمڑی ادھیڑ رہا تھا۔ ریکھا سرعت سے آگے بڑھی اور منجیت کو رسیوں سے آزاد کرا کے اس کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھول دیا اور بولی۔

''منجیت موسی ...... آپ یہاں سے بھاگ جاؤ...... میں سب کو بلا کر لاتی ہوں۔'' اس سے پہلے کہ

منجیت کچھ کہتی، ریکھا عجلت میں دوڑتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ منجیت آس پاس کے مکانات کی طرف بڑھ کر دستک دینے لگی جبکہ ریکھا کا رخ مسجد کی طرف تھا۔ وہاں چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو اس نے دور سے ہی پکارا اور صورتحال سے باخبر کر کے واپس دوڑ پڑی۔

چھوٹا سا تو گاؤں تھا منٹوں میں پورا گاؤں جائے وقوع پر پہنچ چکا تھا۔ شیبا نے تیج پال کو ادھ مری حالت میں چھوڑ دیا اور جسپال کی طرف آ گیا۔

منجیت ہر آنے والے کو اپنے اغوا اور ریکھا کی ذہانت کا قصہ سنا رہی تھی۔ ہر شخص ریکھا کی دلیری اور حوصلے کی تعریف کر رہا تھا۔ منجیت نے آگے بڑھ کر ریکھا کو گلے لگا لیا دور سے آتی نندنی نے یہ منظر دیکھ لیا اور طمانیت کے احساس سے دل ہی دل میں خوش ہو کر اس نے اپنی ضد چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ منجیت کو ریکھا سے اب کوئی شکایت نہیں رہی تھی۔

کسی کا بھی دھیان تیج پال کی طرف نہیں گیا جو چپکے سے نیم بے جان ہاتھوں سے بندوق اٹھا چکا تھا۔ اس کا نشانہ منجیت تھی مگر نقاہت کی وجہ سے گولی منجیت کی بجائے شیبا کے گلے میں دھنس گئی۔ وہ خرخراتی آوازیں نکالتا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

سرپنچ جی نے فوراً اپنی بندوق سنبھالی اور پے در پے کئی فائر تیج پال پر کئے۔ وہ تڑپتا ہوا لمحوں میں ساکت ہو گیا۔ رتن دوڑتی ہوئی باپ سے لپٹ کر رونے لگی جبکہ باقی تمام لوگ اشک بار آنکھیں لئے شیبا کے آس پاس بیٹھ گئے۔

شیبا مر چکا تھا پر اپنے ساتھ باطل کو بھی لے ڈوبا تھا۔ تیج پال نام کی نحوست ہمارے گاؤں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی تھی۔

پھر شیبا کو برسوں تک کوئی بھول نہیں پایا۔ وہ یاد بن کر ہمارے سینوں میں دفن رہا۔ ہمیشہ کے لئے......

نانا جان کی کہانی مکمل ہوتے ہوتے سب بچے سو چکے تھے۔ انہوں نے نندنی کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور تیج پال کی بے حیا فطرت کے ناقابل ذکر واقعات پوشیدہ الفاظ میں پیش کئے تھے۔ بچے تو سمجھ نہیں پائے مگر میں بھائی بہنوں میں سب سے بڑا ہونے کی وجہ سے سب کچھ سمجھ گیا اور اس کہانی میں وہ تمام واقعات میں نے کھلے الفاظ میں پیش کئے ہیں۔ کسی خیال کے تحت میں نے نانا جان سے دریافت کیا۔

''آپ نے یہ نہیں بتایا کہ شیبا آخر آیا کہاں سے تھا۔''

''بیٹا...... اس گاؤں سے بہت دور فرنگیوں کی ایک چھاؤنی تھی۔ وہاں کے حاکم مارک فیرس کی بیٹی ازابیلا فیرس شیبا کو برطانیہ سے لائی تھی۔ ازابیلا کو اپنا منگیتر پیٹرک بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ اسے منہ تک نہ لگاتی تھی۔

ایک روز پیٹرک خطرناک عزائم کے تحت ازابیلا کو چپکے سے اغوا کر کے جنگل کی طرف لے گیا۔ اس سے قبل وہ ازابیلا کا دامن تار تار کرتا، اچانک شیبا خطرے کی بو سونگھتا ہوا وہاں پر ان پہنچا اور پیٹرک کا حشر نشر کر دیا اس دوران پیٹرک نے شیبا کو ہلاک کرنے کی غرض سے گولیاں بھی چلائیں مگر شیبا کے ایک بھی نہ لگی۔ پیٹرک دم توڑ گیا۔

گولیوں کی گونج دار آوازیں حاکم مارک کے کانوں تک پہنچ گئی تھیں وہ سرعت سے بندوق اٹھائے جائے وقوعہ پر جا پہنچا اور پیٹرک کا حشر دیکھ کر مشتعل ہو گیا اس نے اپنی بیٹی کی ایک نہ سنی اور شیبا پر بندوق تان لی۔ شیبا گھبرا کر برق رفتاری سے دوڑتا ہوا جنگل میں غائب ہو گیا۔ وہ مارک کے عتاب سے بچ کر ہمارے گاؤں تک پہنچ گیا جہاں پہلی بار اسے ریکھا نے دیکھا تھا پھر شیبا کے مرنے کے ایک سال بعد سب کو اس کے مالکان کے متعلق خبر ملی تھی۔'' نانا جان کہانی کا الجھا پہلو سلجھا کر سونے کے لئے لیٹ گئے۔

☆......☆......☆

ہتھیارا

ضرغام محمود۔ کراچی

اپنے تئیں وہ بہت شاطر ذہن تھا، اپنے بچائو کے لئے اس نے سارے پلان مرتب کرلئے تھے جس کی وجہ سے وہ بہت خوش تھا لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ اس کے قریب کھڑی موت اس پر قہقہہ لگا رہی تھی اور پھر اچانک......

قدرت کے وضع کردہ قانون میں مداخلت، اذیت سے دوچار کردیتی ہے۔ ثبوت کہانی میں ہے

عورت کو گھر کی ملکہ کہا گیا ہے۔ اسے عزت دی گئی حتیٰ کہ عورت کے پیر کے نیچے جنت رکھی گئی مگر پھر بھی بیٹی کی پیدائش کو کبھی کھلے دل سے تسلیم نہیں کیا گیا۔ دائی بھی جب بیٹی پیدا ہوتے دیکھتی ہے تو مایوس ہوجاتی ہے کیونکہ اسے پتہ ہوتا ہے کہ اب اسے کوئی خاص انعام نہیں ملے گا اور جب کبھی بیٹا پیدا ہوتا ہے تو دائی کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں ہوتا کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اب اسے انعام زیادہ ملے گا مگر ہمارے معاشرے ہی میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جہاں بیٹی کی پیدائش قابل فخر بات ہوتی ہے اگر وہاں دائی یہ کہہ دے کہ مبارک ہو بیٹا ہوا ہے تو سب کے منہ اس طرح لٹک جاتے ہیں جیسے دائی نے کوئی بری خبر سنائی ہو سب کا دل ڈوبنے لگتا ہے کہ آنکھوں میں تاریکی چھا جاتی ہے اور بڑی بوڑھیاں تو باقاعدہ دہائی دینے لگتی ہیں لیکن اگر وہی

دائی بیٹی کی پیدائش کی خبر دے تو ایسا لگتا ہے سارے گھر میں بہار آ گئی چاروں طرف پھول کھل گئے دائی کو زرنقد ہی نہیں جوڑے اور دیگر بیش قیمت تحائف بھی دیئے جاتے ہیں سارے محلے میں چراغاں ہوتا ہے اور دیگیں چڑھتی ہیں زچہ بچہ خصوصی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں، مزاروں پر شکرانے کی چادریں چڑھائی جاتی ہیں غریب مساکین کو خیرات بانٹی جاتی ہے غرض معاشرے کا وہ طبقہ بیٹی کو صحیح طور پر لکشمی سمجھتا ہے۔

شیانا بھی ایسے ہی طبقے سے تعلق رکھتی تھی اس کی پیدائش پر بھی اسی طرح دھوم مچائی گئی تھی، پھر شیانا تھی بھی بے انتہا خوب صورت خاص طور پر اس کی ہری ہری آنکھیں جو بالکل کسی بلی کی طرح معلوم ہوتی تھیں اس لئے اس کا نام شیانا رکھا گیا۔ شیانا جوان ہوئی تو اس کا رقص میں کوئی جواب نہ تھا وہ اعضاء کی شاعری اس طرح کرتی کہ دیکھنے والا دل مسوس کر کے رہ جاتا وہ گاتی بھی اس طرح تھی کہ مردے جاگ اٹھیں ایک ایک سر کو اس طرح الاپ لگاتی کہ بڑے بڑے استاد عش عش کر اٹھتے۔

شیانا کے بہت سے طلبگار تھے مگر اس نے کسی کو اپنا ہاتھ بھی پکڑنے نہیں دیا وہ صرف گانا گاتی اور فضا میں سر بکھیرتی اس نے پندرہ سال کی عمر میں جب پہلی بار رقص کیا تو دیکھنے والے دنگ رہ گئے مگر شیانا جتنی نازک دکھائی دیتی تھی حقیقتاً وہ اتنی نازک نہیں تھی اگر وہ اپنی انا پر آ جاتی تو پھر بڑے سے بڑا طرم خان اسکے سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔

شیانا کو اپنے عاشقوں کو لیموں کی طرح نچوڑنے کا فن آتا تھا جیسے ہی کوئی اجنبی مالدار کوٹھے پر گانا سننے آتا اور دونوں ہاتھوں سے دولت لٹاتا تو شیانا سمجھ لیتی محترم عقل کے کورے اور گانٹھ کے پورے ہیں۔ وہ ایسے عاشقوں کو جب تک کوڑی کوڑی کا محتاج نہ کر دیتی اسے جال سے نہ نکلنے دیتی اس کا عاشق جب گانا ختم ہونے کے بعد کوٹھے سے اترتا تو شیانا اپنے خاص بوڑھے نوکر سے اس عاشق کو بلواتی اور پہلی نظر میں عشق ہو جانے کا ناٹک کرتی۔ عورتوں کے معاملے میں مرد عموماً اور عاشق خصوصاً پرلے درجے کے احمق ہوتے ہیں شیانا کا عاشق بھی پہلی نظر ہی میں مجنوں کا دادا بن جاتا اور شیانا کے اشارہ ابرو پر بندروں کی طرح ناچتا پھر شیانا کی فرمائشوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا، نت نئے زیورات اور قیمتی ملبوسات کی فرمائش کی جاتی بڑی بڑی رقمیں بہانے بہانے سے وصول کی جاتیں۔ مگر ان سب وصولی کے باوجود شیانا اپنے عاشق کو اپنا ہاتھ ہی پکڑنے کی اجازت دیتی اور اگر عاشق کی پیش قدمی آگے بڑھتی تو شیانا ایک ادائے ناز سے اپنے آپ کو چھڑا لیتی اور جب عاشق کنگال ہو جاتا تو کسی دوسرے عاشق سے اس کو پٹوا کر بھگوا دیا جاتا اور پھر نئے عاشق سے اسی طرح کا ڈرامہ کیا جاتا۔

شیانا کو بچپن سے یہی سبق پڑھایا گیا تھا اس کی ماں اس سے اکثر کہتی تھی "شیانا خدا حسن سب کو دیتا ہے اکثر شریف زادیاں بہت خوبصورت ہوتی ہیں مگر وہ حسن کی ناقدری کرتی ہیں اور بہت جلد مرجھا جاتی ہیں حسن کی قدر صحیح طور پر ہم کرتے ہیں اور اس حسن سے فائدہ اٹھاتے ہیں جب تک حسن و شباب برقرار رہتا ہے، ہم حسن کا خراج وصول کرتے ہیں۔ پیار، محبت، ایثار وغیرہ جیسے الفاظ ہمارے لئے نہیں بنے، طوائف اصل میں ایک پتھر ہوتی ہے وہ دیکھنے میں کتنی ہی نرم و ملائم ہو مگر طوائف کو پتھر ہی ہونا چاہئے جسے کسی کی محبت نہ پگھلا سکے۔"

مگر یہ پتھر پگھل گیا جب پہلی بار بہرام خان نے اس کوٹھے پر قدم رکھا تو شیانا کو لگا اسے جس شہزادے کا انتظار تھا وہ آ گیا اور پھر شیانا بہرام خان کی بانہوں میں گرتی چلی گئی بہرام خان اپنے قبیلے کا ہونے والا سردار تھا اور شادی شدہ بچوں والا تھا مگر شیانا جیسی حسن کی دیوی نے جب اس کی جانب نظر التفات کی تو وہ بھی پگھل گیا اور شیانا نے ہزار مخالفتوں کے باوجود بہرام خان سے نکاح کر لیا اور کوٹھا چھوڑ کر بہرام خان کے ساتھ اس کی کوٹھی میں منتقل ہو گئی۔ بہرام خان کی پہلی بیوی اور بچے گاؤں میں تھے اور وہ خود شہر میں شیانا کے ساتھ رہتا تھا۔

☆......☆......☆

ایک روز شیانا اپنی کوٹھی کے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی سمندر کا نظارہ کررہی تھی کس طرح لہریں پانی سے سر اٹھاتیں اور ساحل کی طرف دوڑی چلی آتیں اور پھر ساحل پر سر پٹخ کر واپس چلی جاتیں جیسے گویا کسی کی تلاش میں ہوں اور اسے ساحل پر نہ پا کر بین کرتی ہوئی واپس جارہی ہوں۔

شیانا کھڑکی میں کھڑی کافی دیر سے یہ منظر دیکھ رہی تھی، یہ خاص کوٹھی سب کوٹھیوں سے الگ تھلگ تھی قریب ترین کوٹھی بھی کافی فاصلے پر تھی۔

سمندر کو دیکھتے ہوئے شیانا اپنی بلی گگن کو پیار کررہی تھی گگن اس کی بیسٹ فرینڈ تھی اس کی سب سے قابل اعتماد دوست تھی۔ گگن چھوٹی سی تھی جب شیانا کی گود میں اس کے ایک عاشق نے دی تھی تب سے شیانا اور گگن ایک جان دو قالب تھے۔ حتیٰ کہ دونوں کا مزاج تک ایک جیسا تھا کوئی شیانا پر ہاتھ رکھتا تو وہ غراتی اور کوئی پھر بھی نہ سمجھے تو پنجہ مار کر دور رہنے پر مجبور کرتی۔

قدرت کے بھی عجیب تماشے ہیں دونوں کی آنکھیں بالکل ایک جیسی ہی تھیں ان کی پتلیاں گہری سبز تھیں اور آنکھوں کی بناوٹ بھی ایک جیسی تھی حتیٰ کہ دونوں کا مزاج بھی ایک جیسا تھا۔ دونوں اپنی محبت میں شراکت برداشت نہیں کرتی تھیں لہٰذا جب بہرام خان شیانا سے محبت کا اظہار کرتا اور اس کا ہاتھ پکڑتا تو گگن غراتی اور ایسا لگتا جیسے وہ بہرام خان کو پنجہ ماردے گی اکثر بہرام خان کہتا۔ ''میں......میں کسی دن اسے گولی ماردوں گا۔''

''اسے مارنے سے پہلے سمجھ لینا جو گگن کا دشمن ہے وہ شیانا کا دشمن ہے۔'' پھر شیانا پیار سے گگن کو کمرے سے باہر بھیج دیتی اور گگن کمرے سے باہر نکل کر دروازے سے لگ کر بیٹھ جاتی اور جیسے ہی بہرام خان کمرے سے نکلتا گگن جلدی سے کمرے میں چلی آتی اور شیانا کی گود میں منہ چھپالیتی۔

ایک رات جب بہرام خان گاؤں سے ایک ہفتہ بعد واپس آیا تو اپنے ساتھ ایک خونخوار بلا بھی ساتھ لے کر آیا۔ اس کے ملازم نے اسے بتایا تھا کہ بلا بے حد خونخوار ہے اور اپنے ہی بچوں کو کھا چکا ہے۔ بہرام خان جب کوٹھی پہنچا تو کوٹھی اندھیرے میں ڈوبی تھی بہرام خان جیپ سے اترا اور ملازم کو آواز لگائی، بہرام خان جب بھی شیانا کے پاس آتا تو اکیلا ہی آتا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شیانا اور اس کی شادی کا راز گاؤں میں اس کے باپ تک پہنچے۔

''شرفو......شرفو......'' بہرام خان ملازم کو آواز دیتا ہوا کوٹھی میں داخل ہوا۔

''صاحب......صاحب......'' شرفو ٹارچ کی روشنی کے ساتھ نمودار ہوا۔

''اندھیرا کیوں ہے۔؟''

''صاحب بجلی چلی گئی ہے اور جنریٹر بھی خراب ہوگیا ہے میں نے شہر میکنک کو فون کیا ہے وہ آتا ہی ہوگا۔'' شرفو نے جواب دیا۔

''اچھا...... یہ لو چابی اور گاڑی اندر کھڑی کردو۔'' بہرام خان نے گاڑی کی چابی شرفو کو تھمائی اور اندھیرے میں چلتا ہوا شیانا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا، بہرام خان کوٹھی کے چپے چپے سے واقف تھا لہٰذا بغیر ٹھوکر کھائے وہ شیانا کے کمرے میں پہنچ گیا۔

''روشنی مت کرنا......کبھی کبھی اندھیرا بھی اچھا لگتا ہے...... یہ بتاؤ میں تمہارے لئے کیا لایا ہوں۔'' بہرام خان شیانا کے قریب ہوتے ہوئے بولا تاریکی میں بہرام خان اور شیانا ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے، شیانا کے ہاتھوں میں گگن تھی جس کی دونوں آنکھیں اندھیرے میں ہیرے کی طرح چمک رہی تھیں اور اسی طرح کی دو آنکھیں بہرام خان کے ہاتھوں میں بھی چمک رہی تھیں۔

''یہ تمہارے ہاتھوں میں کیا ہے۔؟'' شیانا نے پوچھا۔

''وہی جو تمہارے پاس ہے۔'' بہرام خان نے جواب دیا۔ بلے نے اپنے مقابل بلی کو دیکھا، انسان بیشک رات کی تاریکی میں کچھ نہیں دیکھ سکتا

مگر جانور اور خاص طور پر بلی رات کی تاریکی میں صاف دیکھ سکتی ہے، بلا اپنے مقابل بلی کو دیکھ کر غرایا تو جواب میں گگن بھی غرائی مگر بلے کے مقابلے میں بلی کی غراہٹ میاؤں میاؤں ہی لگی، اندھیرے میں دونوں کی غراہٹ عجیب تاثر پیدا کررہی تھی، بلا بہرام خان کے ہاتھوں میں مچل رہا تھا، وہ بلی کو دبوچ لینا چاہتا تھا بہرام خان کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔'' میں تمہاری گگن کے لئے جیون ساتھی لایا ہوں۔''

اسی وقت بجلی آ گئی اور کمرہ روشن ہوگیا۔ شیانا نے گگن کو زمین پر چھوڑا تو بلا بھی بہرام خان کے ہاتھوں سے نکل کر گگن کے پیچھے بھاگا گگن میاؤں میاؤں کرتی کمرے سے باہر بھاگی اور بلا بھی غوں غاں کرتا اس کے پیچھے بھاگا۔

''اب تمہاری گگن کم از کم ہمیں تنگ نہیں کرے گی آخر اسے بھی معلوم ہونا چاہئے کہ پیار کیا ہوتا ہے ، دیکھ لینا کچھ دنوں بعد وہ تمہیں بھی بھول جائے گی۔''

''میری گگن کبھی مجھے نہیں بھول سکتی۔ وہ عورت ہے اور عورت وفا کی دیوی ہوتی ہے۔ اس کی فطرت میں وفا ہے۔''

''مرد کی فطرت میں پیار ہے۔'' بہرام خان نے کہا اور شیانا کو اپنی بانہوں میں جکڑ لیا، شیانا بہرام خان کے چوڑے سینے سے آ لگی۔'' کیسا گبرو جوان ہے جب سامنے آتا ہے تو حواسوں پر چھا جاتا ہے۔'' یہ شیانا کی سوچ تھی سچ ہے پیسہ عورت کی کمزوری ہے مگر جب کسی گبرو جوان کو عورت پسند کرلے تو وہ زر، زمین کو لات مار کر اس کے پاس آ جاتی ہے ایسا ہی تو شیانا نے بھی کیا تھا۔

☆......☆......☆

شیانا کو بچوں کا بڑا شوق تھا وہ جب بھی شاپنگ کے لئے جاتی وہاں اکثر عورتوں کو اپنے بچوں کے ساتھ لاڈ کرتے دیکھتی تو اس کی خواہش دو آتشہ ہو جاتی اسی خواہش کے زیر اثر ایک دن شیانا نے بہرام خان سے کہا۔'' مجھے کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر سے رابطہ کرنا چاہئے۔''

''کیوں......؟'' بہرام خان نے حیرت سے پوچھا۔

''کچھ پرابلم نہ ہو...... آخر ہماری شادی کو سال ہو چکا ہے مگر اب تک میرے ماں بننے کے کوئی آثار نہیں ہے۔''

''ارے ...... جانو...... ماں بننے سے تمہارا یہ خوب صورت بدن ختم ہو جائے گا اور تم موٹی ہو جاؤں گی ۔ یہ ماں واں بننے کا خیال دل سے نکال دو...... تمہارا یہ حسن سدا بہار ہے۔'' بہرام خان نے شیانا کا ہاتھ پیار سے دباتے ہوئے کہا۔

''تمہارے تو پہلی بیوی سے بچے ہیں اس لئے تمہیں فکر نہیں...... مگر مجھے اپنے لئے بچہ چاہئے...... ماں بنا عورت کی معراج ہے۔'' شیانا ضدی لہجے میں بولی۔

اسی وقت گگن شیانا کے پاس آئی شیانا نے جھک کر گگن کو گود میں اٹھالیا۔'' کچھ دنوں سے گگن سست ہو رہی ہے بلکہ اس کا بدن بھی بھاری ہو رہا ہے۔'' شیانا نے فکرمندی سے گگن کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''تم تو نہیں مگر تمہاری چہیتی شاید ماں بننے والی ہے۔'' بہرام خان نے مسکرا کر کہا۔

''کیا...... سچ...؟'' شیانا بے یقینی کے لہجے میں بولی۔

اب شیانا گگن کا اور زیادہ خیال رکھنے لگی اسے گگن پر بے انتہا پیار آتا اس نے خاص طور پر گگن کے لئے صحت مند غذائیں منگواتی اور اگر کبھی بلا گگن کے کھانے میں حصہ دار بنتا تو شیانا اسے مارنے دوڑتی اس کا سارا وقت اب گگن کی دیکھ بھال میں گزر رہا تھا جب گگن ممتا کا بوجھ اٹھائے آہستہ آہستہ ادھر ادھر چلتی تو شیانا حسرت سے اسے دیکھتی اور پھر مسکرا کر کہتی۔'' کمینی کیسے اترا اترا کر چل رہی ہے جیسے مجھے جلا رہی ہو۔''

آخر کار گگن نے تین معصوم بچوں کو جنم دیا، شیانا نے پہلے ہی اس کے لئے گھر کا انتظام کرلیا تھا لکڑی کا ایک چھوٹا سا گھر بنوایا تھا جو اوپر سے کھلا تھا اور اس میں نرم نرم بستر لگایا اور ماں بچوں کو اس میں لٹا دیا چھوٹے چھوٹے بچے آنکھیں بند کئے اس میں لیٹے رہتے گگن ان کو دودھ پلاتی تو شیانا حسرت سے انہیں دیکھتی، گگن

اب پوری طرح چوکس رہتی ہر وقت چوکنی حالت میں ادھر ادھر دیکھتی رہتی۔

''آخر تجھے کس بات کا ڈر ہے یہ انسان کے بچے تھوڑی ہیں جو اغوا ہو جائیں گے ...... پھر یہاں کمرے میں کون آئے گا۔'' شیانا اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولتی۔

آخر کار گگن کا اندیشہ صحیح ثابت ہوا ایک رات شیانا گگن کی میاؤں میاؤں پر بے ساختہ اٹھ بیٹھی اس نے لائٹ جلا کر دیکھا گگن اپنے گھر کے اطراف چکر لگاتے ہوئے میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔

''کیا ہوا گگن۔؟'' شیانا بستر سے اٹھ کر گگن کے پاس آئی تو دیکھا کہ وہاں دو ہی بچے ہیں تیسرا بچہ غائب تھا۔ گگن اپنے گھر میں بچوں کو سمیٹ کر اپنی آغوش میں چھپا کر بیٹھ گئی اور بڑے دردناک انداز میں شیانا کو دیکھنے لگی۔ ''گھبرا مت ...... یہیں کہیں ہوگا ......'' شیانا بڑبڑانے کے انداز میں بولی اور کمرے میں چاروں طرف نظر گھما کر دیکھنے لگی جیسے بچے کو ڈھونڈ رہی ہو، اسی وقت شیانا کو غاؤں غاؤں کی آواز آئی اس نے آواز کی سمت دیکھا آواز باتھ روم سے آرہی تھی باتھ روم کا دروازہ کھلا تھا وہ جلدی سے باتھ روم میں پہنچی تو دکھ سے رہ گئی بلا آدھ کھائے بچے کو منہ میں دبا کر باتھ روم کے روشن دان سے باہر بھاگ رہا تھا۔

''یا خدایا تو نے کیا فطرت بنائی ہے بلے کی جو اپنے ہی بچے کو کھا گیا۔'' شیانا دکھی دل کے ساتھ گگن کے پاس واپس آئی۔

''کیا ہوا ...... کیوں روشنی کی ہے۔؟'' بہرام خان جو نیند میں تھا بولا۔

''وہ شیطان اپنے ہی بچے کو کھا گیا۔''

''کون۔؟''

''وہ بلا ...... اور کون۔؟''

''ارے کھانے دو ...... آدھی رات کو کیوں پریشان کر رہی ہو۔'' بہرام خان نے کہا اور کروٹ بدل کر سو گیا۔ شیانا بڑے دکھ کے ساتھ گگن کے پاس بیٹھی اس کا سر سہلا رہی تھی آج گگن شیانا کی گود میں بھی نہیں آئی اور اپنے بچوں ہی کے پاس بیٹھی رہی۔

''تو کیوں اتنی بے فکری سے سو گئی تھی کیا ہمارے ملک کی مائیں اتنی بے فکری سے سوتی ہیں۔'' شیانا گگن کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی تو گگن نے سر جھکا لیا وہ بھی اپنا منہ ایک بچے پر رکھ کر سہلاتی اور کبھی دوسرے بچے کو زبان سے چاٹنے لگتی۔ وہ ہر طرح سے اپنے بچوں سے ممتا کا اظہار کر رہی تھی۔

اس واقعہ کے بعد شیانا بے حد ہوشیار ہوگئی، جب گگن کسی ضرورت کے لئے کمرے سے باہر جاتی تو شیانا اس کے بچوں کی دیکھ بھال کرتی اور چوکنی رہتی ایک ہفتہ گزر گیا سب خیریت رہی مگر جانوروں میں بھی چالاکی ہوتی ہے وہ بھی ضرورت کے وقت حالات اور موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے اپنے شکار کرنے کا انداز تبدیل کر لیتے ہیں۔ بلے نے بھی محسوس کیا کہ وہ غراتا ہوا جاتا ہے تو شیانا اور گگن ہوشیار ہو جاتی ہے لہٰذا وہ کئی دن دبے پاؤں موقع کا انتظار کرتا رہا پھر اسے موقع مل گیا کمرے کا ایئر کنڈیشنڈ خراب تھا اس لئے شیانا نے کھڑکی کھول دی مگر حفاظت کے خیال سے اس نے گگن کے گھر کو اپنے بستر کے ساتھ رکھ لیا۔

رات خیریت سے گزر گئی صبح کی سپیدی نمودار ہونے لگی، روشنی ہلکے ہلکے پھیل رہی تھی بلا دبے پاؤں کھڑکی کے راستے اندر آیا اور بے آواز قدموں سے چلتا ہوا بچوں تک پہنچا اور جھپٹا مار کر ایک بچے کو منہ میں دبوچا اور بھاگا، گگن زور سے غرائی، گگن کی آواز سے شیانا کی آنکھ کھل گئی اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اس نے دیکھا بلا ایک بچے کو منہ میں دبا کر بھاگ رہا ہے وہ بلے کے پیچھے دوڑی مگر پھر کچھ سوچ کر رک گئی اور پلٹ کر بہرام خان کے سرہانے آئی اور بہرام خان کے سرہانے رکھا اس کا پستول اٹھایا اور بلے کے پیچھے دوڑتی ہوئی باہر گارڈن میں پہنچی، گارڈن میں پہنچ کر اس نے دیکھا بلا بچے کو منہ میں دبائے بھاگ رہا ہے اور ممتا کی ماری گگن اس کے پیچھے دوڑ رہی ہے شیانا نے پستول سے بلے کا نشانہ

باندھا اور فائر کر دیا۔

فائر کی آواز سے بہرام خان کی آنکھ کھل گئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اس نے پریشانی کے عالم میں سرہانے دیکھا اپنا پستول اٹھانا چاہا مگر اس کا پستول غائب تھا وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور باہر کی طرف بھاگا باہر گارڈن میں اس نے دیکھا شیانا اس کے پستول سے نشانہ باندھے بلے پر فائر کر رہی ہے شیانا نے پھر ایک گولی چلائی مگر وہ بھی بلے کے نہ لگی۔

''شیانا پستول دو گولی مت چلاؤ۔'' بہرام خان چیخا مگر شیانا نے بہرام خان کی بات نہ سنی، وہ بلے کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی تھی وہ آج بلے سے ایک ایک بچے کا حساب چاہتی تھی۔

''شیانا رک جاؤ فائر مت کرو۔'' بہرام خان پھر چیخا مگر شیانا پر جنون طاری تھا بلے نے کوٹھی کی باؤنڈری پھلانگنے کے لئے لمبی چھلانگ لگائی، اسی وقت شیانا نے تیسرا فائر کیا۔ گولی کی رفتار بلے کی رفتار سے بہت تیز تھی بلا اچھلا ضرور مگر وہ دیوار نہ پھلانگ سکا اور گولی کھا کر زمین پر گر پڑا اور تڑپنے لگا بچہ اس کے منہ سے چھوٹ کر گھاس پر گر پڑا شیانا اور گگن ایک ساتھ بچے تک پہنچیں ان کا خیال تھا بچہ صرف زخمی ہوا ہوگا مگر جب وہ قریب پہنچی تو دیکھا کہ بلے کے تیز دھار دانتوں نے معصوم بچے کی گردن درمیان سے ادھیڑ دی ہے۔

شیانا نے بے اختیار دل پکڑ لیا گگن کے منہ سے ایسی اداس اور دردناک غراہٹ نکل رہی تھی جسے سن کر ہر ماں کا دل کانپ اٹھے شیانا نے بلے کی طرف دیکھا اس کے لہو سے گارڈن کی سبز گھاس سرخ ہو رہی تھی وہ عجیب نظروں سے شیانا کو دیکھ رہا تھا شیانا کے دیکھتے دیکھتے بلے نے دم توڑ دیا۔ بلے کا تازہ تازہ لہو دیکھ کر شیانا کو متلی ہونے لگی اور وہ ابکائی لیتی ہوئی باتھ روم کی جانب بھاگی، باتھ روم میں الٹی کر کے وہ نڈھال ہو گئی۔

بہرام خان اس کے پاس آیا اور پیار سے اس کا سر دباتے ہوئے بولا۔ ''تم نے خواہ مخواہ پریشانی مول لے رکھی تھی۔ بلے کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ بچوں کو کھا جاتا ہے۔''

''مگر آج میں نے اس سے سارے مظالم کا حساب لے لیا۔ اب گگن کا بچہ محفوظ رہے گا۔''

''اچھا تم آرام کرو میں کچھ دنوں کے لئے گاؤں جا رہا ہوں۔'' بہرام خان نے کہا۔

''بہرام...... اب میں یہاں نہیں رہوں گی۔ مجھے شہر میں مکان لے کر دو۔'' شیانا بولی۔

''دیکھو۔ شہر میں رہنے سے ہمارا راز کھل سکتا ہے اگر ہماری شادی کی خبر ابا جان تک پہنچ گئی تو مصیبت ہو جائے گی۔''

''آخر کب تک...... یہ راز چھپاؤ گے۔''

''بس چند دن اور...... ویسے بھی تمہیں اتنا سمجھنا چاہئے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور اپنی بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ رہتا ہوں۔'' بہرام خان نے پیار سے شیانا کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

''اپنی ہوس کو محبت کا نام نہ دو۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو مجھے اپنی حویلی میں لے کر چلو۔'' شیانا بہرام خان سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی۔

''اچھا اس بارے میں بعد میں بات کریں گے ابھی مجھے گاؤں کے لئے نکلنا ہے۔'' بہرام خان یہ کہتا ہوا باتھ روم میں گھس گیا۔

☆......☆......☆

ایک ہفتہ بعد بہرام خان دوبارہ شیانا کے پاس آیا تو شیانا بستر پر لیٹی تھی وہ چہرے سے برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔

''کیا ہوا شیانا طبیعت خراب ہے۔ میں ڈاکٹر کو فون کرتا ہوں۔'' بہرام خان بولا۔

''یہ ڈاکٹر کا نہیں لیڈی ڈاکٹر کا کیس ہے۔'' شیانا نے بیڈ پر سہارے سے بیٹھتے ہوئے سر پر دوپٹہ جماتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب۔؟''

''مطلب آپ باپ بننے والے ہیں۔'' شیانا

نے شرماتے ہوئے بہرام خان کو بتایا تو بہرام خان چونک پڑا اس نے بے اختیار گگن اور اس کے بچے کو دیکھا جو ایک دوسرے سے کھیل رہے تھے بچے نے آنکھیں کھول دی تھیں اور اب اپنی ماں سے اٹھکیلیاں کر رہا تھا، بہرام خان کا دل ڈوبنے لگا وہ بخوبی جانتا تھا کہ اولاد ہونے کے بعد شیانا اس کوٹھی میں رہنا پسند نہیں کرے گی۔ بہرام خان خوب جانتا تھا عورت جب تک ماں نہیں بنتی اپنے شوہر ہی کو اپنا سب کچھ سمجھتی ہے مگر اولاد ہونے کے بعد وہ اولاد کے حق کے لئے شوہر کے سامنے بھی ڈٹ جاتی ہے۔ بیوی کمزور ہوتی ہے مگر عورت ماں بن جائے تو ماں بہت مضبوط ہوتی ہے۔

بہرام خان مجبور تھا وہ شیانا کی اولاد کو حقوق نہیں دے سکتا تھا اس نے گہری نظروں سے شیانا کو دیکھا اور پھر بولا۔ ''اس کی کیا ضرورت تھی، عورت جب تک ماں نہیں بنتی وہ حسین رہتی ہے مرد اس کی طرف کھنچا چلا آتا ہے تمہارے سامنے میری مثال موجود تھی میں اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ کر اسی لئے تمہارے پاس آتا ہوں کہ بچے پیدا کر کے وہ کھنڈر ہوگئی ہے جو عورتیں اپنا حسن وشباب نہیں سنبھالتیں ان کے شوہر دوسری جگہوں پر منہ مارتے ہیں۔''

''تم جتنا بھی کہہ لو مگر عورت کی عظمت و بڑائی ماں بننے میں ہے ہر عورت اپنے شوہر کے بچوں کی ماں بننے میں فخر محسوس کرتی ہے یہ بچے مرد کی پاؤں کی زنجیر ہوتے ہیں دیکھ لو تمہاری پہلی بیوی کھنڈر ہو چکی ہے مگر بچوں کی زنجیر تمہارے پیروں میں ڈال دی ہے لہٰذا تم بھاگے بھاگے اس کے پاس پہنچ جاتے ہو۔ اب میری قسمت بھی جاگ اٹھی ہے میں بھی تمہارے پاؤں میں اولاد کی زنجیر ڈال دوں گی آخر میرا حسن وشباب کب تک برقرار رہے گا وقت کی دھول میں سب ختم ہو جاتا ہے بس اولاد کی زنجیر میاں بیوی کو باندھ کر رکھتی ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتی ہو۔؟''

''کہنا تو مجھے بہت کچھ ہے مگر پہلے مجھے کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے کر چلو۔''

''ٹھیک ہے میں کسی لیڈی ڈاکٹر سے وقت لیتا ہوں۔''

☆......☆......☆

اگلے دن شیانا بہرام خان کے ساتھ لیڈی ڈاکٹر کے کلینک پہنچی۔ لیڈی ڈاکٹر کا کلینک شہر کے وسط میں ایک مصروف جگہ پر تھا۔ بہرام خان شیانا کو لے کر کلینک میں داخل ہوا اور استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی سے بات کر کے شیانا لے کر لیڈی ڈاکٹر کے کمرے میں پہنچا۔

''آیئے...... آیئے یہ ہیں۔ آپ کی وائف جن کا آپ نے کل ذکر کیا تھا۔'' بہرام خان اور شیانا جب لیڈی ڈاکٹر کے کمرے میں داخل ہوئے تو لیڈی ڈاکٹر نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔

''جی......'' بہرام خان نے مختصر جواب دیا شیانا نے غور سے لیڈی ڈاکٹر کو دیکھا وہ ادھیڑ عمر کی ایک تجربہ کار ڈاکٹر لگتی تھی۔

''ٹھیک ہے آپ باہر بیٹھیں۔ میں آپ کی مسز کو چیک کر لیتی ہوں۔'' لیڈی ڈاکٹر نے بہرام خان سے کہا تو وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

بہرام خان کے کمرے سے نکلنے کے بعد لیڈی ڈاکٹر اپنی کرسی سے اٹھی اور اس نے کمرے کی چٹخنی لگائی اور شیانا کو کمرے میں بچھے بیڈ پر لیٹنے کا کہا۔

شیانا کرسی سے اٹھی اور کمرے میں بچھے بیڈ پر لیٹ گئی۔

''یہ آپ کا پہلا بے بی ہے۔؟'' لیڈی ڈاکٹر نے شیانا کو چیک کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی...... ہماری شادی کو ابھی سال ہی ہوا ہے۔'' شیانا نے جواب دیا۔

''مبارک ہو...... آپ امید سے ہیں، اللہ آپ کو چاند سا بچہ دے۔'' لیڈی ڈاکٹر شیانا کو چیک کرنے کے بعد بولی۔

شیانا یہ سن کر خوشی سے کھل اٹھی۔ اور آہستگی سے بستر سے اترتے ہوئے بولی۔ ''آپ سچ کہہ رہی ہیں۔''

''ہاں...... مگر مجھے جھوٹ بولنے پر مجبور کیا جارہا ہے۔'' لیڈی ڈاکٹر بولی۔

''کیا مطلب......؟''

''کل شام تمہارے شوہر کلینک میں آئے تھے اور یہ پیسے دے کر گئے......'' لیڈی ڈاکٹر نے میز کی دراز سے پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی شیانا نے سوالیہ نظروں سے لیڈی ڈاکٹر کو دیکھا۔

''تمہارے شوہر چاہتے ہیں کہ میں تم سے جھوٹ کہہ دوں کہ تم ماں نہیں بننے والی ہو بلکہ یہ کہوں کہ تمہارے اندر کچھ پرابلم ہے اور تمہیں اس بہانے ایسی دوائیں دوں کہ تمہارا یہ بچہ ختم ہوجائے۔''

''کیا......؟'' شیانا حیرت زدہ رہ گئی۔

''نہ صرف یہ کہ یہ بچہ ختم ہوجائے بلکہ آئندہ تم کبھی ماں نہ بن سکو۔'' لیڈی ڈاکٹر نے کہا تو شیانا نے غصے سے دونوں مٹھیاں بھینچ لیں اور غضب ناک نظروں سے دروازے کو گھورنے لگی جس کے باہر بہرام خان بیٹھا تھا۔

''بیٹی مجھے تمہارے شوہر کی ہسٹری معلوم ہے وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ تم سے کوئی اولاد ہو کیونکہ اس کی خاندانی بیوی موجود ہے اور اس بیوی سے اس کی اولاد بھی ہے۔ اس لئے وہ تم سے کسی حالت میں اولاد نہیں چاہے گا۔ مگر میں ایک عورت ہوں جانتی ہوں کہ اولاد عورت کے لئے کیا ہوتی ہے اولاد عورت کو مکمل کرتی ہے اولاد عورت کو تکمیل کی اس معراج پر پہنچاتی ہے جہاں فرشتے بھی اس رشک کرتے ہیں۔ میں تمہارے بچے کو ضائع کرنے جیسا گناہ نہیں کرسکتی۔'' لیڈی ڈاکٹر نے کہا اور نوٹوں کی گڈی شیانا کے ہاتھ میں دے دی پھر گویا ہوئی۔

''اب تمہیں خود فیصلہ کرنا ہے کہ تم ماں بننا چاہتی ہو یا نہیں۔''

شیانا نے نوٹوں کی گڈی لیڈی ڈاکٹر کے ہاتھ سے لے لی اور اسے اس طرح دبایا جیسے بہرام خان کا گلا دبا رہی ہو۔ اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

''کیا ہوا خیریت ہے ناں۔؟'' باہر بہرام خان شیانا کو غصے سے پیر پٹختا ہوا جاتا دیکھ کر جلدی سے اس کے پیچھے بھاگا اور شیانا سے پوچھا مگر شیانا کچھ کہے بغیر کلینک سے باہر کی طرف چل دی۔

''کیا ہوا کیا بولی ڈاکٹر۔'' بہرام خان نے گاڑی چلاتے ہوئے کئی بار پوچھا مگر شیانا خاموش رہی۔ بہرام خان دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ جب لیڈی ڈاکٹر نے اس کے منصوبے کے مطابق شیانا کو بتایا ہوگا کہ وہ ماں نہیں بننے والی ہے تو شیانا کو دھچکا لگا ہوگا اور شیانا کا متوقع ردعمل شاید اس دھچکے کا نتیجہ ہے۔

''چلو کہیں باہر کھانا کھاتے ہیں پھر گھر چلیں گے۔'' بہرام خان نے خوش گوار لہجے میں کہا مگر شیانا نے انتہائی خون خوار نظروں سے اسے گھورا تو بہرام خان سٹ پٹا گیا۔

''اچھا بابا...... گھر ہی چلتے ہیں۔'' بہرام خان شیانا سے نظریں چراتا ہوا بولا۔ کوٹھی میں پہنچ کر بہرام خان نے جیپ روکی تو شیانا اتر کر کوٹھی میں داخل ہوگئی ۔بہرام خان بھی پیچھے پیچھے کوٹھی کے اندر آیا۔ شیانا سیدھی اپنے کمرے میں آگئی بہرام خان بھی اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ ''کیا ہوا...... خیریت تو ہے ناں...... کیوں اتنی پریشان نظر آرہی ہو۔؟''

''جس ماں کے بچے پر ایک خونخوار ہتھیارے کی نظر ہو وہ کیوں پریشان نہ ہوگی۔'' شیانا پھنکاری۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا۔''

''یہ لو......'' شیانا نے نوٹوں کی گڈی بہرام خان کے منہ پر دے ماری نوٹوں کی گڈی بہرام خان کے منہ پر لگ کر زمین پر گرگئی بہرام خان نے ایک نظر نوٹوں کی گڈی کو دیکھا پھر وہ سارا معاملہ سمجھ گیا۔ ''تو اس بڑھیا ڈاکٹرنی نے تمہیں سب کچھ بتادیا۔''

''ہاں......اور یہ بھی بتایا کہ تم میرے بچے کے دشمن ہو۔''

''ایک بات تو تم اپنے دماغ میں بیٹھالو شیانا...... یہ بچہ تو تم پیدا نہیں کروگی۔'' بہرام خان

سرد لہجے میں بولی۔

''مجھے دھمکی مت دو بہرام خان میں کون ہوں تم جانتے ہو۔'' شیانا کا لہجہ بھی سرد ہوگیا

''مجھے پتہ ہے تم کس خاندان سے ہو۔؟''

''اس خاندان کے تلوے چاٹنے تم میری چوکھٹ پر آئے تھے۔'' شیانا چیخی۔

''چپ کر ذلیل عورت۔'' بہرام خان نے ایک زوردار تھپڑ شیانا کے منہ پر مارا تو شیانا لڑکھڑا کر گر پڑی مگر پھر جلدی سے کھڑی ہوگئی تھپڑ کی وجہ سے شیانا کے ہونٹ پھٹ گئے اور پھٹے ہونٹوں سے خون رسنے لگا شیانا نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی سے خون صاف کیا گگن یہ دیکھ کر زور سے غرائی مگر شیانا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔

''بہرام خان یہ بچہ میرا ہے اور میں اسے ضرور دنیا میں لے کر آؤں گی۔''

''اول تو یہ بچہ دنیا میں آئے گا نہیں اور اگر آ گیا تو تمہارے پاس پرورش نہیں پائے گا، میں اسے تم سے چھین کر لے جاؤں گا۔ تم جانتی ہو میری پہنچ کہاں تک ہے۔ میں تمہیں کل صبح تک کی مہلت دیتا ہوں۔ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچو اور کل صبح مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کردینا۔'' بہرام خان یہ کہہ کر کمرے سے چلا گیا۔

شیانا بے اختیار سسک پڑی اس کے منہ سے سسکیاں نکلنے لگیں اور وہ منہ چھپا کر بے آواز رونے لگی آنسو اس کے گال پر بہنے لگے۔ گگن اپنی مالکن اپنی پیاری سہیلی کی یہ حالت دیکھ کر فوراً اس کے پاس آئی اور چھلانگ مار کر شیانا کی گود میں چڑھ گئی شیانا نے گگن کو اپنے سینے سے لگالیا۔

''گگن تیرے بچے کو خونخوار بلے سے تو میں نے بچالیا مگر آج ایک خونخوار بلا میرے بچے کو مارنا چاہتا ہے۔ اسے کون بچائے گا۔'' شیانا شدت کے ساتھ رونے لگی۔ گگن نے اپنا سر شیانا کے گالوں پر رگڑنا شروع کردیا جیسے وہ شیانا کے آنسو پونچھنا چاہتی ہو۔

تھوڑی دیر تک گگن شیانا کے گالوں پر اپنا سر رگڑتی رہی پھر چھلانگ مار کر شیانا کی گود سے اتری اور کمرے کے ادھ کھلے دروازے کی جانب بڑھی۔

''گگن کہاں جارہی ہو۔؟'' شیانا گگن کو جاتا دیکھ کر بولی تو گگن نے دروازے پر رک کر شیانا کو دیکھا اور ایک ہلکی سی غراہٹ کے ساتھ اس کا جواب دیا اور دروازے سے باہر نکل گئی۔

''گگن.....'' شیانا چلائی اور گگن کے پیچھے بھاگی وہ گگن کا مقصد جان گئی تھی، شیانا بھاگتی ہوئی لان میں پہنچی، اسی وقت بہرام خان کی جیپ کوٹھی سے باہر نکلی، گگن بھی جیپ کے پیچھے بھاگی سڑک پر پہنچ کر بہرام خان نے جیپ روکی اور جیب میں ہاتھ ڈال کر سگار نکالا اور اسے سلگایا اور سگار کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے جیپ آگے بڑھادی، اسی وقت گگن نے ایک لمبی چھلانگ لگائی اور جیپ کی پچھلی کھڑکی جس کا شیشہ اترا ہوا تھا سے ہوتی ہوئی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''گگن۔'' شیانا کے منہ سے ایک گھٹی ہوئی چیخ برآمد ہوئی۔

بہرام خان نے جیپ کے ایکسی لیٹر پر پیر کا دباؤ بڑھایا اور جیپ ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ جتنی تیزی سے جیپ چل رہی تھی اس سے زیادہ تیزی سے بہرام خان کا دماغ چل رہا تھا، اب بہرام خان شیانا سے شادی کے فیصلے پر پچھتا رہا تھا وہ جھنجھلا رہا تھا کہ اس نے ایک طوائف سے شادی ہی کیوں کی اور اب اس کا خون ایک طوائف کی گود میں پرورش پائے گا۔ ''اگر.....اگر پیدا ہونے والا بچہ لڑکی ہوئی تو۔؟'' بہرام خان کی غیرت یہ گوارہ نہیں کررہی تھی وہ اس سے آگے سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔''

بہرام خان اسی ادھیڑ بن میں گاڑی چلا رہا تھا کہ اچانک اسے غراہٹ کی آواز سنائی دی، اس نے بیک مرر میں دیکھا پچھلی سیٹ پر گگن بیٹھی تھی۔

''گگن ...... تم یہاں کیا کررہی ہو......؟'' بہرام خان نے حیرانگی سے گردن گھما کر گگن کی جانب دیکھا، اسی وقت گگن اچھلی اور اس کا پنجہ

بہرام خان کے گال کا گوشت ادھیڑتا چلا گیا۔
"ککن......" بہرام خان تکلیف سے چیخا اور اس نے ایکسی لیٹر سے پاؤں ہٹا کر بریک پر رکھنا چاہا مگر تکلیف کی وجہ سے وہ یہ نہ کرسکا اسٹیئرنگ بہرام خان کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور جیپ سڑک پر لہرانے لگی ،اسی وقت سامنے سے ایک بدمست ٹرک بھی تیز رفتاری سے چلا آرہا تھا اس ٹرک نے بہرام خان کی جیپ کو ایک زوردار ٹکر ماری، ٹھیک اسی وقت گگن نے بھی اچھل کر بہرام خان پر حملہ کردیا اس مرتبہ گگن کا حملہ صحیح نشانے پر پڑا اور گگن کے پنجے میں بہرام خان کی بائیں آنکھ آ گئی اور آنکھ کا ڈیلا گگن کے حملے کے نتیجے میں باہر آ گیا۔
بہرام خان کے منہ سے خوف ناک چیخ نکلی، ٹرک کی ٹکر سے جیپ ہوا میں اچھلی اور سڑک کے کنارے گری اور لڑھکتی ہوئی نشیب میں گرنے لگی، گگن جیپ کے لڑھکنے سے پہلے ہی چھلانگ مار کر باہر نکل آئی۔ جیپ لڑھکتی پٹخنیاں کھاتی نشیب کے طرف جارہی تھی گگن بھی جیپ کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگی نشیب میں پہنچ کر جیپ لڑھکنا بند ہوگئی۔
گگن جیپ کے بونٹ پر چڑھی سامنے ڈرائیونگ سیٹ پر بہرام خان اپنے ہی خون میں نہایا ہوا تھا۔ اس نے چونکہ سیٹ بیلٹ باندھی ہوئی تھی اس لئے وہ جیپ سے باہر گرنے سے محفوظ رہا مگر اس کا پورا چہرہ اور کپڑے اس کے اپنے خون میں تر تھے، گگن دھیرے سے بہرام خان کے قریب پہنچی، بہرام خان کی سانسیں بہت دھیرے دھیرے چل رہی تھیں۔
گگن جیب سے باہر آئی جیپ کی پیٹرول کی ٹنکی بھی شاید اوپر سے گرنے کی وجہ سے ٹوٹ گئی تھی اور ٹنکی میں سے پیٹرول مسلسل گر رہا تھا جس نے آس پاس کی زمین کو بہت دور تک گیلا کردیا تھا۔ گگن پھر جیپ پر چڑھی اور بہرام خان کے قریب پہنچی ابھی تک بہرام خان کی سانسیں چل رہی تھیں۔
گگن نے جیپ میں ادھر ادھر نظریں دوڑائی شاید وہ کسی خاص چیز کی تلاش میں تھی۔

اچانک گگن کو وہ چیز نظر آ گئی وہ چیز بہرام خان کا سگار تھا جو،اب بہرام خان کے قدموں میں پڑا تھا گگن بہرام خان کے قدموں کے پاس اتری اور اس نے احتیاط سے سگار کو اپنے منہ میں دبالیا۔ سگار ابھی تک سلگ رہا تھا گگن سگار لے کر جیب سے باہر آ گئی پھر وہ اس جگہ پہنچی جہاں پر پیٹرول کی ٹنکی سے پیٹرول گر رہا تھا گگن نے اپنے منہ سے سگار پیٹرول میں گرایا اور پھرتی کے ساتھ واپسی کے لئے بھاگ کھڑی ہوئی۔
تھوڑی دیر میں گگن کو اپنے پیچھے ایک خوف ناک دھماکے کی آواز آئی اس نے پلٹ کر دیکھا بہرام خان اپنی جیپ کے ساتھ جل رہا تھا۔ گگن کے منہ سے ایسی غراہٹ نکل رہی تھی جیسے وہ بہرام خان کے اس انجام پر خوشی کا اظہار کررہی ہو۔

☆......☆......☆

شیانا گگن کے بچے کے پاس بیٹھی تھی جو اپنی ماں کو اپنے پاس نہ پاکر بے چین ہورہا تھا اور نحیف آواز میں میاؤں میاؤں کررہا تھا جیسے اپنی ماں کو پکار رہا ہو۔ اسی وقت گگن کمرے میں داخل ہوئی اور اپنے بچے کے پاس گئی، بچہ ماں کو اپنے قریب پاکر خاموش ہوگیا اور ماں کے جسم کی گرمی کو محسوس کرنے لگا۔
"کیا ہوا گگن۔؟" شیانا نے بے چینی سے پوچھا تو گگن شیانا کے پاس آئی اور شیانا کی گود میں چڑھ گئی اور دھیرے دھیرے اپنا منہ شیانا کے گال پر رگڑنے لگی اس کے منہ سے ہلکی ہلکی غراہٹ نکل رہی تھی۔ شیانا گگن کا مطلب سمجھ گئی اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے مگر اس نے ان آنسوؤں کو پونچھ ڈالا۔
"ہاں گگن......جو خونخوار بلا اپنے بچوں کو کھاتا ہے اس خونخوار بلا کا یہی انجام ہونا چاہئے۔"
شیانا نے بے اختیار گگن کو اپنے سے چمٹا لیا۔ گگن نے بھی اپنے پنجے شیانا کے گلے میں اس طرح ڈال دیئے جیسے شیانا کے گلے لگ رہی ہو۔

یقینی موت

مدثر بخاری-شہر سلطان

نوجوان تپتے ریت کے ریگستان میں اپنی جان بچانے کے لئے سرپٹ بھاگ رہا تھا کہ اچانک وہ گر پڑا پھر دہشت ناک آوازوں سے چونک گیا اور جب بغور دیکھا تو حواس باختہ ہوگیا کیونکہ......

ظلم وزیادتی اورانتقام کے خمیر میں گندھی ہوئی پراسراریت کے لبادے میں لپٹی کہانی

وہ بھاگ رہا تھا صحرا کی تپتی جان لیوا ریت پر...... اس کا دماغ صرف ایک ہی آرڈر دے رہا تھا ”رکنا مت، اگر ایک لمحہ کے لئے بھی رک گئے تو موت یقینی ہے۔ پیچھے مڑکر دیکھنا بھی موت کودعوت دینا ہے۔“ پھر وہ بھاگتے بھاگتے جیسے گر پڑا انگارے کی مانند تپتی ریت پر...... اس کا دل بے ترتیب انداز سے دھڑک رہا تھا۔ بالکل زیروبم کی مانند تیز تیز، سانس لیتے ہوئے اسے لگا جیسے وقت آخر آن پہنچا ہے اور جیسے اجل کا فرشتہ اس کی طرف بڑھ رہا ہو۔ جیسے روح، جسم کی قید سے آزاد ہونے کو ہو۔ دشمن اس کے سر پر پہنچ چکا ہو۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں تنہا بے یارومددگار ایک نوجوان موت کی اندھی وادیوں میں داخل ہونے کے لئے تیار تھا۔ مگر پھر معجزہ ہوا کہ بادلوں نے آسمان کی نیلی فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور پھر اسے لگا جیسے وہ بارش

میں بھیگ رہا ہے ریت ٹھنڈی ہونے لگی اس نے آنکھیں کھول دیں بارش مناسب انداز سے جاری تھی۔ البتہ اس کے پیچھے کچھ موجود نہ تھا۔ صحرا خاموش اور تنہا اس کا منہ چڑا رہا تھا اس نے سکون کا سانس لیا۔ جیسے وقتی حملہ ٹل گیا ہو پھر بارش کے برسنے کا سلسلہ شروع ہوا، تھوڑی بہت کن من چلی۔

ایک چیز اسے حیران کرگئی...... دشمن ٹل گیا، بارش اچھی ہوئی اسے سکون کا بہانہ ملا۔ مگر کیسے اور کیونکر......؟ یہ معجزہ ہی ہوا تھا کہ وہ یقینی موت سے بچ نکلا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا سانس بحال ہو چکا تھا۔ مگر ریت پر چلنا دوبھر تھا۔ وہ اٹھا ہی تھا کہ پھر اوندھے منہ ریت پر آگرا...... پھر اسے ریت میں ایک گہرا گڑھا نظر آیا گہرا اندھا خوف ناک گڑھا۔ جو بالکل اندر کی جانب بہت نیچے تک چلا گیا تھا اس جگہ واضح الفاظ میں کچھ لکھا تھا۔ ریت کی نرم سطح پر 1994ء کے الفاظ ہندسوں کی صورت میں واضح پڑھے جاسکتے تھے۔

وہ کافی دیر تک اس خوف ناک گڑھے کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "1994ء کا مطلب اس کی محدود عقل سے باہر تھا۔"

☆......☆......☆

سب کا لاڈلہ اور پیارا عادل مراد ہاسٹل سے واپس آیا تو جیسے عید کا سماں بندھ گیا۔ وہ گاڑی سے اترا تو قریب کھڑے سب نے اسے خوش آمدید کہا۔

اس کی خوشی میں مراد ولا کو بہترین انداز میں سجایا گیا تھا پورے دو ماہ بعد آیا تھا اپنے گھر۔

مراد علی بزنس مین، رخشندہ مراد بیوی، دادی، اور عادل مراد، لوگ بہت کم مگر محبتوں سے لبریز۔ جب والد مراد علی نے فیصلہ کیا کہ عادل مراد شہر جائے گا اور ہاسٹل میں قیام کرے گا تو والدہ رخشندہ مراد رونے کو آگئیں۔ بہت ارمان تھے بیٹے کے اپنے دل میں کئی وہم اور وسوسے تھے دل میں، مگر جیسے تیسے اسے ہاسٹل میں شفٹ ہونا پڑا۔

شہر کی اپنی زندگی، کالج کی الگ فضا، عادل اس سے بہت جلد مانوس ہو گیا۔

اسے اپنی طرح کے پردیسی دوست مل گئے۔ تعارف ہوئے روم میٹ بہت اچھے ملے۔ غرض چند ہی دنوں میں خوب جمنے لگی۔ پردیس میں دل لگانے کے لئے دوست بنانے لازمی ہوتا ہے ورنہ ایک ایک لمحہ کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے ایک نئی زندگی اور خوابوں کا سلسلہ شروع ہو گیا نئی زندگی نئے ڈھنک رنگ اور دھڑکن کے ساتھ خوشبو اور بہار کے رنگوں کے ساتھ، برسات کے موسم میں بھیگنے کے احساس کے ساتھ شاعری کی زبان بولتے لمحوں کی مانند نرم ٹھنڈی گھاس کے پرلطف احساس کے ساتھ بارش کے بعد کے ٹھنڈی ہوا کے احساس کے ساتھ زندگی میں خوشی اور محبت کے حسین جذبات کے ساتھ اسے ایک احساس ملا۔ جو اسے فضاؤں کی وسعتوں میں اڑاتا چلا گیا۔ جو اسے ہمالیہ کی بلندی سے اونچی اور سمندر کی موجوں کی مانند تیز......

☆......☆......☆

ہما تبسم، ایک مکمل زندگی کا احساس، ایک جگنو، ایک روشنی، ایک دیا تھا اس کے لئے، جو خوبصورت اور زندگی سے بھرپور، تبسم اس کی زندگی میں بہار کی مانند آئی اور دل کی زندگی سیراب ہوگئی۔ زندگی جینے کا مزہ ہی الگ تھا اس کے ملنے سے۔

برسات کے بھیگے رومانٹک موسم میں وہ یونہی موسم انجوائے کرنے سڑک پر آنکلا تھا اس کے پاس بائیک تھی وہ ہولے ہولے ٹھنڈی ہوا میں آگے بڑھ رہا تھا ہاسٹل سارا خالی پڑا تھا اسے بھی مستی کرنے کا جنون چڑھا۔ سڑک پر لوگ تھے خاص طور پر قریبی چوک پر رش تھا۔ بارش کے بعد لوگ عموماً باہر نکلتے ہیں کچھ اکیلے کچھ فرینڈز کے ساتھ اور کچھ فیملی کے ساتھ۔

وہ بائیک لئے جارہا تھا کہ اچانک بادل گرجے۔ جو بارش رک چکی تی دوبارہ پھر شروع ہوگئی یہ شدید بارش تھی وہ بھی واپسی کا پلان بنانے لگا کہ اس کے سامنے ایک دوشیزہ ٹوٹے سینڈل مگر پریشان صورت نظر آئی۔

وہ گلابی جوڑے میں ملبوس دلکش چہرہ لئے معصوم سی لڑکی اداس آنکھوں میں حیرانی لئے فٹ پاتھ پر تنہا

کھڑی تھی۔

عادل کا دل بھی نازک تھا دل میں نرم گوشہ کا احساس جاگا لیکن پھر خیال آیا کہ بہتر نہیں کیا سمجھے اعتماد کا زمانہ نہیں ہے لوگ طرح طرح سے سوچتے ہیں۔

مگر نجانے کون سی کشش نے اسے مجبور کر دیا۔

بارش زور پکڑ چکی تھی سڑک ویران تھی وہ کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا کہ اس کا کوئی جاننے والا آ نکلے اور اسے گھر لے جائے۔

احساس کے تحت اسے خیال آیا کہ اگر کوئی تنہا اس سڑک پر اس موسم میں کھڑا ہو تو کیا کرنا چاہئے۔؟

''مدد...... صرف مدد...... چاہے جو کوئی کچھ بھی سوچے۔'' وہ سوچ ہی رہا تھا کہ لڑکی اس کی جانب آنے لگی۔ وہ پریشان صورت لئے قریب آئی۔

''سنیے......!''

خوب صورت آواز مگر کچھ حد تک گھبرائی ہوئی۔

''جی......!'' وہ بولا۔

''اگر آپ غلط نہ سمجھیں تو پلیز! مجھے گھر تک پہنچا دیں۔ میں آپ کی احسان مند رہوں گی آپ اجنبی ہیں مگر آپ پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔'' وہ بولی۔

''Sure...... آپ مجھے راستہ بتائیں۔''

میں آپ کو بتاتی رہوں گی۔

''اگر میری ماں بیمار نہ ہوتی تو آپ کو بھی تکلیف نہ دیتی۔''

''کوئی بات نہیں...... ویسے آپ یہاں کر کیا رہی تھیں محترمہ؟''

''پڑھتی ہوں...... آج پوائنٹ مس ہو گیا...... بھائی تو کوئی ہے نہیں جو لینے آ جاتا۔''

''اور ابو؟......'' اس نے پوچھا۔

''ابو تو اس دنیا سے کب کے چلے گئے۔'' وہ اداس لہجے میں بولی۔

''اوہ سوری...... میں نے آپ کو دکھی کر دیا۔''

وہ راستہ بتا رہی تھی۔ وہ ڈرائیو کرتا جا رہا تھا، عادل کو وہ سفر خوشبو کا سفر لگا۔ ایک عجیب احساس تھا اس ہم سفر کے ساتھ، دل کی گھنٹی بجی...... آواز آئی کاش! یہ سفر کبھی ختم نہ ہوتا۔

''بس بس...... یہی ہے میرا گھر۔'' ایک رہائشی علاقے میں اس نے بائیک رکوا دی۔

''میرا گھر تھوڑا آگے ہے...... اس خلوص کا بہت بہت شکریہ...... آیئے میں آپ کو اپنی امی سے ملواؤں۔''

''تھینکس...... پھر کبھی...... اپنا خیال رکھا کریں...... زمانہ پر اعتماد کرنا تھوڑا مشکل ہے۔'' وہ اسے بغور دیکھتے ہوئے بولا۔

''جی بالکل...... میں چلتی ہوں...... امی کی طبیعت خراب ہوگی میری وجہ سے۔!''

''ضرور......!'' وہ بولا۔

وہ جانے لگی اس کا دل چاہتا تھا کہ ''خدارا رک جاؤ۔ مت جاؤ، سنو پھر کب ملوگی۔ ملوگی بھی سہی یا صحرا میں تنہا چھوڑ دوگی۔'' اس کے دل میں سوال تھے۔

وہ چلی گئی تھی، مگر بے دھیانی میں اس کی ایک پتلی سی کتاب نیچے گر پڑی تھی۔

''عادل نے کتاب اٹھالی۔

''سنیئے۔ آپ کی بک گر گئی ہے۔'' مگر وہ جا چکی تھی۔

''رہنے دو ناں...... ایک نشانی تو ہاتھ لگی۔ مت واپس کرو۔'' ایک آواز آئی دل سے۔

''ہاں رہنے دو۔ کتاب ہی تو ہے۔'' اس نے بائیک اسٹارٹ کی اور آگے ایک نئے احساس اور خیال کے ساتھ۔

☆......☆......☆

دو دن تک دل کی بستی خوش رہی، تیسرا دن اسے اداس کر گیا۔ کیوں؟

اس کا دل بے چین و بے قرار کیوں تھا؟

اس دلربا، حسین مگر معصوم و پاکیزہ چہرے کو ایک نظر دیکھنے کو دل بے قرار تھا۔

کلاس میں کئی حسین فیشن ایبل لڑکیاں تھیں

مگر عادل نے کبھی کسی کو دل میں انٹری نہ دی تھی؟

بہت سی لڑکیاں اس کی وجاہت پر جان دینے کو تیار تھیں مگر دل کا اختیار کیا؟

وہ اداس تھا مگر پرامید بھی۔ ''وہ ملے گی ...... ضرور ملے گی۔'' ایک ہی شہر ایڈریس بھی معلوم تھا مگر صرف ایک ٹھوس جواز سامنے آتا تھا۔

والدین نے اسے اعلیٰ تربیت سے نوازا تھا۔ اس کی اعلیٰ سوچ اسے وہاں جانے سے باز رکھ رہی تھی۔

''مت جاؤ سراب کے پیچھے...... اس نے لفٹ لی تم نے مدد کی ...... مجبور و بے کس لوگوں کی دعا کافی ہوتی ہے وہ صرف ماں، بیٹی ہیں کن حالات میں زندگی گزار رہی ہوں گی کچھ معلوم نہیں۔؟

پھر میرا وہاں جانا، کتنا معیوب لگے گا محلے کے لوگ لڑکی کے متعلق غلط بات کریں گے ...... نہیں ...... اس سے پیار ہے۔

تو انتظار کرو، قدرت خود بخود ملا دے گی......

مگر کب تک؟'' انہی سوالوں کے دوران اس نے الماری سے کتاب ڈھونڈی اس کی گری ہوئی کتاب جو اس نے بطور نشانی اٹھالی تھی اس نے پہلا ورق پلٹا۔

پہلے صفحہ پر نام لکھا تھا...... ہما تبسم ...... اور نیچے فون نمبر درج تھا۔

اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ ''واہ کیا اتفاق ہے......'' بہت سوچ سمجھ کر اس نے کال ملائی۔

نمبر پش کرتے ہوئے اس کا دل بے ترتیب طریقے سے دھڑک رہا تھا جسم کانپ رہا تھا اور دماغ ماؤف تھا۔

پہلی کال پر جواب موصول نہ ہوا۔ اس نے مزید دو کالز ملائی مگر نمبر شاید اجنبی تھا جس کی وجہ سے کال موصول نہ کی گئی تو اس نے ایک پیغام ٹائپ کیا۔

''ہیلو! آپ کی کتاب بارش والے دن گر گئی تھی۔ میں نے اٹھالی آپ کو پکارا بھی تھا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔'' اس نے میسج سینڈ کردیا۔

چند لمحوں بعد میسج ریسیو ہوا۔

''اوہ تو یہ آپ تھے میں سمجھی کوئی تنگ کر رہا ہے۔''

اس نے ڈرتے ڈرتے کال ملائی۔

''ہیلو......!''

''ہیلو...... کیسے ہیں آپ۔؟'' دوسری طرف اضطرابی کیفیت تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ آپ کیسی ہیں؟''

''اللہ کا احسان ہے۔''

''اصل میں آپ کی کتاب اس دن گر گئی تھی آپ کو آواز بھی دی مگر آپ نے سنا نہیں۔''

''اوہ! سوری...... کوئی مسئلہ نہیں۔''

اور پھر ایک نئی دوستی کا آغاز ہوا دو دھڑکنیں قریب آگئیں۔

ہما تبسم اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ بہت جلد دونوں کو محسوس ہوا کہ زندگی اگر ساتھ گزاری جائے تو بہترین رہے گی کیونکہ مزاج اور دل دونوں ایک راستے پر گامزن تھے۔

☆......☆......☆

عادل مراد اپنے گھر آچکا تھا۔ سب ہی خوش تھے۔ سب نے ایک ساتھ ہی کھانا کھایا۔ مگر ایک بات واضح محسوس کی جاسکتی تھی کہ عادل مراد کچھ پریشان تھا۔ اس کی ڈگری مکمل ہوچکی تھی اب اسے اپنے مستقبل کے لئے بزنس کو دیکھنا تھا یا ولایت جانا تھا اعلیٰ تعلیم کے لئے۔

مگر جب سے وہ آیا تھا ان دونوں موضوعات پر بات نہ ہوسکی تھی کیونکہ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی ذہنی پریشانی میں مبتلا تھا۔

اس کی والدہ اور والد نے اس چیز کو واضح محسوس کیا کھانے کی میز پر وہ خاموش رہا تھا ابھی دو ماہ پہلے وہ ہشاش بشاش گھر آیا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی نام کی کوئی چیز نہ تھی۔

بابا کی جان اور سب کا لاڈلہ باتوں میں سب سے آگے تھا۔ دل کا صاف اور ہمدرد...... جانے کس کرب میں مبتلا تھا جس سے سب ہی ناواقف تھے۔

وہ کھانا کھانے کے بعد ......

آ گیا تھا۔

''آج کل عادل کچھ پریشان ہے۔ آپ نے نوٹ کیا۔؟''

''ہاں..... وقتی غم کوئی مسئلہ ہوگا۔ چار ماہ شہر میں رہ کر آیا ہے بہت سے فرینڈ ہوں گے دوستوں سے بچھڑنے کا غم ہوگا۔ فکر مت کرو۔'' اس کے والد بولے۔

''ایسا ہی ہو خدا کرے..... میرا بچہ کتنا کمزور اور پریشان لگ رہا ہے۔ خدا جانے کیا معاملہ ہے؟'' والدہ بولیں۔

عادل اپنے کمرے میں واپس آ گیا تھا۔ اس کا دل خوف سے بھرا ہوا تھا۔ جیسے کچھ غلط ہونے والا تھا؟ وہ بے بسی کے عالم میں بیڈ پر گر گیا۔ اسے ماضی کے حالات ازبر تھے۔

کون کیوں اسے مارنا چاہتا ہے؟

کون ہر روز اسے خواب میں آتا ہے؟

تبھی اسے دو ماہ پہلے کے حالات یاد آنے لگے۔

زندگی مطمئن اور خوش گزار تھی ہما تبسم نے بھی محبت کا اظہار کر دیا تھا۔

خالص اور پاکیزہ محبت یادگار لمحات کا موجب بنتی ہے جب صرف روح سے پیار ہو تو زندگی گلزار بن جاتی ہے۔

ہما تبسم ایم بی اے میں تھی جبکہ عادل کا بھی فائنل ائیر تھا۔ دونوں کی محبت عروج پر تھی اس معاملے میں دونوں نے اپنی فیملیز کو آگاہ کر دیا لڑکی مناسب اور اچھی تھی۔

طے پایا کہ دونوں کی تعلیم کے بعد شادی کر دی جائے گی۔ مگر معاملات خراب ہو گئے جس کا صرف دو لوگوں کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔

☆......☆......☆

رافع کا تعلق امیر گھرانے سے تھا۔ مگر تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ فہم و فراست بھی اعلیٰ تھی۔ سلجھا ہوا اور اعلیٰ اقدار کا مالک وہ ایک مکمل وجاہت سے بھرپور نوجوان تھا چاچا نے پالا پوسا اعلیٰ تعلیم دلائی۔ پھر والد کی جائیداد کا حصہ ملا..... جسے اس نے خرچ کرکے ایک شاندار بزنس فرم کا حصہ بنا لیا۔ بزنس دن رات محنت

استقبال......!

حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ کے شاگرد خاص حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا علمی مقام یہ تھا کہ آپ کو ''امیر المومنین فی الحدیث'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ایک بار آپ عراق کے شہر رقہ تشریف لے گئے۔ یہ خبر سن کر پورا شہر حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے استقبال کے لئے امڈ آیا۔ اتفاق کی بات کہ اسی وقت خلیفہ ہارون رشید اپنی بیوی زبیدہ کے ساتھ شہر کے دوسرے دروازے سے داخل ہوا مگر وہاں اس کے استقبال کے لئے رعایا میں سے کوئی ایک شخص بھی موجود نہیں تھا۔ صرف شہر کا حاکم اپنے ملازم کے ہمراہ حاضر تھا۔

ہارون رشید نے حاکم سے دریافت کیا۔ ''آج یہ کیسا سناٹا ہے؟ کیا یہاں کے لوگ شہر چھوڑ کر چلے گئے ہیں؟''

حاکم شہر نے جواب دیا۔ ''امیر المومنین اس وقت شہر کے دوسرے دروازے سے مشہور فقیہ اور محدث عبداللہ بن مبارکؒ داخل ہو رہے ہیں۔ تمام لوگ ان کے استقبال کے لئے دروازے کے سامنے جمع ہیں۔''

زبیدہ بھی حاکم شہر کا جواب سن رہی تھی۔ فوراً ہی شوہر کو مخاطب کرکے بولی۔ ''حضور والا۔! اسے کہتے ہیں حقیقی عظمت اور قدر و منزلت کہ کسی جبر کے بغیر عبداللہ بن مبارکؒ کی پیشوائی اور زیارت کے لئے پورا شہر راستے میں آنکھیں بچھائے کھڑا ہے۔ اور ایک آپ ہیں کہ جب تک فوج اور سرکاری کارندے اپنے ڈنڈے اور ہتھیار نہ سنبھالیں، اس وقت تک ایک آدمی بھی آپ کے استقبال کو حاضر نہیں ہوتا۔''

(ایس امتیاز احمد۔ کراچی)

کے باعث عروج پر تک جا پہنچا۔

لے دے کے تھا ہی کون اس کا؟

چاچا، چاچی، عمر کے اس حصے میں جو صرف دعائیں دینے کے لئے تھے والدین تو بچپن میں چل دیئے۔ ایک خوف ناک کار حادثے میں دونوں چل بسے۔ مگر وہ بچ نکلا...... وہ آج بھی اس خوف ناک حادثے کی دھندلی یادوں کو ری وائنڈ کرتا تو بے اختیار کلیجہ منہ کو آجاتا۔

اسے احساس ہوتا جیسے ایک اور وجود تھا جو اس کے ساتھ زندہ بچا تھا کون تھا ننھا وجود؟ چند ماہ کا معصوم وجود، کون تھا وہ؟ اس کی بہن، ننھی سی۔

''چاچا جی...... اس حادثے میں ہم کتنے لوگ تھے۔؟''

''چار لوگ ...... ماں باپ تم اور تمہاری بہن ...... تمہاری بہن چند ماہ کی تھی، ہمیں حادثے والی جگہ پر ملی نہیں تھی۔

اس کا کچھ پتہ نہ چلا...... ہر جگہ ڈھونڈا مگر نجانے کون لے گیا اسے۔'' چاچا نے بتایا۔

''پتہ نہیں کس حال میں ہوگی میری بہن...... زندہ بھی ہوگی یا مرگئی ہوگی۔'' نہیں مگر...... میرا دل کہتا ہے کہ وہ زندہ ہوگی وہ مجھے بلاتی ہے چاچا...... میرا دل کہتا ہے وہ میرے آس پاس ہی ہے۔ مگر کیسے پہچانوں گا؟''

''چاچا جی۔ کوئی نشانی تو ہوگی...... پلیز! میری مدد کریں۔'' میں نے اس کو ڈھونڈنا ہے۔

''ہاں ایک نشانی ہے۔ اس کی گردن پر دائیں اور بائیں پاس پاس دو کالے تل تھے۔''

''میں ڈھونڈوں گا اسے...... ہر جگہ ڈھونڈوں گا کہیں تو ملے گی۔''

اس کا ارادہ واقعی پختہ تھا۔ چٹانوں جیسا مضبوط۔

☆......☆......☆

اسے وہ دن یاد آرہا تھا جب ہوٹل میں تبسم اس کے ساتھ ڈنر کررہی تھی۔

''شادی کے بعد ہنی مون منانے کہاں لے چلو گے؟'' وہ بولی۔

''جہاں دل کرے گا...... جہاں تم چاہو گی...... چلے چلیں گے۔''

''مجھے شمالی علاقہ جات پسند ہیں۔ کھلی فضاء ...... سرسبز اونچی اونچی پہاڑیاں برف سے ڈھکی چوٹیاں......'' وہ کہنے لگی۔

''ضرور چلیں گے جی...... کھانا تو کھالیں...... ٹھنڈا ہورہا ہے۔''

اسی وقت ایک سوٹ بوٹ جوان اپنی ٹیبل سے اٹھ کر ہما تبسم کی طرف آیا۔

اس کا انداز اپنائیت سے بھرپور تھا۔

وہ ہما تبسم کے چہرے کو بغور دیکھنے لگا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اس کے چہرے کی طرف چلا گیا۔ دونوں اس صورت حال سے گھبرا گئے۔

اس اجنبی نے ہما کی گردن کو غور سے دیکھا۔

اسی لمحے عادل کا ہاتھ گھوما...... اور اجنبی کے چہرے کو سرخ کر گیا۔

''بدتمیز...... بے شرم آدمی ہو تم۔''

ہما خود پریشان تھی۔

اجنبی کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی اور وہ مسکراہٹ اسے مہنگی پڑی۔

عادل نے گرم سالن کا ڈونگہ اجنبی کے چہرے پر دے مارا اجنبی سسکی بھرنے لگا مرچیں اس کی آنکھوں میں جا چکی تھیں وہ چیخنے لگا اور پھر ہما کا دل دھڑکنے لگا۔ کوئی تعلق، کوئی رشتہ اندرونی تھا۔ جس نے اسے جکڑ لیا۔ ہما نے پانی کا گلاس اٹھا کر اجنبی کو پکڑایا تاکہ اجنبی پانی سے اپنا منہ دھولے۔ ایسا کرنے سے اجنبی کا منہ صاف ہوگیا۔

اجنبی غصہ میں تھا مگر اس نے کوئی بات نہ کی۔ بلکہ شکریہ ادا کرتا ہوا چلتا بنا۔

''کیا ضرورت تھی اس کے چہرے پر سالن انڈیلنے کی......'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''کوئی تمہاری طرف اس طرح دیکھے مجھے منظور نہیں۔ تم میری ہونے والی بیوی ہو ہما کوئی تمہیں

چھوئے میرے سامنے......میرے بس سے باہر ہے۔‘‘
’’ٹھیک ہے...... مگر اس طرح کا ظالمانہ رویہ اپنانا بھی تو گناہ ہے یہاں ہزاروں لوگ بیٹھے ہیں اگر کوئی ایک اس طرح کا رویہ برت رہا ہے تو کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوگی۔‘‘
پتہ نہیں کیوں اس اجنبی کے حق میں وہ بول رہی تھی نہ چاہتے ہوئے بھی۔
’’میں تمہاری سوچ سے متفق نہیں ہما۔ اس نے تم سے بدتمیزی کی۔ میں نے جواب دیا۔ اب وہ آئندہ کسی کو اس طرح تنگ نہیں کرے گا۔‘‘
دونوں کا موقف ٹھیک تھا مگر حقیقت سے ناواقف ...... اسی لمحے عادل نے نیچے جھک کر ایک وزیٹنگ کارڈ اٹھا کر جیب میں ڈال دیا۔ اس کا ذہن شاید کوئی اٹل پلان تیار کر چکا تھا۔

☆......☆......☆

رافع گھر آیا تو چہرہ بگڑا ہوا تھا چاچا نے پریشانی سے پوچھا۔
’’خیریت تو ہے بیٹا...... یہ کیا ہوا؟ سارا چہرہ عجیب ہو رہا ہے۔‘‘
’’کچھ نہیں چاچا جی......بس ایسے ہی......ایک گڈ نیوز ہے۔‘‘
’’کون سی گڈ نیوز......؟‘‘ چاچا نے پوچھا۔
’’آج میں نے ایک لڑکی کو دیکھا جس کے گردن کے دونوں سائیڈ پاس پاس تل تھے۔ جس طرح آپ نے بتایا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہی میری بہن ہے۔ اور اس کا گھر بھی میں نے دیکھ لیا ہے پھر اس نے سارا واقعہ بتایا۔ اور یہ بھی بتایا کہ اس نے بعد میں اپنی گاڑی میں اس لڑکی کا تعاقب کر کے گھر بھی دیکھ لیا۔
’’ویری گڈ...... اچھی خبر ہے۔ مگر اس لڑکے نے تمہارے اوپر سالن گرا کے ٹھیک نہیں کیا لگتا ہے ویسے تمہارا انداز ٹھیک نہیں ہوگا۔ شاید اس لئے اس نے ایسا کیا ہو۔‘‘
’’چاچا جی ...... مجھے چھوڑیں...... آپ میرے ساتھ ابھی چلیں مجھ سے مزید اپنی بہن کی جدائی برداشت نہیں ہو رہی۔‘‘
’’ٹھیک ہے ہم ابھی چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کیا واقعی تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔‘‘

☆......☆......☆

عادل مراد کا غصہ سے برا حال تھا۔
اس اجنبی کا نام پتہ اسے وزیٹنگ کارڈ سے حاصل ہو گیا تھا۔
اس کے جذباتی دماغ نے ایک خوف ناک فیصلہ کر لیا تھا اسکا رخ رافع کے گھر کی جانب تھا ایک جوش تھا، غصہ تھا جو کسی صورت نارمل ہونے کا نام نہ لے رہا تھا۔
اس کی بائیک رافع ہاؤس کے سامنے تھی...... اسی وقت ایک کار رافع ہاؤس سے باہر نکلی اس کی نظروں نے دیکھ لیا تھا کہ رافع اور ایک بزرگ آدمی کار میں تھے۔
اس نے تعاقب شروع کر دیا۔ اس نے محتاط طریقے سے تعاقب کیا گاڑی مختلف سڑکوں سے ہوتی ہوئی ہما تبسم کے گھر کی جانب چل دی...... اور پھر اس کے دماغ کی نسیں پھٹنے لگی کیونکہ گاڑی ہما تبسم کی گلی میں داخل ہو گئی تھی اس نے بائیک سائیڈ پر کھڑی کر دی اور پیدل چل پڑا۔ وہ لوگ ہما کے گھر کے اندر داخل ہو گئے تھے۔
’’آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے۔؟‘‘ اس نے سوچا۔
’’کیوں ہما اسے دھوکہ دے رہی ہے؟ آج صبح بھی ہما نے اس اجنبی کی سائیڈ لی تھی وہ کیوں ایسا کر رہی تھی؟ اور اب وہ اس کے گھر آ گئے تھے۔
ایک شک اس کے دماغ میں ٹھہر گیا تھا جس نے اپنا شکنجہ مضبوط سے مضبوط تر کر لیا تھا اس نے اپنی جیب میں ایک بھاری چیز کو چیک کیا اور بنا سوچے ایک غلط فیصلے پر پہنچ گیا۔

☆......☆......☆

دونوں فیملیز کے درمیان خوشی کا ایک رنگ آ کر گزر گیا...... رافع نے تمام کہانی سنائی۔ اس کے چچا نے بھی قصہ گوش گزار کیا۔ تو بوڑھی بھی بول پڑی۔
میں کھیتوں میں کام کر رہی تھی کہ زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی اور ساتھ یہ بچی جو بالکل ننھی اور ناسمجھ

تھی میری گود میں آ گری۔ میری گود ویران تھی خدا نے جھولی بھردی تھی میں نے بعد میں دیکھا کہ ساتھ ہی ایک کار کا حادثہ ہوا پڑا تھا مجھے کچھ سمجھ نہ آیا۔ مگر پھر جیسے مجھے خوشی مل گئی۔ بات سامنے آ گئی تھی۔

اس کے دونوں سائیڈ گردن پر پاس پاس دو تل تھے۔ رافع کو اپنی بہن مل گئی تھی یہ بہت بڑی خوشی تھی۔

پھر اس نے بتایا کہ وہ ایم بی اے کررہی ہے۔ رافع نے آج صبح والے واقعہ کو بتایا۔ معافی بھی مانگی۔

☆......☆......☆

وہ لوگ کافی دیر تک گھر کے اندر رہے...... ادھر عادل پسٹل ہاتھ میں لئے کھڑا تھا...... تبھی وہ لوگ نظر آئے۔ عادل نے پسٹل پر اپنی گرفت مضبوط کرلی ...... پھر ایک خیال کے تحت اس نے پسٹل میں سائلنسر لگا دیا تاکہ گولی کی آواز دور تک نہ جائے۔

گلی سنسان تھی۔ صبح کا وقت موت جیسی خاموشی جیسے ہی وہ لوگ سامنے آئے اس نے ٹریگر دبا دیا ایک ہلکی سی دلخراش چیخ برآمد ہوئی گولی عین سینے پر لگی اور رافع بے جان ہوکر نیچے گر گیا۔

ایسا کرنے کے بعد اسنے بائیک اسٹارٹ کی اور ہاسٹل آ گیا اس کا غصہ ابھی تک عروج پر تھا۔ لیکن اس نے فیصلہ کیا کہ ہما کو بھی ضرور مزہ چکھائے گا۔

اگلی شام وہ ہما کے گھر میں تھا...... اس کا غصہ ابھی تک عروج پر تھا۔

''کیوں کیا ہے یہ سب؟ کون لوگ تھے وہ جو تمہارے گھر آئے تھے؟ کب سے ہے یہ چکر؟''

''تم کیا بکواس کررہے ہو؟ کون لوگ آئے تھے یہاں؟'' وہ بھی چیخ رہی تھی۔

اس کا ماتھا ٹھنکا۔

''بھائی تھا وہ میرا...... ماردیا کسی نے اسے...... کل ہی مجھے وہ ملا اور کل ہی مارا گیا۔''

عادل کو مزید غصہ آ گیا صرف شک کی بنیاد پر...... اس نے ہما کو تھپڑ دے مارا۔

''جھوٹ بولتی ہو، تم ایک دوسرے کو جانتے ہو۔ کب سے چل رہا ہے یہ چکر...... کیوں مجھے دھوکہ دیا۔؟'' وہ دھاڑنے لگا۔

ہما کی حالت قابل رحم تھی پھر وہ چیخ پڑی۔ ''خدا کے لئے ایک مقدس رشتے کو داغدار مت کرو...... میرا بھائی تھا۔ ہم بچپن میں کھو گئے تھے۔''

''افسوس تمہیں مرنا ہوگا...... تم میرے قابل نہیں رہی...... پہلے تم مرو...... پھر میں خود کو مارلوں گا۔'' اس نے ٹریگر دبا دیا۔ ہما تبسم کی تبسم اجڑ گئی صرف غلط فہمی کی بنیاد پر اس نے بیچ کا گلہ گھونٹ دیا۔

اس نے پستول کنپٹی پر رکھا اور ٹریگر دبا دیا۔ مگر قسمت کہ گولی نہ نکلی۔

☆......☆......☆

پولیس اسے پکڑ کرلے گئی مگر حیرت انگیز طور پر وہ رہا کردیا گیا سب کچھ اس کے خلاف تھا ایک بھی ثبوت نہ ملا۔

وہ پولیس کی سزا سے تو بچ گیا مگر پھر اذیت ناک اور ناقابل برداشت عذاب تسلسل سے دوچار ہوگیا۔ دن کا چین اور رات کا سکون اس سے جاتا رہا وہ بے سکونی کے دلدل میں دھنس کر ماہی بے آب ہوگیا۔ وہ ہر روز ایک خواب دیکھتا، صحرا، دوڑتا ایک دہشت ناک سانپ، ایک خوف ناک آگ جو اس کے پیچھے لگی ہوتی تھی وہ بھاگ رہا ہوتا پھر ایک جگہ رک جاتا بارش ہوتی اور پھر اسے یکم جنوری 1994ء لکھا نظر آتا اور ساتھ ہی اس کے نام کا کتبہ لکھا نظر آتا۔ وہ تاریخ یکم جنوری ہی تھی کہ اسی روز اس نے رافع کو موت سے ہمکنار کیا تھا۔

وہ آرام وسکون کے لئے ترسنے لگا، دل کی دھڑکن کبھی رکتی محسوس ہوتی تو کبھی بے قابو کرجاتی، پیاس کی شدت بڑھ جاتی اور گلے میں کانٹے سے چبھنے لگتے تو غٹاغٹ پورا گلاس چڑھا جاتا مگر پھر چند لمحے بعد وہی اتھل پتھل حالت ہوجاتی۔ اس کی زندگی عذاب بن گئی تھی جہاں ذرا آنکھ لگتی تو وہ رات کے ملگجے اندھیرے میں بھاگ رہا ہوتا اس کی رفتار اتنی تیز ہوتی کہ پورا جسم پسینے میں شرابور ہوجاتا اور پھر ہڑبڑا کر اس

کی آنکھ کھل جاتی اس پر لرزہ طاری ہوتا، اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا ہوتا، پھر جیسے اس کے سامنے ہما آن کھڑی ہوتی اسے ہما کی مسکراہٹ یاد آتی بیتے لمحے اور ساتھ بتائے وقت نے اسے دردناک عذاب سے دوچار کردیا تھا۔

ایک صبح جب وہ جاگا تو اس کے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا وہ شاور لے رہا تھا کہ پانی ختم ہوگیا تو وہ تولیہ لے کر باہر نکلنے لگا کہ اسے لگا جیسے گرمی بڑھ رہی ہے، حبس بڑھتی گئی اس نے دروازے سے باہر نکلنا چاہا مگر دروازہ جیسے باہر سے لاک کردیا گیا ہو ادھر گرمی کی حدت میں ناقابل برداشت اضافہ ہوگیا۔

عجیب وغریب کیفیت تھی اس کی ...... پورا واش روم بھٹی کی طرح دہک رہا تھا اسے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا اور پھر جیسے دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا وہ ہمت پیدا کر کے باہر نکل آیا اور کچھ سانس بحال ہوا تو زندگی اپنی سی لگی۔

پل پل کے کرب واذیت سے دوچار حالات کے تحت اس کی ذہنی حالت بدلنے لگی تھی۔

وہ راتوں کو جاگنے لگا مگر نیند پھر بھی اسے آدبوچتی اور پھر وہ خواب کی وادی میں پہنچ جاتا۔

اس رات بھی ایسا ہوا۔ مگر پھر جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ واقعی ایک صحرا میں تھا۔ سورج طلوع ہوچکا تھا۔ مگر وہ صحرا میں کیسے پہنچا؟ اس نے دماغ پر بہت زور ڈالا مگر حقیقت کو نہ جان سکا پھر دن چڑھنے لگا اسے بھوک، پیاس محسوس ہونے لگی وہ حیران وپریشان صحرا میں بھٹکنے لگا دھوپ بہت تیز تھی تمازت بڑھتی چلی جارہی تھی اسے اب اپنا دماغ ابلتا اور جسم جلتا ہوا محسوس ہوا...... وہ دوڑ رہا تھا حقیقت میں، مگر نہیں کوئی سایہ نہ آبادی...... ! پھر اچانک اسے اپنے پیچھے ایک خوف ناک اور دہشت ناک سانپ کی پھنکار سنائی دی۔

وہ مزید تیز بھاگنے لگا ...... بالکل ویسے جیسے خواب میں بھاگتا تھا پھر بھاگتے بھاگتے اچانک اس کے دماغ میں آج کی تاریخ گھومنے لگی۔ آج یکم جنوری 1994ء تھا وہی تاریخ جس دن اس نے رافع کو مار ڈالا تھا اور جو خواب میں اسے وہی تاریخ نظر آتی تھی۔ آج وہی تاریخ تھی۔ بھاگتے بھاگتے وہ تھک کر چور ہوگیا تھا، اس کی ٹانگوں میں سکت باقی نہ تھی وہ لڑکھڑایا اور دھپ سے گر گیا۔

اب سانپ کا دور دور تک نام ونشان نہ تھا۔

بارش ہونے لگی تھی۔ اتنی گرمی میں بارش اسے رحمت لگی موسم خوش گوار ہو چلا تھا۔

وہ اٹھا بھاگا اور پھر اوندھے منہ گر پڑا جب اس نے آنکھیں کھولیں تو سامنے وہی گڑھا تھا قبر نما...... خوف ناک ...... پھنکارتے ہوئے خوف ناک کالے سانپوں سے بھرا ہوا تھا۔ پھر وہ گڑھا خود بخود گہرا ہونے لگا بہت زیادہ گہرا...... پھر اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا اور آواز سنائی دی۔

''افسوس ...... صد افسوس تم نے ناحق بے گناہ لوگوں کو مار ڈالا۔ تم نے سچائی جانے بغیر مجھے مار ڈالا۔ پھر سچائی جاننے کے باوجود میری بہن کو بھی مار ڈالا۔

وہ آج ہی کی تاریخ تھی ناں...... بہت جی لیا تم نے اب مرو...... یہ صحرا ہی تمہارا مدفن بنے گا۔'' وہ رافع کی آواز تھی۔

''مجھے معاف کردو...... مجھے نہیں مرنا...... میں غلطی پر تھا پلیز! مجھے مت مارو۔'' عادل گڑگڑانے لگا۔

''میں کیوں ماروں گا تمہیں بلکہ تم خود مارو گے اپنے آپ کو......'' سانپ کی پھنکار دوبارہ سنائی دی تو اس پر لرزہ طاری ہوگیا اور کسی اندرونی دردناک تکلیف کی وجہ سے وہ چیخنے لگا اور اس جگہ تیزی سے لوٹنے لگا پھر وہ تیزی سے اٹھا قدم آگے بڑھانا چاہا کہ اچانک گڑھے کے اندر جا گرا پھر کسی غیبی قوت نے گڑھے کے اوپر مٹی ڈالنا شروع کردی...... اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ریت برابر ہوگئی۔ عادل مراد اپنے انجام کو جا پہنچا۔ البتہ اس جگہ ریت پر ایک کتبہ کھدا ہوا نظر آیا۔ ''عادل مراد ولد مراد علی...... تاریخ وفات یکم جنوری 1994ء''

عشق ناگن

قسط نمبر: 15

ایم الیاس

چاہت خلوص اور محبت سے سرشار دلوں کی انمٹ داستان جوکہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی کہ دل کے ہاتھوں مجبور اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے بے شمار جان لیوا اور ناقابل فراموش مراحل سے گزرتے ہوئے بھی خوشی محسوس کرتے ہیں اور اپنے وجود کے مٹ جانے کی بھی پروا نہیں کرتے۔ یہ حقیقت کہانی میں پوشیدہ ہے۔

یہ دنیا رہے نہ رہے لیکن کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔ انہی الفاظ کو احاطہ کرتی دلگداز کہانی

یہ کیفیت نہ جانے کتنی دیر تک اس پر مسلط رہی تھی۔ جب تک اس کی حالت دوبارہ رہی تو اس کے ذہن میں پہلا خیال یہ کوندا بن کے لپکا کہ جل کماری کو کیوں نہ اپنے سامنے طلب کرے۔

وہ سنگیت سے کوئی مشورہ نہیں لے سکتا تھا۔ ماضی کے تجربات پر ذہن دوڑایا تو اس کا داہنا ہاتھ آپ ہی آپ اس کے گلے میں لٹکے ہوئے منکہ پر پہنچ گیا جس کے بے شمار جوہر اور اسرار اس پر آشکارا ہو چکے تھے۔ اس نے دھڑکتے دل سے اور کانپتے ہاتھوں سے وہ منکہ گلے سے اتارا اور اسے اپنے زندان کی تیرہ و تار دیواروں پر دھیمے دھیمے ضربیں لگانے لگا۔ اسے پورا یقین تھا کہ ان چوٹوں سے پورے جل منڈل میں ایک بھونچال آجائے گا۔ اور جل کماری حواس باختہ اور سراسیمگی سے اس کے پاس آپہنچے گی۔

اسے اپنے عمل کا آغاز لحظہ بھر میں نہیں ہوا تھا کہ ایک پرہول دھماکا ہوا تو اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ سنگیت کی کئی سریلی چیخیں گونجیں اور اس دوران جل کماری کی قہرباز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

اس نے چند ساعتوں کے بعد آنکھیں کھولیں تو اس کے اردگرد اب اس تاریک قید خانے کی دیواریں نہیں تھیں بلکہ وہ ایک سنگلاخ میدان میں جل کماری کے روبرو موجود تھا۔ اس کے قریب ہی سنگیت گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ پوری طرح چھپ گیا تھا...... ہر طرف جل منڈل کی وہی ٹھنڈی روشنی پھیلی ہوئی تھی جو گناہوں کی اس تیرہ و تار اور زیر آب سرزمین سکون کا واحد ذریعہ تھی...... اس کے آس پاس فضا میں دھندلائی ہوئی کہر کے ہلکے ہلکے مرغولے بکھرے ہوئے تھے جنہیں دیکھ کے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندان کے در و بام اس دھوئیں میں تحلیل ہوئے ہوں۔

"ہرجائی......! کیوں اس دھرتی کے باسیوں کو تنگ کرتا اور ستاتا ہے۔" جل کماری اس کے سامنے شعلہ جوالہ بنی ہوئی کھڑی تھی اور اس کے الفاظ میں آگ کے شعلوں کی لپک نمایاں تھی۔ وہ حیوان کی سی حالت میں شاید اس لئے آئی تھی کہ آکاش شاید زندان میں گھبرا کے اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دینا چاہتا ہو۔ اور وہ اس کے چرنوں میں گر پڑے گا۔

جب جل کماری نے دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کے حسن کا جادو آکاش پر کوئی اثر نہیں کر رہی ہیں تو اس نے خشونت بھرے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تجھے اب بھی اپنی شکتی پر گھمنڈ ہے...... یادرکھ! اگن ناگ کا وچن تو خود توڑ چکا ہے اور اب

تو میرے قابو میں ہے...... میں دیکھوں گی کہ تیری چہیتی امرتا رانی کا منکہ کب تک تیرے کام آتا ہے......؟ میرے سیوک جلد ہی اس کا آپائے بھی ڈھونڈ لیں گے......"

"اگر یہ بات ہے تو تو بھی میری بات کان کھول کے سن لے کہ میں جل منڈل میں آزاد رہنا چاہتا ہوں...... ابھی تو میں نے زمین پر ہلکی چوٹ لگائی ہے...... اگر اس بار تو نے مجھے قید کر کے مجبور کرنے کی کوشش کی تو میں منکے کی وہ چوٹیں لگاؤں گا کہ جل منڈل کے درودیوار لرز اٹھیں گے اس طرح جس طرح زلزلہ آتا ہے اور پھر تجھ سمیت یہاں کے باسی بہرے ہو جائیں گے۔" آکاش نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

"بہرے ہو جائیں گے۔" وہ چڑانے والے لہجے میں اس کے الفاظ دہرا کے قہقہہ مار کے ہنسی۔ "ننھے بالک......! ہمارے جل ناگ جنم جنم کے بہرے ہوتے ہیں...... ہم کانوں سے نہیں سنتے...... ہمارے بدن کی ہوا...... لہروں کی چال سے سارا حال سمجھا دیتی ہے...... سننے کی شکتی تو بس پرانے ناگوں کو ہی ملتی ہے......" یہ کہہ کر وہ آکاش کی طرف بڑھی۔ "اس کلموہی کو تو میں مہالہ لے جا کے کسی دیو جیسے بھالو کے بھٹ میں پھینکوں گی۔ وہاں اسے اپنے جون کا مزا آئے گا۔"

ریچھ کے بھٹ کا نام آتے ہی وہ چونک پڑا۔ اس کے ذہن میں بے حد ساختہ دو کہانیاں سر ابھارنے لگیں جو پیالہ کی ترائیوں میں لینے والوں میں مشہور تھیں...... دیو جیسے ڈیل ڈول والے ریچھ بڑی چالاکی سے ان قبائلیوں کی خوب صورت نوجوان اور سبک اندام لڑکیوں عورتوں کو اٹھا کے اپنے بھٹ میں لے جاتے تھے۔ پھر اپنے کانٹے دار سخت زبان سے چاٹ چاٹ کے ان کے پیروں کے تلوے صاف کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے گوشت کی باریک اور حساس جھلیوں کے نیچے ہڈیاں چمکنے لگتی تھیں۔

جل کماری دوسرے لمحے مشتعل سی ہو کر سنگیت کی طرف کسی بری نیت سے بڑھی تو آکاش چراغ پا ہو کے بولا۔

"تو ایک بدکار...... پاپی اور بدچلن ناگن ہے اور تیرے مقابلے میں سنگیت معصوم ہے...... میں تجھے کسی قیمت پر اس کے قریب جانے نہ دوں گا اور نہ پھول کی طرح مسلنے دوں گا۔"

آکاش نے اس کی بانہہ پکڑ کے اس قدر زور سے جھٹک کر چھوڑ دیا کہ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ زمین پر گر گئی۔

"ہٹ جا......" جل کماری بجلی کی سی سرعت سے کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے فضا میں ہاتھ ہلا کے حلق سے ایک عجیب آواز لگائی۔ صرف ایک پل میں اس کے ارد گرد ان گنت موٹے موٹے سیاہ بھونروں کی بوچھاڑ ہو گئی۔ وہ غیض و غضب کے عالم میں اس کے ارد گرد بھن بھنانے لگے۔ سنگیت وہ ان بے ہنگم آوازیں سنتے ہی سہم کے چیخی اور اس کے سینے سے آلگی اور بے ہوش ہو گئی۔

آکاش بھی اس ناگہانی افتاد سے فوری طور پر سراسیمہ ہو گیا۔ لیکن جب ان اذیت ناک بھونروں نے چند انچ کے فاصلے پر دائرہ بنا لیا تو اسے قدرے تسلی ہوئی کہ وہ منکہ کے باعث اس پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کر رہے۔

جل کماری اس کے سامنے استہزائیہ انداز سے قہقہے لگاتی ہوئی گھورنے لگی۔

"سن......!" آکاش نے تڑختے لہجے میں کہا۔ "میں نے اب تک تجھ پر کوئی وار نہیں کیا ہے...... تو مجھے کسی حملہ پر مجبور نہ کر...... اگر تو نے اپنے ان مہلک سیوکوں کو میرے ارد گرد سے نہیں ہٹایا تو میرے انتقام سے بچ نہ سکے گی؟"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ تو اپنے ارمان پورے کر لے اور میں خوش ہو جاؤں۔" جل کماری معنی خیز انداز سے بولی۔ اس کے پیاسے ہونٹ اور مستی بھری آنکھیں اسے جان دعوت دینے لگے۔

آکاش سمجھ گیا کہ جل کماری نے اسے ورغلانے کے لئے چال چلی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اسے اپنا اسیر بنا کے سنگیت سے دور کر دے...... لیکن اس نے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بے ہوش سنگیت کو بائیں ہاتھ پر سنبھالا۔ پھر خود نیچے جھک کر زمین پر سے کنکر وغیرہ کی چٹکی اٹھانی چاہی لیکن جونہی اس کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں زمین سے ٹکرائیں تو جل کماری نے زہر

قہقہہ لگایا۔ آکاش کی زبان مغلظات بکتی چلی گئی۔

چند ساعتوں پیشتر آکاش نے خود کو کچی زمین پر کھڑا ہوا پایا تھا۔ لیکن جیسے ہی اس نے زمین کو چھوا تو وہ سنگلاخ پتھر کی طرح صاف اور چکیلی لگی۔ اس لئے اسے مطلوبہ چٹکی میسر نہ آسکی۔

''یہ جل منڈل کی پراسرار دھرتی ہے۔'' جل کماری کی زہریلی آواز سیاہ بھونروں کی وحشیانہ بھن بھناہٹ میں گونجی۔ ''سون ہاٹ کے سنسان ویرانوں میں تو نے شیوناگ کا راج دیکھا تھا...... میں جو چاہتی ہوں۔ وہی ہوتا ہے...... مورکھ......! اب بھی ایک موقع ہے...... سنہرا موقع...... تو میری آغوش میں آجا۔''

''میں تجھ پر اور تیرے بدن اور تیری آغوش پر تھوکتا ہوں کتیا......!'' آکاش نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

''تو مجھے پھر ذلیل کررہا ہے...... میرے حسن کی توہین کررہا ہے؟''

جل کماری نے غضب ناک ہوکے کوئی منتر پڑھ کے ان سیاہ بھونروں پر پھونک ماری۔

وہ خوف ناک سیاہ بھونرے آکاش پر ٹوٹ پڑنے کے لئے کوندا بن کے لپکے۔ لیکن اس کے بدن سے محض چند انچ کے فاصلے پر ہی ہجوم در ہجوم چکرانے لگے۔ ان سیاہ بھونروں کو دیکھ کے جو بہت بڑے بڑے تھے۔ ان کی جسامت چمگادڑوں کے برابر تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی اتنے بڑے سیاہ بھونے نہیں دیکھے تھے۔ ان کا جم غفیر تنی چادر بن گیا تھا۔ اسے ایک عجیب سی وحشت ہونے لگی تھی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ فضا میں لہرا کے انہیں بھگانے کی کوشش کی لیکن وہ اڑتے ہی رہے۔ بھاگنا چاہئے تھا۔ لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی حملہ نہیں کیا۔ وہ قدرے دور رہے تھے۔

''میں جانتی ہوں کہ منکے کے کارن یہ تیرے شریر کو نوچ نہ سکیں گے...... لیکن یہ بھونرے گھنٹوں کیا دنوں تک بھی اس طرح تجھ پر حملہ آور ہوتے رہیں گے...... تو کب تک ان سے بچتا رہے گا؟'' وہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔

جل کماری اس کی نظروں سے اوجھل سی ہوگئی تھی۔ کیوں کہ وہ اس کے حسن کی کرشمہ سازیوں کے جال میں پھنسا نہیں تھا۔ اسے کتیا کہہ کے اسے ذلیل کیا اور اس کی اہانت کی تھی۔ اس نے اپنا جادو خوب چلایا تھا تاکہ آکاش پھر سے اس کے ہاتھوں کھلونا بن جائے اور سنگیت کو سسک سسک کے مرنے دے۔

وہ جل کماری کی آواز کی سمت کا اندازہ کرکے اس کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ سنگیت کا بے حس وحرکت بدن اس کی گود میں جھول رہا تھا۔ بھونروں کا غول اس کے ساتھ ساتھ ہی بڑھنے لگا تھا۔

''تیری ہوشیاری...... تیری چالاکی...... اور شاطرانہ چال تیرے کسی کام کی نہیں...... میں تجھے پاگل کتا کرکے رہوں گی......'' اس مرتبہ جل کماری نے اپنی آواز کسی اور سمت سے کہی تھی۔

''سن...... حسین چڑیل......! تو اپنی اوقات میں رہ...... تو یہ بات کیوں بھول رہی ہے کہ میں نے تجھے ہر طرح سے پامال کیا اور تجھے ذلیل وخوار کرکے تیری عزت، وقار اور حاکمیت رہنے نہیں دی...... تیری اوقات کیا رہی......؟ ایک راج کماری ہوتے ہوئے بھی تو ایک طوائف سے بھی بدتر رہی۔''

اس نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ ایک عجیب اور سنسنی خیز قسم کا واقعہ رونما ہوا...... اس کی توقع کے برعکس بھونروں کے غول بھن بھناتے ہوئے اس سے خاصی دور آپ ہی آپ چلے گئے۔ جسے وہ اس اچانک اور غیر متوقع واقعہ سے حیرت زدہ رہ گیا...... وہ سوچ ہی رہا تھا کہ عقب سے کسی نے اس پر حملہ کردیا۔

حملہ آور کوئی عورت تھی۔ وہ اس حملہ سے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور بے ہوش سنگیت کو سنبھال نہ سکا۔

یہ حملہ آور کوئی اور عورت نہ تھی...... جل کماری تھی جس نے غائبانہ انداز سے حملہ کیا تھا تاکہ جسمانی زور آزمائی سے وہ سنگیت کو اس کے ہاتھوں کی گرفت سے نکال لے۔

وہ اس بات سے جل بھن رہی تھی کہ سنگیت اس کی گود میں ہے اور وہ اسے سہارا دیئے ہوئے ہے...... وہ سنگیت کی جگہ لینا چاہتی تھی۔ لیکن اس نے جب محسوس کیا کہ اب آکاش کے تیور بالکل بدل گئے اور وہ اس سے متنفر سا ہوگیا

ہے۔ وہ سنگیت کی جگہ نہیں لے سکتی۔
دوسرے لمحے جل کماری کی زبان سے عجیب وغریب اور ناقابل فہم کلمات نکلنے لگے تھے۔ اس کے لہجے میں بلا کی تیزی وتندی ظاہر ہو رہی تھی...... آکاش اس بات کی کوشش اور جدوجہد کرنے لگا تھا کہ سنگیت اس کی دسترس سے نکل نہ پائے...... ورنہ پھر وہ ہاتھ ملتا رہ جائے گا۔ اور جل کماری اسے ناقابل برداشت ایذائیں دے گی۔
آکاش نے مایوسی کی حالت میں سوچا کہ اسے حوصلہ ہارنے کی ضرورت نہیں بلکہ فیصلہ کن قدم اٹھانا چاہئے۔ پھر اسے چند لمحوں کے بعد مہلت مل گئی۔ اس نے اپنی پوری قوت سے اپنا گھٹنا جل کماری کے ناف کے نیچے دے مارا۔ جل کماری کی چیخ بڑی دل خراش تھی اور وہ کسی گیند کی طرح اچھل کے زمین پر جا گری اور اپنا پیٹ پکڑ کے کسی زخمی پرندے کی مانند تڑپنے لگی۔ اس کا چہرہ اذیت سے سیاہ پڑتا چلا گیا۔ وہ چند ساعتوں تک جل کماری کی یہ کیفیت دیکھتا رہا تھا۔ لیکن اتنی دیر میں پھر بھونروں کے غول نے دوبارہ گھیر لیا اور فضا سنگیت کی پے در پے چیخوں سے لرز اٹھی۔
معاً اسے مظلوم لڑکی کا خیال آیا۔ جل کماری پر تشدد آمیز وار کرتے ہوئے سنگیت اس کے ہاتھوں سے پھسل کے زمین پر گر گئی تھی اور پھر سیاہ بھونروں نے سنگیت کے کومل بے پردہ بدن کو نشانہ بنا لیا تھا۔
دفعتاً آکاش کی نگاہ قدموں پر پڑی۔ اب وہ سخت زمین مٹی آلود تھی۔ اس کی رنگت سرخی مائل مٹی میں بدل چکی تھی۔ اس نے بغیر کسی تاخیر کے جھک کے زمین سے مٹی اٹھائی اور اسے منکہ سے لگا کے فضا میں اچھال دی۔
مٹی کی چٹکی بظاہر حقیر سی تھی اراس کی مقدار آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ آکاش کا پھونکنا ہی بھونروں میں ایک ایسا شور بلند ہوا جیسے کوئی بم پھٹا ہو۔ اس گونج سے بھونرے حواس باختہ سے ہو کے منتشر ہونے لگے۔ جب تمام بھونرے بکھر کے مختلف سمتوں میں پرواز کرنے لگے تو عقاب جیسے سرخ رنگ کے بڑے بڑے اور خوف ناک پرندے جن کے پنجے بہت بڑے تھے۔ سینکڑوں کی تعداد میں مختلف سمتوں سے نمودار ہو کے ان پر حملہ آور ہو گئے۔
انہیں نگلنے لگے جیسے بڑی مچھلی چھوٹی مچھلیوں کو نگل جاتی ہے۔ ان ہزاروں سیاہ بھونروں سے ایسا لگتا تھا کہ سیاہ دیواریں کھڑی ہوں...... سیاہ بادلوں نے حصار میں لیا ہوا ہو اب فضا ان سے صاف ہو چکی تھی۔
آکاش نے سنگیت کی طرف دیکھا جو بے حال سی زمین پر بے ترتیبی سے پڑی بری طرح چیخ رہی تھی۔ ابھی بھی کچھ بھونرے اس کے مرمریں بدن سے جونک کی طرح چمٹے ہوئے تھے اور اسے بے تابانہ اٹھا کے گود میں لے لیا۔ اس کے بدن سے سنگیت کا جسم مس کرتے ہی وہ بھونرے اڑ گئے۔ ان کے اڑتے ہی ان پر سرخ پرندے جھپٹ پڑے۔
اس وقت سنگیت کی حالت ایسی ابتر تھی کہ اس کا سارا چہرہ اور بدن سوج چکا تھا۔ وہ بے جان آنکھیں موندے تھوڑی دیر تک کراہتی رہی۔ وہ اسے گود میں لئے زمین پر بیٹھا اور بالوں کو سہلاتا اور زخموں میں رستے لہو کو صاف کرتا رہا۔ پھر وہ زخموں کے ٹیسوں کی تاب نہ لا کے بے ہوش ہو گئی۔
پھر اس نے گردوپیش کا جائزہ لیا تو جل کماری کو درد کی شدت سے تڑپتے پایا۔
آکاش کا جل کماری پر وار ناقابل برداشت تھا۔ اس کے پاس آٹھ دس موٹے موٹے اور بدوضع جل ناگ بے چینی سے ادھر ادھر جمع تھے...... اب آسمان پر ایک بھی بھونرا دکھائی نہ دیتا تھا۔ سرخ پرندوں کے غول انہیں چٹ کر کے ایک سمت تیزی سے اس طرح جا رہی تھیں جیسے بھونروں کے پوجا پاٹ سے ان کا پیٹ نہیں بھرا ہوا۔
آکاش کو جل کماری کی نہ تو کوئی پروا تھی اور نہ فکر......؟ اس وقت آکاش کو اس بات کا احساس نہیں تھا کہ ایک انسان کے ہاتھوں جل کماری کی ہلاکت کے نتائج کس قدر ہول ناک اور لرزہ خیز ثابت ہو سکتے ہیں؟
اسے سنگیت کی فکر اور پریشانی تھی۔ وہ قیمتی اور پراسرار منکے کو سنگیت گلابی اور ورم آلود بدن پر آہستہ آہستہ پھیرنے لگا۔ اس کے بدن کے جس حصے سے وہ منکہ مس

ہوتا تھا اس کی حالت حیرت انگیز طریقے سے معمول پر آنے لگی تھی۔ وہ سنگیت کے متاثرہ بدن کے حصوں کا جائزہ لینے لگا۔

سنگیت کے دانت سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ آکاش کی بڑی محنت کے بعد اس کے دانتوں میں جنبش پیدا ہوئی اور جب اس میں اتنا خلا ہوگیا کہ وہ منکہ اس کے منہ میں ڈال سکے۔ پھر اس نے ڈوری سے منکہ اتارا۔ پھر بڑی احتیاط سے منکہ سنگیت کے منہ میں رکھ دیا۔ جیسے ہی منکہ سنگیت کے منہ میں گیا اور اسے چوسا...... چوستے ہی وہ ایک جھٹکے سے ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی اور متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ آکاش نے اسے منع کیا تھا لیکن وہ تیزی سے اٹھ گئی۔ جیسے ہی وہ اٹھی اس کے حلق میں پھندا سا لگ گیا۔ آکاش کو اپنی نبضیں ڈوبنے کا احساس ہونے لگا۔ منکہ بوکھلاہٹ کے باعث سنگیت کے گلے سے پیٹ میں اتر گیا۔ اور وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ تھامے بے اختیار کھانسے جارہی تھی۔

آکاش نے اسے جھکا کے اس کے پشت پر زور زور سے تھپکیاں دیں...... سنگیت نے خود اپنے حلق میں اپنی انگلیاں ڈالیں تاکہ کسی نہ کسی طرح اسے قے ہوجائے اور منکہ باہر آجائے۔ لیکن اس کی ہر کوشش بے سود رہی۔

منکہ باہر نکالنے کی ان کوششوں کے ساتھ ساتھ آکاش کی متوحش نگاہیں بار بار زخمی پرندے کی طرح تڑپتی جل کماری کی طرف اٹھ جاتی تھیں کہ کہیں اسے اس غیر متوقع اور اچانک اندوہناک حادثے کا علم تو نہیں ہوگیا ہوگا؟

سنگیت ہر ممکن کوشش کررہی تھی کہ کسی نہ کسی طرح منکہ باہر نکل آئے پھر اس نے ناکام ہو کے ہتھیار ڈال دیئے اور آکاش کی طرف بے بسی سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے اور چہرہ متغیر سا ہوگیا۔

"سنو...... میری جان! اپنی زبان بند رکھنا...... جل منڈل میں کسی کو بھی اس واقعہ کا علم ہرگز ہرگز نہ ہونے دینا...... جل کماری تم سے زیادہ میری بدترین دشمن ہے...... اگر اس کے علم میں یہ بات آگئی کہ میں منکہ سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں اور اس سے محروم ہوگیا ہوں؟ تو جانتی ہو کیا ہوگا......؟ وہ مجھے زندہ زمین میں گاڑ دے گی...... اور مجھ پر خوف ناک بلاؤں کی یورش کرا کے وہ تشدد اور سزائیں اور ایذائیں دے گی کہ میں مرنا چاہوں بھی تو مر نہ سکوں گا......" اس نے سنگیت کو اپنے بازوؤں میں لے کر اس طرح سے سرگوشی کی کہ جل کماری کی نظر پڑے تو وہ سمجھے کہ بوسہ لے رہا ہے۔"

لیکن اس وقت جل کماری نے یہ جذباتی سا منظر نہیں دیکھا۔ وہ اپنی تکلیف میں مبتلا تھی۔ سنگیت نے اثبات میں سر ہلایا۔

"لیکن تم ہر سمے مجھ سے قریب رہنا...... میں ہر بات بھولی ہوئی ہوں...... میں بتا نہیں سکتی یہ حرکت نادانستگی میں ہوئی جس نے میرے سینے میں خلش کا خنجر اتار دیا ہے...... میرے من میں نیزوں کی سی چبھن ہورہی ہے۔ لیکن تم اس بات کا خیال رکھنا کہ کسی وجہ سے کوئی فقرہ، جملہ یا بولی میری زبان سے نکل جائے......؟" وہ روہانسی سی ہوگئی۔

"ہاں...... ہاں...... میں تمہارے پاس ہی رہوں گا...... تم کسی بات کی چنتا نہ کرو۔" آکاش نے اس کا شانہ تھپک کے دلاسا دیا۔

اس وقت پہلی بار آکاش نے خوف و دہشت کا احساس کیا...... اس کا دل اندر سے ریزہ ریزہ ہورہا تھا۔ بدن پر ہلکی سی کپکپی چھائی جارہی تھی...... سمندر میں میلوں نیچے اس پراسرار دنیا میں اپنے جانید شمنوں کے پنجوں میں جیسے جکڑا ہوا تھا۔ اپنی واحد قوت سے اپنی نادان اور جلد بازی کے سبب ہاتھ دھو بیٹھا تھا کہ...... اگر جل کماری کو اس کی اس محرومی کا شبہ بھی ہوجاتا تو اسی وقت میری زندگی کی ساعتیں مختصر ہوجاتیں...... ان بدلے ہوئے سنسنی خیز حالات میں انجیل کماری کو کسی شبہ اور شکوک کا موقع دیئے بغیر مصالحانہ رویہ اختیار کرنا تھا...... ریاکاری اور منافقت سے کام لینا تھا...... وقت پڑنے پر گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا تھا۔ اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔

اس بات کا اندیشہ تھا کہ کسی بھی مرحلے پر ٹکراؤ ہوجاتا...... اور وہ بھونرول جیسا کوئی اور وار اس پر کرسکتی تھی

جس سے اس کا بچنا اور نا ممکن تھا۔ وقت کا جو تقاضا تھا اسے اس پر عمل کرنا تھا۔

آکاش نے سرعت سے بہت سارے پہلوؤں پر سوچ و بچار کی اور سنگیت کا ہاتھ تھام کے جل کماری کی طرف بڑھا۔

جل کماری ابھی تک زمین پر پڑی کانپ رہی تھی۔ اس کی کیفیت تڑپنے کی سی تھی۔ اس کے گھٹنے کی ضرب جل کماری کے سب سے نازک حصے پر پڑی تھی اور وہ ناف سے بہتے خون سے آلود ہو رہی تھی۔

وہ جل کماری کے گرد بے چینی سے کلبلاتے اور رینگتے ہوئے جل ناگوں کو ایک طرف ہٹا کے اس کے پاس زمین پر جا بیٹھا۔

وہ آنکھیں موندے کراہ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر جو اذیت تھی اس نے جل کماری کے چہرے پر زردی بھر دی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ تکلیف کی شدت پر قابو نہیں پا رہی ہے۔

''جل کماری......! میری پیاری جل کماری......! جان تمنا!'' اس نے اپنا ہاتھ اس کے سرد رخسار پر رکھ کے محبت بھرے لہجے میں پکارا۔

اس سے جل کماری کو ایسا لگا کہ جیسے وہ کوئی سندر سپنا دیکھ رہی ہو۔ اسے اپنی سماعت پر فتور کا احساس ہوا۔ لیکن یہ سندر سپنا تھا نہ ہی سماعت کا فتور...... آکاش کے ہاتھ کا لمس وہ محسوس کر رہی تھی۔ اس نے چونک کے آنکھیں کھول دیں جن کی گہرائیوں میں کرب والم کے بادل تھے جو افق پر چھائے ہوئے تھے۔ آکاش کو پاس دیکھ کے اس کے چہرے پر حیرت کی سرخی ابھری اور گہری ہوتی گئی

''جل کماری......! میری پیاری جل کماری......! تم زخمی ہو گئیں۔'' آکاش نے اپنے لہجے میں سارے جہان کی مٹھاس بھرتے ہوئے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر کے اس کی پیشانی چوم لی۔

''ہٹ جاؤ...... چلے جاؤ......'' جل کماری نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''تم بڑے سنگ دل ہو...... ظالم اور سفاک ہو...... جل منڈل کی دھرتی زیادہ دن تمہارا بوجھ سہہ نہ سکے گی...... تم نے میری کوکھ اجاڑ دی...... اب میں صدیوں کے جیون میں کبھی اپنی کوکھ سے کسی جل ناگ کو جنم نہ دے سکوں گی...... مجھے سدا کے لئے تم نے بانجھ کر دیا۔''

''مجھے شما کر دو جل کماری......! میں اپنی اس بے رحمی پر بڑا پشیمان ہوں۔ دراصل غصے کی حالت میں...... میں اپنے آپے میں نہیں رہ سکا تھا......'' اس کے ہونٹوں نے جل کماری کے لبوں کی مٹھاس بھرلی۔ ''میں نے جب تمہیں دیکھا تب سے تمہارا دیوانہ رہا ہوں...... تو نے میری محبت اور ناقابل فراموش لمحات گھڑیوں اور دنوں، ہفتوں کی لاج نہیں رکھی...... میں نے تمہیں ہر طرح سے خوش کیا اور اپنی بے پناہ محبت کا یقین دلایا۔ تمہاری ہر بات مانی...... اس کے باوجود تم نے مجھے بلاوجہ بھینٹ چڑھانے کی کوشش کی...... اس کے باوجود بھی تمہیں اپنی محبت کا یقین دلانے کی کوشش کی اور اب اور اس وقت بھی یہی کہتا ہوں کہ تم سے بے پناہ محبت ہے۔''

''تم...... تم نے اس حرام زادی کے کارن میری کوکھ پر لات ماری ہے؟'' اس نے سنگیت کی طرف نفرت بھری نظروں سے دیکھا۔

جل کماری کے بدلتے لہجے نے اس کا دل خوش کر دیا۔ اس کا نفسیاتی حربہ اثر کر رہا تھا۔

''دیکھو میری جان...... جل کماری......!'' اس نے بڑی محبت اور سنجیدگی سے مخاطب کیا۔ ''تم اس بات سے انکار نہیں کرو گی کہ سنگیت انسان ہے...... مجھے تم سے محبت ہی نہیں بلکہ عشق ہے...... میں تمہارے عشق کی بڑی قدر کرتا ہوں...... میں سنگیت کو اس لئے اہمیت دے رہا ہوں کہ اس کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں...... میں تمہاری محبت کی خاطر احسان فراموش نہیں بن سکتا......؟ اگر تم مجھے اس بات کا یقین دلا دو کہ اس لڑکی کو جل منڈل میں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا...... تو میری دشمنی پریم اور محبت میں بدل سکتی ہے۔'' جل کماری نے اس کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ جیسے اس کے الفاظ اس کی سچائی کا اندازہ کر رہی ہو۔

''تم نے میرا جیون نشٹ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی......'' وہ گہرے سکوت کی دیوار گراتے ہوئے

بولی۔ ''ابھی میرا جیون باقی ہے..... مگر میں تمہارے ہاتھ مرجاتی تو.....؟''

''میری جان زندگی.....! تم اسے بھول جاؤ..... رات گئی بات گئی۔'' آکاش نے اس کا ہاتھ جذباتی انداز سے چوم کے کہا۔ ''میں نے تمہیں محض باز رکھنے کے لئے لات ماری جونشانہ چوک کرگئی اور زیادہ زور سے نہیں..... میری اور سنگیت کی موت سے زیادہ کچھ بھی نہ ہوتا..... تم میری محبت..... میرا عشق..... اور میرا اسندر سپنا..... میں تمہاری محبت کیسے فراموش کرسکتا ہوں۔ تم نے جس فیاضی سے اور ہر طرح سے مجھے اور میں نے خوش کیا تمہاری خواب گاہ کا ذرہ ذرہ اس کا گواہ ہے..... تم میری جان!..... میرا دل ہوتو سنگیت میری محسن ہے..... میں صرف ایک کی خاطر دوسرے کو چھوڑ نہیں سکتا.....''

آکاش نے ایک طرح سے اس کی تعریف میں شاعری کی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ عورت کی سب سے بڑی کمزوری اس کی تعریف ہے۔ اس کی شاعرانہ باتوں نے اسے متاثر کیا تو وہ جذباتی طور پر متاثر ہوگئی۔ لیکن پھر بھی کہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

''میں کیسے اس چوٹ کو چھوڑ دوں.....؟ کیا تم نے مجھے زندہ درگور نہیں کردیا ہے.....؟''

''دیکھو..... میں نے تو پہل نہیں کی..... تم جو غصے اور جذباتی کیفیت میں میرے منہ کو آئی تھیں۔ اس میں میرا کیا دوش؟''

آکاس کے جواب نے اسے لاجواب کردیا۔ وہ چند لمحوں تک خاموش رہی۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔

''اچھا..... میں تمہارے اس کارن سے شما کرتی ہوں..... میرے علم میں یہ بات ہے کہ یہ اپنی تمام شکتیوں سے محروم ہوچکی ہے اور تمہارے سہارے اس کا جیون باقی ہے..... جل منڈل کی اہمیت ہے کہ اسے توڑنے والوں کا فیصلہ میری ذات کرتی ہے..... اور میں تمہیں وچن دیتی ہوں کہ اسے زندہ سلامت اس کی دنیا میں لوٹادوں گی۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' آکاش نے دل پر جبر کرکے اعتراف کیا۔ ''تم کتنی پیاری ہو جل کماری!''

اب انحصار سنگیت پر تھا۔ کیوں کہ منکہ اب سنگیت کے پیٹ میں پہنچ چکا تھا اور اگر اسے جل منڈل سے نکال کے بیرونی دنیا میں بھیج دیا جاتا تو وہ دیار غیر میں بالکل ہی بے یارو مددگار ہوکے رہ جاتا۔

''تم جہاں کہوگے میں سنگیت کو وہیں پہنچادوں گی۔'' جل کماری نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ وہ اب اس کی باتوں سے فریب کھا چکی تھی۔

''آج کل امرتارانی ہے کہاں.....؟'' اس نے قدرے تذبذب سے موضوع بدلا لیکن دل میں ڈر بھی رہا تھا۔

''کیوں.....؟ اب تمہیں اس سے کیا سروکار.....؟'' جل کماری چونک پڑی اور اس کی آنکھوں میں شک کی گھٹا چھاگئی۔

''عورت بڑی شکی مزاج اور حاسد ہوتی ہے۔'' آکاش نے خود کو سنبھال کے کہا اور ہنس دیا۔ ''میری جان اس لئے کہ سنگیت کو میں وہاں بھیجنا چاہتا ہوں۔ اس لئے کہیں تم ہم دونوں پر شک نہ کرتی رہو۔''

''اوہ.....'' جل کماری مطمئن ہوکے اس کے سہارے زمین پر بیٹھ گئی۔ پھر بولی۔ ''امرتارانی ابھی تک نیلے ساگروں کے بیچ کالی بھومی کے جزیرے پر تمہاری راہ تک رہی ہے۔ اسے پورا بسواس ہے کہ اگن دیوتا کی بھینٹ سے بچ کے تم سیدھے کالی بھومی پہنچو گے..... وہ پل پل تمہارا سپنا دیکھ رہی ہے۔''

''خیر..... میری بلا سے..... مجھے اس سے کیا لینا ہے۔'' آکاس نے بے پرواہی سے کہا۔ ''لیکن یہ تو بتاؤ کہ سنگیت کالی بھومی تک کیسے اور کیوں کر پہنچے گی.....؟ کیا ذریعہ ہوگا؟''

''ساگر میں تیر کے جائے گی.....''

''یوں تو وہ مرجائے گی.....؟'' آکاش نے کہا۔

''کیوں.....؟'' جل کماری نے سنگیت کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔

اس لئے کہ اس کی شکتی نشٹ ہوچکی ہے اور وہ غضب ناک موجوں اور پانی کا دباؤ نہ جھیل سکے گی۔'' آکاش بولا۔

''تم کسی بات کی چنتا نہ کرو اور نہ پریشان ہو.....''

جل کماری نے شاہانہ بے پروائی سے دلاسا دینے کے انداز میں کہا۔
''میرا خون زخم سے کافی بہہ گیا ہے۔ جس سے اتنی کمزوری اور نقاہت ہوگئی ہے کہ میں اپنے قدموں پر نہیں چل سکتی۔'' وہ بولی۔ ''تم دور کھڑے ہو جاؤ تاکہ میرے یہ سیوک مجھے راج بھون پہنچا دیں۔''
آکاش جب اس سے قدرے دور کھڑا ہو گیا تو جل کماری نے اپنے قریب رینگتے ہوئے ناگوں کی طرف اشارہ کیا۔
جل کماری کا اشارہ پاتے ہی وہ سارے جل ناگ پھرتی سے اس کی طرف بڑھے اور بڑی مہارت کے ساتھ اسے اپنے جسموں پر لے لیا اور تیزی کے ساتھ رینگتے ہوئے آگے آگے چلنے لگے۔ پھر جل کماری نے انہیں ہمراہ آنے کا اشارہ کیا تو وہ دونوں بھی چل پڑے۔
سیوک تیز رفتاری سے جل کماری کو لے جانے کے باعث ان کے اور اس کے درمیان خاصا فاصلہ پیدا ہو گیا۔ آکاش نے دیکھا کہ جل کماری چوں کہ ان کی گفتگو سن نہیں سکتی۔ یوں بھی وہ نڈھال سی ہو رہی ہے تو اس نے فاصلہ اور بڑھنے دیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔
''سنگیت جانی......! منکہ تمہارے پیٹ میں اترتے ہی اس کے اثرات ظاہر ہونے لگے ہیں۔'' پھر اس نے توقف کر کے اپنے اندیشے کا اظہار کر ہی دیا۔
''ہاں......'' سنگیت نے اسے پرتشویش نگاہوں سے دیکھا۔ ''اس منکہ کے باعث ہی جل کماری کے پاس جو جل ناگ مجھے نرغے میں لئے ہوئے تھے اب وہ مجھ سے قدرے دور دور ہوتے جا رہے ہیں۔''
''اب تمہاری احتیاط اور ہوشیاری ہی میں ہماری نجات پوشیدہ ہے......'' آکاش نے جذباتی انداز سے اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈالا تو سنگیت نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''اگر اس کمینی کو ذرا سا شک ہو گیا تو وہ ہم دونوں کو بڑی سفاکی اور درندگی سے موت کے گھاٹ اتار دے گی۔ اس لئے اس بات کی کوشش کرنا کہ جل منڈل والوں کے قریب نہ رہو۔ انہیں تم پر شبہ نہیں ہونا چاہئے۔''

''میں تم سے تمہارے دل سے قریب ہی رہوں گی۔''
وہ اس افتاد سے سراسیمہ اور حد درجہ خائف سی نظر آنے لگی تھی۔ ''جل کماری نے مجھے وچن دیا ہے کہ وہ تمہیں جل بھومی پہنچا دے گی......'' آکاش نے سرگوشی میں آہستگی سے کہا۔ ''امرتا رانی کے پاس پہنچ کے اسے ساری بپتا سنا دینا۔ میرا دل تو نہیں چاہتا ہے کہ میں تمہیں پل بھر کے لئے بھی اپنے سے جدا کر دوں۔ کیوں کہ تمہاری موجودگی سے میرے دل کو بڑی تقویت رہے گی۔ تمہارے جانے کے بعد جب تک امرتا رانی جل منڈی میں آئے گی...... میرے سر پر ہر وقت خونی تلوار لٹکتی رہے گی۔''
''تم اس قدر فکر مند اور پریشان نہ ہو......؟'' اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''میں تو اب تمہاری کرپا سے زندہ ہوں۔ میرا جیون تو تم ہو...... تم چاہو تو میرا پیٹ چیر کے منکہ نکال سکتے ہو۔ میں تمہارے لئے اس سے بھی بڑی قربانی دے سکتی ہوں۔''
''نہیں......'' آکاش نے اس کے ایثار پر دنگ رہ گیا اور اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ جذباتی ہو کے جل کماری کی پروا نہیں جو پلٹ کے دیکھے بغیر چلی جا رہی تھی۔ وہ سنگیت کے چہرے پر جھک گیا۔ اس کا دل بھر آیا تھا۔ پھر چند ثانیوں کے بعد آکاش نے کہا۔ ''کیا تم مجھے خود غرض سمجھتی ہو میں ایسے دس منکہ تم پر نچھاور کر سکتا ہوں۔ میرے لئے تمہاری زندگی اس منکہ سے کہیں زیادہ قیمتی اور اہم ہے......''
''دیکھو...... آکاش جانی......! میں تو اس بھرے سنسار میں اکیلی ہوں...... میرے پیچھے کوئی رونے والا بھی تو نہیں...... میرا جیون تمہارے کام آ جائے تو میری آتما پرلوک میں سکھی رہے گی...... تمہیں اپنی پتنی نیلم کے لئے زندہ رہنا ہے اور وہ غریب بھی تم سے ملنے کی آس لئے ناگ بھون کی کٹھنائیاں جھیل رہی ہے...... میری جان تمہارے کسی کام آ گئی تو میں کتنی خوش ہوں گی بتا نہیں سکتی۔''
اسے اندازہ نہ تھا کہ سنگیت اتنی بلند اور اس قدر عظیم ہے......؟ عورت ایثار کا پیکر ہوتی ہے...... اس میں کیسا عظیم پاپوتر اور گہرا جذبہ ہے...... وہ سوچے بغیر نہ رہ سکا......
''آکاش......! تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ...... تم

نیلم کی محبت ہو......‘‘ سنگیت نے اسے یاد دلایا۔
’’نیلم......؟‘‘ آکاش کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز میں بڑا کرب تھا...... نیلم ایک وفا شعار جیون ساتھی تھی۔ وہ اس کی زندگی کا محور اور اس کی بے پناہ مسرتوں کا سرچشمہ اور اس کی آرزوؤں کی زندہ تعبیر...... اس کا نام زبان اور دل میں آتے ہی سینہ کٹ گیا اور اپنا لہو وہ آپ پی گیا۔
’’میرے آکاش پیارے......!‘‘ ان کے درمیان سکوت کی جو دیوار کھڑی ہوگئی تھی اور سنگیت کی دل گرفتہ آواز نے توڑ دی۔
’’آدمی کیا ہوتا ہے......؟ مٹی کا بنا ہوا جو ایک دن اسے چتا کی راکھ میں مل کے مٹی کا حصہ ہی بننا ہوتا ہے...... میں یہ سمجھ لوں کہ میری زندگی اب تمام ہورہی ہے...... ہر انسان کی زندگی چند روزہ ہوتی ہے اور اسے ایک دن پرلوک میں جانا ہوتا ہے...... تمہاری زندگی اور تمہارے پریم کے لئے اپنی جان نذر کرکے مجھے کتنی خوشی ہوگی تم اندازہ نہیں کرسکتے......؟‘‘
اس نے بڑے غور سے سنگیت کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور اس کے مرمریں ہاتھوں کو چوم لیا۔ اس کی باتوں میں بڑی گہرائی تھی۔ وہ ایک فلسفی ذہن رکھتی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے اس کا یہ خیال تھا کہ سنگیت صرف بستر کی بہترین ساتھی ہے۔ بھگوان نے اسے جتنا خوب صورت بنایا۔ کشش اور گداز اور پرشباب اور پرشباب بدن دیا تھا اسے اس سے کہیں ذہین بنایا ہوا تھا اور اس کے وجود میں کوٹ کوٹ کے جذبے بھر دیئے تھے...... جنگل میں جنم لینے اور پلنے والی ہستی تھی یہ......
آکاش نے پل بھر میں جو سوچا تھا اس پر وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔ ایک اہم فیصلہ کرلیا تھا۔ اب اسے نیلم تک رسائی اور بازیابی تک اسے اپنے جذبات کے بجائے عقل اور شعور سے کام لینا تھا۔
تھوڑی دیر کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ دونوں جل کماری کے قافلے کے ہمراہ راج بھون جا پہنچے...... راستے میں پڑنے والے ناگ آشرموں پر بنے موکھلوں

اچھی بات

ایک آدمی نے ٹوٹتے ہوئے پھول سے پوچھا کہ جب تمہیں توڑا گیا تو دکھ ہوا تھا۔ پھول نے بہت خوب صورت جواب دیا۔ ’’جب میں نے توڑنے والے کی خوشی دیکھی تو اپنا دکھ بھول گیا......؟

(سرور۔ بھریا روڈ)

میں سے سینکڑوں بدوضع جل ناگ سر نکالے جل کماری کی حالت زار گھور گھور کر ایسے دیکھ رہے تھے جیسے انہیں یقین نہیں آرہا ہو۔
جل کماری کے حکم پر اسے اور سنگیت کو ایک پرتکلف اور آراستہ کمرے میں چھوڑ کے جل کماری لنگڑاتی ہوئی کمرے سے نکل کے کہیں اور چلی گئی۔
میز پر شیشے کے ایک جگ میں گلابی رنگت کا ایک مشروب اور تین گلاس رکھے تھے۔ یہ کوئی جام سا لگا۔ سنگیت نے دو گلاس میں جام لبالب بھرا اور ایک جام اس کی طرف بڑھایا۔
’’یہ جام جل منڈل کے ایک رس بھرے پھل کا ہے۔‘‘ سنگیت بولی۔ ’’اسے جی بھر کے پی لو۔ اس رس میں بڑی توانائی ہے اور کئی دنوں تک بھوک محسوس نہ ہوگی۔ تمہارے پیٹ میں جو زہریلے سانپ ہیں وہ نشے میں ڈوب جائیں گے۔ تمہیں تنگ نہیں کریں گے۔ اتفاق سے اس گلابی شراب کے بارے میں میں جانتی ہوں۔‘‘
ان دونوں نے دو دو جام پی کے بڑی توانائی محسوس کی اور بھوک پیاس ختم ہوگئی۔ سنگیت نے خالی گلاس ایک طرف رکھ دیئے...... آکاش نے اپنے جسم میں بڑی توانائی محسوس کی تھی۔ وہ اس کی ضرورت محسوس کررہا تھا۔
اس خواب گاہ کا سا ماحول بڑا سحر انگیز اور خواب ناک اور ہیجان خیز تھا۔ بہکا دینے والا تھا۔
لیکن وہ جل کماری کی عدم موجودگی کے باعث

خاموشی اور مہر بلب بیٹھے رہے۔ گو سنگیت بہت زیادہ پریشان اور متوحش دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھوں میں خوف کے سائے لرزاں تھے۔ آکاش کا دل کررہا تھا کہ وہ سنگیت کو سینے میں جذب کرکے اسے دلاسا دے اور محبت بھری باتیں کرکے حوصلہ بڑھائے۔ لیکن وہ ایسا کرنے سے اس لئے قاصر تھا اور اندیشہ تھا کہ جل کماری جانے کس لمحے آجائے اور پھر اس پر شدید اعصابی ہیجان چھایا ہوا تھا...... اس کی خود اعتمادی کی بنیادیں لرز کر رہ گئی تھیں اور آنے والے فیصلہ کن لحات کے تصور ہی سے اس کا دوران خون تیز ہوا جارہا تھا۔ اس نے کئی بار چور نظروں سے سنگیت کی جانب دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں دونوں ہی گھبرا کے ادھر ادھر دیکھنے لگے تھے کہ کہیں وہ بہک نہ جائیں۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کے جل کماری کا پارہ چڑھ جائے۔

انہیں جل کماری کا زیادہ دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد ہی واپس آگئی تھی۔

وہ بڑی ہشاش بشاش دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بغیر کسی سہارے کے اپنے قدموں پر چلتی ہوئی آئی تھی۔ اس پر ایک عجیب عجیب سی سرشاری طاری تھی۔ اس کی مست خرامی سے ایسا لگتا تھا کہ اس کی کھوئی ہوئی توانائی بحال ہوچکی ہے۔ اس سے اس کی یہ حالت دیکھ کے یہ کہنا دشوار تھا کہ تھوڑی دیر قبل اپنے قدموں پر کھڑی ہونے کے قابل بھی نہیں تھی۔

"سنگیت کو میں آج اور ابھی اسی سے کالی بھومی بھجوا رہی ہوں۔"

جل کماری کے یہ الفاظ اس کے ذہن پر کسی وزنی ہتھوڑے کی طرح بجنے لگے۔ اس کے ذہن میں فوراً یہ خیال کسی سفاکی کی طرح آیا کہ کیوں نہ وہ اس لمحے سنگیت کو فرش پر گرا کر چشم زدن میں اس کا پیٹ چاک کردے۔ ایک آب دار خنجر اس نے دیوار گیر دیکھا تھا جو سجاوٹ کے لئے تھا۔ اس طرح مقدس منکہ دوبارہ اس کی ملکیت بن جائے گا۔ لیکن وہ اپنے اس ظالمانہ فیصلے پر عمل نہ کرسکا۔

جل منڈل تک آنے والی غضب ناک سمندری گپھا کے سنگم پر روانگی کے مرحلے سے قبل اس نے اپنی پنڈلی سے بندھے امرتا رانی کے بالوں کو جلا کے راکھ میں تبدیل کرلیا تھا تاکہ گرو مہاراج کی ہدایت کے مطابق سمندری ریلوں میں بہا سکے۔

جب وہ گپھا کے سنگم کی طرف جانے کے لئے راج بھون سے باہر آئے تو ایک انوکھے واقعے نے جنم لیا۔

جل منڈل میں ہر طرف ایک دبا دبا ہیجان سا آکاش نے محسوس کیا تھا۔

اس دھرتی پر پہلی بار یہ انوکھا واقعہ جنم لے گا اس کے ذہن و گمان میں نہ تھا۔

جل منڈل میں ممنوعہ دنیا کے رسم و رواج سے بغاوت کرکے چوری چھپے اس دھرتی پر گھس آنے والی انسان زادی عبرتناک موت کی سزا دینے کے بجائے بحفاظت سمندروں سے باہر والی دنیا میں بھیجا جارہا تھا۔

راج بھون کے باہر ناگ آشرموں کے اوپر جل منڈل کی سرخی مائل زمین کے اوپر چپے چپے پر ہر طرف بے شمار جل ناگ لہرا رہے تھے...... ان کی مدھم مدھم پھنکاروں کے سبب اس بے حد وسیع و عریض سمندر گپھا میں ہولناک گونج جنم لے رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے دنیا کے تمام سمندروں میں بسنے والے جل ناگ جل منڈل میں جمع ہوئے ہوں۔

وہ آہستہ آہستہ ناگ آشرموں کے اوپر سے ہوتے ہوئے پیچھے چھوڑ آئے۔

جل منڈل کا وسیع نام اب قدرے شادا کی جانب مائل تھا۔ سنگیت حیران و پریشان اور اجنبی نگاہوں سے درودیوار کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ متغیر تھا۔ آنکھیں متوحش تھیں۔

اگر اس وقت جل کماری نہ ہوتی تو آکاش سنگیت کا الوداعی بوسہ لے کر رخصت کرتا۔ سنگیت پریشان اور ہراسان ہونے کے باوجود بھی یہی چاہتی تھی آکاش سے رخصت ہورہی تھی اور اس کا دل خون کے آنسو رورہا تھا۔ وہ بے بسی کی تصویر بنی ہوئی کھڑی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اس گپھا کے اس درے نما دروازے کے حصے میں داخل ہوئے جہاں سمندری پانی کے بہاؤ کی

اذیت ناک چنگھاڑیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس پر نا قابل بیان اضطراب سوار ہوگیا...... اپنی دنیا کی دعوت انگیز تصویر نگاہوں میں لہرائی تو وہ کانپ اٹھا۔ اس رنگین تک پہنچنے کا راستہ اس قدر ہولناک اور جان لیوا تھا کہ کسی ماورائی قوت کی موت کے بگیر اس سے زندہ گزر جانا ناممکن تھا۔

اچانک جل کماری نے اسے خیالوں کے گرداب سے باہر کھینچ لیا۔ وہ بولی۔

''تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہاری سنگیت کو فوراً کالی بھومی کیوں بھیج رہی ہوں......؟'' اس نے پرخیال نظروں سے آکاش کو دیکھا۔ آکاش نے جواب میں نفی کے انداز سے سر ہلایا۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔

''اچھا ہے یہ چلی جائے گی......'' وہ آکاش کے قریب ہو کے اس کے کان کے پاس اپنا منہ لا کے سرگوشی کی۔ ''یہ حرام زادی اس قدر حسین ہے کہ اس کا جسم شعلوں کی طرح دہکتا ہوا سا ہے...... اس کی کشش دیکھو...... اس کی موجودگی میں تم مجھ پر پوری توجہ نہ دے سکو گے...... اس کے دفع ہونے کے بعد تمہارے من میں اس کا خیال نہیں آئے گا۔''

آکاش اس کی بات سن کے بے رغبتی سے مسکرا دیا۔ جل کماری کی نگاہوں میں ابھی سے خمار کی مستی جھانکنے لگی تھی۔ وہ اپنے سراپا کے قیامت انگیز نکھار کے باجود اسے محض ہوس کی ڈائن لگ رہی تھی۔

وہ سنگیت اور جل کماری کے ہمراہ ٹھہر گیا اور اس کے عقب میں جل ناگ خوشی کی کیفیت میں لہرا لہرا کے سمندری پانی میں کودنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کوئی جشن منانے کی تیاری کر رہے ہوں۔

آکاش نے سنگیت کے چہرے پر ایک نگاہ ڈالی...... اس کی پھٹی پھٹی دہشت زدہ نگاہیں ڈیڑھ ہزار نیدم کی گہرائی سے گپھا کے ذریعے اوپر اٹھنے والے پانی پر جمی ہوئی تھیں۔

کچھ دیر بعد جل منڈل والی خشک گپھا اور سمندری موجوں کے غضب ناک ریلوں سے چنگھاڑتی ہوئی گپھا کا سنگم سامنے آگیا...... پانی کی تیز و تندی پھوار جل منڈل والی شاخ میں دور دور تک اڑا رہی تھی۔

آکاش نے چند قدم آگے بڑھ کے امرتا رانی کے جلے ہوئے بالوں کی راکھ سمندری پانی میں جل کماری کی نظروں سے بچا کے ڈال دی۔ اس سمے اسے موقع مل گیا تھا۔

''یہ تم نے کیا پھینکا ہے......؟'' جل کماری ہذیانی لہجے میں چیخی اور اس کی طرف جھپٹی۔

''کچھ نہیں......'' آکاش نے جواب دیا۔ ''تمہاری کمر پر ہاتھ رکھے رکھے شل ہوگیا تھا۔ اسے جھٹک رہا تھا۔''

وہ ہنس کے سنگیت کی طرف مڑ گئی...... پھر اس سے یوں تو لہجہ تمسخرانہ تھا۔

''چلو...... چھوٹی رانی جی......! پانی میں کود جاؤ...... میرے سیوک جو پانی میں اتر چکے ہیں۔ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ تمہیں کل تک کالی بھومی میں پہنچا دیں گے......''

''نن...... نہیں...... نہیں......'' سنگیت نے ہیجانی لہجے میں ایک زوردار چیخ ماری۔

''وہ کیوں......؟'' جل کماری نے اسے حیرت سے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

اس لئے کہ میں مر جاؤں گی...... مجھے یہ ساگر خون لگتا ہے...... میں اس میں نہیں کودوں گی۔'' اس نے خوف زدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''میں اس طرح بے موت نہیں مروں گی...... میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔''

آکاش نے اسے بڑے پیار سے سمجھایا اور رخسار تھپ تھپائے اور کہا۔

''سنگیت......! جل کماری وچن دے چکی ہے کہ وہ تمہیں زندہ سلامت اور خیریت سے کالی بھومی پہنچا دے گی۔ جہاں امرتا رانی تمہاری راہ دیکھ رہی ہے...... یہ ایک سنہرا موقع ہے۔ تم جل کماری پر بسواس کرو۔ یہ اب ہماری مہربان ہستی ہے۔ دشمن نہیں...... اس نے جو وچن دیا ہے اس پر بسواس کرو۔''

''نہیں...... نہیں...... مجھے جل کماری سے نفرت نہیں ہے...... اس کی بات پر بسواس ہے...... یہ خونی ساگر

موت سے کہیں خطرناک ہے۔ مجھے بڑی بے دردی سے موت کا شکار کردے گا۔ میں سسک سسک کر مرنا نہیں چاہتی...... کیا میں نہیں جانتی کہ موت کا عفریت کیا ہوتا ہے...... تم مجھے مجبور نہ کرو...... آکاش!'' وہ بری طرح سسک پڑی۔

آکاش نے اسے زیادہ مجبور کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے سنگیت کی دہشت سے اندازہ کرلیا تھا کہ اس کا ذہنی توازن بگڑ رہا ہے اور اس کی خوب صورت، بڑی بڑی اور کالی آنکھوں کے افق تا افق موت کی زردی خوف بن کے چھائی ہوئی ہے...... اور پھر آکاش کو ایسا محسوس ہوا کہ کہیں وہ دماغی ابتری کی حالت میں منکہ کا راز افشا نہ کردے۔ وہ شاید یہ کہہ دے کہ اس سے بہتر ہے کہ تم میرا پیٹ چاک کرکے منکہ نکال لو...... اس طرح اس کا بنا بنایا کیوں کھیل بگڑ جائے گا۔ وہ کسی قیمت پر منکہ کے بارے میں جل کماری کو خبر نہ ہونے دینا چاہتا تھا۔ اس میں نہ صرف اس کی بلکہ سنگیت کی سلامتی کا راز پوشیدہ تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ اسے پانی کے سرکش سے خود بھی خوف محسوس کررہا تھا۔

اس نے سنگیت کی ہٹ دھرمی اور ضد کے پیش نظر جل کماری سے کہا۔

''سنگیت سمندر کی سرکشی اور بے لگام لہروں سے بہت زیادہ دہشت زدہ ہوگئی ہے۔ جان من! کیا تمہارے ذہن میں ایسی کوئی تدبیر نہیں ہے کہ سنگیت بغیر کسی ڈر اور خوف کے سفر کرکے کالی بھوی پہنچ جائے...... یہ سولہ برس کی عمر کی معصوم سی دوشیزہ ہے۔ اس پر ترس کھاؤ۔ دیا کرو......''

''کیوں نہیں ہے...... دوسرا راستہ بالکل ہے......'' جل کماری نے جواب دیا۔ ''میرا ایک سیوک ہے...... شکتی ناگ......! تم کہو تو وہ سنگیت کو زندہ نگل لے گا...... اور کالی بھومی پہنچ کر اسے امرتا رانی کے چرنوں میں اگل دے گا۔''

''اس طرح سنگیت کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچے گا......؟'' آکاش نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

''نہیں...... بالکل نہیں اس طرح تو اس کی ہر طرح سے رکھشا ہوگی اور راستہ بھی بڑی آسانی سے جلد کٹ جائے گا...... اور پھر وہ اس کے پیٹ میں آرام سے رہے گی اور اس طرح محسوس کرے گی جیسے کسی کشتی میں سفر کررہی ہے۔'' جل کماری نے جواب دیا۔ ''میں خود بھی اس طرح سے سفر کرچکی ہوں۔''

آکاش نے محسوس کرلیا تھا کہ جل کماری سچ کہہ رہی ہے۔ اس نے بادل نخواستہ کہا۔

''تم یقین دلا رہی ہو ٹھیک ہے...... پھر ایسا ہی کرلو۔ یہ زیادہ مناسب رہے گا۔''

جل کماری نے فوراً ہی کسی نامانوس زبان میں کچھ کہا۔ اس کے کہنے کی دیر تھی کہ گپھا میں امڈتے ہوئے طوفانی بہاؤ میں سے ایک بارہ فٹ لمبا اور اس کی جسامت بیس فٹ سے کچھ زیادہ ہی ہوگی اور اس کا بدن اس قدر پھولا ہوا تھا کہ بیک وقت دو آدمی سما سکتے تھے۔ اچھل کر خشکی پر آگیا۔

جل کماری کا اشارہ پاکے اس دیوزاد جل ناگ نے کوئی دو تین مرتبہ اپنے منہ کا دہانہ پھاڑا جو ایک بڑے اور ایسے غار کی طرح تھا جس میں بیک وقت دو فرد بآسانی اندر سما سکتے تھے۔

اس کے منہ کے اندر تیز، چمکیلے اور خنجروں کی طرح نوک دار دانتوں کی قطاریں دیکھ کے کچھ پریشان ہوگیا اور اس کے سارے بدن پر سرد سفاک قسم کی سنسنی کسی خنجر کی نوک کی طرح کاٹتی ریڑھ کی ہڈی کو کاٹنے لگی۔

''تم اس کے قریب جاؤ۔'' جل کماری نے سنگیت سے کہا۔ ''وہ تمہیں سانس کے زور سے اندر کھینچ لے گا...... یہ جو اس کے نوکیلے دانت ہیں تمہارے جسم سے مس نہ ہوں گے۔ تم محفوظ رہوگی۔''

سنگیت کو جیسے اس کی بات کا یقین نہیں آیا۔ وہ دہشت آمیز چیخیں مار کے سہم گئی اور آکاش سے لپٹ گئی۔

''نہیں...... نہیں......'' سنگیت ہذیانی لہجے میں بولی۔ ''یہ مجھے کھا جائے گا...... میں نہیں جاؤں گی۔''

آکاش نے اسے اپنے جسم سے الگ کرکے دلاسا دیا اور رخسار تھپتھپائے۔ پھر میٹھے لہجے میں بولا۔

''تم چنتا نہ کرو اور نہ خوف زدہ ہو...... تمہارا بال تک بیکا نہیں ہوگا...... بلاوجہ پریشان ہورہی ہو۔''

جل کماری نے کوئی منتر پڑھ کے سنگیت پر پھونک ماری...... جل ناگ نے اپنا مہیب دہانہ کھولا...... اس لمحے سنگیت کسی تنکے کی طرح اڑتی ہوئی اس کے منہ میں چلی گئی۔ اس کے اندر جاتے ہی دہانہ بند ہوگیا۔

آکاش کافی دیر تک ششدر و مبہوت کھڑا رہا اور سمندری ریلے کو گھورتا رہا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے اپنے ہاتھوں سے سنگیت کی چتا نذر آتش کی ہو۔ ایک سوگواری سی اس پر مسلط ہوگئی تھی۔ اس کا سینہ اندر سے کٹ رہا تھا...... وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی وہ جل ناگ جو ایک لمبی چوڑی کشتی دکھائی دے رہا تھا تھوڑی ہی دیر میں اس نے میلوں کی مسافت طے کرلی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دور جاکے ایک دھبا سا بن گیا اور نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ آکاش نے دل میں آہ بھر کے سوچا۔ یہ جل ناگ سنگیت کو خیریت سے جل بھومی پہنچادے گا۔

''آؤ لوٹ چلیں......'' جل کماری نے اس کا ہاتھ بڑی محبت اور گرم جوشی سے تھام لیا۔ ''جل کماری کے آج تم کچھ ایسے انوکھے روپ جو کبھی نہیں دیکھے اور نہ ان کا تصور کرسکتے ہو...... تم نہ صرف سنگیت اور امرتا رانی کو بھول جاؤ گے اور ان عورتوں بلکہ دیگر کو جو تمہاری زندگی میں آچکی ہیں۔''

آکاش نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنے دل میں اسے مخاطب کیا۔

''کتیا......! ڈائن......! بدچلن......! تو یہ جان لے کہ تیرا کوئی سا بھی انوکھا روپ اور تیرے حسن کا کوئی جادو مجھ پر چل نہیں سکے گا...... تیرے ارمان، سپنے اور خواہشات مٹی میں ملادوں گا......''

جل کماری نے اسے کئی بار میٹھے لہجے میں مخاطب کیا اور اس کی طرف خود سپردگی کی نظروں سے دیکھا تاکہ وہ بہک جائے، لیکن آکاش نے اپنے آپ کو قدرتی نظاروں کی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ اس لئے کہ اس کے دل میں نفرت کا لاوا ابل رہا تھا۔ وہ شعلہ مجسم بنی تھی اور اپنی لگاوٹ کی باتوں سے سنگیت سے نجات پانے کا جشن منانا چاہتی تھی۔

محبت کے جذبے سے جل کماری ناآشنا تھی۔ وہ صرف جذبات کی آسودگی اور جسمانی تعلق کو محبت سمجھتی تھی۔ اس کے چہرے پر میلا پن، پراگندگی اور آنکھوں میں خود سپردگی کی سرخی تھی۔ جس سے وہ متاثر ہوکے جل کماری کے حوالے اپنے آپ کو ڈھال دیتا۔ یہ حسن کا جادو، تناسب اور پیچ و خم بھی اس پر اثر نہ کرسکے اور اس نے یہ تاثر دیا کہ سنگیت کو کھودینے کا صدمہ ہورہا ہے۔

لیکن وہ جانتا تھا کہ جل کماری سے نفرت کا رویہ دیر تک قائم نہ رکھ سکے گا۔ اسے ہر حال میں خوش رکھنا اور اس کی ہر بات ماننا ہوگی۔ اس کے سوا چارہ نہ ہوگا۔ کیوں کہ اس کی غرض پوشیدہ تھی۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ پستی میں گرنا اور دان دینا پڑتا ہے۔ آدمی کتنا مجبور اور بے بس ہوجاتا ہے۔ ایک اذیت ناک فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ اذیت کیا ہوتی ہے۔ اس کا دل جانتا تھا۔

راج بھون پہنچ کے جل کماری اسے اسی یادگار اور خواب ناک ماحول کی خواب گاہ میں لے گئی۔ جہاں پہلی مرتبہ پھسل کے لمحات کو رنگین بنایا تھا۔ پھر وہ جشن منانے کے بعد فاتحانہ انداز سے غائب ہوگئی۔

خیال انگیز تنہائی میسر آتے ہی آکاش کو اپنی حماقتوں پر پھر افسوس اور پچھتاوا محسوس ہونے لگا۔ اب اسے سنگیت کے زندہ بچنے اور کالی بھومی تک پہنچنے کی امید بہت کم رہ گئی تھی۔ اسے پشیمانی ہورہی تھی کیوں نہ اس نے رحم اور جذبات کا گلا گھونٹ کے سنگیت کا پیٹ چاک کردیا ہوتا اور منکہ نکال لیا ہوتا۔ جس کے ہوتے ہوئے کم از کم جل کماری کے پراسرار اور ناقابل فہم حربوں اور اس کے جسمانی قرب کا شکار ہونے سے بچ سکتا تھا۔ اس کے ارمانوں اور خواہشات کو تہس نہس کرکے اسے مفلوج کردیا ہوتا۔

جس وقت وہ گپھا کے سنگم پر سنگیت کو پیٹ میں جاتا دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اسے بھی گپھا میں کود پڑنے کا خیال آیا تھا۔ لیکن ہر قوت سے محروم ایک مجبور ہوتے

ہوئے ایسا کوئی اقدام خودکشی کے برابر ہی ہوتا۔ لہٰذا اس نے خود کو باز رکھا۔ لیکن اب سوچ رہا تھا کہ منکے کا راز افشا ہوگیا تو شاید اسے لرزہ خیز حالات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ جن سے خودکشی بدرجہا بہتر ہوگی۔

جو کچھ ہوچکا تھا اس پر اس کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ تن بہ تقدیر ہوکے پامردی کے ساتھ مقابلہ کرے گا۔ اگر بھگوان کو منظور ہوا تو اسے ہر حال میں جل منڈل کی غدار دھرتی سے نکلنے کا موقع مل جائے گا۔

وہ بڑی افسردگی سے بستر پر دراز اپنے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہورہا تھا کہ جل کماری اپنے ہاتھوں میں ایک تھالی اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی اور دلربانہ انداز سے اس کے پاس بیٹھ گئی۔

''آکاش جی......! کیا بات ہے بڑے پریشان اور فکرمند لگ رہے ہو؟'' وہ ایک طرف تھالی رکھ کے بولی۔ اور اس کے ہاتھ تھام لئے جس میں گرم جوشی تھی۔

''آخر کو انسان ہوں۔'' آکاش نے بڑے صبر و تحمل سے جواب دیا۔ ''میں نے اپنی دنیا کی قیمت دے کر تمہیں تو اپنالیا ہے...... لیکن اپنے ہم نسلوں کی صحبت سے محرومی کی خلش ستارہی ہے۔ افسردہ کررہی ہے۔''

''کیا اکیلا آدمی فلسفی ہوتا ہے؟'' اس نے آکاش کے ہاتھ کی پشت پر اپنے ہونٹ پیوست کردیئے۔ چند لمحوں کے بعد بولی۔ ''میں تمہارے لئے شراب لاتی ہوں اس کے نشے میں ڈوب کے تم اپنے ہر دکھ سے بے نیاز ہوجاؤ گے۔''

یہ کہہ کر وہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔ ایک لمحے میں دوسرے کمرے سے صراحی اور دو پیانے لاکر اسے شراب سے لبریز کیا۔ پھر ایک پیانہ اس کی طرف بڑھادیا۔

آکاش نے پیانہ ہاتھ میں لے کر غور سے اس میں بھرے سیال کو دیکھا اور اسے ایک ہی سانس میں غٹا غٹ حلق سے اتار کے خالی کردیا۔ یوں بھی اس وقت وہ بہت پیاسا ہورہا تھا۔

جل کماری نے اسے اور دو جام بھر بھر کے پلادیئے۔ حلق سے اترنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک ایسے جہان میں پہنچ گیا ہے۔ جہاں کوئی رنج والم اور مصائب نہیں ہیں۔ اس جام کا اثر ایسا تھا کہ اس نے جل کماری کے حسن کو دوآتشہ بنادیا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ آتش فشاں بن گئی ہو۔

''جل کماری......! اس جام سے میری نس نس میں آگ دہکنے لگی ہے۔'' اس نے لڑکھڑاتی زبان میں کہا۔ ''باہر چلتے ہیں تاکہ تازہ اور خنک ہوا سے جسم کو ٹھنڈک ملے۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے...... تھوڑی دیر میں یہ آگ سرد ہوجائے گی۔'' وہ شوخی سے بولی۔ ''میرے ہاتھ میں بڑی نرمی اور ٹھنڈک ہے۔ پریشان نہ ہو۔''

''میری کنپٹیاں سنسنارہی ہیں؟'' آکاش نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

''ایسا کرو...... میرے دونوں ہاتھ اپنے سینے میں رکھ لو......'' وہ دلکش انداز سے مسکرائی۔

پھر آکاش نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔

جل کماری نے اسے فریب دیا تھا...... مکاری کی تھی۔ اس کے سینے پر ہاتھوں کے لمس سے ایسا لگا کہ جیسے اس نے دو دہکتے انگارے رکھ لئے ہوں۔ وہ اسے انجان پستی میں گرانا چاہتے ہوں۔

''جل کماری......! میرے جذبات سے نہ کھیلو......'' آکاش سنبھل کے بولا۔

''ہاں...... میری جان......!'' جل کماری نے دونوں ہاتھ جوڑ کے اسے پرنام کیا۔ ''اب مجھے غور سے دیکھو۔ اور بتاؤ کہ میں کیسی لگ رہی ہوں۔ کیا سنگیت سے حسین؟''

''ہاں...... تم سنگیت سے کہیں حسین دکھائی دے رہی ہو۔'' پھر آکاش نے دیکھا وہ سنگیت کے روپ میں آگئی ہے۔

''تم سنگیت کے بہروپ بھر کے مجھ سے کھیلنا چاہتی ہو......! ایسا نہ کرو۔''

''ایک شرط پر میں اپنے اصل روپ میں آسکتی ہوں۔'' اس کی ہنسی فاتحانہ سی تھی۔

"مجھے ہر شرط منظور ہے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ نشے کے باعث توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ فرش پر گر گیا۔

دوسرے لمحے وہ جل کماری کے اصل روپ میں آ گئی..... وہ اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے بولی۔

"مجھے صرف ایک چیز درکار ہے جو تم دے سکتے ہو..... مجھے دے دو۔"

"میں تمہارے لئے آسمان کے تارے بھی توڑ کے لاسکتا ہوں۔ تم حکم تو کرو میری جان!" اس نے کہا۔

"میرے پاس وہ چیز ہے تو تم خود ہی لے لو..... انتظار کس بات کا ہے؟"

"بات صرف اتنی ہے کہ بڑی بے بس سی ہوں۔ میری مجال نہیں۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"تم اور بے بس.....؟ تم تو جل کماری ہو۔" آکاش نے حیرت کا اظہار کیا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں....."

"ہاں....." جل کماری نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ورنہ میں خود لے لیتی۔" پھر وہ توقف کر کے اپنے مرمریں، گداز اور سڈول بدن کو ایسے بازوؤں سے لچک اور جنبش دینے لگی کہ آکاش بہک کے پھسل جائے، غلاظت کی پستی میں گرنے سے اس کی راہ سب سے بڑی رکاوٹ دور ہو جائے۔ "اس چیز کو میں تمہاری آ گیا کے بنا خود سے لے لینا تو درکنار چھو بھی نہیں سکتی۔ اگر میں نے ایسا کیا تو نشٹ ہو جاؤں گی۔"

"جلدی سے بولو..... میرے صبر اور تحمل کا امتحان نہ لو۔" آکاش نے تیزی سے کہا۔

"ناگ رانی کا منکا مجھے دے دو۔" وہ خود سپردگی کے لہجے میں بولی۔ "وہ چاہئے۔"

جل کماری نے یہ بات کہنے کو تو کہہ دی تھی لیکن اس کی آواز میں ارتعاش سا تھا اور آنکھوں میں سے وحشیانہ چمک جھانک رہی تھی۔

"منکا میرے پاس نہیں ہے۔ تم میرے پاس آ ؤ۔ تسلی کرلو۔" اس نے سچ کہہ دیا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو....." وہ غرا کے بولی۔ "کہاں جا سکتا ہے۔ تمہارے گلے میں پڑا ہے۔ کیا میں نہیں جانتی کہ تم اس کی حفاظت اپنی جان سے زیادہ کرتے ہو۔"

"نہیں..... میں کیوں جھوٹ بولوں....." آکاش نے ہذیانی لہجے میں کہا۔

"تم اس لئے جھوٹ بول رہے ہو کہ مجھے اپنی آغوش میں لے کر میرا گلا دبا کر ختم کر دو۔"

"میں تم سے کوئی ڈرتا ہوں کہ جو جھوٹ بولوں؟" آکاش نے اپنی قمیض نکال کے ایک طرف پھینک دی۔

اس نے آکاش کا نیم برہنہ جسم دیکھا۔ واقعی اس کے گلے میں منکا نہیں تھا۔ جل کماری کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اور اس کی آنکھوں میں جو وحشیانہ چمک تھی دم توڑ گئی۔

"آ جاؤ میری بانہوں میں تاکہ ہم دنیا و مافیہا کو بھول جائیں..... منکا کو بھول جائیں۔ ہم اور تم محبت بھری باتیں کرلیں، محبت جو بڑی اچھوتی اور پاکیزہ ہوتی ہے۔" آکاش بولا۔

"شاید تم نے منکا کپڑوں میں چھپا لیا ہے۔ اب یہ نچلا لباس بھی اتار دو۔" وہ تنک کر بولی۔ "منکا جا کہاں سکتا ہے؟"

"وہ منکا سنگیت کے پیٹ میں اتر کے محفوظ ہو گیا ہے۔" آکاش نے بڑے اطمینان سے بتایا۔

"کیا..... کیا کہا.....؟ منکا سنگیت کے پیٹ میں اتر گیا.....؟ وہ احمقوں کی طرح اسے دیکھنے لگی۔ "وہ کیسے؟"

پھر آکاش نے اسے واقعہ سنایا تاکہ یقین آ جائے۔

جل کماری کے چہرے کا جغرافیہ ہی بدل گیا۔ اس کے تیور خطرناک ہو گئے۔ اس کے چہرے پر ان گنت شکنیں پڑ گئیں تو وہ کسی چڑیل سے کہیں مکروہ اور گھناؤنی نظر آنے لگی، تو وہ اپنی جگہ ساکت و جامد ہو گیا۔

"جھوٹے.....! مکار..... ذلیل.....!" وہ قہر و غضب میں ڈوبی ہوئی آواز میں گونجی۔ "تو نے اس لئے چالاکی سے سنگیت کو نکال دیا.....؟ کاش! مجھے اس کا اندازہ ہو جاتا..... شک ہو جاتا تو میں اسے اپنے ہاتھوں سے ذبح کر دیتی..... خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا..... کمینی بچ کے کہاں جائے گی.....؟ وہ ابھی کالی بھوی نہ پہنچی

ہوگی..... سنگھ ناگ کو اپنی واپسی کا حکم دیتی ہوں..... وہ اس کمینی کو بیچ سمندر ہی میں کسی گھڑیال کا نوالہ بنادے گا..... اور تو..... اٹھہرا بھی.....“

اتنا کہنے کے بعد وہ اپنی کسی نامانوس زبان میں ہذیانی انداز میں چیخی..... اسے اپنے اردگرد دہشت ناک دھاکوں کی آوازیں گونجیں۔ تو اسے اپنے کان کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ اس گھپ اندھیرے میں بے شمار وحشی ناگ اس پر ٹوٹ پڑے..... درد اور کرب ناک اذیت سے اس کی چیخیں نکل پڑیں۔

تیری بات مان کر میں نے یہ ناٹک رچایا تھا..... پر تو ایک نمبری کا ئیاں نکلا..... ابھی میں دیکھتی ہوں کہ کون سی شکتی جل منڈل میں تجھے میرے شراپ سے بچائے گی.....؟“

اس جانکنی کے عالم میں جل کماری کی غضب ناک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی، اور پھر ایک موٹی سی جسامت کا جل ناگ اس کی گردن میں کسی رسے کی طرح لپٹ گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دینا چاہی لیکن وہاں پہلے ہی مضبوط رسیوں کی طرح جل ناگ لپٹے ہوئے تھے..... اس کی گردن پر جل ناگ کی گرفت سخت ہونے لگی اور اس کے دماغ میں آندھیوں کا سا شور ابھر ابھر کے معدوم ہونے لگا۔ جیسے بے شمار بدروحیں کسی سانحہ پر ہم آواز ہوکر رو رہی ہوں۔

بے شمار جل ناگ اس کے بدن سے جونک بنے ہوئے تھے اور ایک موٹا سا جل ناگ اس کی گردن تک لپٹا ہوا تھا۔ اردگرد ایک ایسا گھپ اندھیرا پھیل چکا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا اور اس کے ذہن میں پر شور سن سناہٹیں گونج رہی تھیں۔ اس کی عقل جیسے مفلوج ہوکر رہ گئی تھی اور اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تھا کہ آخر ہو کس طرح شیطانی عقوبت کا شکار ہوگیا ہے۔ اور اس کے دل و دماغ پر جو سارا نشہ مسلط تھا وہ ایک دم سے کافور ہوگیا تھا۔

”اوہ مورکھ.....“ تو دیکھے گا کہ اب میں تجھے کس طرح سے نشٹ کرتی ہوں..... تیرے منتر اور میرے شراپ سے بچا نہ سکیں گے..... میں نے تجھے جو خواب گاہ میں شراب نوشی کی دعوت دی تھی کیا تو سمجھتا نہیں ہے کہ اس میں کون سا جذبہ کارفرما تھا..... میں جو تجھ پر بادل بن کے برسی تھی جانتا ہے کیوں اور کس لئے..... میں یہ چاہتی تھی کہ میرے حسن کا جادو تجھ پر چل جائے۔ اور تو نشے میں مست ہوکر میری فیاضی اور مہربانی کے کارن منکہ میری جھولی میں ڈال دے اور میں اسے اپنی ملکیت بنالوں۔ لیکن تو نے میری امیدیں خاک میں ملادیں۔“

صورت حال بڑی عجیب، گھمبیر اور مضحکہ خیز تھی۔ اس نے سنگیت کی جان اور محبت کی خاطر محرومی کا راز آشکار نہیں کیا تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ ایسی وارفتگی، والہانہ اور خودسپردگی سے پیش آیا تھا کہ وہ منکہ کے بارے میں کوئی بات نہ کرے۔ وہ کبھی اس شدت سے جل کماری سے پیش نہیں آیا تھا۔ لیکن چوں کہ جل کماری کو منکہ کا حصول چاہئے تھا اس لئے اس نے بھی سوانگ رچایا تھا اور اسے یہ تاثر وہ صرف اس کے قرب اور محبت کی خواہاں ہے۔ اگر آکاش کو ذرا بھی شبہ ہوجاتا کہ جل کماری منکہ کے حصول کے لئے اس پر مر مٹ رہی ہے تو وہ شاید اسے موت سے ہم کنار کردیتا۔

اب اس کی ساری بساط الٹ چکی تھی۔ وہ یہ چاہ رہا تھا کہ جل کماری سے اس وقت تک کھیلتا رہے جب تک سنگیت جل بھومی نہ پہنچ جائے۔ لیکن اب جل منڈل کی پراسرار اور ناقابل عبور سرزمین پر ایک قیدی ہوگیا تھا۔ بے بس اور مجبور ہوگیا تھا اور جل کماری کے رحم و کرم پر تھا۔ اس ڈائن کے ایک اشارے پر اس کی جنبش ابرو پر اس کی زندگی کا تمام تر دارومدار رہ گیا تھا۔

آکاش کا خیال تھا کہ جل کماری شاید اسے معاف کردے۔ کیوں کہ اس نے جل کماری کو جس طرح اور جس انداز سے خوش کیا ان نشاط انگیز لمحات، محبت بھرے الفاظ اور اس کے حسن و شباب کیت عریف کی تھی اس کا خیال آتے ہی اس پر ترس کھا جائے۔ کیوں کہ عورت تعریف کی بھوکی ہوتی ہے۔ ایک بھکارن کی طرح اپنی جولی لئے پھرتی ہے..... اس نے جس طرح جل کماری کو خوش کیا، چاہت کا اظہار کیا، شاید ہی کوئی مرد

کر پائے۔ اس میں ریاکاری اور منافقت تھی۔ لیکن سنگیت کی خاطر...... سنگیت کی محبت کے لئے اور اس کی سلامتی کے لئے جل کماری کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملادیئے۔ اس نے اپنے دل پر پتھر رکھا...... جبر و زیادتی سے سب کچھ کہا تھا۔ وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس نے حد سے زیادہ جل کماری پر فیاضی کی تھی۔

لیکن جل کماری نے اسے مایوس کیا تھا۔ اور پھر جل کماری کی مہربان اور حد سے فیاضی اور حیوانیت منکہ کے لئے تھی۔ اب منکہ سے محرومی نے اسے جراغ پا کردیا اور اس نے انتقام کے اندھے جنون میں اسے کسی بات کا ہوش اور خیال نہیں رہا تھا۔ اس کے گلے سے جونک کی طرح لپٹے ہوئے موٹے موٹے جل ناگ کی گرفت لحظہ بہ لحظہ سخت ہوتی جارہی تھی اور اس کی نگاہوں کے سامنے زرد اور سیاہ رنگ کے گھٹتے بڑھتے گنجان دائرے ناچنے لگے تھے۔ یہ کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ پھر اس کا ذہن بے ہوشی کی تاریک اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا اور اسے دنیا و مافیہا میں کسی چیز کی خبر نہ رہ گئی۔ پورے وجود پر بے عملی اور بے فکری کا ایک جمود مسلط ہوگیا۔

اس کی طویل بے ہوشی کب تک رہی تھی اسے کچھ خیال نہ آیا تھا۔

اس کے دوبارہ ہوش میں آنے کا سبب بہت سی ملی جلی اور خوف ناک قسم کی چیخیں تھیں۔ جن میں عجیب سی گونج اور گرجداری نمایاں تھیں۔ اس نے آہستگی سے بدن کو حرکت دی اور محسوس کیا کہ اسے رسیوں وغیرہ سے باندھا نہیں گیا ہے۔ لیکن اس نے دوسرے لمحے محسوس کیا کہ اس کا بدن ننگے اور نوکیلے پتھروں کی تکلیف دہ چبھن کو محسوس کررہا ہے۔ اس نے آنکھیں کھولنی چاہی لیکن غنودگی سے پپوٹے منوں بھاری لگ رہے تھے۔ پھر بھی اس نے بڑے جبر اور طاقت سے دباؤ ڈال کر آنکھیں کسی نہ کسی طرح کھول لیں تو اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔

گو کہ جل کماری کا روپ ایک عورت کا سا ہی تھا۔ لیکن وہ انسانوں کی دنیا کی نہیں لگتی تھی۔ اس کا

شکر و احسان

کسی نے بوعلی سینا سے پوچھا۔ ”دن کیسے گزر رہے ہیں۔“ انہوں نے کہا۔ ”گناہ گار ہونے کے باوجود اللہ کی نعمتیں مجھ پر برس رہی ہیں۔“ ”سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس بات پر اللہ کا شکر ادا کروں۔ کثرت نعمت پر یا بے شمار عیبوں سے چشم پوشی پر۔“

(عادل۔ شاہ پور چاکر)

روپ کسی اور دیس کی مخلوق کا سا تھا۔ وہ ایک ایسی حالت میں تھی کہ اس کی دنیا میں کوئی لڑکی عورت کسی کے سامنے نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کے کھلے ہوئے گہرے سیاہ ریشمی لانبے لانبے بال اس کی پشت پر گہرے سیاہ بادلوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے چندن سے بدن کو نمایاں کررہے تھے۔ لیکن اس کے گورے چہرے پر دہشت کی سرخی نمایاں تھی اور آنکھوں کے ڈھیلے کسی چڑیل کے انداز میں لگ رہے تھے۔ اس کی شکل و صورت اور خال و خد اور سراپا وہی تھے جو اس کے سامنے اسے بہکانے کے لئے آتے تھے۔ لیکن اس وقت جل کماری اپنی ساری نسوانی کشش اور حسن و شباب کے جادو بھرے بدن سے محروم ہو چکی تھی۔ اس کا روپ اور جسمانی کشش ایسی نہ تھی کہ مرد بہک جائے۔ وہ اس وقت کسی ڈائن کا روپ دکھائی دیتی تھی۔ اس کے داہنے ہاتھ میں کانسی کی ایک بڑی چمکیلی تھالی موجود تھی اور وہ چہرے کے بدلتے تاثرات کے ساتھ بہ غور اس تھالی کی چمک دار سطح کو گھورے جارہی تھی۔

چبوترے کے نیچے پتھریلی زمین پر اس کے اردگرد غضب ناک جل ناگ لہرا رہے تھے۔ جل منڈل اس وسیع اور ہولناک غار میں گونجنے والی مہیب چیخیں ان ہی جل ناگوں کی پھنکاروں کی ہم آہنگی سے پیدا ہورہی تھیں

اور ان کی گونج سے زمین اس طرح دہلتی محسوس ہو رہی تھی جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔

"تو بیاکل ہی رہے گا۔ آکاش......!" اچانک جل کماری نے چبوترے پر سے میری جانب دیکھے بغیر کہا تو اس کی آواز میں زہرنا کی تھی۔ "جل منڈل میں اب تجھے اپنا جیون بھی چٹان کی طرح بھاری معلوم ہوگا۔ اور پھر تو موت کی آشا کرے گا...... لیکن جیون تیرے لئے روگ بنا رہے گا۔"

آکاش نے بڑے بڑے خوف زدہ نظروں سے چبوترے کی جانب دیکھا لیکن جل کماری اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ اس کی نگاہیں بدستور کانسی کی تھالی پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

"جل کماری......!" آکاش نے اسے پکارا تو اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آواز میں خوف و دہشت کی کپکپی سی نمایاں ہو رہی ہے اور جل کماری نے پھر بھی اس کی طرف دیکھنا گوارا نہیں کیا۔

"چپ وہ نرک کے ایندھن......" وہ کرخت لہجے میں دھاڑی۔ "میرا سنگھ ناگ اس سمے نیلے ساگر میں تڑپتا پھر رہا ہے...... میری آگیا کا پالنا اب اس کے بس کی بات نہیں رہ گئی ہے۔ تیری کلنکنی سنگیت کالی بھومی پر امرتا ناگ رانی کے چرنوں میں پڑی ہوئی ہے۔ وہ ساگر سے باہر ہے۔ اور سنگھ ناگ اسے باہر اگل چکا ہے۔ تیری چالوں کے کارن مجھے سنگھ ناگ کو واپس بلانے میں چند سمے کی دیر ہو گئی اور آدھی بازی میرے ہاتھ سے نکل گئی۔ ورنہ تیری سنگیت اس سمے اپنی جان کے روگ سے چھٹکارا پا چکی ہوتی۔"

سکون اور اطمینان کی ایک گہری سانس اس کے وجود کے نس نس میں پھیل گئی۔ سنگیت اب منکہ سمیت کالی بھومی امرتارانی کے پاس پہنچ چکی تھی...... اب وہ جل کماری اور سنگھ ناگ کی موذی گرفت سے باہر تھی اور اس کی کہانی سنانے میں کوئی دیوار اور رکاوٹ نہ تھی۔ اس کے ڈوبتے دل میں امید کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اس کی اقتاد سن کر امرتارانی پہلی فرصت میں مجھے جل کماری کے چنگل سے نکالنے کے لئے جل منڈل کی پراسرار زمین کا رخ کرے گی اور وہ کسمپرسی کی موت کا شکار ہونے سے بچ جائے گا۔

"مر گیا......؟"

اچانک جل کماری کے منہ سے کراہ آمیز کراہ نکلی اور کانسی کی تھالی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے گر گئی جس کی چمک دار سطح پر وہ شاید اپنی شکتی کے سہارے ان ساگروں کا حال دیکھ رہی تھی۔ جہاں سنگھ ناگ اپنی جل کماری کے حکم کی تعمیل نہ کر سکنے کی بنا پر اپنی زندگی کو موت کی پرسکون آغوش میں ڈال چکا تھا۔

پھر جل کماری نے اس بلند چبوترے سے نیچے چھلانگ لگائی، پھر اس کا نازک مرمریں، پرشباب اور بدن فضا میں اڑتا تیزی سے آکاش کے قریب ہی زمین پر آ ٹکا۔

وہ اس وقت تک زمین پر ہی پڑا ہوا تھا۔ جل کماری نے تحقیر آمیز انداز سے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر ماری اور فضا میں منہ اٹھا کے اپنی مخصوص اور نامانوس زبان میں ہذیانی انداز سے اتنے زور سے چیخی کہ جیسے کسی نے اس کی پشت پر کسی شے سے ضرب لگائی ہو۔

جل کماری کی اس دردناک ہذیانی کا ردعمل فوراً ہی ظاہر ہوا...... اور سنگلاخ زمین پر دور دور تک پھیلے ہوئے ناگ یک بیک اس طرح سے غائب ہو گئے جیسے ان کا وجود ہی نہ ہو۔ اور اس سیاہ چبوترے کے نیچے وہ تنہا جل کماری کے چرنوں میں پڑا رہ گیا...... اسے ایسا محسوس ہوا کہ جل کماری شاید اب اسے اپنے جذبات کا نشانہ بنانا چاہتی ہو۔ اور اس کے دل کے کسی کونے میں کسی امنگ نے جنم لیا ہو۔

"اور اب تو تیار ہو جا......" جل کماری کے لہجے اور تیور نے اس کا خیال غلط ثابت کر دیا۔ وہ اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتی ہوئی سرد سفاک لہجے میں بولی۔ "منکہ جو تیری شکتی کا راز تھا۔ اب کالی بھومی پہنچ چکا ہے...... اور تو میرے سامنے بالکل بے بس اور اپاہج سا ہو چکا ہے...... تو کسی اور غلط فہمی میں نہ رہنا کہ میں تیری جھولی میں ٹپک پڑوں گی۔ میں تو تجھے سکا سکا کر اپنی آتما کو ٹھنڈک پہنچاؤں گی...... تو نے مجھے جو دکھ پہنچایا ہے۔ وہ میں بھی

نہیں بھول سکتی۔"

آکاش نے اس کی بات کا کوئی جواب دینے کے بجائے ہمت کی اور کہنیوں کا سہارا لے کر زمین سے کسی نہ کسی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے شکست خوردہ انداز میں پوچھا۔ اس کی آواز میں نرمی سی تھی۔

"آخر تو مجھ سے کس بات کا انتقام لینا چاہتی ہے......؟ کیا میں نے تجھے ہر طرح سے خوش نہیں کیا؟ میں نے تیری ہر وہ بات جو تو نے چاہی...... مجھے اشاروں پر نچایا......اور اب تو اتنی نفرت اور محبت سے پیش کیوں آرہی ہے......؟ ایسا لگتا اور لگ رہا ہے جیسے تو ایک خارش زدہ کتیا ہو؟"

وہ چند ثانیوں تک خاموش لیکن نفرت اور غصے کی حالت میں اس کی بات سنتی رہی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چلتا رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوتا رہا۔ تمتا تا رہا۔ کان کی لویں دہک رہی تھیں۔ پھر وہ تپی تلی تلخ آواز میں بولی۔

"میں تیری ان باتوں سے انکار نہیں کروں گی...... یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ مجھے نہ صرف تیری جوانی بلکہ تیری محبت کا جذباتی انداز پسند آیا تھا۔ اب تو میرے قابو میں آچکا ہے۔ اب مجھے تجھ سے سخت ترین نفرت ہو چکی ہے...... تیرے کارن میرا بیٹا میرے ہاتھوں موت کی بھینٹ چڑھ گیا۔ مجھ پر جان دینے والے سنگھ ناگ نے ہتھیا کرلی۔ اب میں تجھے کٹھن سزائیں دوں گی اور تیری لاش کے بدلے شیوناگ سے تیرا وہ لڑکا لے لوں گی جو تیری پتنی نیلم کی کوکھ سے اس ڈراؤنی دھرتی پر جنم لینے والا ہے۔ تیری ہٹ کے بعد اب اس پر میرا پورا پورا ادھیکار ہے۔ میں اسے اپنی راتوں کی مانگ میں سجاؤں گی۔"

آکاش کا دماغ ماؤف ہونے لگا کہ جل کماری ایک مرتبہ پھر اسے اس کے سگے خون کے بارے میں اپنا گھناؤنا منصوبہ بنا رہی تھی۔ جب کہ اس کا بچہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ اس پر جل کماری کی ہوسناک نگاہیں مرکوز تھیں۔

"اس بار میں نے جو تمہیں چاہا تھا اس میں کوئی کھوٹ اور تصنع نہیں تھا۔" آکاش نے بڑے مضبوط لہجے میں اسے یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔ مگر اصل بات یہ تھی کہ تم نے میری اس محبت، جذبے اور والہانہ پن کا جواب خلوص سے نہیں دیا بلکہ تم نے مجھے اپنے حسن کی کیف و مستی کا فریب دے کر منکے کے حصول پر لگی ہوئی تھیں کہ مجھے ہر طرح سے خوش کر کے منکہ حاصل کرلو۔ تمہاری مجبوری یہ تھی کہ تم میری آگیا کے بغیر منکہ حاصل نہیں کر سکتی تھیں۔"

"سن...... مجھے مورد الزام نہ ٹھہرا...... تیرا دل صاف ہوتا اور میل نہ ہوتا......ریاکاری اور میرے قرب کی ہوس نہ ہوتی تو مجھے بتا دیتا کہ منکہ اب تیرے پاس نہیں ہے اور وہ سنگیت کے پیٹ میں محفوظ ہو چکا ہے۔ لیکن چوں کہ تو پاپی بنا ہوا تھا۔ اس لئے پاپ کی سیاہی کے دلدل میں ڈوب کر درندہ بن گیا تھا۔" جل کماری نے بڑی نفرت اور حقارت سے کہا۔

آکاش نے سمجھ لیا تھا کہ اب وہ اس کی کسی بات کو سچ نہیں مانے گی اور اسے اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ جل کماری کسی بیمار کی طرح اس کے منصوبے کے جال میں نہیں آئے گی۔ آکاش نے سوچا کہ تیر کمان سے نکل چکا ہے اور وہ کسی قیمت پر اس کی باتوں میں نہیں آئے گی۔ اس لئے جل کماری سے مصالحت کرنا فضول اور بے سود تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ جل کماری کے سامنے جھکنے سے بہتر ہے کہ اس سے پامردی سے مقابلہ کرے۔ جب کہ اس کی آخری سانس میں ہمت ہے......دم خم ہے اور وہ جو کچھ کر سکتا اور تدبیر سوچ سکتا ہے کرلے۔

"تم جو کہہ رہی ہو میں تمہارے اس الزام اور جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔" آکاش نے اس کی نظروں میں اپنی نظریں پیوست کردیں۔ لیکن اس میں میرا اتنا قصور نہیں ہے جتنا تیرے جادو بھرے بدن کا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تیری معیت میں گزرتے ہوئے لمحہ لمحہ سے محروم ہو جاؤں...... کاش! تم اتنی حسین نہ ہوتیں...... اب ان تمام باتوں سے ہٹ کے بتاؤ کہ تم کیا چاہتی ہو؟ میں تیری ہر بات اور فیصلہ سننے کے لئے تیار ہوں......تو مجھے کیا سزا دینا چاہتی ہے؟"

وہ ایک زوردار مکروہ قہقہہ مار کے ہنسی۔ اس کی ہنسی اس قدر زہریلی اور بھیانک تھی جیسے کوئی چڑیل نہیں رہی

ہو اور اس کے بدن پر ایک جھرجھری سی آ گئی۔ وہ بولی تو اس کی آواز کسی ڈائن کی سی غراہٹ تھی۔

تو اس لئے مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کررہا ہے کہ منکہ کے بغیر تو میرے پاؤں تلے کسی کیڑے کی طرح آچکا ہے...... میں جب اور جس وقت اور جس لمحہ چاہوں تجھے مسل کر رکھ دوں۔"

"میں جانتا ہوں کہ تو میری بے بسی اور کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔" آکاش نے بے نیازی سے کہا۔ "تو مجھے خوف زدہ اور ہراساں کررہی ہے۔ جس کی مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔"

"لیکن میں تجھے یہ بات بتادوں کہ تو اتنی آسانی سے موت کی بھینٹ نہیں چڑھے گا...... میں موت سے کہیں بے رحم اور سفاک ہوں...... تیرے بدن کا ایک ایک جوڑ ہلا کے رکھ دوں گی...... تو موت کے لئے منت کرے گا۔ سماجتیں کرے گا اور التجائیں کرے گا...... میرے چرنوں کو کسی کتے کی طرح چاٹے گا...... کیوں کہ جب تجھے اندازہ ہوگا کہ اس زندگی سے موت بہتر ہے...... لیکن زندگی کے ڈراؤنے اور بھیانک روگ تیرا سایہ بنے رہیں گے۔" اس نے پھر ایک بھیانک قہقہہ لگایا اور اسے گھورنے لگی۔

"مجھے موت سے ڈرانے کی کوشش نہ کرو...... میں موت سے خوف زدہ ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

آکاش نے اس پر اپنی بے خوفی ظاہر کرنے کے لئے مسکرادیا۔ لیکن اسے اپنی یہ مسکراہٹ بے جان سی لگی۔ وہ بولا تو اسے اپنی آواز کھوکھلی سی لگی۔ لیکن یہ حقیقت تھی کہ جل کماری نے جس لہجے اور جن الفاظ میں اسے مخاطب کیا تھا اس کے سارے بدن میں لہو کو منجمد کردیا تھا۔

"میں نے تیرے لئے پھانسی تیار کردی ہے...... ابھی تو خود ہی دیکھ لے گا کہ میں نے تیری سواگت کے لئے کیا شان دار بندوبست کیا ہے۔" وہ تلخی سے بولی اور زور سے تالی بجائی۔

ایک لمحے کے لئے آکاش کے دل میں آیا کہ کیوں نہ جل کماری کو دبوچ کے پیار و محبت اور من مانیوں سے اس کی نفرت اور حقارت کو دھودے۔ اس کی محرومیاں اور حسد و جلن دھودے...... جو بھی ہو اس ڈائن کے دل کے کسی کونے میں اس کی محبت کی رمق موجود ہے۔ شاید وہ برف کی طرح پگھل جائے۔ آخر وہ عورت ہے اور وہ مرد...... دونوں ایک دوسرے کی محبت اور جذبات کی رو میں کئی بار بہہ چکے ہیں۔ اور پھر جل کماری ایک ہوس پرست عورت ہے۔ وہ اپنے آپ کو محبت اور خود سپردگی سے حوالے کردے گی۔

لیکن جل کماری اس سے کئی قدموں پر تھی۔ قریب ہوتی تو کسی شکاری کی طرح جھپٹ پڑتا۔ وہ اس کی طرف پیش قدمی کرتا تو وہ فوراً ہی اس کے ارادے کو بھانپ کے ہٹ جاتی...... معاً اس کی نگاہ سامنے نظر آنے والے دیوہیکل سیاہ چبوترے پر پڑی عجیب سی دھند کی آغوش میں لپٹا ہوا تھا۔ اسے یوں لگا تھا جیسے پتھروں کا وہ چبوترہ برف کی کسی سل کی طرح تیزی سے پگھلتا جارہا ہو۔ اس کا حجم بتدریج گھٹتا رہا اور آخر کار وہ چبوترہ اپنی جگہ سے پراسرار انداز میں بالکل غائب ہوگیا اور اس مقام پر اتنی گہری دھند چھاگئی کہ وہ کوشش کے باوجود اس کے پار کچھ نہ دیکھ سکا۔

اس کا دل ان جانے وسوسوں کی بنا پر غیر معمولی افتاد سے دھڑک رہا تھا۔ اندیشوں کے زہریلے پھنکارتے ناگ اس کی چھٹی حس کی ہولناک خطرے سے آگاہ کررہی تھی۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس کے پیروں میں مجبوری کی بیڑیاں پڑی تھیں۔ اپنی جسمانی طاقت اور قوت ارادی کے سوا اسے ایسی کوئی مدد حاصل نہیں تھی جس کے سہارے میں آنے والے لمحوں کی عقوبت ٹال سکے اور اس کے سائے سے بچ سکے۔

جل کماری کی نگاہیں کسی ساحرہ کی طرح اس دھند پر جمی رہیں۔ پھر اسے اس دھند میں یک لخت نہ جانے کیا نظر آیا کہ اس نے زور سے چیخ کر زمین پر داہنا پیر مارا اور وہ کہر ایک دم غائب ہوگئی۔ اس کے چھٹنے پر جو منظر سامنے آیا اسے دیکھ کر آکاش کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

(جاری ہے)

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

زندگی پر اس سے بڑھ کے تبصرہ کوئی نہیں
ٹھیک دریا کے کنارے ہے زمین کربلا
کربلا میں اہل بیت کے حوصلے تھے دید کے قابل
وہاں پر شکر کرتے تھے جہاں پر صبر مشکل تھا
(ساحل دعا بخاری...... بصیر پور)

اپنوں سے بھی کبھی درد ایسا ملتا ہے
آنسو پاس ہوتے ہیں پر رویا نہیں جاتا
(صبا محمد اسلم...... گوجرانوالہ)

قدرت کے کرشموں میں اگر رات نہ ہوتی
تو خوابوں میں بھی کبھی ان سے ملاقات نہ ہوتی
یہ دل ہر غم کی وجہ ہے وسیم
یہ دل ہی نہ ہوتا کوئی بات نہ ہوتی
(شرف الدین جیلانی...... ٹنڈوالہ یار)

دن رات ماہ و سال سے آگے نہیں گئے
ہم تو تیرے خیال سے آگے نہیں گئے
لوگوں نے روز مانگا نیا خدا سے کچھ
ہم اک تیرے سوال سے آگے نہیں گئے
(رضیہ...... کراچی)

چہرہ تو چھپالیا ہے اب آنکھیں بھی چھپالو جانم
ہم دل میں اتر جاتے ہیں آنکھوں کے راستے
(شمش الحق...... کراچی)

کس کی عنایتوں نے یہ دن دکھائے ہیں
میرے اپنے بھی یوں پھر سے پرائے ہیں
کھل کے برستا نہیں آج یوں ابر بھی
ہم زمانے کے ہاتھوں سے ستائے ہیں
(محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد)

میں جو کوئی بھی ہوں صرف تیرا ہوں
مجھ سے اے میرے دوست میری ذات نہ پوچھو!!!
(فلک فیضان...... رحیم یار خان)

کچھ رنگ تیرے روپ میں "یوسف" کی طرح ہیں
ورنہ میں تیرے ہجر میں "یعقوب" نہ ہوتا.....!
تیری طرح میں بھی کسی اور کو دل میں بسالیتا.....
تو ہر وقت یہ تیری یاد میں "مصلوب" نہ ہوتا!
(انتخاب: راحل بخاری...... بصیر پور)

زخموں کو جو اس کے ہم نے اپنالیا
پھولوں جیسے پھر کسی نے بدن پہ سجالیا
بھولتا نہیں ہے اس کا چہرہ اب تو خواب میں
اس نے غم کے ماروں کو یوں رلادیا
(انتخاب: یاسمین...... کراچی)

ذرا سی بات پہ وہ بدگمان ہوگیا
مسکراتا ہوا دل پھر سے سنسان ہوگیا
ہنستے بستے گھروں میں یہ کیسا آسیب چھاگیا
کسی کے اجڑنے کا پھر سے سامان ہوگیا
(انتخاب: سلمان سلیم...... کراچی)

جہاں میں جس سے تھی زندگانی میری
بھولے سے اس نے قدر نہ جانی میری
(انتخاب: رضوان علی...... لاہور)

زندگی جینے کے قابل نہ ہوتی
اگر خدا نے محبت بنائی نہ ہوتی
کوئی موت کی تمنا نہ کرتا دانش
اگر محبت میں بیوفائی نہ ہوتی
لاہوتی عماد.......... آھدی موڑ دوشالہ

محبت کے قیدیوں کو زنجیر کی کیا ضرورت
محبت دل میں ہو تو تصویر کی کیا ضرورت
سید وہاب علی.......... کراچی

جب تیرا درد میرے ساتھ "وفا" کرتا ہے
اک سمندر میری "آنکھوں" سے بہا کرتا ہے
اُسکی باتیں مجھے "خوشبو" کی طرح لگتی ہیں احسان
پھول جیسے کوئی صحرا میں کھلا کرتا ہے
احسان سحر.......... میانوالی

یہ چاند اور ستارے رفیق ہیں میرے
میں روز ان سے بیان اپنا حال کرتا ہوں
غلام سرور کھوکھر.......... قصور

☆☆

لیکن جب دل سے چھن جائے محبت مار دیتی ہے
جدائی زندہ رکھتی ہے رفاقت مار دیتی ہے
کبھی دامن کو پھیلانا بڑا دشوار ہوتا ہے
کبھی انسان کو اس کی ضرورت مار دیتی ہے
تعلق ظالموں سے ہو تو کوئی کچھ نہیں کہتا
کسی مظلوم کی لیکن حمایت مار دیتی ہے
کبھی انکار کے رستے پہ چلنا ٹھیک ہوتا ہے
کبھی انسان کو اس کی بغاوت مار دیتی ہے
کبھی ظلم و ستم رکھتا ہے دنیا میں اسے زندہ
کبھی انسان کو اس کی شرافت مار دیتی ہے
ذرا سا بھی کسی سے بھر سفر طے ہو نہیں سکتا
لیکن جب دل سے چھن جائے مسافت مار دیتی ہے
کبھی معصوم بن جاتا ہے دنیا کی یہ نظروں میں
کبھی انسان کو دل کی عدالت مار دیتی ہے
(حکیم خان حکیم...... کامل پور موسیٰ)

زہے تحریک غم باب اکثر تک جا پہنچی
دعائے نیم شب آہ اثر تک جا پہنچی
یہ ذوق سجدہ ریزی رنگ ہی لاکر رہا آخر
جبیں کی آج ان کے سنگ در تک بات جا پہنچی
کسی کے حسن عالم تاب کی ضوپاشیاں توبہ
ستارے، کہکشاں، ہر و قلم تک بات جا پہنچی
بھٹکتا کارواں نزدیک منزل جب نظر آیا
فریب وہمیٰ رہبر تک بات جا پہنچی
مریض غم کی حالت کا خدا ہی حافظ و ناصر
کہ اب بے چارگی چارہ گر تک بات جا پہنچی
مٹادینے کو ہے عالم، سعی آشگفتہ ساماں کو
قدر اے جذبہ دل بے دلی اوپر تک جا پہنچی
لہو جب رونے لگی چشم گل واجد گلستان میں
حال فکر ارباب نظر تک جب بات جا پہنچی
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی...... کراچی)

غم شام، درد سحر جوں کا توں تھا
محبت کا تیری اثر جوں کا توں تھا
جلانے کی کوشش میں شامل تھی دنیا
مگر چاہتوں کا وہ گھر جوں کا توں تھا
شہر سے جو لوٹا تو آنکھوں نے دیکھا
وہ صدیوں پرانا نگر جوں کا توں تھا
یوں محسوس ہوتا تھا منزل قریں تھی
جو آنکھیں کھلیں تو سفر جوں کا توں تھا
نبھانے کو قسمیں تو کھاتا رہا وہ
مگر دل میں رانا کے ڈر جوں کا توں تھا
(قدیر رانا...... راولپنڈی)

ناکام ہو کے بھی تجھ سے وفا نبھاتے رہے
ہر قدم پہ ہم تو یوں بھی فریب کھاتے رہے
بہت دور تک بھی تیری شہرت کی ہوا
بھولے سے تم کیوں پھر نگاہ چراتے رہے
تیری دہلیز پہ پہنچے تو صدا کوئی نہ آئی
روٹھے ہوؤں کو ہم یوں بھی مناتے رہے
جن کے طفیل زندگی میں پھول کھلتے تھے
آج وہ میری نظروں سے اوجھل ہوتے رہے
چپ چاپ ہے فضا ساری تیرے بناں ہمسفر
تیری یادوں سے ہم پھر دل کو جلاتے رہے
سکھ کوئی نہ پایا سب کچھ لٹا کے جاوید
دیکھ کے قسمت اپنی ہم پھر اشک بہاتے رہے
(محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد)

سودا عمل لے کر جس وقت نکلتا ہوں
تقدیر کی گردش کو پاؤں سے کچلتا ہوں
غرور کی آتش کا کیا مجھ پہ اثر لیکن
اک آگ ہے سینے میں اس آگ میں جلتا ہوں
عرفان کے درجے کو پہنچا ہے جنون میرا
ہر روز نئی خود ہی زنجیر بدلتا ہوں
کھٹکا ہو مجھے کیونکر گہرائی باطل کا
فطرت کے ضوابط کی آغوش میں پلتا ہوں

دانش کی بساط اٹھی اب دل کا زمانہ ہے
جس راہ میں خطرہ ہو اس راہ پہ چلتا ہوں
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

ہماری آنکھ سے آنسو اگر ٹپک جاتا
تمہاری بزم میں شعلہ سا اک بھڑک جاتا
ٹھکانہ مل ہی گیا ورنہ تیز بارش میں
وفا کا پنچھی یقیناً کہیں بھٹک جاتا
سفارشوں سے اسے نوکری ملی تو سہی
وہ لڑکا ورنہ پیڑ سے لٹک جاتا
ملا کیا توڑ کے تم کو ذرا بتاؤ تو
جو کام صبر سے لیتے تو پھل بھی پک جاتا
پکارنا تو خدا کو بہت ضروری تھا
تمہارے گھر سے کیا جاتا، ہمارا حق جاتا
سفر وفا کا تھا عاطر محیط صدیوں پر
وہ دو قدم بھی اگر ساتھ چلتا، تھک جاتا
(رانا حنیف عاطر......جھڈو)

شکوہ عشق نہیں جرأت گفتار نہیں
میرے ہاتھوں میں کوئی جبر کی تلوار نہیں
ابن آدم ہوں انسان سے محبت کی ہے
آگ کا، چاند کا، پتھر کا پرستار نہیں
میں نے مانا کہ تو یوسف سا حسین ہے لیکن
یہ میرا دل ہے کوئی مصر کا بازار نہیں
اے خدا مجھ کو "محبت" دے "عبادت" کے عوض
میں تو تیری کسی جنت کا خریدار نہیں
جس نے انسان سے محبت ہی نہ کی ہو اقبال
درحقیقت وہ خدا کا بھی طلب گار نہیں
(انتخاب: شگفتہ ارم درانی......پشاور)

ایسا نہیں کہ تجھ سے محبت نہیں ہمیں
غم روز روز سہنے کی عادت نہیں ہمیں
ہر بار تیرے سامنے سر کو جھکا لیا
اور پھر بھی دیکھ تجھ سے شکایت نہیں ہمیں

تو یہ اعتبار کر کہ تجھے چاہتے ہیں
تیرے سوا کسی کی بھی چاہت نہیں ہمیں
ہم جانتے ہیں کہ تو ہے تنہا ہمارے بن
اوروں سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہمیں
تو بھول بھی جائے تو آئیں گے تیرے پاس
دیکھ تیرے بغیر جینے کی عادت نہیں ہمیں
(صبا محمد اسلم......گوجرانوالہ)

سنا ہے!!! سنا ہے اس جہاں میں زندگی کی قحط سالی ہے
یہاں دو چار دن جینے کا اکثر ذکر ہوتا ہے
یہاں ہر چیز فانی ہے سبھی کو موت آنی ہے
یہاں اظہار کیا کرنا یہاں پر پیار کیا کرنا
مگر......! مگر کچھ یوں بھی سنتا ہوں
کہ ایسا اک جہان ہوگا
جہاں پر موت آنے کا کوئی دھڑکا نہیں ہوگا
حیات جاوداں کے سب وہاں اسباب رکھتے ہیں
یہ میرا تم سے وعدہ ہے، ہاں وعدہ ہے
اگر......!!! دونوں وہاں مل گئے
وہیں اقرار کرلیں گے وہیں اظہار کرلیں گے
وہیں پھر پیار کرلیں گے وہیں پھر پیار کرلیں گے
وہیں پھر پیار کرلیں گے......!!!!
(فلک فیضان......رحیم یار خان)

ہزاروں بار کہتے ہیں ہمیں تم سے محبت ہے
سر بازار کہتے ہیں ہمیں تم سے محبت ہے
کبھی جن کی گھنی چھاؤں میں دونوں بیٹھ جاتے ہیں
وہ سب اشجار کہتے ہیں ہمیں تم سے محبت ہے
میں جب بھی پوچھتا ہوں اپنے بارے میں خیال ان کا
تو وہ ہر بار کہتے ہیں ہمیں تم سے محبت ہے
بہاریں جب چمن کی محفلوں میں مسکراتی ہیں
گل و گلزار کہتے ہیں ہمیں تم سے محبت ہے
ہمارا راز الفت آشکارا ہوگیا کیسے
کہ اب اغیار کہتے ہیں ہمیں تم سے محبت ہے
سر محفل جو اپنا حال دل کہتے نہیں یاور

پس دیوار کہتے ہیں ہمیں تم سے محبت ہے
(انتخاب: کاشف عبید کاوش...... بٹ گرام)

ہم سے کیا پوچھتے ہو ہجر کے موسم میں
ہم تیرے لوٹ آنے کی دعا کیا کرتے ہیں
ہر لمحہ تصور میں تجھے سوچا کرتے ہیں
یوں تیری یادوں کا احترام کیا کرتے ہیں
تم ہی نہیں ہو جاناں ورنہ اب بھی وہیں دسمبر میں
دھوپ میں بیٹھ کر تیری لکھی شاعری پڑھا کرتے ہیں
اب کوئی ہاتھ انہیں سنبھالنے نہیں آتے
میری آنکھوں میں اگر آنسو ہوا کرتے ہیں
تیرے جانے کے بعد اس ویران دل کو ایسے سنبھالا ہے
کہ بس صبح وشام ہر کونے میں تیری یادیں مسکراتی ہیں
ہم سانس لے رہے ہیں فقط تیری یادوں کے سہارے
ورنہ وہ مسکراتا باسط تو مرچکا ہے کب کا
(راجہ باسط مظہر بھٹی...... گوجر خان)

کتابوں کے ورق کو پلٹ کر سوچتا ہوں
یونہی پلٹ جائے زندگی تو کیا بات ہے
خوابوں میں مجھے روز ملتا ہے جو
حقیقت میں مل جائے تو کیا بات ہے
کچھ مطلب کے لئے لوگ ڈھونڈتے ہیں مجھے
بن مطلب کا کوئی آئے تو کیا بات ہے
قتل کرنے کے بعد تو سب ہی لے سکتے ہیں
دل میرا اگر کوئی باتوں سے لے جائے تو کیا بات ہے
اپنے رہنے تک تو خوشی دونگا سب کو اے دوست
کسی کو میرے پیار سے خوشی مل جائے تو کیا بات ہے
(طاہر اسلم عرف مٹھو بلوچ...... سرگودھا)

تجھے یاد رکھے یہ دنیا کچھ ایسے کام کر
محبتیں ہوں عام ختم ہوجائیں یہ شر
زر۔ زن۔ زمین کا جگڑا ہے چار سو
قصہ تمام کر ان کا اور کسی بات سے نہ ڈر
دشمن ہوا ہے کیوں بھائی بھائی آج کل
دیکھ کر حال زمانے کا دامن ہوگیا میرا تر
یہ ہالا خانے یہ میکدے آباد ہوئے ہیں جب سے
تب سے ویراں ہونے لگے ہیں خدا کے گھر
نام تیرا بھی لکھا جائے گا سنہری حروف میں
اخوت و اتفاق کا درس پھیلادے گا تو اگر
فقط اپنا ہی نہیں دوسروں کا درد بھی رکھتے ہیں ہم
بہت روئیں گے اپنے وغیر ''قاضی حماد'' جوگیا مر
(قاضی حماد سرور...... اوکاڑہ)

پھر دل نے کہا ہے تجھے مانگوں خدا سے
پھر آنکھوں نے تیری دید کی چاہت کی ہے
پھر آج برس گئیں یاد میں تیری آنکھیں
پھر آنکھوں نے نیند کی چاہت کی ہے
پھر لہجہ میں دکھ آن سمیٹا ہے
پھر آنسوؤں نے آنکھوں سے بغاوت کی ہے
پھر وہ تیرا ساتھ یاد آگیا مجھ کو
پھر دل نے محسوس تیری ضرورت کی ہے
تیرے دکھ تیری یاد سینے سے لگا کر
بہت ٹوٹ کر میں نے تجھ سے محبت کی ہے
بیان کر ان سے میرا حال دل اے زندگی
کہیں وہ یہ نہ سمجھیں ہمیں ان کی یاد نہیں آتی
(ابوہریرہ...... بہاولنگر)

جام تو بہت ہیں لیکن کوئی نہیں ہے ساقی
گر پلانا ہی ہے تو نور کا جام ہی پلادے ساقی
حوض کوثر ہے اور ہم کھڑے ہیں بھکاری تمہارے
اپنی رحمت کے بھر بھر کر پلادے جام ساقی
یہ تو عیاں ہیں سب پہ کہ رحیم و کریم ہے تو
محبوب کے صدقے بھردے جھولی ہماری ساقی
آخرت میں لگا ہوگا ہجوم حوض کوثر پے
ہو نہیں سکتا کہ ہمیں بھول جائے ہمارا ساقی
ہم منگتے ہیں زندگی بھر مانگا ہے تجھی سے
اپنے فضل و کرم کے دو گھونٹ پلادے ساقی
(سلیم بیگ ہمدانی...... کراچی)

وقت کی سکندر ہوں
پھر بھی تم سے کمتر ہوں
مجھ کو دیکھتے کیا ہو؟
آئینے سے سندر ہوں
تم خوشی کے ساحل ہو
غم کا میں سمندر ہوں
ناز خود پہ کرتا رہ
تیرا میں مقدر ہوں
کہتی ہے نظر تیری
خوش نما سا منظر ہوں
عرش پر چمکتی ہوں
چاند کے برابر ہوں
تو اگرچہ ہے پارس
میں بھی ایک جوہر ہوں
نور پھیلا خانم پر
اس لئے منور ہوں
(فریدہ خانم......لاہور)

جو مٹ جائے دو باتوں سے
تھکن اس کو نہیں کہتے
جو لمحوں میں اتر جائے
تھکن اس کو نہیں کہتے
آنکھیں موند دے میری
میری تھکن اتار دے
کبھی تو تھم بیسل بحر بیکراں
کبھی تو ڈھل
شب ہجر میں مسافراں
میری جاں پہ بن گئی ہے
تلوار تن گئی ہے
تجھے یہ نہیں کہتی
گھونگٹ اتار دے
اے وقت کی رقاصہ
جھانجھر اتار دے
(یاسحر......مدینہ سیداں گجرات)

دکھ صرف
لفظوں میں نہیں کھلتے
کسک
صرف لہجوں اور باتوں میں نہیں تیرتی
کچھ جذبے ہمیشہ نظر بند رہتے ہیں
کچھ خوابوں کو کبھی پیرہن نہیں ملتا
ایسے میں......
تمہاری امیر آنکھوں کو
میرے غریب جذبوں پر پڑی
اذیت کی دھول کیسے دکھائی دے
گی......؟
(انتخاب:......ساجد وراجہ ہنڈواں سرگودھا)

اک لمحہ ہوں جانے والے
لوٹ کے پھر نہ آنے والا
غم کی خوشی کی کیا پرواہ ہے
ہر دم چلنے سے ناتا ہے
مختی میرے دلبر جانی
غافل کی ہے ایک نشانی
پہلے خود نہ کام کرے گا
پھر مجھ پر الزام دھرے گا
جس نے مجھ کو سمجھا فانی
جگ نے وہ شخصیت مانی
(چوہدری قمر جہاں علی پوری......ملتان)

صبح و شام اچھا کام کریں ہم
بڑوں کا احترام کریں ہم
جب کسی سے ملاقات کریں ہم
پہلے اس کو سلام کریں ہم
ہر روز نیا کام کریں ہم
حکم مانیں ماں باپ کا ہر آن ہم
کھیلتے بھی ہیں خوب ہم
پڑھتے بھی ہیں خوب ہم
عبادت بھی کرتے ہیں خوب ہم
ذر بھی پڑھتے ہیں خوب ہم
نماز کا اہتمام کریں ہم
قرآن کو صبح و شام پڑھیں ہم
(تحریر نعیم اللہ......ہڈالی)

سال کی پہلی بارشوں کے موسم میں
تجھے یاد کرنے کی عادتیں پرانی ہیں
آج بھی ان بارشوں میں کھڑے
گھنٹوں بھیگتے رہتے ہیں
مگر
بھیگنے کا احساس نہیں ہوتا
کیونکہ
اپنے وجود کو بھلا کر
ہم تیری یادوں میں کھو جاتے ہیں
پر اب کی بار سوچا ہے
عادتیں بدل ڈالیں گے
لیکن
پھر خیال آیا عادتیں بدلنے سے
سال کی پہلی بارشوں کے موسم میں
کبھی تبدیلی کا سونامی نہیں آئے گا
اب کے سال پہلی بارشوں کے موسم
میں
تیرے بن جیا نہ جائے گا
لوٹ آؤ جاناں
کہ
اب کے سال ان
بارشوں کے موسم میں
اکٹھے بھیگیں گے
ایک دوسرے میں کھو کر
پھر سے ایک جاں ہو جائیں گے
(راجہ باسط مظہر بھٹی......گوجر خان)

جان میری مجھ کو تم بے پناہ چاہو
چاہا نہ ہو کسی نے اس طرح چاہو
میری ذات میں سما جاؤ تم اس طرح
نکل نہ پاؤ جو اگر تم نکلنا چاہو
(حمیرا غلام حسین کیریو......کراچی)
☆☆

عقرب

نور محمد کاوش۔سلانوالی سرگودھا

نوجوان کو زور زبردستی قابو کرکے اسے ایک شیشے کے بڑے تابوت میں ڈال دیا اور پہلے سے اس تابوت پر ہزاروں بلکہ لاکھوں خونخوار زہریلے بچھو موجود تھے کہ نوجوان کی فلک شگاف چیخ کان پھاڑنے لگی۔

جناتی دنیا کی خیروشر کے ماحول میں تہلکہ مچاتی دلوں کو دہلاتی اچھوتی اورانوکھی کہانی

میں جس گھر میں مقیم تھا وہ گھر کسی پرانے کھنڈر سے مشابہہ تھا۔اس کی کھڑکیاں بھی ثابت نہ تھیں۔ اور اس کے چوبی ستون تک دیمک خوردہ ہوچکے تھے۔سونے پہ سہاگا مکان کا نصف حصہ درختوں کے جھنڈ میں روپوش تھا اورنظر آنے والے حصے پرخشک بیلیں کسی سادھو کی بے ترتیب داڑھی کی مانند پھیلی ہوئی تھیں۔چاروں اطراف خاموشی کا راج رہتا تھا کیونکہ میرا گھر آبادی سے چنداں ہٹ کے تھا۔میرے گھر کے ساتھ ایک ہی میرے گھر سے مشابہہ گھر تھا،جس کی دیوار میرے گھر کی دیوار کے ساتھ مشترکہ تھی مگر میں نے عرصے سے وہاں پر کسی کو رہتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

لکڑی کا میلا ٹوٹا ہوا دروازہ ،اس پر لٹکا ہوا ٹاٹ کا پھٹا ہوا پردہ، صحن میں لگا ٹاہلی کا درخت اور دو گھروں کو جوڑتی ایک مشترکہ دیوار جس میں دراڑیں پڑ چکی تھیں۔ ڈوبتے سورج کی کمزور کرنیں بے بسی سے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں مدغم ہورہی تھیں۔سونے پہ سہاگا دھند غیر ماورائی آسیب کی طرح گردوپیش پر چھارہی تھی۔

کمرے میں لیٹے لیٹے نجانے کیوں یکبارگی میرا دل ہولنے لگا۔حالانکہ ٹھنڈ بہت زیادہ بڑھ چکی تھی باوجود اس کے کہ نجانے کیوں کمرے میں آنا فانا گھٹن بڑھنا شروع ہوگئی اور یوں لگنے لگا جیسے ابھی سانسوں کی ڈوری ٹوٹ جائے گی اور میرا جسد خاکی کرچیاں کرچیاں ہوجائے گا۔میں چاروناچار خستہ حال چارپائی سے اٹھا اور ہاتھ بڑھا کر جیبی ٹارچ کی روشنی میں دیوار کے ساتھ نصب گردآلود بورڈ کے بٹن دبانے شروع کردیئے تبھی میری تابڑتوڑ سعی رنگ لائی اور درختوں کی جھنڈ سے چھائے اندھیرے کی لپیٹ میں آئے صحن میں لگا اکلوتا بلب روشن ہوگیا۔مگرنیم تاریک ماحول،مدقوق بلب کی شرمسار روشنی اندھیرے پر حاوی ہونے سے قاصر تھی۔

یہ گھر مجھے آباؤاجداد سے ورثے میں ملا تھا۔ماں باپ بچپن میں ہی خالق حقیقی سے جاملے تھے۔والد کی شہر کے وسط میں ہی ایک پرچون کی دوکان تھی۔جس سے اچھی خاصی آمدن حاصل ہوجاتی تھی۔ والد صاحب کی رحلت کے بعد اس دوکان کو تایا جان نے ذمہ دارانہ طور پر چلایا تھا اور تایا جان کی وفات کے بعد میں نے دوکان سنبھال لی تھی۔تایا جان کی کوئی اولاد نہ تھی۔بیوی عرصہ دراز قبل سورگباش ہوگئی تھی۔ انہوں نے والد صاحب کی رحلت کے بعد میری پرورش اپنی سگی اولاد کے جیسی کی تھی۔تایا جان آرمی سے ریٹائرڈ تھے۔ انہوں نے بھی اپنا سب کچھ میرے نام ہی کروادیا تھا۔تایا جان کا بھی ایک گھر تھا جسے انہوں نے والد صاحب کی وفات کے بعد بھلے

داموں بیچ کے سارا پیسہ بینک اکاؤنٹ میں رکھ دیا تھا۔ بینک اکاؤنٹ میرے نام پہ تھا۔ جس میں والد صاحب کی جمع پونجی کے علاوہ تایا جان نے اپنی جمع پونجی بھی جمع کروادی تھی جو مل ملا کے اچھی خاصی رقم بن گئی تھی۔

میں صبح سے شام تک دکان پہ اس قدر مصروف رہتا تھا کہ سر کھجانے تک کی فرصت نہ ملتی تھی۔ میرا ارادہ بن گیا تھا کہ اس بوسیدہ مکان کو بیچ کر شہر کے وسط میں ہی کوئی مکان لے لوں۔ میرے پاس اب اللہ تعالیٰ کا دیا بہت کچھ تھا اور میں ایک مہنگا مکان بھی خرید سکتا تھا اور اب ارادہ بھی یہی تھا کہ اس بوسیدہ مکان کو خیر آباد کہہ کر کوئی جگہ شہر کے وسط میں خرید کر وہاں ایک عالی شان کوٹھی تعمیر کرواؤں اور پھر تمکنت اور شان و شوکت سے اپنی شادی کروں۔ میری نظر میں ابھی کوئی لڑکی نہیں تھی اور نہ ہی والدین نے اپنے حیات میں کہیں کوئی بات چیت کی تھی۔ کام سے مجھے بھی فرصت نہ تھی کہ آنے والی زندگی سے متعلق کوئی فیصلہ کرسکوں۔

میرے والدین نے میری پرورش بڑے ناز و نعم سے کی تھی۔ میرے والد صاحب کی دیرینہ خواہش تھی کہ میں پڑھ لکھ کر کسی اعلیٰ عہدے پر فائز ہو جاؤں مگر قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا۔ میں اس وقت میٹرک کے امتحانات سے فارغ ہوا تھا جب والد صاحب اللہ تعالیٰ کی رضا میں چلے گئے اور تایا جان بھی ان کے پیچھے جلد ہی اللہ کی رضا میں چلے گئے۔ پڑھائی سے میرا دل مکمل طور پر اچاٹ ہو گیا تھا۔ در و دیوار کاٹ کھانے کو دوڑتے تھے۔ میٹرک میں نے اعلیٰ نمبروں سے پاس کرلیا تھا باوجود اس کے میں نے تعلیم کو خیر آباد کہہ کے اپنے والد کا کام سنبھال لیا تھا۔ میں جتنا بھی پڑھ لکھ لیتا نوکری تو میری پہنچ سے کوسوں دور تھی کیونکہ اس ملک کا ایک دیرینہ رواج لحظہ بہ لحظہ چلتا آرہا ہے کہ جو جس نشست پر براجمان ہے اس کی نشست پر کوئی اور براجمان ہونے کی جسارت نہیں کرسکتا بلکہ اس نشست کا وارث اس کی پود ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ڈگری ہولڈر امراء ان ڈگریوں کی کاپیاں کروا کے ان میں کوئی دال بیچ رہا ہوتا ہے تو کوئی چھولے۔

ڈگری ویسے تو کام نہ آئی چلو دال چھولے بیچنے کے تو کام آئی۔ امراء کی صف اول میں غرباء کے لیے جگہ حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔ اگر کوئی غریب ترقی کی منازل طے کرتا ہوا آگے آنے بھی لگے تو غرباء اس کو وبال جان گردانتے ہوئے جلد ہی اس کی خاطر تواضع کردیتے ہیں۔

مجھے اب اس گھر سے گھن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اس گھر کے در و دیوار سے مجھے خوف آنے لگا تھا۔ اطبائے فلسفہ نے ہراس کی تحقیقات آج تک مکمل نہیں کی۔ اس لیے یہ بیان کرنا سخت مشکل ہے کہ کونسا منظر کس طرح کا خوف پیدا کرسکتا ہے۔ اکثر راتوں کو ڈر سے اٹھ کے بیٹھ جاتا تھا یوں لگتا تھا جیسے بہت سے خوفناک چہرے یکبارگی مجھے نگل لینا چاہتے ہیں۔ نجانے کیوں میرے شب و روز اس گھر میں عذاب کی مانند گزرنے لگے تھے۔ آج بھی سوئے سوئے یکبارگی یوں لگا جیسے کسی نے جھنجھوڑا ہو۔ میں حواس باختہ آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ لائٹ آف تھی۔ جیبی ٹارچ سرہانے رکھی ہوئی تھی جلدی سے اٹھائی اور کمرے کی لائٹ آن کی مگر کوئی بھی نہیں تھا۔ میرا دل خوف سے بری طرح کانپ رہا تھا۔ میری سانسیں بے ترتیب سی ہو چکی تھیں۔ نجانے کیوں ایک ان دیکھے خوف نے میرے رگ و پے پر قبضہ جما لیا تھا۔

کمرے میں اچانک حبس بے جا اور گرمی میں اضافہ ہونے لگا مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ میں سرعت سے باہر نکل آیا۔ باہر نکلتے کے ساتھ یوں لگا جیسے سرد ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو۔ قلب و ذہن کو کچھ راحت محسوس ہوئی۔ تازہ دم ہوا تو جیبی ٹارچ کی روشنی میں دیوار کے ساتھ نصب گرد آلود بورڈ کے بٹن دبانے شروع کیے۔ بجلی کا جیبی ٹارچ جو میرے ہاتھ میں تھا۔ کو مدت دراز سے اس کے استعمال کی نوبت نہ آئی تھی۔ مگر جونہی اسے روشن کیا تو دودھیا روشنی کی لمبی لکیر پھیل گئی۔ تبھی میری تابڑ توڑ سعی سپھل ہوئی اور درختوں کے جھنڈ سے چھائے اندھیرے کی لپیٹ میں آئے صحن میں لگا اکلوتا بلب روشن ہوا۔ ملگجا نیم تاریک ماحول، مدقوق بلب کی شرمسار روشنی اندھیرے پر حاوی ہونے سے قاصر.........

تیز دھوپ ہو تو فلک کا رنگ شفاف نیلم کی طرح لگتا ہے۔ دھوپ کم ہو تو منظر سناٹے کی چادر اوڑھ لیتا ہے۔ ہر شے رنگ بدل لیتی ہے۔ گھاس کے اتنے شیڈ تو کسی کلر کیٹ میں دیکھنے کو نہیں ملتے جتنے دن کے وقت سورج کی کرنوں کے باعث نظر آتے ہیں جبکہ سولے پہ سہاگارات کے اس پہر مدقوق بلب کی روشنی ایک عجیب سماں برپا کر رہی تھی۔ اوپر سے دھند نے چہار سو کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں اس وقت تنگ موری کے پاجامے اور کرتے پر واسکٹ پہنے ہوئے تھا اور پیروں میں کولہاپوری چپل تھی۔ ایک شانے پہ بڑا رومال تو میں ہر وقت رکھتا تھا اور یہ خو مجھے آباؤ اجداد سے ملی تھی۔ میرے تایا جان بتاتے تھے کہ دادا حضور بھی ایسے ہی شانے پہ رومال رکھتے تھے۔ آگے والد صاحب اور تایا جان کا رومال بھی سدا شانے پہ ہی رہتا تھا۔ پھر ایک چلتی پھرتی وراثتی خصلت نے مجھے تو نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی گرفت میں جکڑنا ہی تھا۔ بے شک چہار سو دھند نے اپنا جال پھیلا رکھا تھا مگر باوجود اس کے ماحول میں خنکی اتنی زیادہ نہ تھی۔ مجھے ذہنی و قلبی اضطراب سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔ لیٹے لیٹے اچانک یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے کمرے میں کسی نے آگ کے شعلے بلند کر دیے ہوں اور اب کچھ سکون میسر آیا تھا۔

میں اپنی ہی دھن میں مگن ایستادہ تھا کہ یکبارگی میری قوت سماعت سے کسی کے گنگنانے کی بازگشت ٹکرائی۔ یہ مردانہ آواز تھی۔ کوئی دھیمے دھیمے گنگنا رہا تھا۔ میں نے بغور سنا تو گنگنانے کی یہ بازگشت ساتھ والے گھر سے آ رہی تھی جو عرصہ دراز سے مقفل تھا۔ میں نے بھنویں اچکائی۔ حیرت ہویدا ہوئی کہ یہاں عرصہ دراز سے کوئی قیام پذیر نہیں ہے کیونکہ یہ ساتھ والا گھر میرے گھر سے کئی درجے بڑھ کر بوسیدگی کا حامل تھا۔ پھر یہاں کسی کے رہائش پذیر ہونے کا تو تصور ہی ناممکنات میں سے تھا۔ میری پیشانی پر حیرت سے سلوٹیں عیاں ہو گئیں کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے بلکہ یہ کہنا بجا ہو گا کہ یہاں تو پوری دال ہی کالی لگ رہی تھی۔ دونوں گھروں کو جوڑتی اس اکلوتی دیوار کے پاس جا سکتا ہوتا تو ایک نظر دیکھ لیتا کہ آخر کار یہاں کون آ کے قیام پذیر ہو گیا ہے۔

تاہلی کے درخت ایک تناور دیوار کا سہارا لیے ہوئے تھا اور پڑوسیوں کے گھر میں قدم جمائے ہوا تھا اس کو پھلانگ کے میں چنداں اوپر ہوا۔ میرے پاؤں زمین سے اوپر اٹھ گئے اور میں کسی لنگور کی مانند لٹک کر رہ گیا۔ اب میں با آسانی پڑوس کے گھر میں تانک جھانک کر سکتا تھا۔ مگر یہ دیکھ کر میں حواس باختہ رہ گیا کہ اس گھر میں ویرانوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ دھند کی چھائی چادر کی وجہ سے آثار واضح تو دکھائی نہ دے پا رہے تھے مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ دیکھنے کے قابل تھا۔ اڑھائی مرلے کے اس مکان میں بیک سائیڈ پہ ایک لمبا کمرہ تھا۔ جبکہ اس کے ساتھ کم و بیش چھ سات فٹ کا برآمدہ تھا۔ مین ڈور کے ساتھ ایک کوٹھری بنائی گئی تھی جسے ڈرائنگ روم کا نام بھی دیا جا سکتا ہے اور کمرہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ تو اس کے مالکان کو پتہ کہ انہوں نے اپنے وقت میں اس کو کن مقاصد کے لیے بروئے کار لائے تھے۔ اس کوٹھری کے ساتھ ایک چھوٹا اٹیچ باتھ روم تھا۔ جبکہ باتھ کی اندرونی دیوار کے ساتھ اور تاہلی کے اس خمار تنے کے نیچے دونوں گھروں کو مشترکہ دیوار کے ساتھ ایک نلکا بھی لگا ہوا تھا۔ جس کو دیکھ کے اندازہ لگانا چنداں دقت طلب امر نہ تھا کہ عرصہ دراز سے اس کو بھی ہاتھ نہیں لگایا گیا۔ اس نلکے پر زنگ کی گہری چادر قبضہ جما چکی تھی۔ الغرض کوئی بھی چیز ادھر سے ادھر نہ ہوئی تھی مگر مجھے اچھی طرح علم تھا کہ گنگنانے کی یہ بازگشت اسی گھر سے سنائی دی تھی اور یہی نہیں میں بغور اس بازگشت کو پہلے سنا تھا دیوار کے ساتھ ایستادہ ہو کر بھی سنتا رہا جب یقین مستحکم ہو گیا کہ یہ بازگشت اسی گھر سے وہ بھی مشترکہ دیوار کے بالکل پاس سے آ رہی ہے تو میں تنے کا سہارا لے کر اس گھر میں تانک جھانک کرنے لگا مگر بے سود۔۔۔۔۔۔

لنگور کی طرح لٹکے لٹکے بازوؤں میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں اوپر سے خنکی میں بھی بتدریج انگریزنگ کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ میں نے تنے کو خیر آباد کہا اور زمین پر آ ٹھہرا۔ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں

تیز دھوپ ہو تو فلک کا رنگ شفاف نیلم کی طرح لگتا ہے۔ دھوپ کم ہو تو منظر سناٹے کی چادر اوڑھ لیتا ہے۔ ہر شے رنگ بدل لیتی ہے۔ گھاس کے اتنے شیڈ تو کسی کلر کیٹ میں دیکھنے کو نہیں ملتے جتنے دن کے وقت سورج کی کرنوں کے باعث نظر آتے ہیں جبکہ سونے پہ سہاگا رات کے اس پہر مدقوق بلب کی روشنی ایک عجیب سماں برپا کر رہی تھی۔ اوپر سے دھند نے چہار سو کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں اس وقت تنگ موری کے پاجامے اور کرتے پرواسکٹ پہنے ہوئے تھا اور پیروں میں کولہاپوری چپل تھی۔ ایک شانے پہ بڑا رومال تو میں ہر وقت رکھتا تھا اور یہ خو مجھے آباؤ اجداد سے ملی تھی۔ میرے تایا جان بتاتے تھے کہ دادا حضور بھی ایسے ہی شانے پہ رومال رکھتے تھے۔ آگے والد صاحب اور تایا جان کا رومال بھی سدا شانے پہ ہی رہتا تھا۔ پھر ایک چلتی پھرتی وراثتی خصلت نے مجھے تو نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی گرفت میں جکڑنا ہی تھا۔ بے شک چہار سو دھند نے اپنا جال پھیلا رکھا تھا مگر باوجود اس کے ماحول میں خنکی اتنی زیادہ نہ تھی۔ مجھے ذہنی وقلبی اضطراب سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔ لیٹے لیٹے اچانک یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے کمرے میں کسی نے آگ کے شعلے بلند کر دیئے ہوں اور اب کچھ سکون میسر آیا تھا۔

میں اپنی ہی دھن میں مگن ایستادہ تھا کہ یکبارگی میری قوت سماعت سے کسی کے گنگنانے کی بازگشت ٹکرائی۔ یہ مردانہ آواز تھی۔ کوئی دھیمے دھیمے گنگنا رہا تھا۔ میں نے بغور سنا تو گنگنانے کی یہ بازگشت ساتھ والے گھر سے آرہی تھی جو عرصہ دراز سے مقفل تھا۔ میں نے بھنویں اچکائی۔ حیرت ہویدا ہوئی کہ یہاں عرصہ دراز سے کوئی قیام پذیر نہیں ہے کیونکہ یہ ساتھ والا گھر میرے گھر سے کئی درجے بڑھ کر بوسیدگی کا حامل تھا۔ پھر یہاں کسی کے رہائش پذیر ہونے کا تو تصور ہی ناممکنات میں سے تھا۔ میری پیشانی پر حیرت سے سلوٹیں عیاں ہوگئیں کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہاں تو پوری دال ہی کالی لگ رہی تھی۔ دونوں گھروں کو جوڑتی اس اکلوتی دیوار کے پاس جا کھڑا ہوا تا کہ ایک نظر دیکھ سکوں کہ آناً فاناً یہاں کون آ کے قیام پذیر ہوگیا ہے۔

ٹاہلی کے درخت ایک تنا جو اس دیوار کا سہارہ لیے ہوئے تھا اور پڑوسیوں کے گھر میں ختم ہوتا ہوا تھا اس کو پکڑ کے میں چنداں اوپر ہوا۔ میرے پاؤں زمین سے اوپر اٹھ گئے اور میں کسی لنگور کی مانند لٹک کر رہ گیا۔ اب میں بآسانی پڑوس کے گھر میں تانک جھانک کر سکتا تھا۔ مگر یہ دیکھ کر میں حواس باختہ رہ گیا کہ اس گھر میں ویرانیوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ دھند کی چھائی چادر کی وجہ سے آثار واضح تو دکھائی نہ دے پا رہے تھے مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ دیکھنے کے قابل تھا۔ اڑھائی مرلے کے اس مکان میں بیک سائیڈ پہ ایک لمبا کمرہ تھا۔ جبکہ اس کے ساتھ کم وبیش چھ سات فٹ کا برآمدہ تھا۔ مین ڈور کے ساتھ ایک کوٹھری بنائی گئی تھی جسے ڈرائنگ روم کا نام بھی دیا جا سکتا ہے اور کمرہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ تو اس کے مالکان کو پتہ کہ انہوں نے اپنے وقت میں اس کو کن مقاصد کے لیے بروئے کار لائے تھے۔ اس کوٹھری کے ساتھ ایک چھوٹا اٹیچ باتھ روم تھا۔ جبکہ باتھ کی اندرونی دیوار کے ساتھ اور ٹاہلی کے اس خمار تنے کے نیچے دونوں گھروں کو مشترکہ دیوار کے ساتھ ایک نلکا بھی لگا ہوا تھا۔ جس کو دیکھ کے اندازہ لگانا چنداں دقت طلب امر نہ تھا کہ عرصہ دراز سے اس کو بھی ہاتھ نہیں لگایا گیا۔ اس نلکے پر زنگ کی گہری چادر قبضہ جما چکی تھی۔ الغرض کوئی بھی چیز ادھر سے ادھر نہ ہوئی تھی مگر مجھے اچھی طرح علم تھا کہ گنگنانے کی یہ بازگشت اسی گھر سے سنائی دی تھی اور یہی نہیں میں بغور اس بازگشت کو پہلے سنا تھا دیوار کے ساتھ ایستادہ ہو کر بھی سنتا رہا جب یقین مستحکم ہوگیا کہ یہ بازگشت اسی گھر سے وہ بھی مشترکہ دیوار کے بالکل پاس سے آرہی ہے تو میں تنے کا سہارہ لے کر اس گھر میں تانک جھانک کرنے لگا مگر بے سود۔۔۔۔۔

لنگور کی طرح لٹکے لٹکے بازوؤں میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگیں اوپر سے خنکی میں بھی بتدریج انکریزنگ کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ میں نے تنے کو خیر آباد کہا اور زمین پر آٹھہرا۔ دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں

کو آپس میں رگڑ کر گرم کیا۔ جب کچھ تکلیف میں کمی واقع ہوئی تو گھوما کیونکہ سردی رگ و پے پہ قابض ہوتی جارہی تھی اور اب تو بتیسی بھی بجنی شروع ہوگئی تھی مگر جیسے ہی میں گھوما اگلا منظر دیکھ کر میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

میرے سامنے میری ہی عمر کا ایک نوجوان میری طرف محوِ حیرت سے تک رہا تھا۔ اسے یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر میرے اوسان خطا ہوگئے تھے۔ اس کے دیکھنے کا یہ انداز بہت زہریلا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی میری تکا بوٹی کر ڈالے گا۔ میں نے تھوک نگلتے ہوئے کرچیاں کرچیاں ہوتے جذبات پر قابو پانے کی سعی کی جس میں میں کسی حد تک کامیاب ہوگیا تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی۔۔۔؟" اس نے میری طرف متواتر شعلہ اگلتی آنکھوں سے تکتے ہوئے کہا۔

"آنکھ کے اندھے، گانٹھ کے پورے دکھتے ہو تم۔۔۔ کسی کے گھر میں یوں تانک جھانک کرنا کیا کوئی اچھا فعل ہے۔ انسانیت بھی اس کی اجازت نہیں دیتی تمہیں ہوش کے ناخن لینے چاہئیں۔ میرا جی کررہا ہے کہ ابھی تمہیں زمین بوس کردوں۔"

اس کی بات سن کر میرے قدموں تلے سے زمین سرک گئی۔ میں تو کبھی زندگی میں کسی سے آج تک ہاتھا پائی نہ کی تھی نہ ہی ہاتھا پائی کے اصول وضوابط سے کوئی آشنائی تھی جس کا واضح مطلب تھا کہ یہ مجھے پسپا کرکے رکھ دے گا۔ یہ تو جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کو مستعد تھا۔ دن کو تارے دکھانے کو تیار تھا۔ تاؤ تو میں بھی بہت کھا رہا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ تھالی کا بینگن بننے کی بجائے مجھے مستقل مزاجی کا مظاہرہ تو بہر صورت کرنا ہے میری تو تقدیر پھوٹ گئی تھی۔ تن بدن میں آگ لگ چکی تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ یہ مجھے تگنی کا ناچ نچا کے رکھ دے گا بجائے تین پانچ کرنے کے کوئی درمیانی راہ نکالنے میں ہی دونوں حریفوں کا فائدہ تھا۔ میں کوئی تیس مار خان تو تھا نہیں نہ ہی تلوے سہلانے کے فن سے آشنا تھا۔ مگر اپنے بچاؤ کے لیے تگ و دو تو کرنا ہی تھی وگرنہ یہ جامے سے باہر ہوگیا تو اس کے غصے پر قابو پانا میرے لیے تو ٹیڑھی کھیر بن جائے گا۔ آئینے میں آئے اس بال کو تو نکالنا ہی تھا۔

"ایکچوئلی میں نے عرصہ دراز سے اس گھر میں کسی کو قیام پذیر ہوتے نہیں دیکھا۔ اچانک گنگنانے کی بازگشت قوت سماعت سے ٹکرائی تو سوچا دیکھ لوں کون ہے پڑوسی ہونے کے ناطے حق تو بنتا ہے کہ پڑوسیوں کا خیال بھی رکھا جائے اب میں آپ کو تھوڑی جانتا تھا کہ آپ یوں آگ بگولہ ہوکے میرے سر پر سوار ہوجائیں گے میں اس گستاخی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔۔۔" میں نے ڈرے سہمے انداز میں کہا۔

تیر نشانے پر جا لگا اس کا غصہ چنداں کم ہوا وگرنہ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ان بن ہوکے رہے گی۔ زندگی میں پہلی بار میں نے اپنے بچاؤ کی خاطر کچھ کہا تھا اور وہ بھی ایسے الفاظ جو فوراً سے بھی پیشتر مدمقابل کی سمجھ میں آگئے تھے۔ آج کا تو دن ہی بدشگونی کا باعث بنا تھا۔ پورا دن ٹھیک سے کام نہیں آیا تھا۔ رات گھر پہنچا تو گھر میں بے چینی، حبس بے جا نے آنکھوں سے نیند چرالی اور سونے پہ سہاگا یہ آفت ناگہانی۔

"وہ تو تمہاری بات اپنی جگہ بجا ہے مگر یہ کوئی طریقہ تو نہیں نہ بنتا یار۔۔۔۔ تمہیں دوسروں کی خیر خبر کا اتنا ہی چاہ ہے تو بجائے تانک جھانک کے دروازے کی طرف سے آؤ اور مہذبانہ طور پر دروازے پر دستک دو آف کورس تم دستک دوگے تو کوئی نہ کوئی تو باہر آئے گا اس سے تمہیں جو کچھ پوچھنا ہو پوچھو مگر۔۔۔۔ چلو چھوڑو میں بھی تمہاری ہی طرح اکیلا ہوں اس دنیا فانی میں ۔۔۔۔ قبل ازاں لاہور میں جاب کرتا تھا مگر اب یہاں واپس اپنے گھر آگیا ہوں تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اب اس گھر کا میں ہی اکلوتا وارث ہوں میرے والدین کو گزرے بھی عرصہ دراز ہوچکا ہے تم مجھے نہیں جانتے مگر میں تم سے واقف ہوں مجھے وقتاً فوقتاً تمہارے والدین کا پتہ چلتا رہا تھا اور بہت رنج وملال ہوا تھا۔۔۔۔" اچانک ہی اس کا موڈ بہت خوشگوار ہوگیا تھا۔ اس نے دریا کو کوزے میں بند کردیا تھا۔

میں ورطۂ حیرت میں مبتلا ہوکر اس کو تکنے لگا کہ میرے بارے میں اتنی زیادہ انفارمیشن رکھتا ہے اور میں اسے جانتا تک نہیں۔ ممکن ہے میرے والدین کے اس کے والدین سے اچھے مراسم رہے ہوں مگر ہائے قسمت کہ وہ بھی اس فانی دنیا میں تن تنہا اور میں بھی کیسی عجیب بات تھی جیسے ہمارے

دونوں کے گھر اپنی بے بسی اور بے چارگی پہ ماتم کدہ دکھائی دیتے تھے عین اسی طرح ہماری قسمت بھی اپنی بے بسی کارونا روتی دکھائی دیتی تھی۔ میں نے کبھی تخیل میں بھی نہ سوچا تھا کہ میرے سامنے ایستادہ یہ نوجوان بھی بالکل میری ہی طرح دنیا کے زمانے کے جان لیوا اور کرب واذیت سے لبریز حالات وواقعات سے دوچار ہوا ہے۔ میں اپنے دکھوں کو بھول گیا تھا۔

انسانی فطرت ہے کہ انسان جتنا بھی دکھوں کی دلدل میں کیوں نہ پھنسا ہوا ہو جب دوسرا انسان اس کے سامنے آکے اپنے دکھوں کا رونا روتا ہے تو ہمیشگی وہ اپنے دکھوں کو یکسر بھلا کر اس کے دکھوں میں اشتراکیت کی سعی کرتا ہے۔ ہمارا دین اسلام بھی ہمیں اسی بات کا درس دیتا ہے اور دنیا کے تمام مذاہب میں سوائے مذہب اسلام کے کسی نے بھی پڑوسیوں اور خلق خدا کے حقوق پر اتنا زور نہیں دیا۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے حقوق معاف کرسکتا ہے مگر حقوق العباد کی معافی نہیں ہے۔ ہاں اگر انسان خود معاف کردے تو وہ الگ تھلگ بات ہے۔

”مجھے بہت ملال ہوا تمہاری بات سن کر مگر ہونی سے کون واقف ہوتا ہے۔ تقدیر کے لکھے کے سامنے ہر کس وناکس مجبور ہے۔۔۔۔۔ مرنے والوں کے ساتھ کوئی مر نہیں جاتا مگر زندگی میں ان کی کمی ہر راہ پر محسوس ہوتی ہے۔۔۔۔۔ اپنوں کی جدائی کا غم تو وہ ہی جان سکتا ہے جو کسی اپنے کی جدائی کا گھاؤ دل پر لگائے ہوئے ہو۔۔۔۔۔ آنکھوں میں اشکوں کا سیلاب رواں دواں رہتا ہے اور دل میں اس اپنے کی جدائی کا غم اکثر وبیشتر طول پکڑ جاتا ہے مگر دل کو چھوٹا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ جو دنیا میں آیا اسے واپس تو جانا ہی ہے۔۔۔۔۔ انسان روتے ہوئے دنیا میں آتا ہے اور سب کو رلاتے ہوئے جاتا ہے۔۔۔۔۔ یہ اصول ہے زندگی کا۔۔۔ اپنوں کی جدائی برداشت کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے میرے بھائی جانتے ہو۔۔۔ دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بیت گئے اور میرے سب چاہنے والے ایک ایک کرکے مجھ سے بچھڑ گئے۔۔۔۔ بس ایک میں ہوں جوان بچھڑے ہوؤں کا غم سینے میں سمیٹے موت کے قدموں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ رہا ہوں۔ کبھی کبھی جب رات کی تنہائیوں میں ماضی کی کھڑکیاں کھول کر جھانکتا ہوں تو وہی اپنوں کے خوب صورت چہرے تصور کے پردے پر ابھرنا شروع ہوجاتے ہیں۔۔۔

بہت تکلیف دیتی ہے مجھے اپنوں کی جدائی، کبھی کبھی دل چاہتا ہے موت کو گلے لگالوں مگر ایک مسلمان کو یہ بات بھی تو زیب نہیں دیتی کہ حالات کے سامنے ہتھیار پھینک کر موت سے ہمکنار ہوجائے۔۔۔۔“ میں اسے دلاسہ دیتے دیتے خود ہی اپنے ضبط کے بند قائم نہ رکھ سکا۔ میری آنکھیں اشکبار ہوچکی تھیں۔ حتیٰ کہ بات کرتے کرتے میری آنکھوں سے آنسو ساون بھادوں کی جھڑی کی مانند برسنے لگے تھے۔ قبل ازاں میں اپنوں کی جدائی میں اتنا نہیں رویا تھا جتنا آج دھاڑیں مار مار کے رونے لگ گیا تھا۔ میرے دل کی بھڑاس نکل رہی تھی۔ وہ مجھے گلے لگائے پیہم ڈھارس بندھانے کی سعی کررہا تھا مگر بے سود۔۔۔

☆......☆......☆

گزرتے دنوں کے ساتھ ہم دونوں کے اندر مراسم گہرے ہونے لگے۔ یوں لگنے لگا جیسے ہم برسوں سے ایک دوسرے سے آشنا رہے ہوں۔ ہم دونوں آپس میں گھل مل گئے تھے۔ اس کا نام ظہریان ملک تھا۔ اس کے والد کا پراپرٹی کا کام تھا۔ جس سے اس نے اتنا کچھ اکٹھا کرلیا تھا کہ اس کی سات پشتیں پاؤں پر پاؤں دھرے بیٹھ کر کھا سکتی تھیں۔ اب اس بھری دنیا میں ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا آسرا تھے۔ ظہریان ملک اپنا کوئی کام کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میرے پاس بھی اب اتنا کچھ تھا کہ میں بھی کوئی اچھا کام کرنے کی سوچ رہا تھا۔ فی الحال ظہریان ملک صبح سے شام تک میرے ساتھ شاپ پہ ہوتا تھا۔ مجھے بھی اس کے آنے سے فائدہ ہوگیا تھا۔ پہلے تو سر کھجانے تک کی فرصت درکار نہ تھی مگر اب میں بہت ایزی رہتا تھا۔ ایک ایک ہوتا ہے اور دو گیارہ کے برابر ہوتے ہیں۔

اب ڈیلی دوپہر کے کھانے کے بعد ہم دونوں یکے بعد دیگرے آرام کرلیا کرتے تھے۔ اب ہم نے مستحکم ارادہ کرلیا تھا کہ کچھ بھی ہوجائے اب کوئی ایسا کام کرنا چاہیے

جس سے اچھا خاصہ زرمبادلہ حاصل ہو۔" زمین جلد از جلد گل مہر" کے مترادف ہم جلد سے جلد اپنے اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اب بھی ہم دونوں کھانا کھانے شہر کے ایک مشہور ہوٹل میں براجمان تھے۔

"دیکھو زریاب ہمیں کوئی نہ کوئی کام کرنا چاہیے کب تک اس چھوٹی سی پرچون کی دوکان سے گزر بسر چلے گا۔۔۔۔۔" ظہریان ملک نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں بھی تمہاری بات سے متفق ہوں مگر ہمیں کاروبار کے ساتھ ساتھ ایک اور کام بھی کرنا ہے۔۔۔۔۔؟" میں نے ظہریان ملک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جو پیہم سلاد کی بھری طشتری سے کھتم گتھا تھا۔ میری بات سن کر اس نے بھنویں اچکائیں اور ناک سکیڑتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"اور کون سا کام ۔۔۔۔۔؟" اس نے سوالیہ آنکھوں سے مجھے تکتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اپنے مکان کو بھی ایک خوبصورت شکل دینی چاہیے صرف کاروبار کی حد تک ہماری سوچ محدود نہیں ہونی چاہیے بلکہ ہمیں اپنے گھر کو بھی اب بوسیدگی سے نجات دلا کر اسے بھی کوئی خوبصورت رنگ دینا چاہیے ۔۔۔۔۔" میری بات سن کر ظہریان ملک زیر لب مسکرایا۔

"ہوں۔۔۔۔۔ یہ نہ ہو ہمارا مکان ہمیں پس پشت صلواتیں سناتا رہے۔۔۔۔" ظہریان ملک کی بات سن کر ہم دونوں کے منہ ایک بھرپور قہقہہ ابھرا۔

ویٹر ہمارے سامنے کھانے کا سامان رکھ کر دبے قدموں پلٹ گیا۔ عین اسی لمحے مجھے ہوٹل کے مین ڈور سے ایک آدمی اندر آتا دکھائی۔ اس نے تھری پیس پہن رکھا تھا۔ اس کی شخصیت قابل دید بھی تھی اور قابل داد بھی۔ میں اسے متواتر دیکھے بنا نہ رہ سکا۔ وہ سیدھا ہمارے ٹیبل کی طرف ہی بڑھ رہا تھا۔ ادھر ظہریان ملک نے مجھے اپنے خیالوں میں گم دیکھا تو میری آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی مگر تب تک وہ بھی ٹیبل تک پہنچ چکا تھا۔ جسے دیکھ کر ظہریان ملک کی حیرت ہویدا ہوگئی۔

"کیا میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ کھانے میں شامل ہو سکتا ہوں۔۔۔۔۔؟" اس نے ایک خالی نشست پر براجمان ہوتے ہوئے باری باری ہم دونوں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لبوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ایک مہنگا پرفیوم اریس پر چھڑکا ہوا تھا۔ پرفیوم کی خوشبو دل و دماغ کو اپنی گرفت میں جکڑ رہی تھی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں یہ بات تو ہمارے لیے قابل فخر ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی دوست کھانے میں شامل ہو۔۔۔۔۔" ظہریان ملک نے مسکراہٹ کا تبادلہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔۔۔ واؤ کیا گرما گرم کھانا ہے لگتا ہے تم لوگوں کو بھی میری طرح گوشت بہت پسند ہے۔۔۔۔۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر لقمہ توڑتے ہوئے کہا۔ سالن ظہریان ملک نے ایک پلیٹ میں ڈال کے اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

"ہم نے ابھی آپ کو پہچانا نہیں ۔۔۔۔۔؟" بالآخر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے دل کی بات کو لفظوں کی مالا پہنائی۔

"ہم پہلے بھی ملے ہوں تو آپ مجھے پہچانو ناں ۔۔۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔۔ اس نے سماعت شکن قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"ویری فنی۔۔۔۔" ظہریان ملک نے رسان سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کھانے سے دو دو ہاتھ کرنے کے بعد بل کی ادائیگی ہماری بے انتہا کہنے کے باوجود اس اجنبی نے کی۔ کھانے کے بعد ہم دونوں چائے پینے کے عادی تھے وہ بھی ہمارا ہمجولی ہی نکلا۔ ہوٹل سے باہر نکل کے ہم پاس ہی ایک ہوٹل میں چائے پینے جا بیٹھے۔

"اب میں اپنا تعارف کروائے دیتا ہوں۔۔۔۔" ہوٹل میں نشستوں پر براجمان ہوتے ساتھ ہی وہ گویا ہوا:

"میرا نام سریز خان ہے اور میں امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس سے منسلک ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ تم لوگ بھی آج

کل کوئی بزنس کرنے کے منصوبے پر سوچ بچار کررہے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ میرے ساتھ بزنس پارٹنر بن جاؤ میرا بزنس اندرون بیرون وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا ہے باقی کسی قسم کا کوئی دباؤ تم لوگوں پر نہیں ہے اچھی طرح سے سوچ بچار کر کے تم لوگوں نے مجھے جواب دینا ہے۔"

اس کی بات سن کر ہم دونوں کے تو پاؤں ہی پھول گئے اتنے بڑے پیمانے پر پھیلے کاروبار میں ہم کس طرح شیئرنگ کر سکتے تھے۔ بے شک ہمارے پاس بہت پیسہ تھا مگر اتنا بھی نہیں تھا کہ اس قدر وسیع وعریض پیمانے پہ پھیلے کاروبار میں اشتراکیت کر سکتے۔

"پہلے نمبر پہ تو یہ بات ہے کہ ہم اتنے سورسز نہیں رکھتے کہ آپ کے اس قدر وسیع وعریض پیمانے پر پھیلے کاروبار میں اشتراکیت اپنا سکیں اور دوسری بات اگر ہم اس قابل ہو بھی جائیں تو ہم آپ پر کیسے ٹرسٹ کر سکتے ہیں۔" جان نہ پہچان ،مفت کا مہمان" والی بات ہوئی۔ پہلی ہی ملاقات میں کسی پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ ہر کام کے کچھ اصول وضوابط ہوتے ہیں۔ ایسے ہی منہ سے نکلی بات اور عمل ہو گیا والی باتیں ہم نہیں مانتے۔ لہٰذا ہم آپ کو حقیقت سے آشنا کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ بات بھی اپنی جگہ بجا ہے کہ ہم کاروبار کرنا چاہتے ہیں مگر اتنے بڑے کاروبار میں اشتراکیت کا ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس لیے آپ سے معذرت چاہتے ہیں آپ کو غلط انفارمیشن موصول ہوئی ہوگی۔۔۔۔۔" ظہریان ملک نے میرے منہ کا لقمہ چھین لیا تھا۔

حقیقت بھی یہی تھی کہ ہم دونوں اپنی جمع پونجی بھی لگا دیتے تو ہم اتنے نہ جمع کر پاتے کہ اس کے کاروبار میں اشتراکیت اپنا سکتے اور دوسری بات ہم اس پر اعتماد ہی کیسے کر سکتے تھے جو شخص ہمارے سامنے نجانے اچانک کہاں سے آن وارد ہوا ہو اور کھانا کھا کے کاروبار میں اشتراکیت کی دعوت دینے پر تل جائے امپوسیبل۔

"فار یور انفارمیشن۔ میں نے آپ سے یہ تو بالکل نہیں کہا کہ اشتراکیت کے لیے آپ کو مجھے کچھ دینا ہوگا۔۔۔۔۔؟" اس نے ہماری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ قبل اس کے کہ ہم میں سے کوئی اس

گفت وشنید کے جاری سلسلے کو مزید طول دیتا ویٹر چائے لے کر آن وارد ہو گیا۔ چائے ہمارے سامنے رکھ کے وہ الٹے قدموں لوٹ گیا۔

"ہاؤ نس پوسی بل کہ ہم کچھ دیں بھی نہ تو اتنے وسیع وعریض کاروبار میں ہماری اشتراکیت بھی شامل ہو جائے اٹس امیزنگ۔۔۔۔" اب کی بار میں نے دلوں کی طرف بوکھلاہٹ بھرے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ میری بات سن کر وہ زیرلب مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ ہم دونوں کو انگشت بدنداں کرنے کے لیے کافی تھی۔ مجھے دال میں کچھ کالا لگ رہا تھا۔

"میں آپ سے ایک بات پوچھنا چاہوں گا۔۔۔۔۔؟" ظہریان ملک نے اس کی طرف شک بھری آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آئی ناؤ کہ آپ کیا پوچھنا چاہ رہے ہیں مسٹر ظہریان۔۔۔۔" اس کے منہ سے اپنا نام سن کے ظہریان حیران رہ گیا۔ یہی نہیں میں بھی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کے رہ گیا۔ وہ ہمارے بارے میں اتنی انفارمیشن کیسے رکھتا تھا۔ ہمارے کسی سوال کا جواب ہمارے پاس نہ تھا۔

"آپ لوگوں کو زیادہ حیران ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایسے ہی آپ لوگوں کے پاس نہیں آگیا بلکہ آنے سے پہلے اپنے سیکرٹری کے تھرو تم لوگوں کا مکمل بائیو ڈیٹا حاصل کیا تھا۔ میں تم دونوں کو اپنے کاروبار میں اس لیے شامل کرنا چاہتا ہوں کیونکہ تم دونوں کا تم دونوں کے سوا اور کوئی نہیں اور ایسا ہی کچھ میرے ساتھ بھی ہے۔ (ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے) مگر ہم اس چیز کو اپنی کمزوری تو نہیں نہ بنا سکتے۔ میں آپ کو پارٹنر ضرور بناؤں گا مگر صرف اس صورت میں کہ تم پرمانینٹ میرے ساتھ کام کرو گے۔ انشاءاللہ تمہیں کسی بھی قسم کا نقصان نہیں ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم لوگوں کا کاروبار کے اندر ایک روپیہ بھی خرچ نہیں ہو رہا بلکہ تم لوگوں کو صرف پیسہ حاصل ہونا ہے۔۔۔۔"

اس کی بات میں دم تھا۔ ہمارا کونسا کچھ خرچہ ہونے لگا تھا۔ ویسے بھی ہم فی الوقت اس کے ساتھ کچھ دن کام کر کے دیکھ لیں گے۔ اگر کوئی بنی فٹ نظر آیا تو سو بسم اللہ نہیں تو انا للہ۔ ہم دونوں نے سوالیہ آنکھوں سے ایک

دوسرے کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کے ساتھ فیصلہ کرنے کا ارادہ بنالیا۔

''ٹھیک ہے ہم تمہارے ساتھ کام کرنے کو بالکل تیار ہیں مگر ہمیں اپنے کام سے متعلق کچھ انفارم تو کرو تم کس قسم کا امپورٹ ایکسپورٹ کرتے ہو، آئی مین کون سی چیز امپورٹ ایکسپورٹ کررہے ہو۔۔۔؟''میں نے چائے کی چسکی بھرتے ہوئے کہا۔ پہلی بار اس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔

''میں مختلف چیزیں امپورٹ ایکسپورٹ کرتا ہوں۔ ملک کے کئی علاقوں میں میری ذاتی بوتیکس بھی ہیں۔ مجھے اپنے آباؤاجداد سے ورثے میں بہت کچھ ملا ہے اتنا کچھ کہ دیکھ کے تم لوگوں کی آنکھیں چندھیا جائیں (چائے کا خالی کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے) ہر بات یہاں اوپن ماحول میں کروگے یا اب میرے ساتھ آفس چلوگے۔۔۔؟''اس نے ایک نگاہ ادھر ادھر دوڑائی اور رازدارانہ انداز میں بولا۔

''پرائیویسی بہت ضروری ہوتی ہے۔ فی الوقت مجھے کوئی نہیں جانتا کہ میں کون ہوں سوائے تم دونوں کے۔ موت، براوقت اور گاہک بتا کر نہیں آتے، اس لیے اب ہوٹلوں میں ہی ساری بات مکمل کرنے کے میرے خیال میں تم لوگوں کو مجھ پہ اعتماد کرکے میرے ساتھ چلنا پڑے گا۔''

اس کی بات مکمل ہونے کے بعد میں نے ظہریان ملک کی طرف دیکھا۔ اس نے ہاں میں اشارہ دیا تو ہم سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب کی بار سمریز خان سے پہلے ہی اٹھ کے ظہریان ملک نے ادائیگی کردی۔ اس وقت بھی ہم کسی عام ہوٹل میں براجمان نہیں تھے۔ تھری اسٹار ہوٹل تھا مگر سمریز کی بات میں دم تھا کچھ باتیں بند کمرے میں ہی بہتر رہتی ہیں۔ جتنی پرائیویسی ممکن ہوسکے کرنی چاہیے کیونکہ اس ملک کے حالات اتنے دگرگوں ہوچکے ہیں کہ کسی کو بھی اب اپنی لمبی زیست کی توقع نہیں ہمہ وقت ہر کس و ناکس سر پر کفن پہنے ہوئے ہوتا ہے کہ موت یہ آئی وہ آئی۔

☆......☆......☆

سمریز خان کا آفس دیکھ کر ہم گنگ رہ گئے۔ یہ ایک پورہ پلازہ تھا۔ سمریز خان نے بتایا کہ یہ پلازہ ایک کینال جگہ پر بنایا گیا ہے۔ جس کی بیس منٹ تین منزلہ تھی سب سے نیچے والی منزل فقط پارکنگ کے لیے مختص تھی جبکہ اوپر والی دونوں منزلیں بطور اسٹور استعمال ہوتی تھیں۔ سامان کی زیادتی کے باعث ایکسٹرا سامان ان سٹورز میں رکھ دیا جاتا تھا۔ گراؤنڈ فلور سے اوپر سات منزل تھیں۔ ہر منزل کے اندر لکڑی اور شیشے کے ملے جلے چھوٹے چھوٹے کیبن بنائے گئے تھے۔ ہر کیبن کم و بیش 8x8 کا تھا۔ اور ہر کیبن ایک اکیلے شخص کے لیے بنایا گیا تھا۔

ہر کیبن میں براجمان شخص کا کام مختلف تھا اور بقول سمریز خان بمعہ گراؤنڈ فلور ان سات منزلوں میں کم و بیش 120 کے لگ بھگ کیبن تھے۔ یہاں ہر شخص کے پاس امپورٹ ایکسپورٹ کا علیحدہ علیحدہ کام تھا۔ کسی کے ذمے کاسمیٹکس کا سامان، کسی کے ذمے بچوں کے ریڈی میٹس تو کسی کے ذمے عورتوں کے میک کے سامان کا حساب کتاب الغرض ان 120 کیبنوں کے اندر براجمان تمام لوگوں کا کام ایک دوسرے سے الگ تھا۔ مطلب سمریز خان 120 قسم کی چیزیں امپورٹ ایکسپورٹ کرتا تھا۔

حیرت سے میری آنکھیں پھیل گئیں۔ ہم اس وقت اس کے دفتر خاص میں بیٹھے تھے۔ دفتر کے باہر ریسپشن پر اس کی سیکرٹری براجمان تھی۔ میرون پھولوں والے زرد سوٹ میں کالی گھنی پلکوں والی لڑکی۔۔۔ باغ میں کھلے سارے پھولوں سے زیادہ شگفتہ لگ رہی تھی۔ موسم کا جوبن اس پر ٹوٹ کر برساتھا۔ اس نے اپنے بے ترتیب گھنگریالے بال کندھوں پر بکھیرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں جگنو اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کی تتلیاں اپنا رنگ بکھیر رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی پھول ہو یا تتلی، یا سیپ میں بند موتی، یا پھر آسمان سے بچھڑا کوئی تارا۔۔۔ جسے قدرت نے زمین پر سجادیا ہو۔

ایک بار تو مجھے یوں لگا جیسے میرے دل کا ظلمت کدہ اب رخ تاباں کی چمک اور مست مست آنکھوں کی سرورانگیزی سے ہمیشہ کے لیے محظوظ ہوچکا ہے۔ مگر یہ ایک فرضی خواب تھا۔ گلے میں ارغوانی مخمل کا سادہ لبادہ اس

پربیش قیمت کالراور باندھنے کو سنہری تسمے لگے ہوئے تھے۔ آف کورس ہزاروں لڑکے اس کی نظر التفات اور ایک خفیف سی مسکراہٹ کے لیے ترستے ہوں گے۔۔۔۔ لمبی لمبی پلکیں آنکھوں پر جھکی ہوئی اور زردر خساروں پر ہلکی سرخی کانشان بہت جان لیوا تھا۔ اس کی رنگت ریشم سے بھیگے ہوئے پھولوں کی تازگی اور پکے ہوئے سیبوں کی شگفتگی کواگر آمیزہ کیا جاسکتا ہے تو بس۔۔۔۔ یہ اس کی رنگت تھی۔ اس کی آنکھیں سیاہ۔ اماوس کی رات کی مانند کالے بھورے رنگ کے گیسو تانبے کی جھلک دیتے ہوں گے۔ قد لمبا نہیں لگ رہا تھا مگر نہایت موزوں بے حد متناسب۔

افوہ! کس بلا کا حسن ہے۔ اسے دیکھتے ہی جھرجھری سی آگئی۔ لب نازک، نگاہیں بے باک، چہرہ کھلتے گلاب کی مانند۔ جس پر ایک نئی تازگی وشگفتگی پائی جاتی تھی۔ مشرق مغرب کے سینکڑوں سنگار اس قدرتی پھبن پر نثار ہوتے تھے۔

ہم اب سمریز خان کے آفس میں براجمان تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار میرا ذہن اس الہڑ مٹیارن کی طرف چلا جاتا جو بری طرح سے میرے قلب وذہن پر قابض ہو چکی تھی۔

سمریز خان کا دفتر بڑا عالیشان دفتر تھا۔ اس کے دفتر میں سامان مشرقی نفاست اور مغربی تمول کا دلکش اشتراک رکھتا تھا۔ کمرے کی ہر چیز نئی اور غیر معمولی تھی۔ سامان آرائش بیش قیمت اور نفیس تھا۔ چھت سے لٹکے ہوئے چینی قمقموں کی روشنی اثر فرحت پیدا کر رہی تھی جبکہ فرشی قالین پر جابجا ریشمی گاؤ تکیے پڑے تھے۔ رنگین پردے، بیش بہا غالیچے، خوشنما چوبی الماریاں اور مشرقی ساخت کے اونچے صندوق نما خانے ہر طرف بکثرت تھے اور ان کے اندر بہت سی بڑی اور عجیب قسم کی مجلد کتابیں، علمی تجربات کا سامان اور متفرق عجائبات رکھے تھے۔ ایک سرے پر مغربی ساخت کا گہرا آتش دان تھا۔ جسے دیکھ کر میں ٹھٹکا کہ آفس کے اندر آتش دان کا کیا کام مگر پھر جلد ہی اس خیال فضول کو ذہن سے نکالا کہ میں کون سا اس سے قبل کسی ایسے بڑے آفس میں آیا ہوں جو مجھے پتہ ہو کہ آفس کے اندر آتش دان بھی ہوتے ہیں کہ نہیں۔۔۔۔ آتش دان پر خوش رنگ ٹائلیں لگی ہوئی تھیں اور اندر عجیب وضع کی کیمیائی انگیٹھی شور پیدا کرتی ہوئی جل رہی تھی۔ چھوٹی میزوں اور ایستادوں پر گلدان رکھے ہوئے تھے۔ جن کے اندر کئی طرح کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ ایک طرف آمنے سامنے چار کرسیاں جبکہ درمیان ایک میز جس پر کچھ پرانی کتابیں جمع تھی جبکہ ایک کرسی دیوار کے ساتھ لگائی گئی تھی۔ بلکہ ایسے ہی جیسے کسی دفتر میں ایک باس کے سامنے ٹیبل لگا ہوتا ہے اور آمنے سامنے کرسیاں لگائی گئی ہوتی ہیں۔۔۔۔ میز سے کچھ فاصلے پر ایک تپائی پر کسی دھات غالباً پلاٹینم کا بنا ہوا برتن رکھا ہوا تھا۔ چاندی کے دیپک میں کوئی مشرقی خوشبو سلگ رہی تھی۔ جس کے دھوئیں کی پتلی لکیر چھت کی طرف اٹھتی نظر آرہی تھی۔

میں محو حیرت سے چہار سو تک رہا تھا۔ مگر میں اس بات سے ناآشنا تھا کہ سمریز خان اور ظہریان ملک کی نگاہیں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ جب دیکھا دیکھی کے اس منظر سے فارغ ہوا اور ان کی طرف متوجہ ہوا تو انہیں پہلے سے ہی اپنی طرف متوجہ دیکھ کر بہت سبکی اور شرم محسوس ہوئی۔ میری کیفیت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دونوں زیر لب مسکرادیے ان کے دیکھا دیکھی میں نے بھی مسکراہٹ کا تبادلہ کیا۔

قبل اس کے کہ ہم میں سے کوئی بولتا ایک سن رسیدہ شخص وہیل ٹیبل گھسیٹتا اندر داخل ہوا۔ ٹیبل کے اوپر تازے جوس سے بھرا ایک جگ اور دیگر لوازمات سجے ہوئے تھے۔ اس کو دیکھ کر ایک بار تو میں خوف سے کانپ اٹھا تھا۔ وہ لمبے قد کا آدمی تھا۔ جس کا بدن گٹھیلا اور مضبوط اور چہرہ جرأت واستقلال کی علامات لیے ہوئے تھا۔ کپڑے چنداں شکن آلود اور سر کے بال پورے طور جمے ہوئے نہ تھے۔ مونچھیں چھوٹی اور کھڑی کھڑی مگر دہانہ شجاعت کا نشان تھا، لیکن اس کے چہرے کا سب سے قابل ذکر حصہ تیز آنکھیں تھیں جو کبھی تیز کبھی متفکر نظر آنے لگی تھیں۔ جن میں شفقت اور ملائمت کی جھلک بھی دکھائی دی تھی۔ رنگ سانولی تھی۔ میری نظر متواتر اس کی آنکھوں پر جمع ہوئی تھی جو برقی مشعل کی طرح جگمگاتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ اس کی

شخصیت کاایک اور بھی قابل ذکر حصہ اس کی شیطانی مسکراہٹ تھی۔

وہ متوسط القامت اور مضبوط، عہد شباب سے گزرا ہوا۔قدرے فربہ وگداز مگراس کے باوجود پھرتیلا دکھائی دے رہا تھا۔اس کے سر کے بالوں میں سفیدی کی جھلک بھی دکھائی دے رہی تھی۔داڑھی اور مونچھیں بھی خشخاشی مگر بھنویں گچھے دار تھیں۔

نجانے کیوں میرا دل یہاں بہت ہول رہا تھا۔میں بار بار ظہریان ملک کی طرف دیکھ رہا تھا اسے ایزی دیکھ کر میں بھی ایزی رہنے کی ایکٹنگ کر رہا تھا ورنہ دل کے مندر میں بجتی خطرے کی گھنٹیاں مجھے یہاں سے فوری نکل جانے کا سندیسہ دے رہی تھیں۔نجانے کیوں مجھے لگ رہا تھا جیسے دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔شکوک وشبہات اور وسوسات میں گھر چکا تھا۔یہ تقدیر ہے جو انسان کو بعید از فہم طریقوں پر ڈھالتی ہے مگر یہاں تو تقدیر بھی نجانے کیوں ساتھ چھوڑ چکی تھی۔

☆......☆......☆

تازے تازے جوس نے اندر جا کے ٹھنڈ پیدا کردی۔حالانکہ سردیوں کا موسم تھا مگر پھر بھی اس ٹھنڈے شربت کو پی جانے کا بہت من کر رہا تھا۔جی کر رہا تھا سارا ایک دم ہی پی جاؤں۔نجانے اس شربت میں ایسی بھی کیا سحر انگیزی تھی کہ باقی ماندہ شربت میں نے گلاس میں انڈیلا اور حلق میں انڈیل دیا۔دونوں میری طرف لبوں پہ ابتسام کی لہریاں لیے تک رہے تھے۔

”ہوں......بہت لذیذ ہے یہ....“ میں نے لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”تمہیں پسند آیا یہی میرے لیے بہت ہے....“ سمریز خان نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

اچانک سمریز خان کی سیکرٹری آفس میں انٹر ہوئی میری تو نہ چاہتے ہوئے بھی نگاہیں اسی پر جم گئیں۔وہ سیدھی آ کے سمریز خان کی چیئر کے پاس جا ایستادہ ہوئی۔اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔جو اس نے کھول کے اس کے سامنے رکھ دی اور خود اسے کچھ سمجھانے کی خاطر چنداں جھک گئی۔وہ جھکی کیا گویا قیامت برپا ہوگئی ہو میرے تن بدن میں چیونٹیاں سی دوڑتی محسوس ہوئیں۔جی چاہا کہ لپک کرا سے دبوچ لوں۔اس وقت جو منظر میرے سامنے منظر تھا نہ قابل بیاں ہے۔المختصر کہ وہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ میرے سامنے ایستادہ تھی۔میری کن نگاہیں اس کے حسن قاتل پر ٹکی ہوئی تھیں۔میں نے جلد ہی محسوس کیا کہ وہ بھی کن انکھیوں سے مجھے تک رہی تھی۔

سمریز خان سے بات کرتے کرتے وہ ایک طائرانہ نگاہ مجھ پہ ڈال لیتی ۔نظروں کا تبادلہ ہوتا تو یوں لگتا گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ بہت کچھ کہہ رہی ہو۔میری اس وقت کیفیت بہت دیدنی بھی بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کبوتری کو بلی کی مانند جھپٹ کر دبوچ لیتا۔

☆......☆......☆

دن گزرتے رہے اور ہماری روٹین بن گئی۔ظہریان ملک اور سمریز خان ایک ہی آفس میں بیٹھتے تھے جبکہ میں نے ایک الگ روم لیا۔اس روم کا دروازہ ریسپشن کی طرف ہی کھلتا تھا۔ریسپشن کی طرف ایک کھڑکی لگائی گئی تھی۔جس میں ایلومنیم اور شیشے کے پٹ لگائے گئے تھے۔جنہیں دھکیل کر کھولا بھی جاسکتا تھا کہ تازہ ہوا اندر داخل ہو سکے۔

جلد ہی میرے اور سمریز خان کی سیکرٹری کے بیچ گہری انڈرسٹینڈنگ ہوگئی۔اس کا نام سحر تھا۔وہ اپنے نام کی طرح واقعی سحر ہی تھی۔جو ایک نظر دیکھ لے اس کا گرویدہ ہوجائے۔میرے دل میں شاید کوئی چنگاری اس کی محبت کی بھڑک اٹھی تھی۔مجھے اس کی آنکھوں میں بھی چاہت کے ابھرے تاثرات دکھائی دیے تو ایک شام ہوٹل میں میں نے اسے کھانے پر مدعو کیا جہاں میں نے احوال دل سے اسے آگاہ کیا۔وہ تو شاید میرے منہ کا نوالہ چھیننے کی خواہش مند تھی۔ترکی بہ ترکی اس نے بھی اظہار محبت کر ڈالا۔میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یوں پلک جھپکتے میں یہ حسینہ مجھ سے محبت کرنے لگے گی۔

گزرتے دنوں کے ساتھ ہمارے درمیان حائل تمام شرم وحیا کے پردے اٹھ گئے۔ابھی تک ہماری اس خفیہ محبت سے سمریز خان اور ظہریار ملک میں سے کوئی بھی آشنا نہ تھا۔

دل میں کئی بار خیال آیا کہ ان دونوں کا آگاہ کر ہی دوں مگر نجانے کیوں ان دیکھی زنجیریں پیروں کو جکڑ لیتی تھیں۔

☆......☆......☆

ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک صحرا میں ایستادہ ہوں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے صحرا کا منظر تبدیل ہونا شروع ہوگیا۔ بڑے بڑے ٹیلے بڑے بڑے محلوں کی شکل دھارنے لگے۔ میری آنکھوں سے حیرت ہویدا تھی۔ میرے پیروں کے نیچے ریت نے شکل بدلی اور جہاں چند سیکنڈ قبل میں ریت پر کھڑا تھا وہاں اب ریت کی بجائے میرے پیروں تلے نہایت چمکدار فرش تھا۔ مجھے کچھ سجھائی نہ دے پا رہا تھا کہ پلک جھپکنے میں یہ سب کچھ کیسے ممکن ہوگیا ہے۔ اچانک وہاں ایک طرف ایک مارکیٹ بن گئی جہاں لوگوں کا رش تھا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ روڈ بن گئے جہاں آمدورفت جاری وساری تھی۔ میں ہکا بکا اپنی جگہ ایستادہ یہ بدلی صورت حال دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے۔ پلک جھپکتے میں صحرا میں ایک شہر آباد ہوگیا ہے۔

ابھی میں انہی خیالات کے بھنور میں پھنسا کھڑا تھا کہ اچانک مجھے اپنے داہنے کندھے پر کسی نے نرم وگداز اور ٹھنڈے ہاتھوں کا لمس محسوس ہوا۔ میں نے جھٹ سے مڑ کر دیکھا تو حیران وششدر رہ گیا۔ وہ کوئی اور نہیں سحر تھی۔

'اتنے پریشان کیوں لگ رہے ہو۔۔۔؟'' اس نے میری طرف الفت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ میں نے اس کی جھیل سی گہری آنکھوں میں جھانکا نجانے کیوں آج پہلی بار مجھے سحر سے خوف سا محسوس ہوا یوں لگا جیسے اس جادوئی منظر کا یہ بھی ایک سین ہے جو میرے سامنے بھیس بدل کر ایستادہ ہے۔ شاید اس نے بھی میرے دماغ میں ابھرتے سوالوں کی جھلک آنکھوں کے راستے جانچ لی تھی اسی لیے بات گول مٹول کر گئی۔ میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ وہی دوبارہ گویا ہوئی۔

''ایسے ہی یہاں پریشان کھڑے رہو گے یا آفس بھی چلو گے سب تمہارا بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔۔۔؟''

اس کی بات سن کر میں ساکت وصامت رہ گیا کہ یہاں اس اچانک وجود میں آتے شہر میں میرا کونسا آفس بن گیا ہے۔

''سحر تم نہیں جانتی کہ۔۔۔کہ یہ سب ۔۔۔اچ۔۔۔۔اچانک ہی۔۔۔'' میں سحر کو ساری بات سے آشنا کرنا چاہتا تھا مگر الفاظ تھے کہ میرا ساتھ ہی نہیں دے رہے تھے۔

''کہ یہ سارا شہر تمہارے دیکھتے ہی دیکھتے وجود میں آگیا بس یہی ناں۔۔۔تو یہ کون سی نئی بات ہوئی ۔۔۔ابھی تو تم نے دیکھا ہی کچھ نہیں چلو میرے ساتھ۔۔۔'' سحر نے میری طرف شعلہ اگلتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی بات سن کر میں انگشت بدنداں رہ گیا۔ بات ختم کر کے اس نے میرے بازو سے پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچا تو میں یوں اپنی جگہ سے اچھل کے اس کے قریب گیا جیسے میں کوئی فٹ بال تھا جو تھوڑی سی ٹھوکر پر اڑ کر کہیں بھی جا گرے۔

میں نے اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑوانا چاہا مگر اس نے بہت مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ باوجود کوشش کے میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور گر گیا اب وہ مجھے ہاتھ سے گھسیٹتی ہوئی لے جا رہی تھی۔ ان گنت لوگ آ جا رہے تھے مگر کوئی بھی میری طرف متوجہ نہ ہو پا رہا تھا۔ میں بار بار اس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑوانے کی سعی کر رہا تھا مگر بے سود۔ اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ مجھے اپنی کلائی میں درد کی اٹھتی ٹیسیں محسوس ہونے لگیں۔ باوجود کوشش کے جب میں اپنے آپ کو اس کی گرفت سے نہ چھڑا پایا تو میں نے زور زور سے مدد کے لیے چیخنا چلانا شروع کر دیا مگر مجال ہے کسی کے کانوں پر جوں تک رینگ جاتی۔

اپنے پاس سے گزرتے ایک شخص کا میں نے پاؤں پکڑ کر اس سے مدد مانگنی چاہی مگر جب میں نے اس کا پاؤں پکڑا تو میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک کر رہ گئی۔ کیونکہ میں نے اس کا جو داہنا پاؤں پکڑا تھا وہ میرے ہاتھ میں تھا جب کہ وہ اپنی مستی میں آگے ہی آگے ایک پاؤں پہ جا رہا تھا دوسرا پاؤں جو میرے ہاتھ میں تھا اس کے چلنے

سے تو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دو پیروں کے سہارے پر چل رہا ہو۔ مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ سب کیا گورکھ دھندہ ہے۔

اچانک وہ ایک جگہ رک گئی اور غصے سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"چپ چاپ میرے پیچھے آنا اگر بھاگنے کی کوشش کی تو جان سے مار ڈالوں گی۔"

اس کی بات سن کر میری رہی سہی جان جیسے نکل گئی ہو۔ میں ایک تنومند مرد ہو کے ایک عورت کے سامنے کتنا بے بس ہو چکا تھا۔ آج تو اتھرد بھی ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ دل ناتواں پہ ایک بہت بڑا گھاؤ لگا تھا۔ جسے میں جاں سے زیادہ چاہنے لگا تھا پس پردہ وہ آستین کا سانپ نکلی تھی۔

میں نے جب غور کیا تو حقیقت میں میں سمریز خان کے آفس کے سامنے ایستادہ تھا۔ مجھے بہت غصہ تھا سحر کی اس حرکت پر۔ میں غصے سے اندر داخل ہوا میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے یا آج میں کام چھوڑ دوں گا یا آج سحر یہاں سے تین تین کرتی جائے گی۔ میں اندر داخل ہوا تو تب تک سحر اپنی نشست پر براجمان ہو چکی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی یہ مکروہ مسکراہٹ مجھے اندر تک کسی لوہے کی گرم سلاخ کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے اسے ایک حقارت بھری نگاہ سے دیکھا اور غصے سے اندر داخل ہو گیا۔

جیسے ہی میں سمریز خان کے آفس میں داخل ہوا اگلا منظر دیکھ کر میری آنکھیں جیسے چندھیا سی گئی ہوں۔ مجھے اپنی قوت بینائی پر شک سا ہونے لگا تھا۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے اور چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

میرے سامنے سمریز خان اور ظہریان ملک زمین پر براجمان تھے۔ اندر کا منظر ہی تبدیل ہو چکا تھا۔ میں جیسے کسی دفتر میں نہیں بلکہ قصاب کی شاپ میں گھس گیا تھا۔ ظہریان ملک اور سمریز خان دونوں میری آنکھوں کے سامنے ایک جانور کو زمین پر لٹائے اسے بھیڑیوں کی طرح نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ دفتر کے اندر موجود تمام دفتری سامان غائب تھا۔ میں حیرت کے سمندر میں بری طرح سے غوطہ زن تھا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا مجھے کچھ پتہ نہ تھا مگر جو بھی ہو رہا تھا عجیب عجوبہ پہ عجوبہ ہی ہو رہا تھا۔

"وہاں کیوں کھڑے ہو دیکھو یہ دنیا کا سب سے بڑا بچھو ہے۔ یہ بچھوؤں کی ایک ایسی نسل ہے جس کا زہر جس کے اندر چلا جائے پلک جھپکتے میں پانی بن کر بہہ جاتا ہے۔۔۔ اور۔۔۔ جانتے ہو ہم اس بچھو کو کیوں کھا رہے ہیں کیونکہ ہم خود بچھو ہیں۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ اور اب تم بھی ہماری ہی نسل میں شامل ہو چکے ہو کیونکہ اتنے دن جو شروب ہم تمہاری رگوں میں انڈیلتے رہے ہیں وہ درحقیقت بلکہ ہمارے اندر کا ایک ایسا زہر تھا جو تمہارے رگ و پے میں ہم نے اتارا۔۔۔ تم جاننا چاہو گے اس زہر نے تمہیں پانی پانی کیوں نہیں کیا کیونکہ تم بہت شگفتی شالی منش ہو اور اس بات سے تم بالکل ناواقف تھے کہ تمہارے اندر کیسی کیسی شکتیاں پنہاں ہیں۔۔۔ یہ بچھو بھی ہماری نسل میں سے تھا اور اب تمہیں اس کی موت کی وجہ بتاتے ہیں۔

ہمارے علاقے کا قانون ہے کہ جو بھی بغاوت کی سعی کرتا ہے اسے سب مل کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ چاہے پھر وہ معافی کا خواستگار ہی کیوں نہ ہو جائے اس کی موت لازمی امر ہوتا ہے۔ یہ میرے ہی آفس کا ایک ملازم تھا۔ جس نے اور کوئی نہیں بس بغاوت یہ کی کہ میری سیکرٹری پر ہاتھ صاف کرنا چاہا اور اس کی سزا اسے کیا ملی تم دیکھ رہے ہو کہ ہم دونوں کیسے نوچ نوچ کر اس کا گوشت کھا رہے ہیں۔ تم میری بات کو سمجھ ہی گئے ہو گے آئندہ آفس میں آؤ تو نگاہیں سنبھال کے رکھنا ورنہ تجھے ایسے نہیں بلکہ ایسی بھیانک موت ماروں گا کہ تیری روح تمام سختیوں کو بھلا کر میری تکلیفوں کو یاد کر کے مرغ بسمل کی مانند تڑپے گی۔۔۔ ماہی بے آب کی مانند یو انڈرسٹینڈ۔"

سمریز خان نے اس بچھو کا ایک پاؤں اس کے جسم سے زور لگا کے کھینچ لیا۔ یہ منظر دیکھ کر میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں خوف سے کھڑا کانپ رہا تھا۔ ظہریان ملک میری طرف غصیلی آنکھوں سے تکے جا رہا تھا۔ مجھے کچھ بھی بھائی

نہ دے رہا تھا۔ بچھو کے اس پاؤں سے خون کی بوندیں پیہم ٹپک رہی تھیں اور وہ انہیں یوں چوس رہا تھا جیسے وہ خون نہ ہو برف کا گولا ہو ساتھ ساتھ وہ اس کا گوشت بھی نوچ نوچ کر چبا رہا تھا۔ اس کے منہ سے بدبو کے بھبھوکے اڑ رہے تھے۔ اس سے آگے مزید دیکھنے کی شاید مجھ میں ہمت نہ تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ہڑبڑا کر ساعت شکن چیخ ماری۔ اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔

میرا پورا جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ نماز فجر کی آذانوں کی بازگشت میری قوت ساعت سے ٹکرا رہی تھی۔ نجانے کیوں اب میرا دل خانۂ خدا کی طرف جانے کو نہیں کر رہا تھا مجھے کچھ بجھائی نہ دے رہا تھا۔ میں باوجود کوشش کے اپنی چارپائی سے نہ اٹھ پا رہا تھا کہ مسجد میں جا کے نماز فجر ادا کر سکوں۔ کہیں حقیقتاً میں کسی آسیبی چکر میں تو نہیں پھنس گیا۔ ایک چبھتے ہوئے سوال نے میرے دماغ کے ایک کونے سے سر اٹھایا۔ مجھے اس وقت کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ میں کیا کروں اور کیا نہ کروں کوئی راہ بجھائی نہ دے رہی تھی۔ مجھے نجانے کیوں ظہریان ملک بھی اسی آسیبی چکر کا حصہ لگنے لگا تھا۔

ایک خواب میرے قلب وذہن پر بری طرح سے سوار ہو چکا تھا۔ یہ خواب کیا حقیقت سے مماثلت رکھتا تھا یا یہ محض ایک خواب ہی تھا؟ شاید ہر وقت سحر کی یادوں میں رہنے اور سریز خان کی طرف سے ہراساں رہنے کہ اسے کسی بات کا علم ہو گیا تو برا محسوس کرے گا اس کا کوئی اثر تو نہیں تھا؟

دوسرے ہی لمحے میرے ذہن کے پردے پر سریز خان کی کہی ایک بات جھومنے لگی۔

"جو مشروب ہم تمہاری رگوں میں انڈیلتے رہے ہیں وہ کوئی شہد یا طہور شراب نہ تھی بلکہ ہمارے اندر کا ایک ایسا زہر تھا جو تمہارے رگ وپے میں ہم نے اتارا۔"

نجانے کیوں یہ الفاظ بار بار میرے دماغ میں ہتھوڑوں کی مانند برس رہے تھے۔ مجھے اپنا سر بھاری بھاری معلوم ہوا اور پھر نجانے کب اور کیسے میں دنیا ومافیا سے بے گانہ ہوتا چلا گیا ہوش آیا تو ایک بار پھر میں چونک اٹھا۔

☆......☆......☆

میری آنکھ کھلی تو میں حیران رہ گیا کیونکہ میرے اوپر ایک سفید کپڑوں میں ملبوس ڈاکٹر جھکا ہوا تھا۔ جو اسٹیتھو سکوپ کو میرے سینے پر مختلف جگہوں پر لگا رہا تھا۔ میری آنکھیں کھلتے ساتھ ہی اس نے موٹے شیشوں والی عینک سے مجھے عجیب نظروں سے گھور کے دیکھا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ تب میں نے دیکھا کہ کمرے میں اس کے ساتھ دو نرس اور ایک ڈسپنسر بھی موجود تھا۔ ڈسپنسر کے ہاتھ میں ایک موٹی سرنج جس کے سامنے چار پانچ انچ کی لمبی سوئی لگی ہوئی تھی پکڑے یوں مستعد کھڑا تھا۔ جیسے اسے خطرہ ہو کہ میں ہوش میں آتے ساتھ بھاگ جاؤں گا۔

سرنج دیکھ کر میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک کر رہ گئی تھی۔ اگر یہ سرنج جو لبالب کسی چمکدار دودر سے انہوں نے بھری تھی اگر مجھے لگتی تو میری تو جان ہی نکل جاتی قبل اس کے کہ میں ان کے شکنجے سے خود کو بچانے کی کوئی تدبیر سوچتا یا ان ظالم ڈاکٹروں کی اس جانوروں کو لگائی جانے والی سرنج سے نجات پانے کے لیے کوئی لائحہ عمل اختیار کرتا دوسرے ہی لمحے موٹے شیشوں والی عینک پہنے وہ ڈاکٹر چھلانگ لگا کر میرے اوپر چڑھ بیٹھا۔ فربہی جسم کے مالک اس ڈاکٹر کا میرے اوپر بیٹھنا تھا کہ مجھے تو دن میں ہی تارے نظر آنے لگے تھے۔ میری سانسیں ہی رکنے لگی تھیں۔ عین اسی لمحے دونوں نرسیں میرے پیروں کو مضبوطی سے پکڑ چکی تھیں۔ مجھ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے کیا یہ بھی کوئی خواب ہے یا میں حقیقت میں کسی مصیبت میں پھنس گیا ہوں مگر مجھے یہ سوچنے کا موقع ہی میسر نہ آیا کیونکہ اچانک مجھے یوں لگا جیسے کسی نے اچانک میری پشت میں گرم لوہے کی سلاخ گھونپ دی ہو۔ پھر تو متواتر میری ساعت شکن چیخیں کمرے کے در و دیوار کو ہلانے لگیں۔ جیسے جیسے سرنج میں بھرا وہ ٹیکہ نما زہر میرے جسم میں شامل ہو رہی تھی مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے جسم پر سے کوئی نوکدار سلاخوں سے گوشت نوچ رہا ہو۔ درد کی تکلیف سے میری آنکھوں سے اتھر و بہہ رہے تھے۔

کب ڈاکٹر میرے جسم سے اٹھا کب اس انجکشن کا اثر زائل ہوا مجھے کوئی خبر نہ تھی۔ تکلیف کی زیادتی کے باعث میں بے ہوش ہوگیا تھا۔ جب ہوش آیا دیکھا تو اسی کمرے میں اسی نرم وگداز بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ کمرے کی سجاوٹ میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا گیا تھا مگر بھلا مجھے ان سجاوٹوں سے کیا لینا دینا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب میرے ساتھ کیا گورکھ دھندا چل رہا تھا۔ اب مجھے یقین ہوگیا تھا کہ میرا خواب سچا خواب تھا اور ظہریان ملک سے دوستی کی داغ بیل ڈال کر میں نے اپنے پیروں پر آپ ہی کلہاڑی ماری تھی۔ اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت کے موافق دل شکستہ ہونے کی بجائے مجھے ہمت واستقلال کا بھرپور مظاہرہ کرنا تھا۔ دل کے پھپھولے پھوڑنے تھے۔ میں دم بخود تھا کہ آخر مجھ سے ایسی کون سی تقصیر سرزد ہوگئی تھی جس کی یہ لوگ مجھے ایسی سزا دے رہے تھے۔ ظہریان ملک کی بے وفائی کی میرے دل میں جو گرہ پڑگئی تھی وہ کسی صورت نہیں کھل سکتی تھی۔ میں ہی مخبوط الحواس ہوگیا تھا جو آن کی آن میں ان دونوں خبیثوں پر شواس کر بیٹھا تھا۔ میں تو اب ان کے خوف سے چوکڑی ہی بھول گیا ہوں۔

''اے اللہ! میری مدد فرما۔ نجانے انجانے میں مجھ سے کون سی غلطی سرزد ہوگئی ہے کہ قلانچیں بھرنا ہی بھول گیا ہوں۔ کب تک میں دکھوں کی چادر اوڑھے رکھوں گا اے کاش مجھے اس وقت ان کی اصلیت سے آشنائی حاصل ہوجاتی اور میں انہیں چلتا کرتا تو آج یوں چراغ سحری ہوتا جارہا ہوں۔ میرے اللہ! مجھے کوئی راستہ دکھا تا کہ میں ان ظالموں کے شکنجے سے نجات حاصل کرکے انہیں چھٹی کا دودھ یاد دلاؤں۔ میں انہیں چاروں شانے چت گراسکوں۔ میں میرے اللہ کب تک چھاتی پر پتھر رکھوں کب تک یہ میری چھاتی پر مونگ دلتے رہیں گے۔ میرے اللہ! ظہریان ملک نے چھپے رستم کی طرح مجھے اپنے جال میں پھنسایا ہے اور اب میں ان جو فروش گندم نما بھیڑیوں کو ابدی نیند سلانا چاہتا ہوں۔

میرے اللہ! میں مانتا ہوں کہ میں لالچ میں آگیا تھا مگر اب میرے اللہ! تو میری مدد فرما اور پانسہ پلٹ حالات کا تا کہ میں ان ظالموں کو ابدی نیند سلاسکوں۔ میرے مالک! تو میری مدد فرما تا کہ بیل منڈھے چڑھنے میں مجھے کسی دقت سے دو چار نہ ہونا پڑے میں ان ظالموں کو اینٹ جواب پتھر سے دے سکوں۔ میرے مالک میں تیری مدد کے بغیر ایڑی چوٹی کا بھی زور لگالوں تو کبھی بھی اپنی منزل سر نہیں کرسکتا۔ میرے اللہ! اب تیری بزرگ و برتر ذات اور تیرے پیارے حبیب کا ہی مجھے آسرا ہے۔''

میری آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی لگ چکی تھی۔ روتے روتے گھگھی بندھ گئی اور اس حالت میں یوں لگا جیسے آنسوؤں کے ساتھ میرے دل ودماغ سے بہت بڑا بوجھ اترتا جارہا ہو۔ مجھے ان تمام حالات میں پہلی بار ایسا سکون میسر آیا تھا کہ زندگی میں اس سے قبل کبھی بھی میں نے ایسا سکون محسوس نہ کیا تھا۔ دل ودماغ سے بوجھ کیا اٹھا نیند کی دیوی نے مجھے اپنی آغوش میں بھرلیا اور میں ایک بار پھر دنیا ومافیا سے بےگانہ ہوتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

اب کی بار جب میری آنکھ کھلی تو ماحول یکسر بدلا ہوا دکھائی دیا۔ میرے منہ سے فوراً ہی یہ الفاظ نکلے۔

''میرے اللہ! میری مدد فرمانا کہیں اب میں کسی نئی مصیبت میں تو نہیں پھنس گیا۔''

اب مجھے اپنا آپ بہت ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ یہ میری دعاؤں کا اثر تھا یا میرے مالک کو میری آہ وزاری پسند آگئی تھی جو بھی تھا مگر میرا دل اب بہت پرسکون تھا۔ مگر اب مجھے تشویش اس بات کی تھی کہ میں اب کہاں آن پہنچا ہوں جب بھی آنکھ کھلتی ہے کسی نئی ہی جگہ آیا پڑا ہوتا ہوں۔ میں تو کب سے اپنے پاؤں توڑ کر بیٹھ چکا تھا۔ میرے دشمنوں نے مجھے پاش پاش کرکے رکھ دیا تھا مگر مجھے افسوس اس بات کا نہ تھا کہ انہوں نے میرے ساتھ زیادتیاں بہت کرڈالی تھیں افسوس تو اس بات کا تھا کہ میں بے قصور تھا اور نا کردہ گناہوں کی سزا بھگت رہا تھا۔ پتہ نہیں کس ڈھب مٹی کے بنے ہیں کہ ایسے پیچھے پڑے ہیں کہ ان سے پیچھا چھڑانا تک دشوار ہوگیا ہے۔ خبیث نہے جھاڑ کے پیچھے پڑگئے تھے۔

میں نے ہمت کرکے ادھر ادھر دیکھا تو گنگ رہ گیا کیونکہ اب کی بار نہ تو میں کسی قصاب کی شاپ نما دفتر میں تھا اور نہ ہی کسی قصائی نما ڈاکٹر کے کسی وارڈ میں بلکہ میں ایک جھونپڑی میں گھاس پھوس کے اوپر ایک چادر اوڑھے پر لیٹا ہوا تھا۔ اس جھونپڑی کے اندر کس قدر سکون تھا۔ نجانے کیوں یکبارگی میرے دل و دماغ پہ چھائی ان درندوں کے خوف کی دھند چھٹ گئی اور دل ہی دل میں میں خود کو تیس مار خان سمجھنے لگا تھا۔ مگر میں جانتا تھا کہ ٹامک ٹوئیاں مارنے سے کام نہیں چلنے والا تھا کوئی نہ کوئی لائحہ عمل ہوتا ہے ہر کام کا۔ وہ مجھ سے بہت طاقتور ہیں اور یہی نہیں انہوں نے میرے اندر بھی بچھو کا زہر بھر دیا تھا۔

میں کوئی نوابوں جیسا امیر تو تھا نہیں مگر ابو اور تایا جان پھر بھی اتنا دے گئے تھے کہ کھائے نہ ختم ہوتا بلکہ دو چار پشتیں بھی کھا پی کے ختم نہ کرتیں۔ مگر مزید کی خواہش انسان کو ہمیشہ خسارے میں ڈالتی ہے اور اسی حرص نے مجھے بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور فرعون بے سامان ان دونوں نے مجھے چھٹی کا سبق یاد دلا دیا کسی نے غلط نہیں کہا تھا کہ:

عاشقو اچھی ملی یہ ناز اٹھانے کی سزا
ساری دنیا کے حسین فرعون بے ساماں ہوئے

اچانک ہی اس جھونپڑی کا گھاس پھوس اور لکڑیوں کو ملا کے بنایا گیا دروازہ کھلا اور نورانی چہرے والے بزرگ نے اپنے قدم جھونپڑی میں رنجہ فرمائے۔ ان کے چہرے کی نورانیت دیکھ کر میری تو آنکھیں چندھیا سی گئی تھیں۔

یا میرے اللہ! کتنا سکون تھا اس نورانی چہرے والے تیرے برگزیدہ انسان کے نورانی چہرے پر۔ میں نے سنا تھا کہ اللہ کے برگزیدہ لوگ جب خود کو کلام الٰہی اور صلوٰۃ وصوم کا پابند کر لیتے ہیں تو رب ذوالجلال ان کے چہروں پر نور کی ایسی بارش کر دیتے ہیں کہ گھپ اندھیروں میں بھی ان کو تلاش کرنے میں رتی برابر دقت سے دوچار نہیں ہونا پڑتا۔ بلکہ اندھیرا ان کے چہرے کی نورانیت کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مجھے تو اپنی گناہ گار آنکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ کبھی تخیل میں بھی نہ سوچا تھا کہ میں بھی کسی اللہ کے نیک اور برگزیدہ بندے کے نورانی چہرے کو دیکھنے کا شرف حاصل کر پاؤں گا۔ مجھے تو شیطانوں نے اب کاغذ کی ناؤ بنا دیا تھا جو طوفانوں بھنوروں کا مقابلہ کرنے کی جسارت تک نہ رکھتی تھی مگر شاید وہ قبولیت کا ٹائم تھا جب میری آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی کے جیسے آنسو جاری و ساری تھے۔

میرے اللہ! شیطانوں نے تو مجھے کانٹوں پر کھینچا تھا اور میں کچی گولیاں کھیلنے والا ان کی کج ادائی کو نہ سمجھ پایا تھا۔ اب سوائے کف افسوس ملنے کے میرے پاس رہ ہی کیا گیا تھا۔ ایسے میں جب میں دنیا سے مایوس ہو چکا تھا تو میرے دل نے صدا دے کے کہا کہ جن کا کوئی نہیں ہوتا ان کا نیلی چھت والا ہوتا ہے۔

میرے اللہ! واقعی میں تیرا کتنا احسان فراموش بندہ ہوں کہ مشکل آئی تو میرے مالک تو مجھے یاد آ گیا اور جب بہار کے دن تھے تو میں نے تجھے یکسر بھلا دیا تھا۔

میرے مالک میں نے تجھ سے طوطا چشمی کی تھی اور باوجود اس کے کہ تو میری گت بناتا میرے مالک تو نے میری مدد فرمائی۔

میرے اللہ! تو بہت رحیم و کریم ہے۔ تو واقعی ایک ماں سے ستر (70) گنا زیادہ اپنی مخلوق سے محبت رکھتا ہے۔

میرے اللہ! ہم کتنے نادان ہیں کہ پھر بھی ہمیشگی تیری نافرمانی کو اپنا وطیرۂ امتیاز بنا رکھا ہے۔

میرے اللہ! مجھے معاف فرما دے۔

میرے اللہ! مجھے معاف فرما دے۔

میرے اللہ! مجھے معاف فرما دے۔

میں یہ بات یکبارگی بھول بیٹھا تھا کہ جھونپڑی میں میرے علاوہ بھی کوئی ہے میں زاروقطار رو رہا تھا اور اپنے مالک سے اپنے گزشتہ گناہوں کی معافی مانگنے لگا تھا۔ آنسو ایک بار پھر جاری و ساری ہو چکے تھے۔ مجھے تو اپنے اللہ! سے معافی مانگنے میں بھی ید طولیٰ حاصل نہ تھی۔ بس جس طرح سے بھی معافی مانگ سکتا تھا مانگ رہا تھا۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام تک نہ لے رہے تھے۔ تبھی میں نے دھندلائے ہوئے ماحول میں اس نورانی چہرے والے برگزیدہ بزرگ کو اپنی طرف لپکتے ہوئے دیکھا۔

وہ میرے قریب آکر بیٹھ گئے اور مجھے گلے سے لگالیا۔
''گڑے مردے اکھاڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔لوگ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ہتھلی پر سرسوں جمانے لگتے ہیں مگر حقیقت یہ ہوتی ہے کہ آبیل مجھے مار کی مانند وہ مصیبت کو خود دعوت دیتے ہیں۔۔۔۔آسمان کا تھوکا ہمیشہ منہ پر ہی گرتا ہے دوسروں کو حقیر گردانتے ہوئے ان کے حقوق کی پامالی کرتے ہیں جس کی وجہ سے حقوق العباد کے ساتھ ساتھ حقوق اللہ کی پامالی بھی کرتے ہیں۔مگر یاد رکھنا آسا جیئے نراسا مرے یعنی زندگی امید سے قائم ہے۔مگر لوگ امید کو چھوڑ کر جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔اب تو حالات ایسا روپ دھار چکے ہیں کہ آوے کا آوا بگڑا ہوا معلوم پڑتا ہے۔آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کے موافق منزل بہت قریب ہونے کے باوجود انہیں دکھائی نہیں دیتی۔لوگ محنت کو ہتک گردانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہیں مگر اندھا کیا جانے بسنت کی بہار۔کر کے کھانے میں کتنا مزہ ہے کون جانتا ہے۔

اللہ کا کتنا تم پر احسان تھا کہ اللہ نے تمہیں ایک اچھا روزگار عطا کیا تھا مگر تمہارے اندر حرص کی بیماری نے جڑیں چھوڑنی شروع کر دی تھیں اور ایک دن وہ جڑیں ایک تومند درخت کا روپ دھار کر سامنے آئیں۔نصیحت کرنے والا ہمیشہ برا لگتا ہے۔کسی نے غلط نہیں کہا کہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔حقیقت ہی کچھ ایسی ہے نصیحت ہمیشہ کسی میں کوئی نقص کوئی عیب دیکھ کر اس کے بھلے کی خاطر ہی کی جاتی ہے مگر گھمنڈ کے نشے میں شرابور شخص ہمیشہ اس نصیحت کو اپنی توہین گردانتے ہوئے الٹا اس کے ساتھ تو تو، میں میں شروع کر دیتا ہے۔اندھے کے آگے روئے اپنے ہی نین کھوئے والی بات بن جاتی ہے۔

میرے بیٹے قناعت پسند بنو۔ہمارا مذہب دنیا کے تمام مذاہب سے بہتر ہے۔اور ہمارا مذہب ہمیں جو درس دیتا ہے آج ہم اس سے بالکل اجتناب برت رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ شیطان اور اس کی شیطانی طاقتیں ہم پر حاوی ہوتی جارہی ہیں۔''

اس نورانی چہرے والے بزرگ نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے مجھے آسرا دے کر سیدھا بیٹھایا اور خود اٹھ کر کونے میں رکھے ایک جگ میں سے بڑا سا گلاس دودھ کا لبالب بھر کے لے آئے اور مجھے تھماتے ہوئے بولے۔

''میرے بچے اسے پی لو تمہارے اندر ان لوگوں نے زہریلے بچھو کا زہر اتار دیا ہے۔تمہارے رگ و پے میں گردش کرتا خون زہر کا روپ دھار چکا ہے۔یہ دودھ جنت کا تحفہ ہے ہمارے لیے جیسے ہی تمہارے اندر جائے گا اس زہر کا اثر زائل پڑ جائے گا اور تمہاری رگوں میں ایک بار پھر سے ایک صاف شفاف خون بہنے لگے گا۔جو تمہاری تمام نقاہت کو نہ صرف ختم کر دے گا بلکہ تمہاری اندر چستی بھر دے گا۔''

میں نے ان کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس لیا اور غٹا غٹ پی گیا۔دودھ کا اندر جانا تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے میرے سینے میں آگ لگ گئی ہو۔اف میرے اللہ! وہ لمحات کتنے تکلیف دہ تھے نا قابل بیان ہیں۔میرے تمام جسم سے گرم دھواں نکل رہا تھا۔میری زبان تو جیسے مقفل ہو چکی تھی۔میں چیخنا چلانا چاہتا تھا مگر بے سود۔۔۔۔۔۔

مجھے تو اس نورانی شخصیت والے بزرگ پر شک سا ہونے لگا تھا کہ نورانیت کے لبادے میں کہیں یہ بھی تو شیطان کا پجاری تو نہیں۔مگر جلد ہی دھواں ختم ہوا اور یوں لگا جیسے جسم بہت زیادہ ٹھنڈا ہو گیا ہو۔ٹھنڈ سے میں کانپنے لگا تھا۔دھیرے دھیرے سب کچھ معمول پر آیا تو سانس میں سانس آئی۔اب جو میں نے محسوس کیا تو حقیقتاً میری تمام نقاہت نو دو گیارہ ہو چکی تھی۔اف میرے اللہ! میں نے انجانے میں ایک بار پھر ایک غلطی کر دی تھی اور تیرے ایک برگزیدہ بندے کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہوا تھا۔مجھے اپنے جسم میں بہت زیادہ چستی محسوس ہو رہی تھی۔یوں لگ رہا تھا کہ اگر میں پتھر کو گھونسہ رسید کروں تو وہ پاش پاش ہو کر بکھر جائے۔میرے دل میں خیال آیا کہ کی گئی گستاخی پہ مجھے اس نیک سیرت وصورت بزرگ سے معافی مانگنی چاہیے مگر قبل اس کے کہ میں لب کھولتا میرے بولنے سے قبل ہی وہ گویا ہوئے:

''میرے بچے میں تم سے بالکل رنجیدہ نہیں

ہوں۔ دل کو چھوٹا مت کرو اور میری بات کو ہمہ تن گوش ہو کے سنو۔ تم اس دریا میں کود چکے ہو جہاں تمہارا واسطہ مگرمچھوں سے پڑ چکا ہے مگر حالات کے سامنے ہتھیار ڈالنا ایک مسلمان کو زیب نہیں دیتے لہٰذا تمہیں ہر حال میں اپنے اللہ پر اور اس کے پیارے حبیبؐ پر بھروسہ رکھنا ہوگا۔ چاہے کیسی بھی مشکل درپیش ہو ہمت مت ہارنا کیونکہ تکلیف تھوڑے وقت کی ہوتی ہے مگر اس کا اجر انسان کی سوچ سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔ تم کبھی سوچ بھی نہیں پاؤ گے کہ جب تم صبر و استقلال کا مظاہرہ کرو گے اور مدد صرف اللہ اور اس کے پیارے حبیبؐ سے طلب کرو گے تو کیسے وہ تمہاری پشت پناہی فرمائیں گے۔ جن لوگوں نے تمہیں اپنا مقدر سمجھ کر تمہیں آن دبوچا ہے حقیقت میں تم ان کا مقدر نہیں ان کی موت ہو۔ تمہیں دبوچ کر انہوں نے اپنا مقدر تو نہیں پایا ہاں البتہ اپنے پیروں پر کلہاڑی ضرور ماری ہے۔ اب وہ دندناتے پھر رہے ہیں اور تمہیں تلاش کر رہے ہیں تاکہ تم انہیں جلد سے جلد جہنم واصل کر کے اس پاک سرزمین کو شیطانوں کے ناپاک وجودوں سے پاک کر سکو۔

میرے بچے کسی بھی قدم پر خود کو تنہا نہ سمجھنا کیونکہ میرے اللہ نے مجھے بہر صورت تمہاری حفاظت کی ذمہ داری سونپی ہے۔ یہ کام بے شک جان جوکھوں کا ہے مگر اس کام کو سر انجام دینے کی ذمہ داری اب تم پر ہی ہے۔ ان شیطانوں کی اصلیت، تمہیں اپنے قابو میں لینے کی وجہ یہ سب باتیں میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا سب سے پہلے تم جاؤ اور سامنے ندی کے آب زلال میں غسل کر کے آؤ اور ہاں (ایک لکڑی کے صندوق میں سے ایک ریشمی لباس نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے) غسل کرنے کے بعد تم نے یہ ریشمی لباس زیب تن کرنا ہے جبکہ جو پہنا ہے اسے ندی کی لہروں کے سپرد کر دینا۔ جاؤ میرے بچے میں تمہاری واپسی تک تمہارے کھانے کا بندوبست بھی کیے دیتا ہوں۔

☆......☆......☆

میں غسل کر کے آیا اور جھونپڑی کے اندر داخل ہوا تو یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا کہ جھونپڑی کے گھاس پھوس والی زمین پر دستر خوان بچھا ہوا تھا اور اس پر بھانت بھانت کا کھانا سجا ہوا تھا۔ ایسے کھانوں کو تو شاید مجھے زندگی میں کھانا تو در کنار دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔ اس چھوٹی سی جھونپڑی کے اندر اتنے وسائل بھی نہ تھے کہ ایسے کھانے اور وہ بھی اتنی تھوڑی دیر میں تیار کیے جا سکتے۔ مارے حیرت کے میری آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ ایک لائن میں آمنے سامنے ڈھیروں طشتریاں ان گنت کھانوں سے سجی ہوئی تھیں۔ گرم گرم کھانوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں نے دانست میں سوچا کہ یہ بزرگ کتنے پہنچے ہوئے ہیں کہ پلک جھپکتے میں بھانت بھانت کے کھانوں سے بھری طشتریاں سجا دی ہیں۔

اللہ والے ہی ہوتے ہیں
جو اللہ سے ملا دیتے ہیں

وہ بزرگ جنہیں میں نے باباجی کا خطاب دے دیا تھا۔ اپنی جگہ سے اٹھے اور میرے پاس ایستادہ ہو کر شفقت سے بولے۔

"صرف دیکھنے سے بھوک مٹاؤ گے میرے بچے یا پیٹ کے جہنم کو بھرو گے بھی۔ چلو شاباش کھانا کھاؤ یہ کھانا تمہارے اندر نور ہی نور بھر دے گا۔ اس کھانے کی وجہ سے تم میں بہت طاقت آجائے گی۔ یہ کوئی عام کھانا نہ سمجھنا بلکہ مجھ حقیر کی طرف سے ایک ایسی ضیافت سمجھنا جو قتاً فوقتاً تمہیں احساس دلائے گی کہ تم میں کتنی طاقت پیدا ہو چکی ہے۔ چلو میرے بچے اب جلدی سے کھانا کھالو۔"

باباجی کی بات سن کر میں خوشی سے مخمور ہو گیا۔ میں کھانے پر کسی بھوکے بھیڑیے کی مانند ٹوٹ پڑا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ اتنا کھا گیا کہ جتنی گنجائش بھی نہ تھی۔ مگر نجانے کیوں پیٹ تھا کہ بھر ہی نہ رہا تھا۔ اتنا لذیذ کھانا کہ ناقابل بیان۔ کھانے کی شیریں برسوں رہے۔ تادم آخر بھی انسان کی یہی خواہش ہو کہ ایک بار وہ کھانا کھانے کو مل جائے۔ المختصر شاید ہی کسی طشتری کے اندر میں نے کچھ چھوڑا ہو۔ میں خود حیران و ششدر رہ گیا کہ میں اکیلا انسان اتنا کچھ کیسے کھا گیا؟

میرے اللہ! یہ میرا پیٹ ہے یا کنواں یا پھر عمرو عیار کی زنبیل جہاں لکڑ پتھر سب کچھ ہضم ہوتا چلا گیا اور یہی نہیں مجھے

حاجت تک کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ قرین قیاس تو یہی تھا کہ اتنا کچھ کھانے کے بعد رہ عدم سدھار جاؤں گا مگر ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ میرے اللہ! کتنا بابرکت کھانا تھا۔ انسان کو چاہے جتنی ہی بھوک ہو چاہے صدیوں کا ہی کیوں نہ بھوکا ہو مگر اتنا کھانا ناممکنات میں سے ہے۔ اور پھر مجھ جیسے شخص کا جو ایک روٹی کھالے تو پیٹ پھٹنے کو لگتا ہے مگر آج۔۔۔۔۔۔۔

''میرے ساتھ آؤ میرے بچے۔۔۔۔'' باباجی نے مجھے کھانے سے فراغت پاتے دیکھ کر جھونپڑی سے باہر قدم رنجہ فرماتے ہوئے کہا تو میں اپنے اللہ کا شکر ادا بجالاتا ان کے پیچھے چل پڑا۔ ہم دونوں چلتے ہوئے ایک برگد کے پرانے درخت کے نیچے جا پہنچے۔ میں اب خود کو بہت تر و تازہ محسوس کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کبھی سستی اور کاہلی نے مجھ تک کو نہ چھوا ہو۔ میں بار بار لبوں پر زبان پھیر رہا تھا کھانا اتنا لذیذ تھا کہ اس کی چاشنی ابھی تک ختم نہ ہوئی تھی۔

برگد کے درخت کے نیچے پہنچ کر باباجی نے نجانے کونسی قرآنی آیت کا ورد کیا پھر برگد کے درخت کی طرف پھونک ماری میرے دیکھتے ہی دیکھتے برگد کے درخت کے اندر ایک بڑا سا شگاف پیدا ہو گیا۔ میں ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ شگاف کیا تھا گویا ایک دروازہ، جس کا ایک ہی پٹ ہو اس کے جتنا شگاف ہوا تھا۔ باباجی بنا کچھ کہے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی سے مجھے اپنے پیچھے چلنے کا کہہ کر اندر داخل ہوئے۔ میں نے بھی اپنے مالک کو یاد کیا اور اندر داخل ہوا۔

میں کیا دیکھتا ہوں کہ شگاف سے نیچے زینہ جا رہا تھا۔ میں نے زینے پر قدم رکھا اور دو سٹیپ ہی نیچے اترا ہوں گا کہ پیچھے سے شگاف ایک بار پھر اپنی اصلی حالت میں آ گیا میں نے جلدی سے مڑ کر دیکھا۔ دل حلق کو آن لگا مگر پھر جلدی سے زینہ اترنے لگا۔ زینے کی آخری سیڑھی سے جیسے ہی میں نے قدم نیچے رکھا میرے قدموں تلے گویا زمین کھسک گئی ہو۔ میں نے سرعت سے مڑ کر دیکھا مگر یہ دیکھ میں حیران و ششدر رہ گیا کہ جس زینے سے میں نیچے اترا تھا اس کا نام و نشان بھی نہ تھا بلکہ وہاں برگد کا نہ کوئی تنا تھا نہ کچھ۔ میں کھلے آسمان تلے ایستادہ تھا۔

میری حیرت دو چند ہوئی۔ میں نے سرعت سے چہار سو نگاہ دوڑائی تو مجھ پر طشت از بام ہوا کہ میں ایک آبادی کے بیچ میں ایستادہ تھا۔ یہ کوئی کچی آبادی تھی۔ چہار سو جھونپڑیاں ہی جھونپڑیاں دکھائی دے رہی تھیں مگر قابل حیرت بات یہ تھی کہ یہ جھونپڑیاں بہت خوبصورت تھیں وہاں گندگی کا کوئی نام و نشان تک نہ تھا۔ دل کو معطر کرتے مشک و زعفران کے جھونکے نتھنوں سے ٹکرائے تو مسحور ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

''میرے بچے بس کرو ٹائم کا ضیاع ہمارے لیے بہتر نہیں ہے۔۔۔۔'' اچانک میری قوت سماعت سے باباجی کی آواز ٹکرائی تو میں یوں چونکا جیسے خواب خرگوش کے مزے لوٹتا کوئی انسان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہے۔

''باباجی یہ ہم کہاں آ گئے ہیں۔۔۔۔؟'' مجھ میں اب مزید برداشت کا مادہ باقی نہ رہا تھا۔ جب صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو پوچھ ہی لیا۔

''تم اس وقت ہمارے قبیلے میں کھڑے ہو۔۔۔۔'' باباجی نے بڑے رسان سے کہا تو میں نے سوالیہ آنکھوں سے باباجی کی طرف دیکھا۔

''باباجی آپ کا قبیلہ۔۔۔۔؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''پہلے آگے چلو یہاں ایک ہی جگہ کھڑے رہنا بہتر نہیں ہے۔ میرے پیچھے آؤ ساری بات وہیں پر ہو گی اب کہیں بھی تمہارے پیر رکنے نہ پائیں وگرنہ اپنے انجام کے تم خود ہی ذمہ دار ہو گے۔۔۔۔'' باباجی تنبیہ کرتے ہوئے ایک بار پھر میرے آگے آگے چل پڑے اور میں چار و ناچار ان کے پیچھے چل پڑا۔

مختلف خم دار راستوں سے ہوتے ہوئے باباجی ایک جھونپڑے کے سامنے رک گئے۔

''تم یہیں کھڑے ہو کر میرا انتظار کرنا میں ابھی آتا اور ہاں احتیاط کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھنا۔ کوئی تانک جھانک یا ایسی ویسی کوئی حرکت مت کرنا وگرنہ اس کا انجام صرف موت ہو گا۔۔۔۔'' باباجی کی بات میں بہت گہرائی تھی۔

مجھے فوراً ظہیریان ملک یاد آ گیا۔ میرے لیے وہی تانک جھانک بہت تھی۔

مجھے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا جلد ہی باباجی باہر نکلے اور میرا ہاتھ تھام کر مجھے اندر لے گئے۔ جھونپڑے کے اندر قدم رکھنے کی دیر تھی کہ یوں لگا جیسے دل کو بہت ہی سکون مل گیا ہو۔ وہ جھونپڑا کیا تھا ایک محل تھا گویا۔ اتنا بڑا جھونپڑا میں نے اپنی حیات میں نہ دیکھا تھا۔ اس جھونپڑے کے اندر مختلف حصے بنائے گئے تھے۔ جنہیں کمروں کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ہم اس وقت جگہ براجمان تھے وہ تو کسی شہنشاہ کا ڈریسنگ روم لگ رہا تھا۔ ایسا عمدہ اور اعلیٰ قسم کا فرنیچر اور زمین پہ بچھا موٹا اور نرم و گداز قالین میرے اللہ میں ایک بار پھر کسی سپنے کا حصہ تو نہیں بن رہا۔ میں نے اپنی دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کو دانتوں تلے دبایا تو دبی دبی چیخ نکل گئی۔ گویا میں اب کی بار کسی سپنے کا نہیں بلکہ ایک ناقابل فراموش حقیقی منظر کا حصہ بن چکا تھا۔ آرائش و زیبائش دیکھ کر میری آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔

کمرے کے اندر ایک سفید ریش قریب المرگ بزرگ ایک نہایت ہی قیمتی بیڈ پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے کی نورانیت نے پورے جھونپڑے نما محل میں گویا نور پھیلا رکھا تھا۔ میں ان کی اس نورانی شخصیت سے بہت متاثر ہوا تھا۔ جی کر رہا تھا کہ بس ٹکٹکی باندھے اس نورانی شخصیت کو ہی تکتا رہوں۔

باباجی نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے ایک نہایت ہی قیمتی رکھے گئے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں جلدی سے بیٹھ گیا۔

عین اسی لمحے ایک نقاب پوش دوشیزہ ہاتھ میں ایک ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ اس کا پورا بدن نقاب کے اندر لپٹا ہوا تھا۔ کیسا مذہبی گھرانہ تھا؟ میرے اللہ یہاں تو تیرے نور کی برسات کیوں نہ ہو اور ایک میں ہوں کہ تیرے حضور سجدہ ریزی کی توفیق نہیں ہوتی تھی۔

میں دل ہی دل میں اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔

لڑکی نے ٹرے ہمارے سامنے ایک خوبصورت ٹیبل پر رکھ دی۔ ٹرے کے اندر ایک جگ مشروب سے لبالب بھرا ہوا تھا جبکہ ساتھ میں دو گلاس بھی تھے۔ باباجی اس نورانی شخصیت کا حال احوال دریافت کررہے تھے۔ انہوں نے جب اس شخص کو ابو جان کہہ کر پکارا تو تب مجھے احساس ہوا کہ میں باباجی کے ذاتی گھر میں اس وقت براجمان ہوں۔ اور یہ قریب المرگ نورانی شخصیت والا شخص باباجی کا رشتے میں ابو ہے۔ باباجی خود بھی کافی عمر کے تھے مگر ابھی ان کے جسم میں کوئی خم پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ صحت مند تھے جبکہ بیڈ پر لیٹے بزرگ آخری کناروں میں دکھائی دے رہے تھے۔

''میرے بچے تم اس مشروب کو پیو۔۔۔۔'' باباجی نے مجھے مخاطب کر کے کہا تو میں نے فوراً ہی ایک گلاس میں مشروب بھرا اور حلق میں انڈیل گیا۔ مشروب کیا تھا گویا دنیا جہاں کے مشروبوں پر اسے فوقیت حاصل تھی۔ میں ایسے ایسے کھانے اور مشروبات سے پیٹ کی آگ ٹھنڈی کررہا تھا جن کے بارے میں میں نے کبھی تخیل میں بھی نہ سوچا ہو۔ ایک گلاس کے بعد ایک اور گلاس پی گیا حتیٰ کہ جگ خالی کردیا۔ باباجی نے ایک نگاہ میری طرف دیکھا اور زیر لب مسکرا دیئے۔ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ کیسے کھانے اور مشروبات تھے جن کو میں جتنا بھی کھائے پیئے جا رہا تھا لکڑ پتھر کی مانند ہضم ہوئے جا رہے تھے۔

☆......☆......☆

رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ ہم اسی باباجی کے والد صاحب کے کمرے میں ہی براجمان تھے۔ پورا دن میں لمبی تان کے سویا تھا۔ مجھے آرام کرنے کے لیے ایک الگ تھلگ کمرہ دے دیا گیا تھا۔ حالانکہ مجھے بالکل غنودگی کی شکایت نہ تھی باوجود اس کے لیٹنے کی دیر تھی کہ فوراً سے بھی پیشتر نیند کی دیوی مجھ پر مہربان ہوگئی۔ اس وقت شاید دن کے دس گیارہ کا ٹائم ہوگا اور سورج دیوتا سوا نیزے پر آنے کے قریب ہوں مگر مجال ہے اس جھونپڑی نما محل میں گرمی محسوس ہو یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی اے سی روم میں لیٹا ہوں۔ یہ کمرہ اس ڈرائنگ روم سے سوگناہ زیادہ سجاوٹ کا حامل تھا۔ میں حیران تھا کہ ایک جھونپڑے کے اندر ایسی گوہر ہائے آبدار چیزوں کی بھلا کیا ضرورت تھی۔ یہ چیزیں رکھنی ہی تھیں تو کم از کم مکان تو پختہ بناتے یہ جھونپڑے

تو ایک ہی ہوا کا تیز جھونکا اڑا لے جائے گا اور یہ سارا ساز و سامان بکھر جائے گا۔

میں جب اٹھا تو معلوم پڑا تھکا ماندہ سورج دھیمی رفتار سے اپنی خواب گاہ کی طرف گامزن ہے۔ میں خود بیدار نہیں ہوا تھا بلکہ آہٹ سن کر بیدار ہوا تھا۔ نجانے کیوں اور کیسے مگر یکبارگی ہی میری آنکھیں کھل گئی تھیں۔ میرے سامنے وہی نقاب پوش خاتون جو ڈرائنگ روم میں شربت دے گئی تھی کمرے کی صفائی میں مصروف تھی۔ مجھے بیدار ہوتے دیکھ کر ایک طائرانہ نگاہ مجھ پہ ڈالی اور سرعت سے باہر نکل گئی۔ میں کوئی اندازہ نہ لگا پایا کہ اس خاتون کی عمر کتنی ہوگی۔ مگر اس کے سرعت سے باہر نکلنے پر تھوڑا اندازہ لگایا کہ ہو نہ ہو یہ کم و بیش چھبیس ستائیس کے پیٹے میں ہوگی۔

رات کا کھانا ہم تینوں نے اکٹھا کھایا میں یہ دیکھ کر گنگ رہ گیا کہ قریب المرگ باباجی کے والد صاحب اب یوں براجمان تھے جیسے ان کو کوئی بیماری ہی نہ ہو۔ ہشاش بشاش صوفے پر براجمان تھے۔ میں جیسے ہی ڈرائنگ روم نما بنے خیمے کے اس کیبن میں داخل ہوا تو دونوں باپ بیٹا میرے استقبال کے لیے ایستادہ ہوگئے۔ مجھے کچھ سمجھ نہ آئی کہ یہ اتنے برگزیدہ انسان میرے ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی یوں ایستادہ کیوں ہوگئے ہیں۔

''میں گستاخی کی معافی چاہتا ہوں مگر میں کیا یہ پوچھنا گوارہ کرسکتا ہوں کہ صبح جب ہم آئے تو آپ کی حالت بہت دگرگوں لگ رہی تھی اور اب اچانک۔۔۔؟'' میں باباجی کے والد صاحب کی طرف سوالیہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے جان بوجھ کر فقرہ ادھورہ چھوڑ دیا۔ میری بات سن کر دونوں باپ بیٹا زیر لب مسکرا دیئے۔

''ہماری بیماری مستقل نہیں ہوتی میرے بچے۔ اللہ کے کلام میں بہت طاقت ہے۔ صبح تم نے مجھے جس حال میں پایا اس وقت میں واقعی بہت ناساز حالات سے دست و گریباں تھا مگر پھر جیسے ہی سورج کی کرنیں زمین پر پڑیں میں نے رب کے کلام سے مدد لی اور اب دیکھ لو۔ امید ہے تم اندازہ بھی نہیں لگا پاؤ گے کہ صبح والے بوڑھے اور اب کے بوڑھے میں بہت فرق نمایاں ہوگیا ہے۔۔۔'' باباجی کے والد نے بھنویں اچکاتے ہوئے کہا۔

''آپ نے بجا فرمایا باباجی۔۔۔'' میں نے ان کی بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے یہاں سب بڑے سردار کے نام سے پکارتے ہیں تم بھی پکار سکتے ہو۔ اس قبیلے کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں ہے۔۔۔'' شاید انہیں باباجی کا لفظ اچھا نہیں لگا تھا اس لیے شاید انہوں نے ناگواری محسوس کی تھی۔ ماتھے پہ آئی شکنیں ان کے اندر کا احوال بتا رہی تھیں۔

''میں معذرت چاہتا ہوں۔۔۔۔۔'' میں نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کا بوسہ کرتے ہوئے کہا۔

''بہت فرمانبردار لڑکے لگتے ہو۔۔۔۔؟'' انہوں نے دست شفقت میرے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ہم تمہارا ہی انتظار کررہے تھے میرے بچے۔ دیکھو کھانا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔۔۔۔'' اب کی بار باباجی نے لقمہ دیا۔ پھر ہم سب نے مل کر کھانے سے دو دو ہاتھ کیے۔ کھانے کی لذت قابل داد تھی۔ اتنے لذیز کھانے کاش ساری زندگی مجھے ملتے رہیں۔ کھانے کا ایک ایک لقمہ اپنی مثال آپ تھا۔ مجھے اپنے بدن میں بہت طاقت محسوس ہونے لگ چکی تھی۔ کھانے کے بعد چائے کا دورانیہ شروع ہوا۔

باہر موسم ابر آلود ہو چکا تھا۔ ایک ٹھنڈ اوپر سے موسم کی خرابی سونے پہ سہاگے والی بات تھی۔ مجھے تو خدشہ لگ گیا کہ آج کی رات ہی میں کہیں اس جھونپڑی نما محل کے ساتھ بہہ ہی نہ جاؤں۔ شاید میرے دل و دماغ میں سر ابھارتے سوالوں کو دونوں باپ بیٹے نے میری آنکھوں سے پڑھ لیا تھا۔

''میرے بچے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بارش کتنی ہی تیز اور طوفانی کیوں نہ ہو پانی کا ایک قطرہ بھی ہمارے قبیلے کے کسی جھونپڑے میں داخل نہیں ہوسکتا۔ سیلاب، آندھی طوفان اور موسلا دھار بارشیں ان خیموں کا بال بیکا نہیں کرسکتیں۔ یہ کوئی عام خیمے نہیں ہیں تمہارے محلوں سے زیادہ ان کے اندر مضبوطی ہے۔ کئی صدیاں یہ بیتا جاتے ہیں مگر مجال ہے تھوڑی سی ان میں خرابی

پیدا ہو سکے۔۔۔۔۔" باباجی نے میرے پریشانی کو جانچتے ہوئے تفصیل سے بتایا تو میں ان کی بات سن کر حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گیا۔

"کیا واقعی صدیاں بیت جاتی ہیں مگر یہ کیسے ممکن ہے۔۔۔۔؟" میں نے اپنی حیرت کو لفظوں کی مالا پہنائی۔

میری بات سن کر باباجی نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ ایک تیز دھار آلہ لے کر خیمے میں ایک طرف زور سے مارا۔ یوں آواز پیدا ہوئی جیسے کوئی پتھر پر لوہا مارتا ہے دوسرے ہی لمحے میں نے ایک ناقابل یقین منظر دیکھا۔ وہ تیز دھار آلہ جو موٹائی، چوڑائی اور لمبائی کے حساب سے بہت مضبوط تھا۔ خیمے سے ٹکرانے کے بعد ٹیڑھا ہو گیا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ ہو پا رہا تھا۔

چائے کے خالی کپ میز پر سج چکے تھے۔ جنہیں وہی نقاب پوش خاتون اٹھا کر لے گئی تھی۔ اب مجھے ایک اندازہ لگانے میں تو قطعاً کوئی پریشانی سے دوچار نہ ہونا پڑا تھا کہ اس گھر میں باباجی کے علاوہ ان کے والد صاحب یعنی بڑے سردار اور ایک یہ نقاب پوش خاتون رہتی تھی۔ علاوہ ازیں یہاں کوئی چوتھا جنس نہ تھا۔

کافی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ باتوں باتوں میں مجھے پتہ چلا کہ باباجی جو جنوں کے ایک خاص قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ جنوں کا قبیلہ تمام قبائل سے عظیم سمجھا جاتا ہے۔ یہی قبیلے سرداری کا مستحق ہوتا ہے۔ تمام قبائل اس قبیلے کے بچے بڑے سب کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ کسی میں اتنی جسارت نہیں ہوتی کہ ان سے نظر ملا سکے۔ اور اگر کوئی قبیلہ یا فرد واحد اس قبیلے کے خلاف بغاوت کی سعی کرتا ہے تو اسے تمام قبائل کی موجودگی میں نظر آتش کیا جاتا ہے۔ یہی نہیں اس کے ساتھ اس کی پوری فیملی کو بھی نظر آتش کیا جاتا ہے اور ان کی راکھ کو سمندر کی لہروں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بغاوت کے واقعات بہت کم رونما ہوتے ہیں۔ بڑے سردار کے قبیلے کو عقرب قبیلے کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس قبیلے کے لوگوں کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ پیدائشی مہاشکتی مان ہوتے ہیں۔ باقی ہر قبیلے کا شخص مہاشکتی مان بننے کے لیے عمل کرتا ہے۔ حتیٰ کہ ساری زندگی عمل کرتے کرتے گزر جاتی ہے اور جب اس کی منزل قریب آتی ہے تو تب تک وہ قریب المرگ ہو چکا ہوتا ہے۔

باہر بادل کی گرج اور بجلی کی چمک جاری وساری تھی۔ تھوڑی دیر بعد موسلا دھار بارش بھی شروع ہو گئی۔ بارش کی بوندیں جب اس جھونپڑی نما محل کے اوپر گرتیں تو یوں لگتا کہ بہت سے لوگ اوپر بھاگ رہے ہیں۔ کبھی کبھی تو بادل اتنی زور سے گرجتا کہ دل حلق کو آن لگتا۔ رگ پھولنے لگی تھیں۔ اچانک بجلی اتنے زور سے چمکتی کہ یوں لگتا ابھی پوری دنیا کو جلا کر خاکستر کر دے گی۔ میں بری طرح سے خوفزدہ تھا مگر باباجی اور بڑے سردار کے تو کانوں پر جوں تک نہ رینگ رہی تھی۔

"خوف کو پریشانی میں مبتلا مت کرو۔ تم آدم زاد بہت چھوٹے دل کے ہوتے ہو ابھی تو ایک بہت بڑا کارنامہ تم نے سرانجام دینا ہے اور ابھی سے تمہارے چھکے چھوٹ رہے ہیں۔۔۔۔" بڑے سردار نے ایک چبھتا ہوا فقرہ اچھالا۔

آدم زاد کبھی چھوٹے دل کا نہیں ہوتا بڑے سردار۔ دنیا آدم زادوں کے سر پر ہی قائم ودائم ہے وگرنہ دنیا بنانے کا کوئی مقصد نہ تھا۔ اللہ رب العزت نے یہ دنیا اپنے پیارے حبیبؐ کے لیے بنائی اور اپنے حبیبؐ کو آدم زاد بنایا نہ کہ جن زاد۔ اس لیے آپ کو زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔" اس کی بات سن کر میں آپے سے باہر ہو گیا اور جو منہ آیا بولتا چلا گیا دونوں باپ بیٹا مجھے حیرت سے تکنے لگے۔

"تم جانتے ہو ہم یہاں کے سردار ہیں اور ہماری مرضی کے بغیر یہاں پر پتہ نہیں ہلتا۔ تمہاری گستاخی پر ہم تمہارا سر قلم کروا سکتے ہیں۔۔۔؟" اب کی بار بڑے سردار کے لہجے میں رعب ودبدبہ اور نفرت وغصے کی آمیزش شامل تھی۔

"فرسٹ آف آل کہ میں گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والا نہیں اور دوسرے نمبر پر آپ لوگ کسی صورت مجھے نہیں مار سکتے کیونکہ میرا زندہ رہنا آپ کے لیے اشد ضروری ہے وگرنہ آپ لوگ میری ایسی خاطر تواضع نہ کرتے میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ اس سارے کے پیچھے ضرور کوئی

راز پوشیدہ ہے۔۔۔۔۔‘‘ ادھر میں بات کر رہا تھا ادھر آسمانی بجلی آب و تاب سے چمک رہی تھی۔ ساتھ ساتھ بارش بھی متواتر اسی سپیڈ سے جاری و ساری تھی۔

’’بہت آفت کے پرکالے لگتے ہو۔۔۔۔؟‘‘ اب کی بار نہ چاہتے ہوئے بھی بڑے سردار نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرایا کیا گویا لبوں نے کرب میں کروٹ بدلی ہو۔

’’میرے بچے تمہیں ایسے الفاظ نہیں استعمال کرنے چاہئیں۔۔۔۔‘‘ اب کی بات بابا جی مجھ سے مخاطب ہوئے۔ میں بابا جی کی طبیعت سے بہت متاثر تھا۔ ان کے بات کرنے کا انداز دل موہ لینے والا تھا۔

’’بابا جی آپ نے سنا کہ بڑے سردار نے ہم آدم زادوں کی بے عزتی کی ہے۔ دنیا کے اندر واحد آدم زاد خالق کی ایسی مخلوق ہے جو دنیا کی ہر شے پر قدرت رکھتی ہے۔ جو ایک جن زاد کو اپنا بندی بنا سکتے ہیں۔ جنگل کے بادشاہ پر سواری کر سکتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ آدم زاد ڈرپوک ہوتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ اس جھونپڑے میں کس قدر مضبوطی ہو سکتی ہے اور نہ ہی مجھے جھونپڑوں کے اندر پڑاؤ ڈالنے کا موقع میسر آیا اس لیے میں تو یہی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا سب کچھ اڑا کر لے جا سکتا ہے۔۔۔۔‘‘ میں بہت ایکسائیٹیڈ ہو چکا تھا میں نے بات کرتے ہوئے ایک نگاہ بڑے سردار پر ڈالی وہ بڑی پر اعتماد آنکھوں سے مجھے تک رہے تھے۔

’’ادھر آؤ میرے سینے لگو میرے بچے۔۔۔۔‘‘ بڑے سردار نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا تو میں ان کی بدلی ہوئی اس کیفیت پر بھونچکا کر رہ گیا۔ میں نے ایک نگاہ بابا جی کی طرف ڈالی تو انہوں نے ہاں میں سر ہلایا میں بڑے سردار کے سینے لگا تو یوں لگا جیسے دنیا جہاں کا سکون مجھے میسر آ گیا ہو۔ یوں لگا جیسے نورانی شعاعیں میرے اندر داخل ہو رہی ہوں۔ میرا سر گھومنے لگا تھا کافی دیر تک بڑے سردار مجھے سینے سے لگائے کھڑے رہے جب میں دوبارہ اپنی کیفیت میں پلٹا تو انہوں نے مجھے خود سے الگ کیا اور فوراً صوفے پر براجمان ہونے کا حکم صادر فرمایا۔ ایک ساتھ ہی ہم تینوں صوفے پر براجمان ہو گئے۔

’’میں نے جو کچھ کہا میرے بچے اس لیے نہیں کہا کہ تمہارے دل کو ٹھیس پہنچے بلکہ اس لیے کہا کہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم کس قدر ہمت و حوصلے والے انسان ہو مجھے فخر ہے تم پر اور مجھے پورا یقین ہے کہ اب تم اس معمے کو سر کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں چھوڑو گے۔ تم ضرور اپنی منزل کو پا لو گے۔‘‘

میں حیرت سے بڑے سردار کی باتیں سن رہا تھا۔

’’میرے بچے اب ہم تمہیں تمہارے یہاں لانے کی وجہ بتائیں گے اور سمریز خان اور ظہریان ملک کے ساتھ ساتھ ان کی سیکرٹری کی اصلیت سے آگاہ کریں گے۔ پھر ہم تم پر چھوڑیں گے تم جو فیصلہ کرو گے۔ اگر تم اس مشکل گھڑی میں ہمارا ساتھ دینے کی حامی بھر لو گے تو ہم اس مشکل سے بہت جلد جان چھڑوانے میں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوں گے وگرنہ ہم تو یہ جنگ متواتر لڑتے ہی چلے آ رہے ہیں۔۔۔۔؟‘‘ اب کی بار بابا جی نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’بابا جی میں آپ کی بات کا مطلب سمجھنے سے یکسر قاصر ہوں آپ اگر وضاحت فرما دیں تو بات کو سمجھنے میں مجھے بھی کسی دقت سے کا سامنا نہیں ہوگا۔۔۔۔‘‘ میں نے بابا جی کی بات سن کر بھنویں اچکاتے ہوئے کہا۔

’’ہم اپنے قبیلے کے اندر کسی بھی ہندو قبیلے کے فرد کو رہنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتے بلکہ اسے اسلام کی دعوت دیتے ہیں اگر وہ قبول کر لے تو اسے رہنے کی اجازت دیتے ہیں علاوہ ازیں اسے یہاں سے واپس چلے جانے کو کہتے ہیں اگر وہ اسلام کی دعوت بھی قبول نہ کرے اور اپنی بات پر بضد بھی رہے تو اسے ابدی نیند سلا دیتے ہیں۔۔۔۔‘‘ بڑے سردار اتنی بات کہہ کر صوفے سے اٹھ کر اپنے بستر پر بیٹھ گئے۔ ایک کمبل انہوں نے ہمیں دیا کیونکہ سردی بڑھ گئی تھی اور ٹھنڈ لگنے لگی تھی جبکہ دوسرا کمبل وہ خود اوڑھ کے بیٹھ گئے۔ پھر بابا جی اٹھ کے گئے اور واپس آئے تو ان کے ہاتھوں میں گرم ٹوپیاں اور اون کی موٹی کھال والی جیکٹیں تھیں جو ہم سب نے ایک ایک کر کے پہن لی۔ چائے

کا پورا تھرمس بھرا پڑا تھا۔ علاوہ ازیں باباجی اندر سے خشک میوہ جات بھی ایک ٹرے میں بھر کر لائے۔

''ہاں تو میں تمہیں اپنے قبیلے کے اصول ضوابط سے آگاہ کر رہا تھا۔''

بڑے سردار نے ہاتھ بڑھا کر خشک میوہ جات اٹھاتے ہوئے کہا۔

''انہی دنوں ہمارے قبیلے میں نجانے کہاں سے تین افراد آن ٹپکے۔ جنہوں نے اپنی درد بھری داستان سنائی کہ ان پر بہت مظالم ڈھائے گئے ہیں اور وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر یہاں تک آئے ہیں اگر کچھ دن انہیں یہاں قیام کرنے کی اجازت دے دی جائے تو وہ مشکور ہوں گے اور بہت جلد یہاں سے کوچ کر جائیں گے۔ ابھی ان کی جان کو خطرہ لاحق ہے اور وہ مدد کی اپیل کر رہے تھے۔

میرے قبیلے کے لوگ انہیں میرے پاس لے کر آئے۔ ساری بات سے مجھے آشنا کیا گیا۔ ہمیں پتہ چلا کہ وہ ہندو ہیں بات ناقابل قبول تھی۔ وہ دو مرد اور ایک عورت تھے۔ میں نے ساری بات سننے کے بعد ایک مرد کو مخاطب کیا۔

''تمہارا نام ہے کیا۔۔۔؟'' میری بات سن کر وہ جلدی سے اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور بولا:

''جی میرا نام بھنور من، یہ میری پتنی لکشماری اور یہ میرا پسر فرنوس بھنور من ہے۔''

ایک ہی سانس میں اس نے اپنی ساری فیملی کا تعارف کروا دیا۔ پھر میں نے اسے تمام اصول وقواعد سے آگاہ کیا اور کہا کہ ''ہم اسی صورت یہاں رہنے کی اجازت دے سکتے ہیں اگر وہ مسلمان ہو جائیں۔''

ان کے دل میں نجانے کیا بات آئی انہوں نے آپس میں علیحدہ جا کے تھوڑی دیر مشاورت کی اور پھر آ کر کہا کہ ''وہ اسلام قبول کرنے کو رضامند ہیں بشرطیکہ ان کی جانوں کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کی جائے تو۔''

ہمیں ان کا یہ فیصلہ سن کر بہت خوشی ہوئی اور فوراً ان کو ضمانت دے دی۔ بس اسی دن سے ہمارے قبیلے کو بری نظر لگ گئی اور ہمیں ایک بہت بڑے امتحان سے گزرنا پڑ گیا۔ بھنور من اور اس کی فیملی بھی جن زادہی تھے۔ وہ ہمارے قبیلے میں کہیں سے بھاگ کے نہیں بلکہ ایک خاص مقصد کے تحت آئے تھے اور ہماری نظروں میں دھول جھونک کر انہوں نے مسلمان ہونے کا ناٹک کرتے ہوئے ہم سب کو اعتماد میں لے لیا اور بہت بڑی ٹھوکر مار گئے۔

ہمارے قبیلے یعنی عقرب قبیلے کی پہچان ایک عقرب ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ اگر وہ عقرب کسی اور کے ہتھے چڑھ جائے تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ان تینوں نے میرے اعتماد کو بہت ٹھیس پہنچائی۔ انہوں نے پورے قبیلے کو اس طرح اعتماد میں لے لیا کہ کوئی ان پر شک بھی نہ کر سکتا تھا کہ ان کے دلوں میں چور ہے۔ خود میں بھی ان کے من کو نہ جان سکا تھا۔ ہمارے قبیلے میں کسی اور قبیلے کے شخص کو فیصلے کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہوتی مگر ان لوگوں نے مجھے اتنا اپنے اعتماد میں لے لیا تھا کہ بھنور من کو میں نے اپنا نائب بنالیا تھا۔

ایک رات میں جب خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہا تھا کہ اچانک رات کے پچھلے وقت سماعت شکن شور برپا ہوا۔ میں اور میرا بیٹا بھی اٹھ گئے اور جلدی سے باہر نکلے۔ قبیلے کے تمام لوگ ہماری اس قیام گاہ کے سامنے جمع تھے اور واویلہ مچا رہے تھے۔ بڑی مشکل سے ان پر قابو پا کر میں نے ان سے اس واویلہ کرنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے نہایت ہی حیران کن اور ناقابل برداشت بات میرے گوش گزار کی۔ قبیلے میں سے ایک نوجوان باہر نکلا اور بولا:

''بڑے سردار بھنور من اور اس کی فیملی نے ہمارے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے۔ وہ مسلمان نہیں ہوئے بلکہ بدستور ہندو مذہب سے ہی ان کی وابستگی جاری تھی۔ رات ہم نے خود ان کو خود ایک بت کے قدموں میں پوجا کرتے ہوئے دیکھا۔ جب ان سے اس بارے میں بات چیت کی اور انہیں کہا کہ ہم تمہاری اس بدعہدی کی شکایت بڑے سردار سے جا کے کرتے ہیں۔ تو انہوں نے نہ صرف ہمارے قبیلے کی ایک لڑکی کو اغواء کر لیا ہے بلکہ وہ اسے لے کر نجانے کہاں چمپت ہو گئے ہیں اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس لڑکی کو نہ صرف ہندو دھرم کی پجارن بنا ڈالیں گے بلکہ اسے کالے جادو کی ماہر بنا دیں گے جو ہمارے ہی قبی

پر موت بن کر نازل ہوگی۔"

میں اس نوجوان کی بات سن کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے اعتماد کو اس طرح سے ٹھیس پہنچائے گا۔ میں نے فوراً ہی حکم دیا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوں ان تینوں کو نور اُسے بھی پیشتر پکڑ کر لاؤ۔ مگر وہ تو یوں غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ انہیں زمین کھا گئی یا کہ آسمان نگل گیا۔ اوپر سے جن کی بیٹی تھی انہوں نے رو رو کر ہمارا جینا اجیرن کر دیا۔

ہم نے دن رات کر کے ایک چلہ کیا اس چلہ میں ہمیں پتہ چلا کہ بھنور من اور اس کی فیملی بہت شکتی شالی ہیں ۔انہوں نے ایک کالی پہاڑ کے اندر بنے غار میں قیام کر رکھا تھا مگر اس غار تک جانا ہر کس و ناکس کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف ہے کیونکہ اس نے غار کے چہار سو دور دور تک ایسا نہایت ہی خطرناک حصار قائم کر رکھا تھا جسے چھوتے ہی ایک شکتی مان بھی جل کر خاکستر ہو سکتا ہے۔

اب یہ ایک نئی مصیبت تھی جس سے ہمارا سامنا تھا۔ ہمارے سوچنے سمجھنے کی تمام تر راہیں مفقود ہو چکی تھیں انہی دنوں ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ کسی شکتی شالی سے بات کی جائے جو ہمیں اس مصیبت کا کوئی نہ کوئی اوپائے بتائے۔ میں نے پھر اس رات ایک عمل کیا جس میں مجھے ایک بزرگ سے ملنے کا اشارہ ہوا۔

ہم دونوں علی الصبح اس بزرگ سے ملنے چل دیے۔ وہ بزرگ بھی تمہاری ہی دنیا کے باسی تھے اور آدم زاد تھے۔ عمل میں ہی ان کے ٹھکانے کا پتہ چل گیا تھا۔ لہٰذا ہم پلک جھپکتے میں ان کے سامنے جا پہنچے۔ وہ اس وقت دنیا و مافیا سے بے خبر ایک ویران اور سنسان جگہ پر ذکر الٰہی میں مصروف تھے۔ ہم نے ان کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم ان کا انتظار کرنے لگے کہ جب فارغ ہوئے تب ان سے بات کریں گے۔ مگر ہمیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اور ہماری طرف دیکھے بغیر ہی انہوں نے ہم دونوں کو مخاطب کر لیا۔

اے جن زادو! تم پر بہت بڑی افتاد پڑنے والی ہے اگر قبل از وقت اس کا کوئی سد باب نہ کیا گیا تو تمہارا پورا قبیلہ تہس نہس ہو کر رہ جائے گا۔۔۔۔۔" بزرگ کی بات سن کر تو ہم دونوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"بابا جی یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔۔۔۔؟" میں نے نہایت ہی پریشان کن لہجے میں کہا۔ "ہم نے ان پر احسان کیا تھا اور ہم یہی سمجھے تھے کہ انہوں نے دل و جان سے اسلام قبول کر لیا ہے مگر پس پشت وہ ہمیں دھوکہ دیتے رہے اور یکبارگی ہماری پیٹھ میں چھرا گھونپ کر چمپت ہو گئے ہم ان سے اس بات کی قطعاً توقع نہ رکھتے تھے۔ ہم اسی لیے آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں بابا جی ہماری مدد فرمایئے وگرنہ شیطانی شکتیاں ہمارے قبیلے کے مکینوں کو جن کے دلوں میں اسلام کا نور پھیل چکا ہے ایذاء پہنچا سکتی ہیں۔"

"شیطان جتنے بھی ہاتھ پاؤں مار لے بالآخر شکست ہی اس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ مگر مردود بہت ضدی ہے پھر بھی باز نہیں آتا۔ ویسے بھی اس کا کیا جاتا ہے اگر ایک نیکوکار انسان کو بہکا کر وہ جہنم کا ایندھن بنا بھی دے تو اس کا کیا جائے گا وہ اس کے بعد کسی اور کو اپنا پیروکار بنا لے گا۔ اس کا تو یہ شیوا ہے اور اس مردود نے تو "نعوذ باللہ من ذالک" رب ذوالجلال سے مقابلہ بازی لگا رکھی ہے یہ نہیں جانتا کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ جیت ہمیشہ حق کی ہی ہوتی ہے باطل کو ہمیشہ منہ کی کھانی پڑتی ہے خدا کے ہاں دیر ضرور ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔۔۔۔" بابا جی کی باتیں کچھ سمجھ میں آ رہی تھیں کچھ سمجھ سے باہر تھیں۔ اب وقت نصیحتوں کے بجائے عمل کا تھا اس لیے میں ایک بار پھر مطلب کی بات پہ آیا۔

"ہزاروں سال بعد اس دھرتی پہ ایک اوغلان جنم لیتا ہے۔ جس کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کی لکیروں میں ستارہ بنا ہوتا ہے۔ ایسا ہی ایک ستارہ اس کی پیشانی پر بنا ہوتا ہے جو اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب اس کی پیشانی پر سلوٹیں عیاں ہوتی ہیں۔ اس کی دونوں آنکھوں کے دیدوں میں بھی ایک ایک ستارہ بنا ہوا ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو بہت شکتی شالی ہوتا ہے۔ ایسے انسان کی پیدائش بعد میں ہوتی ہے جبکہ نورانی، کالے اور سفلی علم جیسے سادھوؤں، پیروں فقیروں اور حتیٰ کہ جوگیوں تک میں لڑائیاں پہلے شروع

ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی خواہش ہوتی ہے کہ جنم لینے والا انسان اس کی گرفت میں آجائے۔ ان میں سے جس کے قبضے میں وہ منش آجائے اس کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں ہوتا ہے۔

اس منش کے اندر بہت ہی شکتیاں پنہاں ہوتی ہیں جن کے بارے میں اسے کوئی علم نہیں ہوتا نہ ہی وہ اس بات سے آشنا ہوتا ہے کہ وہ بہت شکتی شالی ہے یا وہ ان شکتیوں کا استعمال کیسے کرے؟ ان میں سے جس کے ہاتھ وہ لگ جائے وہ اس کو اپنے علم کے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیتے ہیں۔ اکثر و بیشتر ایسا انسان کسی سادھو، جوگی یا کسی کالے علم کے ماہر کے ہاتھ ہی لگتا ہے اور وہ اس کا جیون اکارت کر دیتے ہیں۔ وہ شخص ان عارضی خوشیوں، پیسے کی ریل پیل، بن مانگے سب کچھ مل جانے پر آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور پھر جس بے دردی سے وہ خون کی ندیاں بہاتا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن اگر وہی شخص کسی نورانی علم کے ماہر کے ہاتھ لگ جائے تو جس سرعت سے وہ شیطان کے چیلوں کو واصل جہنم کرتا ہے اس کی نظیر ملنا تو ناممکنات میں سے ہوتا ہے لہٰذا میں تمہیں بتاتا چلوں ایسا ہی ایک شخص اس دنیا پر موجود ہے اور کالی شکتیاں اس کے بہت قریب پہنچ چکی ہیں مگر قبل اس کے کہ وہ ان کے نرغے میں پوری طرح سے جکڑا جائے فوراً سے بھی پیشتر اسے ان شیطانوں کے نرغے سے نکالو اور اپنے پاس لے جاؤ۔

شیطانی طاقتیں تمہارے علاقے میں اب داخل ہونے کی جسارت بھی نہ کر پائیں گی میں تمہارے علاقے کے گرد ایک حصار قائم کیے دیتا ہوں۔ یاد رکھنا وہ حصار صرف اس دن تک قائم دائم رہے گا جب تک تمہارے علاقے میں زنا اور بے وجہ قتل کی کوئی واردات وقوع پذیر نہ ہو جس دن کوئی ایسا واقعہ رونما ہو گیا تمہارے علاقے کو کالی طاقتیں اپنی تاک میں رکھ لیں گی۔۔۔۔۔" بابا نے اتنی بات کر کے چپ سادھ لی۔

انہوں نے چوغے نما قمیض کی جیب سے ایک چمڑے میں سلا تعویذ جس کے اندر ایک دھاگہ بھی ڈالا ہوا تھا۔ انہوں نے تسبیح کے دانے گرانے شروع کر دیے۔ ان کے لب بڑی سرعت سے ہل رہے تھے۔ پھر انہوں نے اس تعویذ پر یکے بعد دیگرے کئی پھونک ماریں اور پھر وہ تعویذ ہماری طرف بڑھا دیا جسے میں نے سرعت سے تھام لیا۔

"یہ تعویذ اس اوغلان کے گلے میں ڈال دینا شیطانی طاقتیں اس کا بال بھی بیکا نہ کر پائیں گی۔ بھنور من کا حصار بھی اس پر اثر نہ کر پائے گا۔ یہ بات اپنی جگہ ہے کہ شیطانی طاقتیں اس کا بال بیکا نہ کر پائیں گی مگر وہ اس کا مقابلہ کریں گی اور اسے ان کا مقابلہ کرنا پڑے گا اگر تھوڑا سا بھی لڑکھڑایا تو شیطانی طاقتیں اس کی تکہ بوٹی ایک کر کے رکھ دیں گی۔ صد ہا احتیاط کرنا پڑے گی کیونکہ احتیاط ہی اس کو کامیابی دلائے گی اگر اس نے یہ بات ذہن میں بٹھالی کہ وہ بہت شکتی شالی ہے تو کالی طاقتیں پلک جھپکتے میں اس کا سر قلم کر کے رکھ دیں گی اور وہ بے موت مارا جائے گا۔ بے شک کالی طاقتیں اس پر اپنا اثر و رسوخ قائم نہ رکھ پائیں گی مگر وہ اس کا مقابلہ ضرور کریں گی اور شیطانی چیلوں کے اندر ایک انسان کی نسبت بہت طاقت ہوتی ہے کیونکہ اس کے جسم میں انسانی خون اور گوشت ہوتا ہے جو وہ مظلوموں کو ابدی نیند سلا کر حاصل کرتے ہیں اور انسانی خون پینے اور گوشت کھانے والے سے دست و گریبان ہونا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے۔"

بابا نے وہ تعویذ میری طرف بڑھایا۔ میں حیران و ششدر بابا کی طرف دیکھنے لگا۔

"وہ شخص تم ہی ہو اس دنیا میں جس کے اندر ایسی شکتیاں پنہاں ہیں کہ اگر تمہیں ان شکتیوں سے آشنائی ہو جائے تو تم ایک ہی پھونک سے ساری کائنات کو جلا کر خاکستر کر دو، اس کائنات کو انگلی کے ناخن پہ اٹھا لو۔۔۔۔۔" بابا نے گہری آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں بابا کی بات سن کر یکسر ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ میرے اندر ایسی شکتیاں کہاں سے پیدا ہو سکتی ہیں جو روز اول سے ہی محرومیوں اور مایوسیوں کے سائے میں

پروان چڑھا ہو بھلا وہ ایسے شکتی شالی منش کیسے ہو سکتا ہے۔ ہلکی سی آہٹ پر جس کا دل اچھل کر حلق کو آن لگتا تھا۔ لگتا ہے یہ بڈھا پچھلی عمر میں سٹھیا گیا ہے جو ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ غلط فہمی کا لبادہ اوڑھ کر یہ مجھے پکڑ کے لائے ہیں مگر انہیں یہ نہیں پتہ کہ جسے وہ شکتی شالی انسان سمجھ رہے ہیں در حقیقت وہ خود برف کا ایک تودا ہے جسے وقت کے آفتاب کی تیز کرنیں وقتاً فوقتاً پگھلائے چلی جارہی ہیں۔ جو شخص خود زمین پر اوندھی پڑی بوتل کی طرح ہے جس کا کارک لگا ہوا ہے مگر غیر محسوس سی لیک۔۔۔ ٹپ ٹپ۔ بوتل سے ٹپکتے نہ دکھائی دینے والے قطرے۔۔۔ ایک صبح جو خالی بے وزن بوتل کی طرح لڑھکتا ہوا اندھیری کوٹھڑی میں جا گرے گا اور لوگ فالتو سمجھتے ہوئے مٹی کا ڈھیر اوپر لا دیں گے تاکہ دوبارہ اس اندھیری کوٹھڑی سے نکلنے کی جسارت نہ کرسکوں اور ادھر یہ بوڑھا۔۔۔

یہ سمجھتا ہے کہ میں شکتی شالی ہوں انگلی کے ناخن پہ کائنات کو اٹھا لوں یہ انگلی ہے یا بروز قیامت لگنے والا ترازو جس کے ایک پلڑے میں پوری انسانیت اور دوسرے پلڑے میں ان کے اعمال نامے تولے جارہے ہوں گے۔

شاید وہ بھی میری اندرونی کیفیات سے آشنا ہو گیا تھا۔ ویسے بھی وہ کوئی منش تھوڑی تھا جن زاد تھا دل کی باتیں پڑھ لینے کی شکتیاں تو ان کو حاصل ہوتی ہی ہیں۔

''تم جو کچھ بھی سوچ رہے ہو غلط سوچ رہے ہو، وہ شخص تم ہی ہو میرے بچے۔۔۔'' بڑے سردار نے پہلی بار بابا جی کی طرح ''میرے بچے'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ میں نے اس کی بات سنی ان سنی کردی۔ ویسے بھی ایسی باتوں پر کان دھرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جن کا حقیقت سے دور دور تک کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔

''یہ تعویذ گلے میں پہنو اس کو پہننے کے ساتھ ہی تم خود ہی اپنی شکتیوں سے آشنا ہو جاؤ گے۔ یہ تعویذ ہی وہ شکتی ہے جو تمہارے اندر سوئے ہوئے شکتی شالی منش کو بیدار کرے گی اور پھر اگر میری باتوں میں دروغ گوئی کا تاثر بھی دکھائی دے تو تم بنا کسی جھجک کے ہمارا ساتھ دینے سے انکار کر دینا ہم فی الفور تمہیں تمہاری دنیا میں بھیج دیں گے تمہارے ساتھیوں سربز خان، ظہیریان ملک اور سحر کے پاس جو تمہیں بھوکے بھیڑیوں کی مانند ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔''

بڑے سردار کی باتوں میں طنز کی آمیزش کو میں نے بہت قریب سے محسوس کیا تھا مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ بس اس تعویذ کو ایک نظر دیکھا اور ایک طائرانہ نگاہ ان دونوں پر ڈالی جو بڑے اشتیاق سے مجھے یوں تک رہے تھے جیسے میں ان کے لیے کسی فرعون کے خزانے سے کم نہ ہوؤں۔ میں نے چپ چاپ تعویذ گلے میں پہنا۔ تعویذ گلے میں پہننے کی دیر تھی کہ مجھے اچانک یوں لگا جیسے کسی نے مجھے یخ بستہ پانی سے اٹھا کر شعلے اگلتی آتش کی نذر کردیا ہو۔ میرے منہ سے ساعت شکن چیخیں نکلنے لگی۔

میں بھاگنا چاہتا تھا کہ کسی پانی کے تالاب میں جا کے چھلانگ لگاؤں مگر بے سود۔۔۔ مجھ میں اتنی بھی سکت باقی نہ رہی تھی کہ ہاتھ اٹھا کر اس تعویذ کو گلے سے نکال پھینکو۔ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ ایک مصیبت سے کیا جان چھوٹی یہ تو اس سے بڑی افتاد پلے پڑ گئی تھی۔ یک نہ شد دو شد والی بات بن چکی تھی۔ اسی کرب و اذیت کی حالت میں نجانے کب میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا چلا گیا۔

جب آنکھ کھلی تو مجھے اپنا آپ بہت ہلکا محسوس ہوا۔ نگاہ ادھر ادھر دوڑائی تو پتہ چلا کہ اسی بڑے سردار کے محل نما جھونپڑے کے ایک بنائے گئے کمرے میں پڑا تھا۔ مجھے سرہانے ایک جگ میں شربت بھرا پڑا تھا جبکہ ساتھ میں ایک گلاس بھی رکھا ہوا تھا۔ ایک طشتری میں کچھ خشک میوہ جات بھی رکھے ہوئے تھے۔ میں اٹھا اور ایک ہی سانس میں جگ کو منہ لگا کے غٹاغٹ سارا شربت حلق میں انڈیل گیا۔

میں اپنی اس تبدیلی پر خود ہی ساکت و صامت رہ گیا تھا۔ یہ بات بھی اپنی جگہ بجا تھی کہ اس شربت کا کوئی ثانی نہ تھا مگر اتنا شربت ایک ہی سانس میں حلق میں انڈیل جانا میرے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ طشتری میں نے اپنے سامنے رکھی اور تھوڑی ہی دیر میں خالی طشتری میرے سامنے پڑی تھی۔ میری بھوک و پیاس بدستور قائم و دائم تھی۔ کچھ سجھائی نہ دے پا رہا تھا کہ آخر معاملہ کیا تھا۔ بے ہوشی سے قبل کے تمام واقعات میرے ذہن سے جیسے کھرچ دیئے گئے تھے۔ میں اپنی ذات سے بھی

آشنا ہو چکا تھا۔ میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ میں کون ہوں۔ اس وقت مجھے ایک ہی فکر دامن گیر تھی کہ کسی طرح کہیں سے مجھے پیٹ بھر کے کچھ کھانے کو مل جائے۔

میں ابھی انہی خیالات کی زد میں تھا کہ میں جس کمرے کے ایک خوبصورت بستر پر براجمان تھا۔ اس کا پردہ سرکا اور بڑے سردار اور بابا جی دونوں اندر داخل ہوئے۔ میں ان دونوں کو دیکھ کے فوراً پہچان گیا کہ یہ بڑے سردار اور بابا جی ہیں مگر میں یہاں کیوں لایا گیا تھا۔ یہ مجھے کچھ یاد نہ تھا۔ بڑے سردار میرے قریب آئے اور مجھے آنکھیں بند کرنے کا حکم صادر فرمایا میں نے کٹھ پتلی غلام کی طرح فوراً سے بھی پیشتر آنکھیں بند کرلیں یوں جیسے مجھے پہلے سے ہی معلوم ہو کہ یہ حکم ملنے والا ہو۔

بڑے سردار نے میرے سر پر اپنا ہاتھ رکھا۔ اس کے ہاتھ کا لمس میں نے واضح طور پر محسوس ہوا پھر تو جیسے بند آنکھوں کے سامنے ایک فلم سی چل گئی ہو۔ گزرے تمام واقعات بڑی سرعت سے آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے اور دماغ پر چڑھی دھند چھٹ گئی۔ اسی لمحے بڑے سردار کی آواز میری قوت سماعت سے ٹکرائی۔

”آنکھیں کھول لو میرے بچے۔“

بڑے سردار کی بات سن کر میں سرعت سے آنکھیں کھولیں اب پچھلے تمام حالات و واقعات میرے ذہن میں نقش ہو چکے تھے۔ ہر گزری بات مجھے یاد آ چکی تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے دونوں کی طرف دیکھا۔

میرے بچے تمہیں مبارک ہو تمہیں بالآخر تمہاری شکتیاں مل ہی گئیں۔ بے شک ایک کرب ناک لمحے سے تم دوچار ہوئے ہو۔ مگر تم نے جس ہمت واستقلال کا مظاہرہ کیا وہ قابل رشک ہے۔ جانتے ہو آسمان کی وسعتوں سے نوری شعاعیں کس سرعت سے تمہارے تن بدن میں گھستی چلی جارہی تھیں۔ ہماری تو آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ تم اپنے رب کا شکر ادا کرو کہ تمہیں شیطانی طاقتوں کے شکنجے میں جکڑنے سے قبل ہی اس ذات نے نوری طاقتوں کے قبضے میں دے دیا۔ وگرنہ اب تک تم مخلوق کے لیے ایک ناسور بن چکے ہوتے اور ایک عبرت ناک موت تمہارا مقدر بن چکی ہوتی۔۔۔۔۔“ اب کی بار بابا جی نے میرے پاس بستر پر براجمان ہوتے ہوئے کہا۔ انہوں نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔ مجھے عرصہ دراز بعد آج یکبارگی اپنے والدین کی یاد آ گئی۔ کتنے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن پر ہمیشگی والدین کی دعائیں سایہ فگن رہتی ہیں۔ اور دنیا کی کوئی بھی ان کا بال تک بیکا نہیں کرسکتی۔

ایک میں ہوں کہ والدین کی جدائی کا غم سینے میں چھپائے ان کی یادوں کے بل بوتے پر زندگی کے دن گزار رہا ہوں۔ والدین کو یاد کر کے یکبارگی میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ دل پہ لگے گھاؤ مندمل ضرور ہو سکتے ہیں مگر ان کے نشانات ہمیشگی ثبت ہو جاتے ہیں۔ گھاؤ ہمیشگی اپنے نشانات نقش کر جاتے ہیں۔ چاہے وہ کسی کی جدائی کا گھاؤ ہو یا کسی اپنے کی موت کا۔ گھاؤ، گھاؤ ہی ہوتا ہے جو فرضی طور پر ختم تو ہو جاتا ہے مگر اس کے اثرات دیر پا رہتے ہیں۔ اور ان گھاؤ کی تپش ہمیشہ انسان کھلساتی رہتی ہے۔ مرغ بسمل کی طرح ہمیشہ انسان انگاروں پر جلتا رہتا ہے۔ ماہئ بے آب کی طرح تڑپتے تڑپتے زندگی اور موت کی جنگ ایک دن ہار جاتا ہے اور ہمیشہ کے لیے خالق حقیقی سے جاملتا ہے۔

”رونے دھونے سے کوئی واپس نہیں آتا میرے بچے۔ دل چھوٹا مت کرو خالق نے تمہیں ایک نیک کام کے لیے چن لیا ہے۔ تم اپنے آپ کو خوش قسمت انسان تصور کرو میرے بچے کہ تم جلد ہی اس پاک دھرتی سے شیطانی طاقتوں کو نیست و نابود کرنے والے ہو۔۔۔۔“ اب کی بار بڑے سردار نے جو میرے سامنے صوفے پر براجمان تھے۔ میری ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

”بالکل میرے بچے! تم خود سوچو رونے سے تو تم کمزور پڑ جاؤ گے حریف تم پر حاوی پڑ جائیں گے جبکہ ہمت و حوصلے سے شیطانی طاقتوں کو تم پل بھر میں چھٹی کا سبق یاد دلا سکو گے اور یہی نہیں تمہیں میرے بچے نا لج ہونا چاہیے کہ کوئی بھی نیک کام کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ بلکہ نیکی تو ایک ایسی جمع پونجی ہے جسے بنک میں جمع کرواؤ یا نہ کرواؤ مگر اس پر سود لگتا رہتا ہے۔ دوگنا چوگنا بلکہ کئی گناہ مگر یہ سود حرام بھی

نہیں ہوتا۔ اور یہی نہیں اس ایک نیکی کا ثواب تمہارے اکاؤنٹ میں تو جائے گا ہی تمہارے اپنوں کے اکاؤنٹ میں بھی اس کا شیئر جائے گا۔ یہ کوئی دنیاوی بینک تو ہے نہیں بلکہ خدائی بینک ہے جہاں انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے تمہاری یہ نیکی کبھی رائیگاں نہیں جائے گی۔''

بڑے سردار کی باتوں میں دم تھا۔ میرے اندر پست ہوتے ارادوں کو تقویت حاصل ہوئی اور اب کی بار میں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ چاہے کچھ بھی ہو میں ان ظالموں کو عبرت ناک موت مار کے اس معصوم لڑکی کو ان کے چنگل سے ضرور آزاد کروا کے لاؤں گا چاہے اس کام میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

''میں جان ہتھیلی پر رکھ کر ان ظالموں کو کیفرکردار تک پہنچا کر ہی دم لوں گا بڑے سردار۔۔۔'' میں کھوئی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا تو دونوں باپ بیٹا میری طرف محوحیرت سے تکنے لگے شاید انہیں مجھ سے اس جواب کی توقع نہ تھی۔

''تمہارے اندر ان ظالموں نے مشروب کی صورت میں جو بچھو کا زہر اور انسانی خون ملا کر ڈالا تھا۔ وہ تمہاری رگ رگ میں سموچکا تھا۔ مگر اس ندی میں غسل کرنے کے بعد تمہارے جسم سے نہ صرف اس کا زہر اتر گیا بلکہ ہر قسم کی میل کچیل جو تمہیں اندر کے شکنجے میں پھنسانے میں ممد و معاون ثابت ہوتی تھی ختم ہوگئی ہے۔ اب تم ماں کی کوکھ سے جنم لینے والے نوزائیدہ بچے کی مثال ہو۔ جس کا چہرہ چودھویں کے چاند کے جیسے پوری آب و تاب سے چمکتا ہے۔

میرے بچے میری ہر بات کو دھیان سے سننا۔ ہم صرف تمہیں ان کی دنیا تک پہنچا سکتے ہیں۔ اس سے آگے مزید تمہارا کوئی ساتھ نہیں دے سکتے۔ تمہارے راستے میں جو بھی رکاوٹ حائل ہو جب تم اس کا اوپائے اپنے دماغ میں سوچو گے تو تمہاری شکتیاں خود سے ہی تمہیں اس کا کوئی بہتر اوپائے بتا دیں گی۔ تمہارے راہ میں ان گنت اور کٹھن دشواریاں پیش آئیں گی۔ تمہیں تمہارے راستے سے ہٹانے کے لیے ہر ممکن سعی کی جائے گی۔ وہ بہت آتش کے پرکالے ہیں۔ تمہیں مات دینے کی ہر ممکن سعی کریں گے۔ اگر تم ان کے اوچھے ہتھکنڈوں میں آگئے تو وہ بلا تاخیر تمہیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے کیونکہ وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح تمہاری تلاش میں سرگرداں ہیں۔ وہ انگشت بدنداں ہیں کہ تمہیں یکبارگی زمیں آسمان کھا گیا ہے یا زمین نگل گئی ہے۔

تمہیں ہر مصیبت کا منہ توڑ جواب دینا ہے۔ حریف کو ناکوں چنے چبوانا ہی تمہارا مقصد ہے۔ ایسی موت مارنا کہ قیامت تک شیطان دوبارہ کبھی ایسی تقصیر سرزد کرنے کی سوچے بھی نہ۔۔۔۔۔'' بڑے سردار کے لب ولہجے سے غصے و حقارت کے تاثرات عیاں تھے۔ یہی نہیں بابا جی بھی بڑے سردار کی باتیں سن کر غصے سے لال پیلے ہوئے بیٹھے تھے۔ ان کی پیشانی پر نمودار ہونے والی سلوٹیں ان کے اندر سلگتی نفرت کی آتش کو عیاں کررہی تھیں۔ حقیقت تو یہ تھی کہ خود میں بھی اب ان کے لیے اپنے دل میں شدید نفرت کے تاثرات رکھتا تھا۔

☆......☆......☆

''سمجھ میں نہیں آرہا کہ اسے زمیں کھا گئی کہ آسماں نگل گیا۔ آخر اس کائنات کا کونسا ایسا کونا کھدرا ہے جس کے اندر وہ جا چھپا ہے اور ہمیں کہیں دکھائی ہی نہیں دے پارہا۔ ہمارا علم ہماری شکتیاں تک اس کا اتہ پتہ نہیں لگا پائیں ہو نہ ہو وہ کسی نورانی شکتی کے زیر اثر ہے مگر وہ جہاں بھی ہے ہمیں ہر حال میں اسے سیپ میں سے موتی کے جیسے ڈھونڈھ نکالنا ہے۔ جتنی جلدی ہوسکے اب ہمیں اس کو موت کے گھاٹ اتارنا ہوگا۔ اگر وہ حقیت میں کسی نورانی شکتی کے زیر اثر ہے تو اب تک اسے اس کی اور ہماری حقیقت سے آشنائی مل چکی ہوگی اور اگر اسے حقیقت میں اس کی اصلیت معلوم پڑگئی تو ہمارا جینا اجیرن کرکے رکھ دے اسے موت کے گھاٹ اتارنا ہمارے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف ہوجائے گا۔ پاؤں پہ پاؤں دھرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہمیں فوراً سے بھی پیشتر اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ہے۔۔۔۔۔'' بھنور من نے سب کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں سے اس کے اندر کی کیفیت عیاں ہورہی تھی۔

خوف اجل نے بری طرح سے اسے اپنی آغوش میں بھرلیا تھا اور شاید اسے کامل یقین ہو چکا تھا کہ موت اس کے سر پر ناچ رہی ہے اور اگلے ہی کسی پل وہ لقمۂ اجل ہو جائے گا۔ اس وقت بھنور من، فرنوس بھنور من اور سحر کے علاوہ اور بھی کافی چہرے اس کے روم میں دکھائی دے رہے تھے۔ یہ وہی دفتر تھا جس کی حالت اچانک ہی تبدیل ہوگئی تھی۔ وہ دفتر سے ایک ایسا بند کمرہ بن گیا تھا۔ جو قبر کی طرح بند تھا۔ اس کے درودیوار میں کوئی دروازہ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ جس کو دیکھ کے کوئی بھی ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو سکتا تھا کہ یہ شخص یہاں اندر کیسے آئے اور اب اندر آچکنے کے بعد یہاں سے باہر کیسے جا پائیں گے۔۔۔؟

بے شک یہ قبر کی طرح ایک بند کمرہ تھا مگر بہت کشادہ کمرہ تھا۔ یہ عام کمرے سے کہیں زیادہ کشادہ روم تھا۔ کمرے میں کسی طرح کی گھٹن تک کا احساس نہ ہو رہا تھا۔ یہی نہیں ایک روشنی کا بھی معقول انتظام تھا مگر یہ روشنی کہاں سے آرہی تھی کوئی پتہ نہ تھا۔

کہیں وہ بڑے سردار یا اس کے لوگوں کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا اگر ایسا ہے تو پھر حالات بہت ہی ناسازگار ہیں کیونکہ وہ سحر کو ہمارے چنگل سے نکلوا کر لے جانے کی ہر ممکن سعی کرے گا۔۔۔" اچانک ہی فرنوس بھنور من نے بھنور من کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو چاروناچار بھنور من کو سوچوں کے بھنور میں اپنی ناؤ چکراتی ہوئی محسوس ہوئی۔

بھنور من کی بات سن کر سحر کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ بے شک وہ ان کے تابع ہو کر ان کے حکم کے مطابق ہر کام احسن طریقے سے سرانجام دے رہی تھی مگر حقیقت میں وہ اپنے دل کے پنہاں کونوں کھدروں میں ان کے لیے نہایت ہی نفرت اور انتقام کے تاثرات رکھتی تھی۔ وہ بہت آتش کی پرکالی تھی۔ وہ موقع کی تلاش میں تھی۔ بے موقع وار کرنا رائیگاں جا سکتا تھا اور ایسی سچوایشن میں ان پر عیاں ہو سکتا تھا کہ عرصہ دراز سے وہ جس لڑکی پر اندھا اعتماد کرتے چلے آرہے ہیں وہ پس پشت ان کے لیے ہی کنواں کھود رہی ہے اور بدلے میں اسے ہی اس کنویں کی نظر کر دیا جائے گا۔

فرنوس بھنور من کی بات سن کر اس کے شکستہ جذبات اور ناامیدی کی پرچھائیاں اس کے چہرے سے ہوا ہو چکی تھیں۔ اسے امید کی ایک کرن دکھائی دے رہی تھی۔ اسے پورے وثوق سے کہہ سکتی تھی کہ وہی نوجوان اب ان کے لیے موجب اجل بن کے آئے گا اور ان ظالموں کو ایسی سزا دے گا کہ ان کی اگلی پچھلی نسلیں یاد رکھیں گی۔

"تم کن سوچوں میں الجھی بیٹھی ہو سحر۔۔۔۔؟" یکبارگی اس کی قوت سماعت سے فرنوس بھنور من کی بازگشت ٹکرائی تو اس نے چونکتے ہوئے حواس باختہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ جو پیہم ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کک۔۔۔۔ کچھ ۔۔۔ نن ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ وہ ۔۔۔ مم ۔۔۔ میں ۔۔۔ تت ۔۔۔ تو ۔۔۔۔" الفاظ تھے کہ مجتمع نہیں ہو رہے تھے۔ اس کی آناً فاناً اس سچوایشن پر دونوں نے پر تشویش آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نہ سحر کوئی الجھن تو درپیش نہیں ہے ناں تمہیں۔۔۔۔۔" بھنور من نے سوالیہ آنکھوں سے اس طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو فوراً سے بھی پیشتر اس نے اپنے منتشر ہوتے حواس کو یکجا کیا۔

"نہیں کچھ نہیں۔ بس میں یہ سوچ رہی تھی کہ اب میں کسی طور واپس جانا نہیں چاہتی۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ دل لگ گیا ہے میرا۔ اب کوئی ایسی ترکیب سوچ رہی ہوں کہ اس نوجوان کو اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی موت کی نیند سلا دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ سانپ کے پھن اٹھانے سے قبل اگر اسے کچل دیا جائے تو بہتر ہوتا ہے ورنہ جب وہ مستعد ہو جاتا ہے تو وبال جاں بن جاتا ہے۔۔۔۔" انہیں اپنے مکمل اعتماد میں لینے کے لیے اس نے ایسا تیر چھوڑا جو نشانے پر لگا۔

ہم تمہاری وفاداری کے قائل ہیں سحر اب ہم تینوں کو یکجا ہونا پڑے گا۔ اول تو ہماری شکتیوں کے آگے وہ ٹھہر نہیں پائے گا۔ اور اگر ہماری شکتیوں کو چکمہ دینے میں سپھل ہو بھی گیا تو ہم اسے ایسا سبق سکھائیں گے کہ نانی یاد آجائے گی۔ دن دیہاڑے تارے نظر آجائیں گے بڑا آیا ہم سے

دست وگریبان ہونے۔ گیدڑ کی جب بھی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے اوراس مورکھ کی موت آئی ہے تو ہماری طرف بھاگا چلا آرہا ہے۔۔۔ بھنور من نے سامنے دیوار پر کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہ ٹکاتے ہوئے کہا۔

''مگر یہ لازم تو نہیں کہ وہ ہمارے خلاف ہی ہوگیا ہو ممکن ہے کوئی ہم سے زیادہ شکتی شالی اسے لے اڑا ہو ہم کچھ اور سوچتے رہیں اور ہو کچھ اور جائے۔۔۔'' فرنوس بھنور من نے بدستور سریز خان پر نگاہیں مرکوز رکھتے ہوئے بھنویں اچکا کر کہا۔

''یہ بھی ممکن ہے۔۔۔'' سحر نے اس کی بات کی تصدیق کی جبکہ بھنور من نے جواباً سر ہلایا۔

''مگر جو بھی ہے ہمیں جلد سے جلد حقیقت کا پتہ لگانا ہے ورنہ ''اب پچھتائے کیا ہوت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت'' کے مترادف پاؤں پہ پاؤں دھرے بس ہاتھوں پر سرسوں ہی نہ جماتے رہ جائیں۔۔۔۔'' فرنوس بھنور من نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

پھر تینوں بہت قریب ہو کر بیٹھ گئے اور تینوں کے درمیان کافی دیر راز دارانہ گفت وشنید کا ایک طویل سلسلہ جاری رہا۔ اس جاری سلسلے کے اختتام پر تینوں کی آنکھوں میں ایک چمک تھی یوں جیسے انہیں پلک جھپکتے میں قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔

☆......☆......☆

بابا کی ہدایت کے عین مطابق میں نے آنکھیں موندھ لیں تو دوسرے ہی ثانیے یوں لگا جیسے میرا شریر اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا جارہا ہو۔ ایک ہول سا پورے وجود پر طاری ہوگیا۔ اب ڈر کی وجہ سے آنکھیں نہ کھول پارہا تھا کہ پتہ نہیں یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ عین اسی لمحے یوں لگا جیسے اوپر اٹھتا شریر اب ایک سمت بڑھ رہا ہو۔ جیسے انسان بستر پر دراز ہوتا ہے عین اسی حالت میں میرا بدن بدستور ایک انجان مگر جان لیوا منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ چاہتے ہوئے بھی آنکھیں کھولنا میرے بس کا روگ نہ تھا۔ ہوا بہت سرعت سے میرے شریر سے ٹکرا رہی تھی۔ سائیں سائیں کی آوازیں میری قوت سماعت سے ٹکرا رہی تھیں جنہیں سن کے تن بدن میں خوف سا پھیل گیا۔

اچانک مجھے یوں لگا جیسے اب کی بار میرا جسم نیچے ہی نیچے جارہا ہو۔ ہوا کا رخ بھی تبدیل ہوگیا تھا۔ اب ہوا میرے چہرے کی بجائے پیروں سے بڑی تیزی سے ٹکراتی ہوئی نیچے سے باقی شریر سے ٹکرا رہی تھی۔ دوسرے سمے میرے پاؤں زمین سے ٹکرائے۔ یوں لگا جیسے تیز چلتی ہوائیں اور سائیں سائیں کی آتی آوازیں سب کچھ یکبارگی تھم سا گیا ہو۔ ابھی میں اسی تذبذب کی حالت سے دوچار تھا کہ بڑے سردار کی بازگشت میری قوت سماعت سے ٹکرائی۔

''آنکھیں کھول لو میرے بچے! اور اب آنکھیں کھول کے ہی رکھنا۔''

میں ان کی بات کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ کہ انہوں نے آخری فقرے پرزور کیوں دیا تھا۔ واقعی اگر آنکھیں کھلی نہ ہوں تو انسان کو دھوکہ کھانے میں دیر نہیں لگتی۔ ماتھے پہ اگر تیسری آنکھ نمودار ہوجائے تو انسان کی خوفناکیت اور اس کی شخصیت کو پرہیبت بنانے میں کوئی دیر نہ لگے مگر حقیقت تو یہی ہے کہ اگر یہ تیسری آنکھ نہ ہو تو دنیا انگلیوں پر نچا کے رکھ دیتی ہے عین اسی طرح جیسے میری تیسری آنکھ نے بروقت کام نہ کیا اور اب میں نجانے کن چکروں میں پھنس کے رہ گیا تھا۔ جن کی آپس میں کڑیاں جڑتی جارہی تھیں۔ جو حل ہونے کا نام تک نہ لے رہے تھے۔

''اے اللہ! یہ شکتی شالی والا روپ مجھے ہی کیوں عطا کیا کسی اور کو عطا کر دیتا۔''

میں نے پرشکوہ آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا مگر فوراً ہی مجھے اپنی تقصیر کا احساس ہوا۔

''میرے اللہ! میری اس غلطی سے درگزر فرما۔ میرے اللہ! مجھ پر رحم فرما۔ میں نادان، مٹی کا پتلا یہ کیسی غلطی کر بیٹھا۔ تو غفور و رحیم ہے میرے مالک! درگزر فرما۔''

میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ میں ابھی اسی سچوایشن سے دوچار تھا کہ مجھے اپنی قوت سماعت سے ایسی آوازیں ٹکرائیں جیسے بہت سے بھیڑیے دھاڑ رہے ہوں۔ میں نے فوراً سے بھی پیشتر سامنے دیکھا تو میرے قدموں

تلے زمین کھسک گئی۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ سامنے کا منظر ہی اتنا بھیانک تھا کہ میں تو کیا کوئی بھی ہوتا تو شلوار گیلی کر بیٹھتا بلکہ اوپر جا چکا ہوتا۔ مگر شاید یہ اس شکتی کا کمال تھا کہ میں زندہ تھا جو میرے تن بدن میں پنہاں تھی۔

میرے سامنے ایک ساتھ چار بدصورت بھیڑیے مجھ پر حملہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ شکل سے تو وہ بھیڑیے ہی تھے مگر کا باقی شریر عجیب ہی طرح کا نہایت ہی پر ہیبت تھا۔ ان کی ٹانگیں تو گویا کسی مردہ ہاتھی کے اسپیئر پارٹس لیے ہوں۔ آج کا سائنسی دور ہے ہر چیز کے سپیئر پارٹس دستیاب ہیں۔ یہی نہیں کوئی انسان بھی اگر اپنے کسی عضو سے ہاتھ دھو بیٹھے تو وہ بھی دوبارہ مل جاتا ہے۔ جیسے اگر کسی کے پاؤں نہیں تو آرٹیفیشل پاؤں لگائے جاتے ہیں اسے تاکہ وہ اپنی زندگی کی بھاگ دوڑ جاری رکھ سکے۔ امید ہے ان بے چاروں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ مگر سوائے منہ کے ان کا تو پورا شریر ہی سپیئر پارٹس میں تبدیل ہو چکا تھا۔

ایک بات نے تو بڑا مجھے ورطۂ حیرت میں مبتلا کر کے رکھ دیا کہ اتنے بڑے بڑے بھیڑیے اور دم کا نام ونشان تک نہ تھا۔ ان بھیڑیوں کے منہ بھی اتنے بڑے کہ سانس پیچھے کھینچیں اور میں دھڑام سے ان کے پیٹ کے اندر۔ مگر ہائے افسوس ان کے پیٹ دیکھ کر نہایت ہی کوفت ہوئی اور ان کی بے چارگی پہ افسوس بھی ہوا کہ دیکھو ویسے کیسے ہٹے کٹے لگ رہے ہیں مگر پیٹ یوں ان پسلیوں میں دھنسے ہیں جیسے صدیوں سے کھانے کو کچھ نہ ملا ہو۔

''اے آدم زاد! چل الٹے قدموں دفع دور ہو جا یہاں سے وگرنہ ہڑپ کر جاؤں گا تجھے۔۔۔۔۔'' دائیں طرف کا آخری بھیڑیا اچانک انسانی آواز میں مجھ سے گویا ہوا تو میری تو چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ بھیڑیے بھی انسانوں کی زبان بولنے پر عبور رکھتے ہیں۔

''ابے منہ کیا کھڑا دیکھ رہا ہے سمجھ نہیں آئی ہمارے باس کی بات۔۔۔۔۔'' اب کی بار اس کے ساتھ والے بھیڑیے نے مجھے مخاطب کیا۔

''تم حقیقت میں بھیڑیے ہی ہو یا کہ بھیڑیے کے روپ میں چھپے انسان۔ یہ کیا گھناؤنا مذاق ہوا بھلا کہ بھیڑیوں کا سا لباس زیب تن کر کے بھیڑیے بن گئے مگر بے وقوفی دیکھو لو تم کر ہی گئے بجائے بھیڑیوں کی طرح دھاڑنے کے انسانوں والی زبان بولنے لگ گئے۔۔۔۔۔'' میں نے ان چاروں کی طرف دیکھ کر زور سے ساعت شکن قہقہہ خارج کیا۔ میری بات سن کر چاروں نے ایک دوسرے کی طرف انگشت بدنداں ہو کر دیکھا۔

''مورکھ! ہم بھیڑیے ہی ہیں دیکھ نہیں رہا۔۔۔۔۔'' ایک بھیڑیے نے اب کی بار ذرا اچھل کود کر کے کہا۔

''ابے پاگلو تم نے مجھے بزدل سمجھا ہے کہ میں تم سے ڈر جاؤں گا اور پھر میری اس بوکھلاہٹ سے تم لوگ استفادہ حاصل کرو گے۔۔۔۔'' میں نے سرعت سے پنڈلی کے ساتھ بندھا خنجر نکالتے ہوئے کہا۔ ''تکہ بوٹی کر دوں گا تمہاری۔''

میں نے خنجر ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ تو چاروں نے پہلے مجھے بغور دیکھا اور پھر ان میں سے ایک اپنے ساتھی کو اشارہ کرتے ہوئے گویا ہوا:

''یہ مورکھ منش ایسے نہیں مانے گا اسے بتاؤ کہ ہم واقعی بھیڑیے ہیں۔''

دوسرے ہی لمحے ایک بھیڑیے نے چست لگائی اور مجھ پر آ گرا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ وہ تو واقعی ہی بھیڑیے ہیں۔ قبل اس کے کہ اس بھیڑیے کا پنجہ میرے دل کے مقام پر پیوست ہوتا میرے ذہن میں بڑے سردار کی بات یاد آ گئی اور میں نے فوراً کہا۔

''چل اتر نیچے۔''

دوسرے ہی لمحے حیران کن طور پر وہ ایک مؤدب غلام کی طرح میرے اوپر سے اتر گیا۔ یہ سب دیکھ نہ صرف میں بلکہ باقی تینوں بھیڑیے بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔ میں بری طرح گھبرا گیا تھا اور کھڑا ہانپ رہا تھا۔

''ٹکڑے ہو جائیں تیرے کیا حال کر دیا ہے تو نے میرا۔''

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ اچانک مجھے

یوں لگا جیسے میرے قریب ہی کوئی چیز دھڑام سے گری ہو۔ میں نے سرعت سے نیچے دیکھا تو میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک کر رہ گئی۔ وہ بھیڑیا حقیقت میں ٹکڑوں میں منقسم زمین پر پڑا تھا۔ میں نے باقی تینوں بھیڑیوں کی طرف دیکھا۔ جو بوکھلاہٹ بھرے انداز میں میری طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

"ارے باپ رے بھاگو یہ تو کوئی ہم سے بھی بڑا شکتی شالی ہے۔ ارے بھاگو کہیں ہمیں بھی واصل جہنم نہ کردے۔"

اب کی بار وہی پہلے والا بولا اور قبل اس کے کہ وہ الٹے قدموں بھاگتے وہ بھی ٹکڑوں میں منقسم ہو چکے تھے۔ میں جانتا تھا کہ کسی کو بھی اگر میں نے زندہ چھوڑ دیا تو وہی میرے لیے وبال جان بن سکتا ہے۔ میں مکمل طور پر صفایا کے ظالموں تک پہنچنا چاہتا تھا۔

ابھی میں وہیں ایستادہ منتشر حواس کو بحال کرنے کی سعی کر رہا تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے کوئی پرندہ پھڑ پھڑاتا ہوا آسمان پر اڑ رہا ہو۔ میں نے سرعت سے اوپر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ کوئی معمولی پرندہ نہ تھا بلکہ بہت بڑا پرندہ تھا۔

"میرے اللہ! یہ کیا افتاد ہے؟"

کم و بیش اس پرندے کی لمبائی اٹھارہ سے بیس فٹ ہوگی اور چوڑائی بھی اس سے کم نہ ہوگی اس کی شکل واضح دکھائی نہ دے پا رہی تھی جبکہ اس کے بڑے بڑے جان لیوا پنجے بہت واضح دکھائی دے رہے تھے۔ میں ٹکٹکی باندھے حیرت کے سمندر میں غوطہ زن اسے تکے جا رہا تھا۔ ہوا کے دوش پہ اڑتا ہوا وہ پرندہ جب پر مارتا تو ہوا کا ایک تیز جھونکا جسم سے ٹکراتا اور یوں لگتا جیسے ابھی اڑ کر دور جا گروں گا۔ دھیرے دھیرے وہ نیچے آ رہا تھا اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ میرے سامنے براجمان تھا۔

مجھے چڑیا چڑیل کہتے ہیں۔ ہر کس و ناکس میرے نام سے کانپتا ہے۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ میرے نام کا ڈنکا بجتا ہے۔ تم جس مقصد کے تحت آئے ہو اس میں کامیاب ہونے کی بات ہی دل سے نکال دو کیونکہ تم اس وقت تک یہاں سے نہیں جا سکتے جب تک مجھے موت کے گھاٹ نہ اتار لو اور یہ تمہارے بس میں نہیں ہے کہ تم مجھے موت کے گھاٹ اتار سکو۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا بندی بنا کے اپنے علاقے میں لے جاؤں گی جہاں ایک خاص عمل کے بعد تم سے شادی رچاؤں گی اور پھر تمہاری شکتیوں پر تمہارے جتنا میرا بھی حق ہوگا۔ میں پھر تمہارا خون پی کر امر ہو جاؤں گی مورکھ منش۔ تم نے یہاں آ کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔۔۔" وہ اچانک ہی پرندے سے ایک خوفناک شکل کی چڑیل میں تبدیل ہوگئی۔ میں زیر لب مسکرایا اور اس کی طرف دیکھ کر کہا تجھے آگ لگ جائے مگر میں یہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا کہ آگ کا ایک دہکتا شعلہ اس کی جانب لپکا مگر اس کے قریب جا کر بجھ گیا۔ وہ بدستور اپنے پیلے پیلے دانت نکالے میری طرف دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی۔

"کر لو جتنے وار کرنے ہیں مورکھ منش۔ تجھے میرا بندی بننے سے دنیا کی کوئی بھی شکتی نہ روک پائے گی۔ میں تجھے موقع دیتی ہوں جتنے پاپڑ بیلنے ہیں بیلو مگر دیکھو کہ تم میرا بال بھی بیکا نہ کر پاؤ گے جانتے ہو اس کی وجہ کیا ہے کیونکہ میری جان ایک چڑیا کے اندر ہے اور وہ چڑیا میرے محل میں ایک ایسی جگہ میں نے چھپا کے رکھی ہے جہاں سے نکالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے کیونکہ جس کمرے کے اندر وہ چڑیا کا پنجرہ ہے اس راستے میں نے ایک حصار قائم کر رکھا ہے اور جو بھی اس حصار کو چھوئے گا فوراً ہی پیشتر جل کر خاکستر ہو جائے گا۔ اس لیے اب تیار ہو جائے آج سے تم میرے بندی بن کر میرے لیے کام کرو گے میرے آقا کو موت کے گھاٹ اتارنے آئے تھے پہلے مجھ سے تو نمٹ لو تمہارے اندر تو اتنی سکت نہیں کہ مجھ سے دست و گریباں ہو سکو آقا سے سامنا کرنا تو تمہارا صرف واہمہ ہے۔۔۔" اس چڑیل نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ایک بار پھر پرندے کا روپ دھار چکی تھی۔

☆......☆......☆

اس نے مجھے لا کر اپنے محل میں آزاد چھوڑ دیا جیسے اسے امید واثق ہو کہ میں چاہ کر بھی اس محل سے نکل نہ پاؤں گا۔ وہ

واقعی محل تھا بالکل کہانیوں میں پڑھے اور ڈرامے فلموں میں دکھائے محلوں سے ہزار ہا گنا خوبصورت۔ پورے محل کے اندر نرم وگداز اور موٹی تہہ والا قالین بچھا ہوا تھا۔ جس پر پاؤں رکھتے ہی سکون محسوس ہو۔ درو دیوار پر ریشمے اور مہنگے پردے لٹکائے گئے تھے۔ ایسے قیمتی اور خوبصورت پردوں کا نہ آج تک کسی کہانی میں پڑھا تھا نہ کسی فلم ڈرامے کے کسی سین میں دیکھا تھا۔ ان کے بارے میں لفظ نہیں کہ ان کے بارے میں کیسے وضاحت کروں کیونکہ حقیقت میں وہ بہت ہی خوبصورت اور دیدہ زیب پردے تھے۔ جگہ جگہ چھتوں پر قیمتی اور بڑے بڑے فانوس لٹکائے گئے تھے جن کے اندر بلب یا انرجی سیور کی بجائے بڑے بڑے ہیرے لگائے گئے تھے۔ اور ہر ہیرا دوسرے سے ہیت کے اندر نہ صرف الگ تھا بلکہ اس میں سے چھم چھم کرتی روشنی بھی اس سے الگ تھی۔

ایک بہت ہی پیارا منظر تھا۔ پورا محل مختلف روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ دیواروں پر لگے پتھروں کو تراش تراش کے ہر پتھر پر ایک الگ ہی ڈیزائن بنایا گیا تھا۔ کسی پر کوئی تصویر بنی ہوئی تھی۔ کسی پر نہایت ہی خوبصورتی نقش ونگاری کی گئی تھی جبکہ کئی تو ایسی بھی تھیں جن پر خونی تصاویر بنائی گئی تھیں۔ محل کے اندر ایک سے بڑھ کر ایک کنیز پھر رہی تھیں اور سب مجھے بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھیں۔

میں ایک بار تو چلتے چلتے ایک سے ٹکرا بھی گیا اور اس کے ہاتھ میں پکڑی طشتری جس میں چھوٹے چھوٹے نہایت ہی قیمتی گوہر ہائے آبدار تھے جو پلک جھپکتے میں ادھر ادھر بکھر گئے۔ اس کے تو کانوں پر جوں تک نہ رینگی تھی کہ اس کی طشتری میں سے سب کچھ ادھر ادھر بکھر چکا ہے مگر میں جلدی سے سیدھا ہو کر اس سے ایکس کیوز کیا۔ جب کہ وہ زیر لب مسکرا دی۔ اور پھر ایک دم بکھرے موتی خود ہی اڑ اڑ کر اس کی طشتری میں دوبارہ بھر گئے اور وہ آگے بڑھ گئی۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور تب مجھے یاد آگیا کہ میں ایک چڑیل کے قبضہ میں ہوں۔

☆......☆......☆

بہت دم مار رہا تھا مگر ہماری وفادار چڑیل نے آخر اسے اپنے نرغے میں جکڑ ہی لیا۔ میں نے تو کہہ دیا ہے کہ اسے کسی طرح ناپاک کرو جب تک اس کو کوئی ناپاکی نہیں ہوتی ہم اس پر اس وقت تک قابض نہیں آسکتے کہہ رہی تھی ایک نوجوان لڑکی بن کر اسے اپنے چنگل میں پھنسانے کی ہر ممکن سعی کرے گی، جانتے ہو اگر ایسا ممکن ہوجائے تو وہ وقت دور نہیں جب ہم اس دنیا پر راج کریں گے۔ شیطان دیوتا کے نام کا ڈنکا بجے گا۔ کوئی مسلا ہمارے سامنے پر مارنے کی سعی نہیں کر پائے گا......' بھنور من خوشی سے پھولے نہ سما پا رہا تھا اسی لیے سامنے براجمان فرنوس اور سحر کو یہ نوید سنا رہا تھا۔

امید کی ایک کرن جو سحر کو دکھائی دی تھی وہ بجھ گئی تھی۔ اس کا دل بجھ سا گیا تھا۔ بظاہر وہ ان کی خوشی میں خوش تھی مگر اندر سے چکنا چور ہو کر رہ گئی تھی۔ ظالموں نے بالآخر اسے اپنے نرغے میں جکڑ ہی لیا ہے مگر کچھ بھی ہوجائے میں اس کی ہر ممکن مدد کروں گی اور ان کے اس بھیانک منصوبے کو تہس نہس کروں گی۔ دنیا پر صرف اللہ نام ہی رہے گا۔ شیطان تو پہلے دن سے ہی لوگوں کو بہکانے کی کوششوں میں سرگرداں تھا مگر ہمیشگی اسے ناکامی سے دوچار ہونا پڑا اور اب بھی شیطان جتنے پر تول لے شکست اس کا مقدر بن کے ہی رہے گی۔

وہ اپنے دل میں مصمم ارادہ کر چکی تھی۔ اس نے اب اس نوجوان کی مدد کرنے کی حامی بھر لی تھی جو اس کے لیے ایک مسیحا بن کے آیا تھا۔ چڑیا چڑیل اس کے سامنے رائی کے دانے کے برابر تھی۔ وہ چاہتی تو ابھی یہاں بیٹھے بیٹھے اسے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتی مگر وہ اس بات سے خوب واقف تھی کہ تھوڑی سی جلد بازی بھی اس کے لیے کتنے کڑے امتحان پیدا کردے گی اور وہ اپنے ساتھ اس نوجوان کا جینا اجیرن نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بلکہ پس پشت اس کی مدد کرکے خود کو بھی ان ناپاک شیطانوں کے چنگل سے چھڑوانے کی متمنی تھی۔

''تم نے جواب نہیں دیا سحر......؟'' یکبارگی اس کی قوت سماعت سے فرنوس بھنور من کی بازگشت ٹکرائی تو وہ چونک کر رہ گئی اور سوالیہ آنکھوں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ان پر کچھ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ ''کیا بات ہے سحر تم آج کل کچھ زیادہ

ہی سوچوں میں گم ری دکھائی دے رہی ہو؟"

فردوس بھنور من نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے یہ سوال داغا مگر اب وہ پوری طرح اس کے اس سوال کا جواب دینے کے لیے مستعد ہو چکی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ فردوس بھنور من کا اگلا سوال یہی ہوگا۔

"نجانے کیوں مجھے واہمہ سا لگا ہوا ہے جب بھی یہاں اس لڑکے کا تذکرہ ہوتا ہے میرا دل حلق کو آن لگتا ہے کہ وہ اتنا شکتی شالی نوجوان اگر ہم تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا تو ہمارا تو قیمہ بنا ڈالے گا۔۔۔" سحر نے اداکاری کرتے ہوئے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ تو اس کی بات سن کر دونوں نے قہقہہ لگایا۔

"ارے تم اتنی ڈرپوک کب سے ہوگئی ہو سحر۔۔۔؟" فردوس بھنور من نے اب کی بار تیکھی آنکھوں سے اسے تکتے ہوئے کہا۔ جب کہ اس نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ خاموش ہی رہی اور متواتر ایسی صورت بنائے رکھی کہ وہ دونوں یہی سمجھیں کہ حقیقت میں یہ اس نوجوان سے خوفزدہ ہے۔

"تمہیں ڈرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے سحر۔۔۔" اب کی بار بھنور من نے لقمہ دیا۔

"تم نہیں جانتی کہ ہماری شکتیاں اتنی بھی ناتواں نہیں ہیں وہ لونڈا سو جنم بھی لے لے تو ہمارا بال تک بیکا نہیں کرسکتا۔ ہم نے اپنے علاقے کے گرد ایک ایسا حصار قائم کررکھا ہے کہ کسی میں اتنی جسارت ہی نہیں کہ ہمارے علاقے میں قدم رکھنے کی غلطی کرسکے۔ یہ نوجوان یہاں خود نہیں آیا بلکہ ہم اس کو خود لے کے آئے ہیں۔ کیونکہ یہ نوجوان ہمارے لیے کسی گوہر ہائے آبدار سے کم نہیں ہے۔ ہم برسوں کی محنت وریاضت کا ثمر ہے یہ۔ ہم ایک بار اس کو کھو کر بہت پچھتائے ہیں اب اس کو جلد ہی شیطان دیوتا کے چرنوں میں بلی چڑھا کر امر ہونے کا سپنا بھی پورا ہو جائے گا۔"

خزاں کے موسم سے قبل ہی جیسے درختوں کی ٹہنیوں اور شاخوں میں لچک ختم ہو جاتی ہے اور وہ ملتجیانہ آنکھوں سے ان پتوں کو دیکھتی ہیں جو بہت جلد ان سے جدا ہونے والے ہوتے ہیں۔ تو ہاتی ماندہ پتے بھی مانند جانی ہے۔ دل مسوس کررہ جاتا ہے ایسے کاش اب لی ایا لے والا خزاں بھی واپس لوٹ جائے۔ مگر خزاں سے زیادہ نقصان تو وہ خود کرتی ہیں کیونکہ نقصان تو تب ہی ہوتا ہے جب کسی بھی قسم کے خوف کو سر پر سوار کرلیا جائے۔ درختوں کی ٹہنیاں اور شاخیں بھی خوف کی ایک قسم کو اپنے اوپر سوار کرلیتی ہے کہ خزاں ان کی رونق کو ختم کرے گا۔ لوگ جو بڑے شوق سے ان کے پیچھے آ بیٹھتے ہیں۔ ان کی ٹھنڈی چھاؤں میں راحت محسوس کرتے ہیں یہاں آنا تو در کنار دیکھنا تک گوارہ نہیں کرتے اور وہ اپنی بے بسی اور بے چارگی پہ ماتم کناں ہوتی ہیں۔

ایسے ہی ایک خوف کی قسم سحر کے سر پر سوار ہوگئی کہ اگر یہ ظالم حقیقتاً اس نوجوان کو شیطان کے چرنوں میں بلی چڑھانے میں سپھل ہو گئے تو پھر تو یہ قیامت برپا کردیں گے۔ بے گناہ لوگوں کا قتل عام شروع کردیں گے۔ کوئی ان کے مدمقابل ٹکنے کی جسارت نہ کرپائے گا۔ اور یہ خالق کی کائنات پر دمادم مست قلندر کر کے رکھ دیں گے۔ اس آفت ناگہانی سے نبرد آزما ہونے کا کوئی نہ کوئی طریقہ، کچھ نہ کچھ سدباب تو ہوگا۔ اگر بروقت ان کے اس بھیانک منصوبے کو ناکام نہ بنایا تو بہت برا ہوگا۔ ممکن ہے بڑے سردار اور ان کے لوگ ہمارے علاقے کے باہر اس امید سے ایستادہ ہوں کہ وہ نوجوان جلد ہی اس علاقے کے گرد بنے حصار کو توڑنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

سوچوں کے بھنور میں وہ بری طرح سے پھنس چکی تھی۔ وہاں سے اٹھ کے وہ اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ مگر اس کی سوچوں کا محور وہی حصار اور ان دونوں کے ساتھ ساتھ ان کی شکتیوں کا خاتمہ تھا۔ اسے کوئی راہ سجھائی نہ دے پا رہی تھی کہ کرے تو کیا کرے۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے رگ و پے میں بھی انسانی خون وگوشت سرایت کرچکا ہے اور اس کے تن بدن میں اب اس کا نہیں نجانے کتنے بے گناہوں کا خون گردش کرتا ہے مگر وہ مجبور تھی یہ سب کچھ نہ کرتی تو وہ ظالم اسے بھی کب کے شیطان کے چرنوں میں بھینٹ دے چکے ہوتے اور وہ کب کی سور گہاش ہو چکی ہوتی۔

شاید اس نیک کام کے لیے ہی اللہ تعالیٰ نے اسے حیات دی تھی۔ اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ سب سے پہلے وہ چڑیا چڑیل کو اسی نوجوان کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتروائے گی اور ایسے کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہو پائے گا کہ چڑیا کیسے اپنے انجام کو پہنچی۔

ارادے جن کے پختہ ہوں نظر جن کی خدا پر ہو
طلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے

بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے اچانک اس کے ذہن میں اپنے غلام چنکار کا خیال آیا۔ اس نے فوراً منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا اور ہوا میں پھونک ماری دوسرے ہی لمحے کمرے میں دھواں بھرنے لگا۔ پھر دھویں نے یکجا ہوکر ایک وجود تخلیق کیا۔ اب وہ وجود اس کے سامنے دست بستہ ایستادہ تھا۔

''کیسے یاد فرمایا آج اپنے غلام کو آپ نے ۔۔۔۔۔۔۔؟'' اس نے نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں سر کو دائیں طرف چنداں خم کرتے ہوئے کہا۔

''چنکار تم میری سب سے طاقتور شکتی ہو اور مجھے تم پر فخر ہے کہ ہر مشکل گھڑی میں تم میرے کام آئے ہو۔۔۔۔'' اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے سے لہجے میں کہا۔

''یہ تو آپ کی کرم نوازی ہے کہ آپ نے ہمیں اتنی عزت بخشی ہے ورنہ غلاموں کو تو چوبیس گھنٹے سر کھجانے تک کی فرصت درکار نہیں ہوتی۔ میں آپ کا مشکور ہوں میری مالکن کہ آپ نے کبھی کوئی ایسا رویہ مجھ سے نہیں اپنایا جس پر میرے دل میں آپ کے لیے میل پیدا ہوسکے۔۔۔۔'' چنکار نے ایک بار پھر سر کو خم کرتے ہوئے نہایت ہی ادب سے کہا۔

''مجھے ایک مصیبت سے دوچار ہونا پڑ گیا ہے چنکار میں، بہت پریشان ہوں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے میں امید کرتی ہوں تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔۔۔۔'' اس نے پہلی بار التجی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بے یقینی سے کہا۔

''کیسی بات کرتی ہیں آپ مالکن! آپ کے لیے تو آپ کا یہ غلام جان تک دینے کو تیار ہے بس آپ کا اشارہ ہو اور یہ غلام اپنا سر کاٹ کے آپ کے قدموں میں رکھ دے ۔۔۔۔'' چنکار نے اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''مجھے فخر ہے کہ میرے پاس تم جیسا وفادار غلام ہے چنکار ۔۔۔۔۔'' اس نے ایک بار پھر تعریفانہ لہجے میں کہا۔

''یہ آپ کی عنایت ہے مجھ پر مالکن ۔۔۔۔۔'' اس نے بدستور اپنے مخصوص انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا۔

پھر سحر نے اس سے چڑیا چڑیل سے متعلق ہر وہ انفارمیشن وصول کی جس کی بنا پر نہ صرف وہ نوجوان بلا جھجک وہ آگ کا حصار پار کر جائے بلکہ چڑیا چڑیل کو جہنم واصل کردے۔ پہلے تو چنکار تھوڑا گھبرایا مگر مالکن کے احسانات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اس نے ہر راز اس کے سامنے اگل دیا۔ جس پر وہ بہت خوش تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اسے فرعون کا دبایا ہوا خزانہ مل گیا ہو۔ خوشی اس کے چہرے سے پھوٹ رہی تھی۔ چنکار نے اس کی ہر ممکن مدد کی حامی بھی بھرلی تھی۔ اور وہی ایک امید کی کرن تھا جو نہ صرف چڑیا کے محل میں داخل ہوسکتا تھا بلکہ اس نوجوان کی ہر ممکن مدد بھی کرسکتا تھا۔ کام جان جوکھوں کا تھا۔ اس کی جان جانے کے ساتھ ساتھ سحر کے لیے بھی مسئلہ بن سکتا تھا۔ مگر وہ اس کے لیے جان تک دینے کو تیار تھا۔ سحر جانتی تھی کہ اگر سمریز خان یا ظہریان ملک کو بھنک بھی پڑ گئی تو فوراً سے بھی پیشتر وہ اسے شیطان کے چرنوں میں بلی چڑھا دیں گے۔

☆......☆......☆

میرے سامنے اچانک ہی نجانے کہاں سے چڑیا چڑیل آن وارد ہوئی اور اپنی تمام تر بھیانک اور بدصورت شکل کے ساتھ میرے سامنے ایستادہ تھی۔ مجھے دیکھ دیکھ کے متواتر زیر لب مسکرائے جارہی ہو۔

''کیسا لگا میرا محل ۔۔۔۔۔؟'' اس نے چمکتی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ تو میں نے ایک طائرانہ نگاہ اس پر ڈالی کیونکہ متواتر اس کو دیکھنا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھنا میرے بس میں نہ تھا۔ اس کی ایسی گندی حالت دیکھ کر سب کچھ باہر آنے کو ہوتا تھا۔

''ہوں ۔۔۔۔ واہ رے صورت نہ شکل، بھاڑ سے نکل ۔۔۔۔'' میں نے تمسخرانہ لہجے میں کہا تو اس نے

کھا جانے والی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ ''بہت پیارا محل ہے تمہارا یقین مانو تعریف کے لیے الفاظ نہیں کہ جنھوں ایک لڑی میں مالا میں پروئے دانوں کی طرح تمہیں پیش کرسکوں مگر ایک بات پورے وثوق سے کہتا ہوں۔ کہ محل تو بہت ہی عالیشان اور قابل داد ہے مگر صد ہا افسوس کہ ایسے خوبصورت اور قابل دید محل کی مالک۔۔۔۔۔۔''

آخری جملے کو میں نے چنداں ناک بسوڑ کر اور ہونٹ سکیڑ کر کچھ اس انداز میں ادا کیا کہ وہ غصے سے یکبارگی لال پیلی ہوگئی۔

''تم جانتے ہو کہ تم کس سے بات کررہے ہو۔۔۔؟'' اس نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''میں یعنی چڑیا چڑیل کالی دنیا کی ملکہ تصور کی جاتی ہوں اور تم میری توہین میری موجودگی میں کررہے ہو۔''

اس کی ترحم آمیز کیفیت دیدنی تھی۔ عورت واقعی جن زادی ہو یا منش اپنی تعریف سنتا تو اسے بہت ہی پیارا لگتا ہے۔ مگر بدتعریفی۔۔۔۔۔۔ اپنی بدتعریفی سن کر تو جل کر کوئلہ ہوجاتی ہے۔ مرغ بسمل کی سی کیفیت ہوجاتی ہے۔ ماہی بے آب کی مانند تڑپ کر رہ جاتی ہے۔ اس کے بس میں نہیں ہوتا کہ مدمقابل کی بتیسی باہر نکال پھینکے۔

''اوہ واقعی تم اور ملکہ۔۔۔۔۔۔؟'' میں نے بے یقینی کے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر وہ بھی جان چکی تھی کہ میں اسے مزید ذق پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

''اگر تم چاہو تو اس محل کے مالک تم بھی بن سکتے ہو۔۔۔۔؟'' اس کا آناً فاناً خوشگوار ہوگیا۔ گرگٹ کی طرح اس نے ایسے رنگ بدلا کہ میں اس کی بات سن کر شش و پنج میں مبتلا ہوگیا اور اس کی طرف سوالیہ آنکھوں سے دیکھا۔

''اتنا خوبصورت محل اور بھی میرا مگر وہ کیسے۔۔۔۔؟'' میں نے خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے پوچھا۔

''اگر تم مجھ سے شادی رچالو تو۔۔۔۔۔'' اس نے ایک ادھورا فقرہ ہوا میں چھوڑا جسے سنتے ہی نہ جانے کیسے اور کیوں مجھے کھانسی شروع ہوگئی۔

''شش۔۔۔شا۔۔۔۔دی ۔۔۔اور۔۔۔وہ ۔۔۔۔ب۔۔۔بھی ۔۔۔۔تت۔۔۔۔تم ۔۔۔۔ سس۔۔۔سے۔۔۔۔تت۔۔۔۔تت۔۔۔۔تو بہ۔۔۔۔ تو بہ۔۔۔۔ میں نے فوراً سے بھی پیشتر اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا جبکہ میری بات سن کر وہ اور طیش میں آگئی۔

''ہوں۔۔۔۔۔۔۔'' وہ جل بھن کے بولی۔ ''دیکھتی ہوں کیسے نہیں کرتے تم مجھ سے شادی۔''

اتنا کہہ کر وہ تو غائب ہوگئی مگر میں اپنے منتشر حواس کو بحال کرنے کی سعی کرتا رہا۔ دل ہی دل میں ہنستا بھی رہا۔ بقول پنجابی کہاوت کے:

منہ نہ متھا جن پہاڑوں لتھا

☆......☆......☆

اب میری بے بسی اور کرب واذیت کے دن شروع ہوچکے تھے۔ میں تو پہلے پہل یہی سمجھا کہ شاید چڑیا چڑیل مجھے کچھ نہ کہے مگر میری یہ خوش فہمی حقیقت کا روپ نہ دھار سکی۔ ایک دن جب میں اس کے محل نما موت خانہ میں سیر سپاٹے کررہا تھا تو یکبارگی وہ میرے سامنے حاضر ہوگئی۔ ایک بار تو میں چونک گیا مگر فوراً ہی میں نے اپنی کیفیت پر قابو پالیا۔

''آج فیصلہ کن مرحلہ ہے میں صرف ایک ہی بار سوال کروں گی ہاں یا ناں میں جواب دینا۔ تمہاری ہاں کی صورت میں تمہاری زیست تمہارے لیے پرسکون بن جائے گی جبکہ تمہارے انکار کی صورت میں تیرا جینا اجیرن کردوں گی تو موت مانگے گا مگر تجھے موت نہیں آئے گی۔۔۔۔'' اس نے میری طرف خونخوار آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

اس کی آنکھوں میں آج مجھے بھی حیرت انگیز طور پر نظر آرہا تھا کہ وہ مصمم ارادہ کرچکی ہے کیونکہ اس کی آنکھوں کی سرخی اس کے اندر اٹھتی لال آندھی کے اثرات ظاہر کررہی تھی۔ مرغ بسمل کی سی کیفیت میں وہ میرے سامنے ایستادہ متواتر کھا جانے والی آنکھوں سے مجھے گھورے جارہی تھی۔ میں نے اس کی بات کا کوئی ریسپانس نہ دیا۔

''مجھ سے شادی کروگے یا نہیں؟''

جب اس نے دیکھا کہ میں نے بھی چپ کا روزہ رکھ لیا ہے تو اس نے اپنا سوال دہرایا۔ جس کے جواب میں میں

نے ایک ٹھنڈی اور لمبی سانس خارج کرتے ہوئے ادھر ادھر اس کے اس کے آس پاس کھڑی الہڑ مٹیاروں کو دیکھا۔ تبھی میں نے دیکھا کہ چار جوان ایک بڑے سے تابوت کو اٹھائے اندر داخل ہوئے اور اسے ہم سے ذرا فاصلے پر ایک جگہ رکھ دیا۔ ان کے پیچھے دو اور جوان اندر داخل ہوئے۔ ان دونوں جوانوں کے ہاتھوں میں مرتبان شکل کے پتھر کے برتن تھے جن میں کیا تھا میں اس بات سے ناآشنا تھا۔ چڑیا چڑیل نے اس تابوت اور ان دونوں جوانوں کے ہاتھوں میں پکڑے ان برتنوں کی طرف دیکھا۔ اس کے لبوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ نے قدم جمالیے۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ اب کی بار مجھے اس کی آنکھوں میں اپنا ایک بھیانک انتقام دکھائی دینے لگا تھا۔

"دیکھ رہے ہوناں یہ تابوت۔"

اس نے تابوت کی طرف انگلی کا اشارہ کرکے کہا۔ پھر وہی انگلی نوجوانوں کے ہاتھوں میں پکڑے مرتبانوں کی طرف کرکے دوبارہ گویا ہوئی:

"اس تابوت میں اب تم ہمیشہ کے لیے رہو گے اور یہ مرتبان بچھوؤں سے بھرے ہوئے ہیں، ان بچھوؤں کو عام بچھو مت سمجھنا یہ بچھو ہم خاص مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں جب بھی ہمیں کسی منش کو بچھو بنانا ہوتا ہے تو اسے ایسے ہی ایک تابوت میں مقید رکھ کر اس کے تابوت میں یہ بچھو چھوڑ دیئے جاتے ہیں اور پھر تابوت کو مقفل کردیا جاتا تھا۔ یہ تابوت عام تالے سے مقفل نہیں کیا جاتا بلکہ ہم ایسے تابوتوں کو اپنے جادو کے دم پر مقفل کرتے ہیں۔ مقفل ہونے کے بعد بچھو اس منش کے جسم میں اپنا زہر انڈیلنا شروع کردیتے ہیں۔ یہ سلسلہ طویل عرصے تک جاری وساری رہتا ہے یہ بچھو منش کو کھاتے نہیں ہیں بس اس کا خون پی جاتے ہیں اور خون کی جگہ اس کے شریر میں اپنا زہر بھر دیتے ہیں۔

پھر جب اس منش کے شریر میں مکمل طور پر ان بچھوؤں کا زہر دوڑنا شروع ہوجاتا ہے تو دھیرے دھیرے یہ اس کے جسم کا گوشت نوچ نوچ کر کھانا شروع کردیتے ہیں۔ مگر تمہیں حیران کن بات بتاؤں کہ منش مرتا نہیں ہے کیونکہ اس کے جسم پر جہاں جہاں سے بچھو گوشت نوچتے ہیں وہاں پر بچھوؤں کے زہر سے بنی ایک جلد ابھرنا شروع ہوجاتی ہے۔ اور پھر ایک وقت وہ آتا ہے جب وہ شریر مکمل طور پر عقرب کے زہر سے بنا ہوا ہوتا ہے۔ وہ منش پھر بہت شکتی شالی ہوجاتا ہے اور خاص کر تم جیسا منش جب عقرب کے زہر سے ایک وجود حاصل کرے گا تو سوچو تم کتنے شکتی شالی بن جاؤ گے۔ تم کسی کو ہاتھ بھی لگاؤ گے تو پلک جھپکتے میں وہ پگھل کر پانی کی طرح بہہ جائے گا۔

اب ہم تمہیں بھی اسی تابوت میں طویل عرصے کے لیے مقید کردیں گے اس طویل عرصے کے دوران ہمیں ایک نہایت ہی اہم چلہ کاٹنا ہے۔ جس دن ہمارے چلے کی آخری رات ہوگی، وہ اماوس کی رات ہوگی۔ ہر طرف گھپ اندھیرے کا راج ہوگا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے گا۔ ایسے میں تمہیں وہاں چلے کے مکمل ہونے کے بعد اس جگہ جہاں میں نے یہ چلہ کاٹنا ہے تمہیں تابوت سمیت درگور کردیا جائے گا۔ اور پھر تم شکتی شالی بن کر ایک بچھو کی صورت اپنا کر خود بخود ہی اس تابوت سے رہائی حاصل کرکے باہر آؤ گے۔ تمہاری جسامت عام بچھوؤں سے ہزار گنا زیادہ ہوگی میری شکتیاں ہمہ وقت تمہارے سر پر منڈلاتی پھریں گے۔ اور وہ شکتیاں تمہیں سیدھا میرے پاس لائیں گی۔ پھر تم میرا ہتھیار بنو گے اور میں اس منزل کو پالوں گی جس کو پانے کی خواہش صدیوں سے میرے دل کے کونوں کھدروں میں پنہاں ہے۔ جن لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنا تمہارا مشن ہے وہ میرے آقا ہیں مگر میں اندر ہی اندر ان کے لیے نفرت کے شدید تاثرات رکھتی ہوں کیونکہ جس منزل کو پانے کے لیے میں دن رات تابڑ توڑ محنت کی تھی وہ منزل ان لوگوں کو مل گئی اب میں اس منزل کو تب ہی پاسکتی ہوں جب ان تینوں کو اپنے ہاتھوں سے شیطان کے چرنوں میں بلی چڑھادوں اور میرا یہ خواب تب ہی عملی جامہ پہنے گا جب میرے ساتھ تم جیسی ایک شکتی شالی طاقت ہوگی۔ میں تمہیں اتنا طاقتور بنانا چاہتی ہوں کہ تمہارا قدم پہاڑ پر پڑے تو وہ ریزہ ریزہ ہوجائے تم کسی کو چھوؤ تو وہ پگھل کر پانی کے جیسے بہہ جائے۔"

چڑیا چڑیل کی باتیں سن کر میرے تو قدموں تلے سے زمین سرک گئی قبل اس کے کہ میں کچھ بولتا وہ کچھ کہے سنے بغیر اچانک یوں غائب ہوگئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ دوسرے ہی لمحے تابوت کا ڈھکنا خود بخود کھلتا چلا گیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے میرا شریر ہوا میں معلق ہوتا چلا گیا۔

اپنے بچاؤ کے لیے میں لاکھ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا مگر یہ سب بے سود تھا۔ میرا دماغ بالکل خالی ہوچکا تھا۔ مجھے کچھ بھی یاد نہیں آرہا تھا۔ چاہ کر بھی کچھ نہیں یاد آرہا تھا۔ اس قدر بے چارگی اور بے بسی پر میری آنکھیں نم ہوچکی تھیں۔ نجانے میں نے اپنی زیست میں ایسی بھی کونسی غلطی کردی تھی کہ جس کی سزا ختم ہی نہیں ہو پارہی تھی عجیب ہی مکافات عمل چل رہا تھا، میں نہ کردہ گناہوں کی سزا بھگت رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے میری بھیانک انجام دکھائی دے رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں تابوت کے اندر ایک مردے کی مانند لیٹا ہوا تھا۔

دوسرے ہی لمحے مرتبان کے ڈھکنے کھول کر درجنوں بچھوؤں کو میرے اوپر گرایا گیا۔ اور پلک جھپکتے میں تابوت کا ڈھکنا بند ہوگیا۔ اچانک مجھے اپنے جسم میں گرم لوہے کی سلاخیں چبھتی ہوئی محسوس ہوئیں ایک سماعت شکن چیخ میرے منہ سے برآمد ہوئی مگر وہ تابوت کے اندر ہی گھومتی پھرتی معدوم پڑ گئی۔ شدت تکلیف سے میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے اور جلد ہی میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

"بڑے سردار ایک نہایت ہی جان لیوا خبر ہے...." بڑے سردار اپنے پسر کے ہمراہ اپنے کمرۂ خاص میں براجمان تھے کہ ان کا ایک خاص ملازم دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"کیا ہوا شمپالی خیریت تو ہے ناں تم اتنے پریشان کیوں دکھائی دے رہے ہو کیا کوئی آفت ناگہانی ٹوٹ پڑی ہے....؟" بڑے سردار کے پسر نے فوراً ایستادہ ہوتے ہوئے کہا۔ تو اس آنے والے ملازم شمپالی نے رخ اس کی طرف بدلا۔

"چھوٹے سردار ہماری ساری محنت رائیگاں گئی۔ ہمیں ابھی اپنی شکتیوں سے معلوم پڑا ہے کہ اس نوجوان کو اس خونی تابوت کی نذر کردیا گیا ہے...."

اتنا کہہ کر پھر رخ بڑے سردار کی طرف موڑا اور دوبارہ گویا ہوا:

"آپ کی دختر سحر نے اسے بچانے کی سعی کی مگر اس سے قبل ہی اسے خونی تابوت کی نذر کردیا گیا۔ اور چڑیا چڑیل نے تو باقاعدہ اپنے چلے کا آغاز بھی کردیا ہے۔ حالات کچھ ٹھیک نہیں ہیں بحالات کشیدگی اختیار کرسکتے ہیں۔ وہاں موجود ہماری شکتیوں نے ہمیں اس نوجوان کو تابوت میں مقید کرنے سے قبل چڑیا چڑیل کی گفتگو سے آگاہ کیا ہے پتہ چلا ہے کہ وہ خود ان تینوں کی جانی دشمن ہے اور وہ ان کو عقرب دیوتا کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا کر ان کی جگہ لینا چاہتی ہے، اور سب سے اہم بات اس نوجوان کو اس بات کا پتہ چل چکا ہے کہ ہم لوگ مسلمان نہیں ہیں بلکہ ہمارے بہروپیے پن سے اسے آشنائی ہوچکی ہے۔ وہ بخوبی جان چکا ہے کہ ہم سب عقرب دیوتا کے پجاری ہیں۔ اگر وہ وہاں سے بچ بھی جاتا ہے تو اب ہم میں سے کسی پر بھی قطعاً شواس نہیں کرے گا۔ وہ الٹا ہماری جان لے لے گا۔ ہمارا سارا پلان چوپٹ ہوچکا ہے۔ وہ بہت شکتی شالی منش ہے، عقرب دیوتا کے عقرب خاص اس کے شریر میں متواتر اپنا زہر بھر رہے ہیں۔ اور آپ اچھی طرح سے اس بات سے آشنا ہیں کہ اگر اس کا شریر عقرب کا روپ دھارنے کی شکتی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تو وہ عقرب دیوتا کا خاص چیلہ بن جائے گا۔ عقرب دیوتا اسے اپنا نائب منتخب کرسکتے ہیں۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ عقرب دیوتا اب خود اس تابوت کی رکھشا کررہے ہیں اور ایسی صورت میں تو ہم اسے نوجوان کو اس تابوت سے بھی نہیں نکال سکتے۔ چڑیا چڑیل بہت ہی آتش کی پرکالی ثابت ہوئی ہے وہ اپنا یہ چلہ عقرب دیوتا کے عظیم بت کے قدموں میں بیٹھ کر کررہی ہے۔ اور ایسی صورت میں تو اس نہ تو ہم اس کا دھیان چلے سے ہٹا سکتے ہیں اور نہ ہی اسے کوئی ایذاء پہنچا سکتے ہیں۔ ہماری بلی ہمیں ہی میاؤں کرے گی تو باقی کیا رہ جائے گا، ہمیں اب کوئی نہ کوئی اوپائے تو نکالنا ہے مگر وہ اوپائے کیا ہوسکتا ہے۔"

شمپالی نے دریا کو کوزے میں بند کردیا تھا۔ اس کی بات

سن کر دونوں باپ بیٹا کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک کر رہ گئی تھی۔ ان کے سوچنے سمجھنے کی تمام تر صلاحیتیں مفقود پڑ چکی تھیں۔ ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ حالات حقیقت میں کشیدگی اختیار کر سکتے تھے۔ سحر کسی اور کی نہیں ان کی ہی دختر تھی۔ مگر انہوں نے اس نوجوان سے وہ دروغ گوئی کی تھی کہ ان کے علاقے کے کسی شخص کی وہ دختر ہے۔ اب تو وہ مکمل طور پر ان سے بد دل ہو جائے گا۔

ہر طرف عمیق اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ روشنی کی کوئی بھی کرن نہ دکھائی دے رہی تھی۔ وہ مٹھیاں بھینچے، نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے، ناک سکیڑے، آنکھیں موندے، پیشانی پر سلوٹیں عیاں کیے اپنی اندرونی کیفیات کو کنٹرول کرنے کی ہر ممکن سعی کر رہے تھے۔ مگر کسی کے لیے کھودے گئے کنویں میں وہ خود ہی منہ کے بل جا گرے تھے۔ اور اس کنویں سے نکلنا ناممکنات میں سے تھا۔

☆......☆......☆

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ چڑیا چڑیل ہم سے بغاوت کرے گی۔۔۔۔۔'' بھنورمن نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''میں نے اس نوجوان کو تابوت کی نذر کیے جانے سے بچانے کے لیے اپنی شکتیاں وہاں بھیجی تھیں مگر انہیں پہنچنے سے قبل ہی وہ نذر تابوت ہو چکا تھا۔ لہٰذا مایوسی کے سوا میرے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ ہمیں اسے اس کے چلے سے روکنا ہوگا ورنہ وہ بہت شکتی شالی ہو جائے گی اور ممکن ہے، ہم اس کے آگے ٹک نہ پائیں۔۔۔۔۔'' سحر نے دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو دونوں نے اس کی طرف سوالیہ آنکھوں سے دیکھا۔

''مگر تمہیں کیسے پتہ چلا تھا کہ وہ اسے نذر تابوت کر رہے ہیں۔۔۔۔۔؟'' بھنورمن نے اس کی طرف سوالیہ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''چنکار کے ذریعے، اصل میں مجھے پہلے دن سے ہی چڑیا پر یقین نہیں تھا، اس کی جانب سے شک سا رہتا تھا اسی لیے میں نے چنکار کو اس کے پیچھے لگا دیا تھا۔۔۔۔۔'' اس نے اپنی اندرونی کیفیت کو ان سے چھپاتے ہوئے کہا۔ مگر ان دونوں کے دل میں اس کے لیے میل پیدا ہو چکی تھی۔

''ہمیں کوئی منصوبہ بندی کرنا ہی پڑے گی۔ میرے دماغ میں ایک پلان ہے مگر میں اپنے پسر کے علاوہ اس پلان میں کسی کو شامل نہیں کرنا چاہتا لہٰذا تم یہاں سے جا سکتی ہو۔۔۔۔۔'' بھنورمن نے گہری عمیق آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے نظر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اسے بھنورمن کی آنکھوں میں شک کے ابھرتے تاثرات واضح دکھائی دیے۔ ایسے ہی تاثرات اسے فرنوس بھنورمن کی آنکھوں میں بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے کوئی بات نہ کی بس دبے قدموں وہاں سے پلٹ آئی۔ مگر دل میں کھٹکا سا تھا کہ اس نے ان پر یہ بات واضح کر کے صریح غلطی کی ہے۔ نجانے اب وہ اس کے خلاف کیا ایکشن لیں گے۔ پہلے وہ اسے ہر معاملے میں ساتھ بٹھاتے تھے مگر آج واضح طور پر بھنورمن نے اسے وہاں سے اٹھ جانے کو کہا تھا۔

ادھر سحر کے جاتے ہی فرنوس بھنورمن نے سوالیہ آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھا۔

''سحر ہمارے خلاف کوئی پروپیگنڈہ تیار کر رہی ہے۔ تم جانتے ہو اس نے چنکار کو وہاں کیوں بھیجا تھا۔۔۔۔۔؟'' بھنورمن نے سوالیہ آنکھوں سے اپنے فرزند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

''یہ اس لونڈے کو باز یاب کرانے کی سعی میں لگی ہوئی ہے مگر یہ اس کی خام خیالی ہے کہ ہم اس کے ان گھناؤنے مقاصد سے آشنا نہیں ہیں۔ میں نے بہت پہلے اس کی آنکھوں میں بغاوت کے ابھرتے تاثرات کو بھانپ لیا تھا۔''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ، میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔۔۔۔۔؟'' فرنوس بھنورمن نے باپ کی بات کو کاٹتے ہوئے پیشانی پر شکنیں ابھارتے ہوئے کہا۔

''سوچنے سمجھنے کے قابل اس نے چھوڑا ہی کہاں ہے۔ چنکار کو اس نے چڑیا کی موت کا راز اس لونڈے کو بتانے کے لیے بھیج دیا تھا۔ وہ تو چڑیا کی عقل مندی کہ اس نے اس کے آنے سے قبل ہی اس لونڈے کو تابوت کی

نذر کردیا تھا۔۔۔۔۔۔'' بھنور من نے کہا۔فردوس بھنور من حیرت کے سمندر میں غرق باپ کی باتیں سن رہا تھا۔ایسے انکشافات کا اس کے قلب و ذہن میں بھی خیال نہ تھا۔اس نے کبھی تخیل میں بھی نہ سوچا تھا کہ سحر کبھی انہیں دھوکہ دے سکتی ہے۔مگر آج وہ سمجھ گیا تھا کہ آنکھوں کا کاجل چرانے کی اس نے کوشش کی تھی اور اس کی سزا تو اسے مل کر ہی رہے گی۔

''بابا میں ابھی اس کی تکہ بوٹی ایک کردوں گا۔۔۔۔'' فردوس بھنور من غصے سے پیچ وتاب کھا کر بولا۔

''جلد بازی میں بازی ہاتھ سے نکل جائے گی میرے پسر۔۔۔۔ پہلے چڑیا نے علی الاعلان بغاوت کی اب یہ۔مگر ہمیں اس کی بغاوت سے استفادہ حاصل کرنا ہے۔علاوہ ازیں ہمیں ناقابل تلافی نقصان سے نبرد آزما ہونا پڑے گا۔ہمیں فی الفور اسے چڑیا سے نمٹنے کا کہنا چاہیے اور ہم اسے اگر یہ کہیں کہ وہ جس طرح بھی ہوسکے چڑیا چڑیل کو واصل جہنم کردے تو ہم اسے آزاد کردیں گے تو تم نہیں جانتے وہ یہ کرسکتی ہے۔اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں۔۔۔۔۔۔'' بھنور من کی بات پر فردوس بھنور من نے بھنویں اچکائیں تو سوالیہ آنکھوں سے باپ کی طرف دیکھا۔

''آپ جانتے ہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سحر کیا ہم سے زیادہ شکتی شالی ہے جو چڑیا چڑیل کو پسپا کردے گی ۔آپ کو اپنے لفظوں پر غور کرنا چاہیے بابا۔۔۔۔'' فردوس بھنور من نے ناک بسورتے ہوئے کہا۔گویا اسے باپ کی بات ناگوار گزری تھی۔

''تم بات کو سمجھے نہیں۔چڑیا کو ختم کرنے کے لیے وہ اپنے لوگوں سے رجوع کرے گی تم ان کی طاقت کا اندازہ نہیں لگاسکتے وہ بہت شکتی شالی ہے۔خاص کر بڑے سردار کی شکتیوں کا تم بالکل ہی اندازہ نہیں لگاسکتے ۔ہمیں مجبوراً ان لوگوں سے مدد طلب کرنا پڑے گی۔اگر ہم بذات خود ان سے مدد طلب کریں گے وہ ہمیں ختم کرکے ہماری شکتیوں کو حاصل کرسکتے ہیں لہٰذا ہمیں سحر کو استعمال کرنا پڑے گا۔جیسے ہی چڑیا چڑیل سے جان چھوٹے گی ہم سحر کے ساتھ ساتھ بڑے سردار اور ان کے لشکر کو تہس نہس کردیں

گے۔۔۔۔۔'' بھنور من کی بات پر فردوس بھنور من نے کوئی تاثر تو نہ دیا۔مگر اس کی آنکھوں میں جھانکنے سے بھنور من کو یقین ہوگیا کہ اس کے پسر کو اس کی کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

☆......☆......☆

اسے کہتے ہیں مکافات عمل اپنے ہی کھودے کنوئیں میں بھنور من اور اس کا بیٹا گر گئے اور اب اس سے نکلنے کے لیے پر تول رہے ہیں۔چڑیا چڑیل کو شکتی شالی بنانے والے بھی وہ خود ہی تھے اور آج جب وہ شکتی شالی بن گئی تو اس نے ایسا طمانچہ دونوں کے منہ پر رسید کیا ہے کہ دونوں کو دن دیہاڑے تارے نظر آنے لگے ہیں اب دوڑے ہم سے مدد حاصل کرنے مگر یہ ان کی خام خیالی ہے۔ہم جانتے ہیں کہ ان آتش کے پرکالوں نے در پردہ کوئی منصوبہ بنا رکھا ہوگا اس لیے ہم ایسے جائیں گے کہ ان کے ہر منصوبے کو خاک میں ملا کر اپنی دختر کے ساتھ ساتھ اس نوجوان کو ان کی گرفت سے آزادی دلوا کر لائیں گے۔۔۔۔'' بڑے سردار نے اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

جیسے ہی بڑے سردار کو اپنی دختر کی طرف سے سندیسہ موصول ہوا تھا۔اس نے فی الفور وہاں جانے کی حامی بھرلی تھی۔بھنور من نے اپنی اپنی بستی کے گرد لگایا ہوا آتشی حصار ختم کردیا تھا۔جس کی وجہ سے اب انہیں وہاں جانے میں کوئی دقت نہ تھی۔اور ان کا فی الفور مقصد چڑیا چڑیل کو ابدی نیند سلانا تھا۔کیونکہ آج اس کے چلے کی آخری رات تھی اگر وہ اپنے چلے میں کامیابی حاصل کرلیتی ہے تو پھر اس کے پاس ایک بہت بڑی شکتی آجائے گی۔وہ پہاڑ کی طرح مضبوط ہوجائے گی۔اسے موت کی نیند سلانا جوئے شیر لانے کے مترادف ہوجائے گا۔

''ہم سب آپ کے ساتھ ہیں بڑے سردار۔ان لوگوں نے ہمیں بزدل بنا کر بھری بستی میں سے آپ کی نہیں بلکہ پوری بستی کی بیٹی کو اغوا کیا تھا۔جس کی سزا انہیں ضرور مل کر رہے گی۔ہم سب آپ کے ساتھ جائیں گے۔ہم اپنے تن من دھن کی قربانی دے کر بھی آپ کی رکھشا کریں گے ۔سحر بیٹی کو آزادی دلوانا ہماری دیرینہ خواہش تھی۔اپنی بستی

کے گرد لگا حصار ختم کر کے بھنور من اور اس کے پسر نے اپنی موت کو آواز دی ہے۔۔۔۔" بڑے سردار کے جھونپڑے نما محل کے سامنے لگے ہجوم میں سے ایک بزرگ کھڑا ہو کر بولا۔

"ہاں ہاں ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔۔۔۔۔" اس کے ساتھ ہی پورے ہجوم نے ایک ساتھ یک زبان ہو کر بڑے سردار کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تو بڑے سردار اور اس کے پسر کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ان کے پیچھے پردے کی اوٹ میں کھڑی بڑے سردار کی چھوٹی بیٹی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بڑے سردار نے اس نوجوان سے ہر بات غلط کہی تھی۔ اس نے ان لوگوں کو اپنے دھرم کا سمجھ کر ان کی ہر بات کو تسلیم کیا تھا۔ بڑے سردار نے دونوں دختر کے بارے میں اسے غلط انفارمیشن دی تھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ بڑے سردار کی یہ بیٹی اس نوجوان پر عاشق ہو بیٹھی تھی۔

اس نے دل کو تو بہت سمجھایا تھا کہ سرابوں کے پیچھے دوڑتے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوا کرتا مگر دل ہے کہ مانتا ہی نہیں کیونکہ دل پہ کس کا زور ہے۔ بڑے سردار اور چھوٹے سردار نے اس نوجوان کے جانے کے بعد اس کی آنکھوں میں مایوسی کے تاثرات بھانپ لیے تھے۔ اس کی موجودگی میں وہ بہت خوش رہنے لگی تھی مگر اس کے جانے کے ساتھ ہی جیسے ایک دم خزاں حملہ آور ہو گئی تھی اور وہ کسی شجر کی مانند خزاں رسیدہ ہو کر رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

چڑیا چڑیل اس وقت اپنے چلے میں مصروف تھی۔ یہ رات اس کے چلے کی آخری رات تھی۔ آج اس نے شکتی شالی بن جانا تھا۔ پھر دنیا کی کوئی طاقت اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہ کر پائے گی۔ خوشی اور غرور دونوں ٹوٹ کر اس پر برس رہے تھے۔ تبھی بیٹھے بیٹھے اسے اپنی سانسوں کی ڈوری ایک دم ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی اور دوسرے ہی لمحے وہ حصار کے اندر پشت کی جانب گر گئی۔ حصار کا دائرہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے گردن سے نیچے تک کا حصہ حصار سے باہر جا گرا اس کے ساتھ ہی ایک دم اس کے شریر نے آگ پکڑ لی اور پلک جھپکتے میں اس کا شریر جل کر راکھ ہو گیا۔ تبھی

ہوا کے ایک شریر جھونکے نے اس راکھ کو اڑایا اور آسمان کی وسعتوں کی طرف چلا گیا۔

چڑیا چڑیل کا موت سے بغل گیر ہونا تھا کہ اماوس کی اس کالی رات میں اچانک ہر سمت الو کی منحوس آواز نے سفر کیا۔ دل دہلا دینے والا یہ الو اڑ کر اس تابوت پر آبیٹھا۔ دوسرے ہی لمحے ایک حیران کن منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ جس جگہ الو براجمان تھا عین اسی جگہ سے اچانک تابوت میں سے ایک ہاتھ باہر نکلا اور دوسرے ہی لمحے الو کو اپنی گرفت میں پکڑ کر وہ ہاتھ دوبارہ تابوت میں غائب ہو گیا اور تابوت والی وہ جگہ ایک بار پھر ویسی ہی دکھائی دینے لگی۔ وہاں پڑنے والا شگاف یک لخت ختم ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

چڑیا چڑیل کے مرنے کی نوید جیسے ہی بھنور من اور اس کے پسر کی قوت سماعت سے ٹکرائی تو دونوں دنگ رہ گئے۔ وہ ان لوگوں کو اتنا بھی شکتی شالی نہ سمجھتے تھے جس قدر وہ اب دکھائی دے رہے تھے۔ چڑیا چڑیل کے تمام کارندوں کو انہوں نے ابدی نیند سلا کر اس کے محل کو زمین بوس کر دیا تھا۔ اب ان کا رخ انہی کی طرف تھا اور ورطۂ حیرت میں ڈالنے والی بات یہ تھی کہ سحران کو چکمہ دے کر وہاں جا پہنچی تھی۔

اب انہیں افسوس ہو رہا تھا۔ انہیں اس بات کا قطعاً خیال ہی نہ آیا تھا کہ اسے دبوچ کر رکھیں مگر جلد بازی اور چڑیا چڑیل سے جان چھڑوانے کی تگ و دو میں وہ بہت کچھ کھو بیٹھے تھے۔ بڑے سردار کے ساتھ ایک جم غفیر اس کے محل کی جانب رواں دواں تھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف سے وہ ان کے نرغے میں گھر گیا تھا۔ بہت جلد اسے یہ منحوس خبر بھی سننے کو مل گئی کہ بڑے سردار کے ساتھیوں نے اس کے تمام چیلوں کو ابدی نیند سلا دیا ہے۔ دونوں کو اپنی موت واضح نظر آرہی تھی۔ تبھی انہی کوریڈور میں دوڑتے قدموں کی بازگشت سنائی دی۔ اور دونوں نے فی الفور دروازے پر ہونے والی دھڑ ادھڑ ادستک پر کان دھرے۔

☆......☆......☆

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بڑے سردار اور اس کا بیٹا غیر مسلم ہوں گے اور پس پردہ مجھے دھوکہ دیں گے۔ کیسے مسلمانیت کا لبادہ اوڑھ کر ان لوگوں نے مجھے اپنے عزائم کے لیے استعمال کرنے کی سعی کی تھی۔ مجھے کتنی اذیت ان کی وجہ سے برداشت کرنا پڑی تھی۔ چڑیا چڑیل نے خونی تابوت کی نذر کر دیا تھا۔ انگاروں کی طرح دہکتے زہر کو میرے اندر انڈیلا گیا تھا۔ میرے جسم پر موجود گوشت اب انسانی گوشت نہ رہا تھا بلکہ بچھوؤں کے زہر سے بنا ہوا تھا۔

یہ تو مجھے معلوم نہ تھا کہ میں اس تابوت کے اندر کتنا عرصہ رہا تھا مگر اتنا جانتا تھا کہ جتنا بھی عرصہ رہا ہوں اس تمام عرصے کے اندر مجھے بچھوؤں نے خون نوچا گھسیٹا ہوگا۔ اور ایک ایک بوٹی جسم سے نوچ لی تھی۔ یہی نہیں خون کی آخری بوند تک پی گئے ہوں گے۔ نجانے کن کرموں کی اتنی بھیانک سزا مجھے ملی تھی۔

رات نے کالی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ مگر اس اماوس کی بھیانک اور کالی رات کا اب مجھ پر کوئی اثر نہ تھا۔ میں تو دن کی بجائے رات کے اس گھپ اندھیرے میں ٹھیک طرح سے دیکھ رہا تھا۔ ابھی میں سوچوں کی کشمکش میں مبتلا تھا کہ مجھے یوں لگا جیسے میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی اور دوسرے ہی لمحے واقعی میں آسمان کی بلندیوں میں ہوا کے دوش ایک انجانی منزل کی طرف محو سفر تھا۔

یا میرے خدایا! یہ اب ایک بار پھر کیسی نئی افتاد آن وارد ہوئی ہے۔ کہیں چڑیا چڑیل نے اپنا خونی چلہ مکمل کر کے مجھے اپنا غلام بنا تو نہیں لیا۔ مگر اس نے تو کہا تھا کہ وہ جہاں پر چلہ کرے گی وہیں میرا تابوت رکھا ہوگا اور وہیں وہ مجھے اپنے تابع فرمان کر کے لے جائے گی۔ مگر یہ تو کچھ اور ہی لگ رہا تھا۔ میں اتنی تیزی سے اڑ رہا تھا کہ چاہنے کے باوجود بھی اپنی بند آنکھوں کو کھولنے کی سکت نہ رکھتا تھا۔

☆......☆......☆

بالآخر میرے قدم زمین سے ٹکرائے تو میں نے فی الفور اپنی آنکھیں کھولیں مگر آنکھیں کھولنے کے ساتھ ہی ایک حیرت انگیز منظر دکھائی دیا۔ میری آنکھوں کے سامنے بڑے سردار اور چھوٹے سردار کے علاوہ دو حسین و دلکش دوشیزائیں براجمان تھیں۔ وہ دونوں کوئی اور نہیں میری آشنا ہی تھیں۔ ایک سحر جھنور من اور اس کے بیٹے کی ساتھی تھی اور دوسری وہ تھی جس نے بڑے سردار کے خیمہ نما محل کے اندر میری سیوا کی تھی۔ میں نے غصے و نفرت سے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

ایک جم غفیر میری آنکھوں کے سامنے لگا ہوا تھا۔ مگر آناً فاناً میری نگاہیں ایک جگہ جا کر رک گئی تھیں۔ وہ منظر واقعی ناقابل یقین تھا۔ سمریز خان اور ظہریان ملک ان دیکھی زنجیروں کے ساتھ ہوا کے اندر لٹکے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ پاؤں پھیلے ہوئے تھے جیسے دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں کو زور سے کھینچ کے باندھ دیا گیا ہو۔ آہنی زنجیریں میں بندھے ان دونوں کو دیکھ کر میں غصے سے پھنکارا۔ میں جانتا تھا کہ اب میں ایک زہریلا انسان بن چکا ہوں اور کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں کہ کوئی میرے مدمقابل ٹھہرنے کی جرأت کر سکے۔

میں نے ایک نظر بڑے سردار اور ان کے ساتھ براجمان چھوٹے سردار اور دونوں دوشیزاؤں کو دیکھا۔ وہ میرے دیکھنے کے انداز کو نہ بھانپ سکے۔ نہ ہی وہاں لگے جم غفیر میں سے کوئی میرے دل کی بات جان سکا اور نہ ہی آہنی زنجیروں میں جکڑے میرے دونوں حریف۔ دوسرے ہی لمحے میں فضا میں اڑتا ہوا سمریز خان کے سر پر پہنچ گیا۔ میں نے اپنی انگلیاں اس کے شریر میں گھسیڑ دیں۔ اس کے منہ سے دل دہلا دینے والی چیخیں برآمد ہوئیں۔ اس کے لیے یہی کچھ کافی تھی۔ پھر پلک جھپکتے میں میں ظہریان ملک کے سر پر تھا۔ میں نے اس کی گردن کے پاس اپنے دانت دبا کر اس کی گردن میں سے خون نکالا۔

بس یہی کچھ بہت تھا۔ پھر ایک جان لیوا منظر سب کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ دونوں کی سماعت شکن چیخوں نے ماحول میں خوف و ہراس کی لہر دوڑا دی تھی۔ ان کی حالت کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ دونوں نہایت ہی کرب واذیت میں مبتلا تھے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کے شریروں میں سے کئی رنگوں کا دھواں نکلنے لگا اور پھر ایک دم ان کے شریروں کو آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

سماعت شکن چیخیں متواتر ان کے حلق سے برآمد ہورہی تھیں۔ چاروں طرف گوشت کے سڑنے کی بساند پھیل گئی تھی۔ ہر کس و ناکس پریشان تھا۔ یہ سب کچھ اتنا جلدی ہوا تھا کہ کسی کو یقین بھی نہ تھا کہ میں پلک جھپکتے میں ان دونوں کا یہ حال کر کے انہیں بے حال کردوں گا۔ مگر جو کچھ ان دونوں نے میرے ساتھ کیا تھا۔ یہ سزا ان کے لیے ناکافی تھی۔

اب کے میرا رخ بڑے سردار اور اس کے ساتھ براجمان ان کے پسر اور دونوں دختر کی طرف چلا گیا۔ ان کے چہروں پر مکمل اطمینان اور خوشی کے تاثرات تھے۔ میں چاہ کر بھی ان کا کوئی نقصان کرنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتا تھا کہ وہ جیسے بھی تھے انہوں نے مشکل حالات میں میرا ساتھ دیا تھا۔ میں وہاں سے واپس پلٹنے ہی لگا تھا کہ چھوٹے سردار کی دل موہ لینے والی آواز میری قوت سماعت سے ٹکرائی۔

''اگر اولاد سے غلطی ہوجائے تو والدین انہیں یکسر فراموش کردیا کرتے ہیں لیکن اگر والدین سے کوئی غلطی ہوجائے تو کیا اولاد ان کو سنبھلنے کے لیے ایک موقع بھی نہیں دے سکتی میرے بچے۔۔۔۔۔'' چھوٹے سردار کی بات سن کر میری آنکھوں نم ہوگئیں۔ آنکھوں کی دیدوں پر آنسوؤں کے لشکر نے قدم جمالیے۔ گویا وہ اب بھی مجھے اپنا بیٹا کہتے تھے۔ ان کے لب و لہجے میں واقعی ایک باپ والی تاثیر تھی۔

''تم اب انسانوں کی بستی میں مت لوٹو میرے بچے۔ کیونکہ تم اب ہمارے جیسے ایک عظیم شکتی شالی عقرب بن چکے ہو۔ تم ہماری قوم کا ایک فرد بن جاؤ۔ ممکن ہے انسانوں کی بستی میں تم سے خون خرابا شروع ہوجائے یا پھر کوئی شیطانی طاقت تمہارے آڑے آجائے۔ تم ہمارے درمیان رہو میرے بچے۔ ہم پہلے جیسے بھی تھے مگر آج اس خالق کائنات کو حاضر و ناظر جان کر کہہ رہے ہیں کہ ہم سب مسلمان ہوچکے ہیں۔

ہم لوگ جان چکے ہیں کہ مسلمان کبھی اپنی بات سے نہیں ہٹتا۔ ہمت و استقلال کی مثال ہیں مسلمان۔ تمہارے حوصلے اور صبر و برداشت نے ہمیں شیطانی راستوں سے ہٹا کر نورانی راستوں پر لگادیا ہے۔ ہم صحراؤں میں پھرنے والے زندگی کو تلاش کرچکے ہیں۔ ہمیں اب فخر ہوگا کہ ہم مریں گے تو اس خالق کے روبرو جانے پر ہمیں شرمساری سے دوچار نہ ہونا پڑے گا۔

یہ بات ٹھیک ہے کہ لحظہ بہ لحظہ ہم نے تم سے دروغ گوئی کی۔ مگر اس وقت ہمارے اندر ایمان کی روشنی نہ تھی۔ درحقیقت سحر میری بہن ہے جسے بچانے کے لیے ہم نے بہت پاپڑ تولے تھے مگر ہماری ہر سعی ناکام گئی اور تم ہماری زندگیوں میں ایک امید کی کرن بن کر ابھرے اور تم نے واقعی وہ کر دکھایا جس کے بارے میں ہم تخیل میں بھی نہ سوچ سکتے تھے۔ آج ایک اور انکشاف بھی تم پر کیے دیتا ہوں کہ سمریز خان عرف بھنور من بڑے سردار کے بھائی اور میرے چچا تھے جبکہ ان کا صاحبزادہ فرنوس بھرنو من عرف ظہریان ملک میرے چچازاد تھا۔

ہر لحاظ سے ہم نے تمہارے ساتھ دروغ گوئی کی چاہو تو ہمیں بھی بھنور من اور اس کے پسر کے پاس بھیج دو اور چاہو تو میرے بچے آج ہمیں ایک بار سنبھلنے کا موقع دے دو۔''

چھوٹے سردار کی بات سن کر میں آبدیدہ ہوگیا اور دوسرے ہی لمحے دوڑ کر ان کے گلے لگ گیا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ آنسو تھے کہ ایک تواتر کے ساتھ بہے جارہے تھے نجانے کتنے غم تھے جو ان اشکوں کے ساتھ کرتے چلے گئے۔ جب دل کا غبار نکل گیا۔ تو میں چھوٹے سردار سے علیحدہ ہوا۔ تبھی بڑے سردار نے آگے بڑھ کے مجھے اپنے گلے لگالیا۔ ہر چہرے پر خوشی کے ابھرے تاثرات مجھے واضح دکھائی دے رہے تھے۔

اب وہاں بڑے سردار، چھوٹے سردار، ان کی دونوں دختر کے علاوہ میں ابھی ایک نشست پر براجمان تھا۔ وہاں ایک دور تک دکھائی دینے والا جم غفیر لگا ہوا تھا۔

''میرے پیارے ساتھیو! آج ہم سب بہت خوش ہیں اور اس خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے میں اپنی دختر عبیرہ کی شادی آپ سب کی موجودگی میں اس عظیم نوجوان سے طے کرتا ہوں جس کی ہمت و حوصلے پر ہمیں قطعاً کوئی شک نہیں۔ ایسے ہی نوجوان ہر نسل کو سنوارتے ہیں۔ اگر ایسے ہی

زندہ دل، حوصلہ مند، انصاف پسند، ایمان کی طاقت سے مزین نوجوان ہر نسل میں پیدا ہو جائیں تو وہ دن دور نہیں جب اسلام دنیا کے کونے کونے میں پھیل جائے گا۔ اور اب میں بنا کسی تاخیر کے رسمِ نکاح شروع کرواتا ہوں۔"

رسمِ نکاح کے بعد تمام بستی والوں کی نہایت ہی اچھے کھانے سے تواضع کی گئی۔ میری اور عبیرہ کی وہ پہلی رات تھی جسے زندگی بھر فراموش نہیں کرسکتا۔ عبیرہ ایک بہت ہی اچھی اور شریف النفس لڑکی تھی۔ ہمارے کمرے میں سہولیات زندگی کی ہر شے موجود تھی۔ ہمارے بیڈ کے بالکل سامنے پیروں کی طرف ایک قدآدم سنگھار میز بھی سجادیا گیا تھا۔ ایک سائیڈ پہ ایک صوفہ سیٹ اور اس کے سامنے ایک نہایت ہی خوبصورت اور دیدہ زیب میز بھی رکھا گیا تھا۔ کمرے کے اندر نہایت ہی پیاری خوشبو آرہی تھی۔ میری یہ رات میرے لیے ناقابل فراموش رات تھی۔ جب میں پہلی بار اپنی ایک نئی زندگی کا آغاز کررہا تھا۔ اس زندگی کا آغاز جس کے بعد میری زندگی میں شاید کبھی دکھوں کا بسیرہ نہ ہو۔

☆......☆......☆

وہ رات کیسے گزری پتہ ہی نہ چلا۔ عبیرہ پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھتی تھی۔ رات وہ کس وقت بستر سے اٹھی مجھے کچھ معلوم نہ تھا۔ میری آنکھ رات کے پچھلے پہر اچانک ہی کھل گئی۔ مجھے اپنے جسم میں شدید تکلیف کا احساس ہوا حتی کہ درد کی زیادتی کے باعث میری آنکھیں نم آلود ہوگئیں۔ تبھی مجھے یوں لگا جیسے میرے جسم کی ہیئت مکمل طور پر تبدیل ہونا شروع ہوگئی ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں اچانک رنگ تبدیل کرنے لگے۔ کمرے کی لائٹ میں نے فوراً آن کردی۔ تب میں نے نہایت ہی بھیانک منظر دیکھا۔

میرے پورے جسم کا رنگ تبدیل ہونا شروع ہوگیا تھا۔ میں نے سرعت سے کمرے کی اندر سے کنڈی لگادی، اور بستر پر براجمان ہوگیا۔ اچانک ہی ایک دبی دبی سی چیخ میرے حلق سے خارج ہوئی۔ کیونکہ میری پسلیوں کے نیچے سے دو عجیب ہی ہیئت کے لمبے لمبے بازو باہر نکلے۔ وہ بازو بالکل ایسے تھے جیسے کسی بچھو کے پاؤں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد تو پلک جھپکتے، میں جیسے بستر پر میں تھا ہی نہیں کوئی بہت بڑا اور بھیانک شکل کا بچھو اپنے پیروں پر ایستادہ ہو۔

میری نگاہیں متواتر سنگھار شیشے میں لگی ہوئی تھیں۔ میں حیران و ششدر تھا کہ یہ سب کیا ہوگیا تھا۔ تھوڑی دیر قبل میں انسانی روپ میں تھا اور اب ---۔ ایک بچھو۔۔۔۔ میرے دل سے ایک آہ نکلی۔

میرے جسم میں بچھوؤں نے اپناز ہر پھیلا دیا تھا۔ میں اب ایک انسان نہیں رہا بلکہ ایک بہت بڑا بچھو بن چکا ہوں۔ ایک طاقتور بچھو۔ جو دنیا کو انگلی کے پور پہ اٹھانے کی سکت رکھتا ہے۔ جس کے سامنے قدآدم پہاڑ بھی کوئی فوقیت نہ رکھتے ہیں۔ جس کے سامنے دنیا کی کوئی طاقت بھی دم نہیں ہلاسکتی۔ مگر مجھے اپنی اس شکتی پر مان نہیں ہے۔ غرور و تکبر کا میں نے قطعاً کوئی لبادہ نہیں اوڑھا کیونکہ میں آج بھی ایک سچا اور پکا مسلمان ہوں۔

میں کبھی بھی کسی انسان کو ایذا نہیں پہنچاؤں گا بلکہ اب انسانوں کی دنیا میں جاؤں گا ہی نہیں۔ کہیں جانے انجانے میں کوئی میرا نشانہ نہ بن جائے اور میں اپنی عاقبت تباہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں خود سے بچھو نہیں بنا بلکہ حالات نے مجھے انسان سے بچھو بنادیا ہے۔ میری ہیئت تبدیل ہوگئی ہے۔ دنیا میں میرا ہے ہی کون؟ میری تو اب دنیا عبیرہ سے ہی منسوب ہے وہ میرا سب کچھ ہے۔ میں اب زمین کی گہرائیوں میں بس اپنی اہلیہ عبیرہ کے ساتھ اپنی زندگانی کے باقی دن بیتاؤں گا۔ میں اس کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ میں بے شک انسان سے بچھو اور بچھو سے انسان کا روپ دھارنے کی شکتی کا مالک بن چکا ہوں مگر پھر بھی میری رگوں میں اب خون نہیں بلکہ زہر دوڑ رہا ہے، اس لیے انسانوں کی بستی کو ہمیشہ کے لئے خیرآباد کہہ کے اب زمین کی پستیوں کو ہی اپنا مسکن بناؤں گا۔ اور زمین کے نیچے سے نکل کر دنیا پر نہ جاؤں گا کبھی بھی نہیں۔